بہنوں کا اپنا ماہنامہ
ستمبر 13
شعاع
ڈیسنٹ سپر سٹور
شان سنٹر کھالیہ

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں، غزلیں

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)----- 600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ---- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا--- 6000 روپے

مستقل سلسلے

ستمبر 2013
جلد 28 شمارہ 1
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: ۲۱، بی ۶ پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

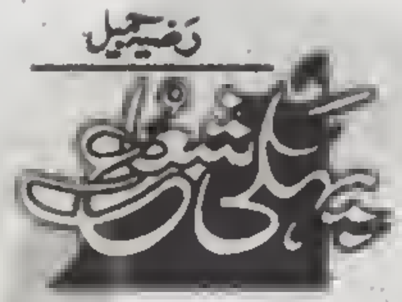

شعاع کا ستمبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

ملک کا بڑا حصہ اس وقت سیلابی ریلے کی زد میں ہے۔ اس میں ہمارے پڑوسی ملک جس سے ہم امن کی آشا رکھتے ہیں، کی کارفرمائیوں کا بھی بڑا حصہ ہے لیکن اصل سبب ہماری نااہلی اور صحیح منصوبہ بندی کا فقدان ہے۔ بارش جو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ پانی جو زندگی کی علامت ہے' ہر سال ہماری کوتاہیوں کے سبب یہ بارش زحمت بن جاتی ہے۔ وہ پانی جو ہمارے رزق کی بنیادی شرط اور ہماری فصلوں کے لیے آبِ حیات ہے' جس سے سستی بجلی پیدا کی جا سکتی ہے' نہ صرف ضائع ہوتا ہے بلکہ ہمارے لیے خطرہ بھی بن جاتا ہے۔

کراچی میں ایک دن کی بارش نے شہری اداروں کی کارکردگی کو آشکار کر دیا ہے۔ یہ معمول کی بارش تھی جس کا دورانیہ دو، ڈھائی گھنٹے سے زیادہ نہ تھا لیکن شہر میں سیلاب کی سی صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ شہر میں بڑے بڑے منصوبے بنانے والوں نے پانی کی نکاسی کے بارے میں کچھ نہیں سوچا اور اس کا نتیجہ کراچی کے شہریوں کو بھگتنا پڑا۔

اس صورت حال میں جبکہ سیلاب سے بے شمار لوگ متاثر ہوئے ہیں، حکومتی اداروں کی طرف دیکھنے کے بجائے ہمیں خود ان کی ہر ممکن مدد کے لیے آگے بڑھنا چاہیے۔

قارئین سے درخواست،

ہماری قارئین مختلف سلسلوں کے لیے ہمیں تحریریں بھجواتی ہیں تو اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بھی لکھتی ہیں۔ ہم شعاع میں جو احادیث شائع کرتے ہیں' وہ احادیث کی مستند کتابوں صحاح ستہ سے نقل کی جاتی ہیں تاکہ کسی غلطی کا احتمال نہ رہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ ہمیں احادیث نہ بھجوائیں۔ بہت سی بہنیں خط کے آغاز میں بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھتی ہیں۔ آپ خط لکھنے کا آغاز کرتے ہوئے بسم اللہ پڑھ لیں۔ خط پر نہ لکھیں کیونکہ اس میں بے ادبی کا احتمال ہوتا ہے۔

اس شمارے میں،

سمیرا حمید ہماری نئی اور نوعمر مصنفہ ہیں۔ انہیں لکھتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ ان کے متنوع اور سنجیدہ موضوعات نے قارئین کو چونکا دیا ہے۔ سمیرا حمید یقیناً مصنفین میں ایک بہت اچھا اضافہ ہیں اور ہم بجا طور پر توقع کر سکتے ہیں کہ گزرتے وقت کے ساتھ وہ مزید آگے بڑھیں گی اور کامیابیاں حاصل کریں گی۔

اس ماہ ان کا ناول "محبت من محرم" شامل ہے۔ قارئین اس کے بارے میں اپنی رائے ضرور لکھیں۔

- ، سمیرا گل کا مکمل ناول اُجالوں کا سفر،
- ، صائمہ اکرم اور صدف آصف کے ناولٹ،
- ، عنیقہ محمد بیگ، امایہ خان، فوزیہ احسان رانا اور معصومہ اقبال کے افسانے،
- ، رخسانہ نگار عدنان اور نبیلہ عزیز کے ناول،
- ، بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا۔ آمنہ زریں کا تبصرہ،
- ، ریحان اسعدی اور ثنا ریحان کا بندھن،
- ، معروف شخصیت سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- ، پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیث کا سلسلہ،
- ، خط آپ کے، شاعری سچ بولتی ہے، شعاع کے ساتھ ساتھ اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا، ہمیں خط لکھ کر ضرور بتائیے گا۔

اک لفظ کُن ہی باعثِ نقش و نگار ہے
یارب تُو کائنات کا پروردگار ہے

یہ عرش و فرش، لوح و قلم، مہر و ماہ و نجم
ہر شے پہ یاکریم تجھے اختیار ہے

معبود ہے تُو ہی یہاں مسجود ہے تُو ہی
ہر چیز تیرے سامنے سجدہ گزار ہے

میرے مقدّرات کی تحریر کو بدل
بندہ نوازیوں کا تیری انتظار ہے

تُو ہے غفور، تُو ہی رحیم و کریم بھی
بندوں کے حال پر کرم بے شمار ہے

اے برگ اس کی کون ثنا کر سکے یہاں
یہ حمد شاعری کا میری شاہکار ہے

برگ یوسفی

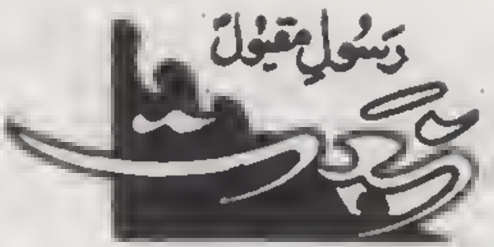

وہؐ ہے شاہِ عرب وہؐ ہے طٰہٰ لقب
وہؐ ہے جانِ جہاں اُس پہ قربان سب
اس جہانِ محبّت پہ لاکھوں سلام
مصطفیٰؐ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
بے وسیلوں کا تنہا وسیلہ بنا
بے سہاروں کا واحد سہارا بنا
ظلمتِ کُفر میں وہ نویدِ سحر
شامِ غم میں سحر کا ستارہ بنا
اس نبیؐ کی رسالت پہ لاکھوں سلام
مصطفیٰؐ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
وہ ہے بحرِ سخا، وہ ہے گنجِ عطا
وہ دُعائے خلیل و حبیبِؐ خدا
اس کی شانِ سخاوت پہ لاکھوں سلام
وہ شہہ ذی حشم ہے خدا کی قسم
وہ شفیع الامم ہے خدا کی قسم
اس نے راہِ ہدایت دکھائی ہمیں
وہ خدا کا کرم ہے، خدا کی قسم
اس چراغِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

بنتِ مجتبیٰ مینا

ادارہ

پیارے نبی کی پیاری باتیں

وعظ کے طور پر واقعات بیان کرنا

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"لوگوں کو وعظ امیر کرتا ہے یا جسے حکم دیا گیا ہو (اور اس منصب پر مقرر کیا گیا ہو) یا ریا کار۔"

فوائد و مسائل : 1 ۔انبیائے کرام علیہ السلام اور سلف صالحین کے واقعات بیان کر کے عوام کو وعظ و نصیحت کرنا ایک اہم منصب ہے۔

2 ۔ اسلامی حکومت میں خطبہ دینا حکمران کا فرض ہے۔ مختلف شہروں میں اپنے نائب (گورنر اور مقامی حکام) مقرر کرنا بھی اس کا فرض ہے، جو اپنے اپنے مقام پر عوام کی دینی رہنمائی کریں اور انتظامی معاملات کی نگرانی اور رہنمائی بھی کریں۔

3 ۔ شرعی امیر کی اجازت کے بغیر وعظ کرنے کا مقصد اپنی علمیت کا اظہار ہو سکتا ہے، جو ریا کاری ہے۔

4 ۔ جب اسلامی سلطنت قائم نہ ہو تو ہر عالم عوام کی دینی رہنمائی کا ذمہ دار ہے لیکن دین کے علم سے بے بہرہ شخص محض اپنی قوت بیان کے زور پر عوام کا قائد بننے کی کوشش کرے گا تو گمراہی پھیلانے کا باعث ہو گا۔

شعر و شاعری کا بیان

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کچھ شعر دانائی اور حکمت ہوتے ہیں۔"

فوائد و مسائل : 1 ۔شاعری کلام ہی کی ایک صورت ہے۔ جس طرح نثر میں اچھی بری دونوں طرح کی باتیں کی جا سکتی ہیں، اسی طرح شعروں میں بھی اچھی بری دونوں طرح کی باتیں ہو سکتی ہیں۔

2 ۔ بری شاعری سے اجتناب کرنا چاہیے، البتہ اچھے شعر کہنا سننا جائز ہے۔

سچے اشعار

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے فرمایا۔

"کسی شاعر کی کہی ہوئی سب سے سچی بات لبید کا یہ کلام ہے۔ "اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے۔" اور امیہ بن ابو صلت قریب تھا کہ مسلمان ہو جاتا۔

فوائد و مسائل : 1 ۔ حضرت لبید رضی اللہ عنہ عرب کے ایک شاعر تھے جو مسلمان ہو گئے تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں فوت ہوئے۔

2 ۔ جو کام اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے وہی نیکی ہے۔

3 ۔ امیہ بن ابو صلت غیر مسلم شاعر تھا لیکن اس کے شعر اچھے تھے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمائے۔

اچھے اشعار

حضرت شرید ثقفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امیہ بن ابو صلت کے سو شعر سنائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر شعر کے بعد فرماتے۔

"(اور شعر) سناؤ۔" اور فرمایا "قریب تھا کہ وہ مسلمان ہو جاتا۔"

فوائد و مسائل : 1 ۔اچھے اشعار کی تعریف کرنا اور فرمائش کر کے سننا جائز ہے، خواہ وہ کسی غیر مسلم شاعر ہی کے ہوں۔ اچھے شعر سے مراد یہ ہے کہ اس میں کفر و شرک یا فسق و فجور والی باتیں نہ ہوں۔

ناپسندیدہ اشعار

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"آدمی کے پیٹ کا شعروں سے بھرے ہونے سے بہتر یہ ہے کہ وہ پیپ سے بھرا ہوا ہو جس سے وہ بیمار ہو جائے۔"

فوائد و مسائل : 1 ۔پیٹ بھرنے سے مراد یہ ہے کہ اشعار سے اتنی دلچسپی ہو کہ ادھر ہی توجہ رہے تاہم برے شعر تھوڑے بھی یاد ہوں تو اچھی بات نہیں۔

2 ۔اس حدیث میں شعروں سے مراد برے شعر ہیں۔

ہجو کرنا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"سب سے بڑا جھوٹ بولنے والا وہ شخص ہے کہ ایک آدمی نے دوسرے کی ہجو کی تو اس نے (جواب میں) پورے قبیلے کی ہجو کی (یہ سب سے بڑا جھوٹا ہے) اور وہ آدمی جو اپنے باپ سے نسبی تعلق توڑتا ہے اور اپنی ماں کو بدکار قرار دیتا ہے۔"

فوائد و مسائل : 1 ۔جس آدمی سے تکلیف پہنچے، اسے تو برا بھلا کہا جا سکتا ہے لیکن اس سے تعلق رکھنے والے دوسرے لوگوں کو بھی برا قرار دینا جھوٹ ہے، جو بہت بڑا گناہ ہے۔

2 ۔ہمارے معاشرے میں یہ چیز پائی جاتی ہے کہ بعض قبائل یا پیشوں کے بارے میں ایک رائے مشہور ہو جاتی ہے جس شخص میں وہ خرابی نہ ہو۔ اس قبیلے یا پیشے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اس سے بھی بد گمانی کی جاتی ہے یا اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ یہ بری عادت ہے۔

3 ۔ ہجو، یعنی شعروں میں کسی کی مذمت برا کام ہے، البتہ مسلمانوں سے بر سر پیکار کافروں کی ہجو کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس کی زد میں مسلمان نہ آئیں۔

4 ۔ قبیلہ یا خاندان باہمی تعارف کا ایک ذریعہ ہے۔ عزت و ذلت کا تعلق عمل سے ہے خاندان سے نہیں۔

5 ۔ اپنے قبیلے کو ادنیٰ سمجھ کر خود کو کسی دوسرے معروف قبیلے کا فرد مشہور کرنا کبیرہ گناہ ہے۔

6 ۔ جب ایک شخص دوسرے قبیلے سے نسبت قائم کرتا ہے تو گویا وہ اس بات کا اعتراف کر رہا ہے کہ اس کی پیدائش اس شخص سے نہیں ہوئی جو اس کا حقیقی باپ سمجھا جاتا ہے بلکہ دوسرے قبیلے کے کسی فرد سے ہوئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کی ماں بدکار ثابت ہوتی ہے۔ اس سے اس حرکت کی برائی واضح ہے۔

نرد (چوسر) کھیلنا

حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس نے نرد کھیلا، اس نے گویا اپنا ہاتھ خنزیر کے گوشت اور خون سے آلودہ کیا۔"

فوائد و مسائل : 1 ۔ نرد یا نرد شیر ایک کھیل ہے جس میں مختلف خانوں میں گوٹیں رکھ کر انہیں ایک خاص طریق سے حرکت دی جاتی ہے، جس کے نتیجے میں کھیل میں ہار جیت ہوتی ہے۔ چوسر اور شطرنج وغیرہ اس کی مختلف صورتیں ہیں۔

2 ۔ نرد اور شطرنج وغیرہ میں عام طور پر شرط لگا کر کھیلا جاتا ہے اور ہارنے والا جیتنے والے کو کوئی چیز یا نقد رقم ادا کرتا ہے، اس لیے یہ جوئے میں شامل ہے جو حرام

ہے۔

3 ۔خنزیر ناپاک جانور ہے۔ ایک مسلمان اسے چھونا بھی گوارا نہیں کرتا۔ چہ جائیکہ اس کا گوشت بنائے یا خون میں ہاتھ رنگے۔ جوئے سے تعلق رکھنے والے کھیلوں سے اتنی ہی نفرت ہونی چاہیے۔

4 ۔ شطرنج اور جوئے کے حرام ہونے کی یہ وجہ ہے کہ لوگ اس میں مشغول ہو کر وقت ضایع کرتے ہیں حتیٰ کہ نماز کی بھی پروا نہیں کرتے۔ کسی دوسرے کھیل میں بھی اس انداز سے مگن ہونا منع ہے کہ عبادت ذکر الٰہی اور حقوق العباد کی ادائی متاثر ہو۔

5 ۔بعض علماء نے بغیر شرط لگائے شطرنج کھیلنا جائز قرار دیا ہے۔ بشرطیکہ دوسرے فرائض کی ادائی پر اثر نہ پڑے لیکن اس سے پرہیز ہی بہتر ہے کیونکہ شروع میں اگر یہ احتیاط ملحوظ بھی رکھی جائے تو عادت پڑ جانے پر اس کا خیال رکھنا مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔

کبوتر بازی

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے ’نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک آدمی ایک پرندے کا پیچھا کر رہا ہے تو فرمایا۔

”ایک شیطان دوسرے شیطان کا پیچھا کر رہا ہے۔“

فوائد و مسائل : 1 ۔پرندوں کو کسی جائز مقصد کے لیے پالنا جائز ہے ’تاہم اگر محض تفریح کے لیے ہوں اور وقت کے ضیاع کا باعث ہوں تو ان سے بچنا چاہیے۔

2 ۔ ہر وہ مشغلہ جس کو جائز حد سے زیادہ اہمیت دی جائے اور اس پر وقت اور مال ضایع کیا جائے ’وہ ممنوع ہے۔

3 ۔ کبوتر بازی کی طرح پتنگ بازی بھی فضول اور خطرناک مشغلہ ہے۔ اس سے بھی اجتناب ضروری ہے۔

4 ۔ کبوتر کو شیطان کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے مفاسد کی وجہ سے شیطان خوش ہوتا ہے۔

تنہائی اچھی نہیں

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ تنہائی میں کیا کیا (خرابی اور نقصان) ہے تو کوئی شخص رات کو اکیلا سفر نہ کرے۔“

فوائد و مسائل : 1 ۔لمبے سفر میں بسا اوقات ایسے حالات پیش آسکتے ہیں کہ ساتھی سے تعاون اور مدد حاصل کرنے کی ضرورت پڑے ’اس لیے سفر میں نیک ہم سفر کا ساتھ ہونا چاہیے۔

2 ۔رات کو زیادہ خطرات پیش آسکتے ہیں ’اس لیے رات کو اکیلے سفر کرنے سے اجتناب ضروری ہے۔

3 ۔اگر انتہائی مجبوری ہو تو اکیلے سفر کیا جا سکتا ہے جیسے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے ہجرت کا سفر اکیلے طے کیا تھا۔

4 ۔ آبادی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا عرف عام میں سفر نہیں کہلاتا لہٰذا اس میں تنہائی جائز ہے۔

آگ بجھا کر سونا

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ’نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جب تم سوتے ہو تو گھروں میں آگ (جلتی) نہ چھوڑا کرو۔“

فوائد و مسائل : 1 ۔موم بتی اور چراغ وغیرہ جلتا ہوا چھوڑ کر سونے سے حادثے کا خطرہ ہوتا ہے۔ گھر میں کسی چیز کو آگ لگ سکتی ہے۔

2 سردی کے موسم میں کمرے گرم کرنے کے لیے بعض اوقات کوئلوں کی انگیٹھی استعمال ہوتی ہے۔ بند کمرے میں انگیٹھی جلتی چھوڑ کر سو جانے سے جہاں آگ لگنے کا خطرہ ہوتا ہے ’وہاں زہریلی گیس کا کمرے میں جمع ہو جانا بھی جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے۔

گیس کا ہیٹر بھی کھلا چھوڑ کر سونے میں بڑے خطرات ہیں۔ اس کے مفاسد بھی اخبارات میں آتے رہتے ہیں۔

3 ۔ بجلی کا بلب جلتا رہے تو اس سے یہ خطرہ نہیں ’تاہم تیز روشنی میں پرسکون نیند حاصل نہیں ہوتی۔ اگر ضرورت ہو تو انتہائی ہلکی روشنی کا بلب جلانا چاہیے۔

4 ۔ کسی بھی خطرناک چیز مثلاً ”بجلی کے آلات استعمال کرتے وقت ضروری احتیاطی تدابیر اختیار کرنا لازم ہے۔

آگ دشمن ہے

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ’کہ مدینہ منورہ میں ایک گھر کو آگ لگ گئی جب کہ گھر والے گھر میں تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے حادثے کی خبر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”یہ آگ تمہاری دشمن ہے۔ جب تم سونے لگو تو اسے بجھا دیا کرو۔“

راستے پر پڑاؤ کرنے کی ممانعت

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”راستے پر قیام نہ کرو ’نہ وہاں قضائے حاجت کرو۔“

فوائد و مسائل : 1 ۔سفر کے دوران رات کو کہیں رکنے کی ضرورت پیش آئے تو راستے سے ہٹ کر آرام کرنا چاہیے۔

2 ۔سفر کے دوران گاڑی روکنے کی ضرورت ہو تو ایسی جگہ روکی جائے جہاں ٹریفک کی آمد و رفت میں رکاوٹ نہ پڑے۔

3 ۔راستے پر قضائے حاجت کرنے سے گزرنے والوں کو پریشانی ہوتی ہے۔

4 ۔ غیر ضروری اور تکلیف دہ اشیا راستے میں پھینکنا بری بات ہے۔

جانور پر تین آدمیوں کا سوار ہونا

حضرت عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ’انہوں نے فرمایا ’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر سے تشریف لاتے تو ہم (بچے) بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کرتے ’چنانچہ (ایک بار) میں اور حسن رضی اللہ عنہ یا حسین رضی اللہ عنہ بھی استقبال کرنے والوں میں شامل تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم میں سے ایک کو سواری پر اپنے آگے اور دوسرے کو اپنے پیچھے سوار کر لیا ’حتیٰ کہ ہم مدینہ پہنچ گئے۔

فوائد و مسائل : 1 ۔بزرگوں کو چاہیے کہ بچوں سے شفقت کا سلوک کریں۔

2 ۔سفر سے واپس آنے والے کا استقبال کرنا درست ہے لیکن اس میں بے جا تکلفات کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔

3 ۔ جانور پر ایک سے زیادہ افراد سوار ہو سکتے ہیں بشرطیکہ جانور آسانی سے بوجھ برداشت کر سکے۔ لمبے سفر میں یا کمزور جانور پر دو افراد کا سوار ہونا مناسب نہیں۔

4 ۔ حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ اور حسن رضی اللہ عنہ یا حسین رضی اللہ عنہ بچے تھے۔ ان دونوں کا بوجھ مل کر بھی ایک بڑے آدمی کے برابر نہیں تھا اس لیے تین افراد کا سوار ہونا جانور کے لیے مشقت کا باعث نہیں تھا۔

تحریر پر (سیاہی خشک کرنے کے لیے) مٹی ڈالنا

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اپنی تحریروں پر مٹی ڈال دیا کرو ’یہ کامیابی کا باعث ہو گا۔ مٹی برکت والی چیز ہے۔“

لو۔" انہوں نے جواب دیا "ہاں"۔

فوائد و مسائل : 1 ۔ اگر آدمی کے پاس کوئی نوک دار چیز ہو تو دوسروں کے پاس سے گزرتے ہوئے احتیاط سے کام لینا چاہیے کہ نادانستہ طور پر کسی کو نہ لگ جائے۔

2 ۔ نصال (پیکان) سے مراد تیر کا وہ نوکیلا حصہ ہے جو لوہے کا بنا ہوا ہوتا ہے اور شکار کو لگ کر اسے زخمی کرتا ہے۔

3 ۔ تیز چھری اور قینچی وغیرہ کی نوک بھی کسی کو چبھ سکتی ہے۔ گدھا گاڑی' بیل گاڑی' یا ٹرک وغیرہ پر لدا ہوا سامان بھی اگر اس قسم کا ہو کہ کسی گزرنے والے کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو سکتا ہو تو لازمی احتیاطی تدابیر اختیار کرنا ضروری ہے۔

4 ۔ رائفل' گن اور کلاشنکوف وغیرہ لوڈ کر کے نہیں رکھنی چاہیے۔ نہ اس حالت میں انہیں لے کر بازار' مسجد یا ایسی جگہ جانا چاہیے' جہاں لوگ جمع ہوں تاکہ اتفاقی طور پر بھی حادثے کا احتمال نہ ہو۔

احتیاط

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب کوئی شخص تیر لے کر ہماری مسجد میں یا ہمارے بازار میں سے گزرے تو اسے چاہیے کہ ان کے پیکان ہاتھ سے پکڑ لے' ایسا نہ ہو کہ کسی مسلمان کو کچھ گزند پہنچے۔"

دو آدمی تیسرے کو چھوڑ کر سرگوشی نہ کریں

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب تم تین افراد ہو تو دو آدمی اپنے (تیسرے) ساتھی کو چھوڑ کر سرگوشی نہ کریں کیونکہ اس سے اسے غم (اور افسوس) ہو گا۔"

فوائد و مسائل : 1 ۔ مسلمان کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے والی ہر حرکت سے اجتناب کرنا چاہیے۔

2 ۔ جب تین آدمیوں میں سے دو الگ ہو کر بات کریں گے تو تیسرا آدمی محسوس کرے گا کہ انہوں نے مجھے اس لائق نہیں سمجھا کہ بات چیت میں شریک کریں' علاوہ ازیں شیطان کے وسوسے سے یہ خیال بھی آ سکتا ہے کہ شاید یہ دونوں میرے خلاف کوئی مشورہ کر رہے ہیں۔

3 ۔ ایسے عمل سے پرہیز کرنا چاہیے جس کے نتیجے میں بدگمانی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔

4 ۔ جب تین آدمی ہوں تو دو آدمیوں کو آپس میں ایسی زبان میں بھی گفتگو نہیں کرنی چاہیے جسے تیسرا سمجھ نہ سکے۔

5 ۔ اگر مجلس میں زیادہ افراد موجود ہوں تو دو آدمی الگ ہو کر بات چیت کر سکتے ہیں۔

جس کے پاس تیر ہوں' اسے چاہیے کہ ان کے پھل (لوہے کا تیز حصہ) پکڑ کر رکھے

سفیان بن عینیہ رحمت اللہ کہتے ہیں میں نے حضرت عمرو بن دینار سے کہا۔ آپ نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہہ کو فرماتے ہوئے سنا ہے۔

"ایک آدمی تیر لے کر مسجد میں سے گزرا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔" "ان کے پیکان پکڑ

الیف ایم 101 کے

ریحان اسعدی ہمراہ ثنا ریحان اسعدی

شاہین رشید

آواز کی دنیا سے تعلق رکھنے والے جن لوگوں کو میں بہت شوق سے سنتی ہوں' ان میں ایک "ریحان اسعدی" بھی ہیں۔ خوبصورت انداز تکلم اور شعر و شاعری کا عمدہ انتخاب ان کی خاصیت ہے۔ "بندھن" کے سلسلے میں اس بار ان کی اور ان کی مسز ثنا اسعدی کی باتیں پڑھیں گے۔

"ریحان کیسے ہیں آپ اور آپ کی مسز؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔ بڑا کرم ہے۔ میں بھی ٹھیک ہوں اور میری مسز بھی ٹھیک ہیں۔"

"روزے اور عید کیسی گزری۔"

"الحمد اللہ روزے بہت اچھے گزرے' کیونکہ موسم بہت اچھا رہا۔ گرمی ہوتی تو شاید تھوڑی مشکل پیش آتی مگر تقریباً" سارا مہینہ ہی موسم اچھا رہا اور جناب عید بھی بہت اچھی گزری۔"

"کیا اہتمام کیا تھا؟"

"وہی جو ہمیشہ سے ہوتا ہے۔ جو روایات ہیں ہماری عید کے دن مہمانوں کی خاطر مدارت کرنے کی۔"

"اور شادی کے بعد تو عید اور بھی اچھی ہو گئی ہو گی۔"

ہنستے ہوئے۔ "بالکل جی۔ کیونکہ رشتے داری ڈبل جو ہو گئی۔ پہلے بھی بہت چاہا جاتا تھا خالہ کے گھر میں اور شادی کے بعد تو چاہت میں مزید اضافہ ہوا ہے تو بہت خوبصورت ہیں یہ پیار محبت کے رشتے۔ بس اللہ تعالیٰ محبتوں کو برقرار رکھے اور مزید اضافہ بھی کرے۔"

"فیملی لائف کیسی گزر رہی ہے۔ اور کتنے سال ہو گئے ہیں شادی کو"

"ماشاء اللہ بہت اچھی گزر رہی ہے۔ 23 فروری 2011 میں ہماری شادی ہوئی تھی۔ اور ماشاء اللہ سے ہماری دس ماہ کی ایک بیٹی بھی ہے جس کا نام بریرہ ہے۔ اس کا مطلب نیک اور پارسا ہے۔"

"ماشاء اللہ۔ پھر تو گھر میں خوب رونق ہو گئی ہو گی۔"

"جی بالکل۔ گھر آتا ہوں تو یہی خوشی ہوتی ہے کہ بیٹی کو پیار کروں گا اور اس کے ساتھ کھیلوں گا۔ وقت گزاروں گا۔"

"ثنا آپ کی خالہ کی بیٹی ہے۔ پھر تو آپ کی ہی پسند ہو گی۔"

"جی! ثنا میری خالہ کی بیٹی ہے اور ہم دونوں ایک دوسرے کو بچپن سے جانتے ہیں لیکن میں نے چونکہ شادی کے فیصلہ کا اختیار اپنے والدین کو دیا ہوا تھا' اس لیے میں نے کسی قسم کی پسند کا اظہار نہیں کیا۔ بس یہی سوچا کہ جو میرے والدین چاہیں گے وہ ہی میرا فیصلہ ہو گا۔"

"اچھا۔ اتنی فرماں برداری؟"

"اس لیے کہ میں اپنے والدین کا ایک ہی بیٹا ہوں۔ میری چار بہنیں ہیں اور والدین کا سب سے بڑا ارمان اپنے بیٹے کی شادی کا ہوتا ہے۔ اس لیے میں نے کہہ دیا تھا کہ آپ جس کو بھی پسند کریں گے' مجھے منظور ہو گا۔"

"کبھی کسی کو پسند کیا یا کبھی خیال آیا کہ اپنی پسند سے شادی کروں۔"

"نہیں کبھی نہیں۔۔۔ اور اگر میں کسی کو پسند کر لیتا اور بے شک سارے کام والدین ہی کرتے تب بھی ہم اس کو ارینج میرج نہیں کہہ سکتے تھے۔ کہلاتی تو وہ میری پسند ہی اس لیے میں نے ایسا نہیں کیا اور ساری ذمہ داری والدین اور بہنوں پر ڈال دی اور میں ان کی پسند پر بہت خوش ہوں۔"

"ثنا آپ کی خالہ کی بیٹی ہیں۔ منگنی کے بعد خالہ کے گھر کے چکر زیادہ لگتے ہوں گے؟"

"ارے نہیں۔ ہمارے خاندان کے رواج بہت سخت ہیں۔ خالہ کے گھر کے چکر کیا لگنے تھے' وہاں تو میرا آنا جانا ہی بند کر دیا گیا۔ ہمارے یہاں یہ رواج ہے کہ چاہے خاندان میں بات پکی ہو یا خاندان سے باہر۔ منگنی کے بعد ملنا جلنا تو دور کی بات رہی فون پر بات کرنے کی بھی اجازت نہیں ہوتی اور آپ یقین کریں کہ تین سال ہماری منگنی رہی۔ اس دوران نہ میں نے اس سے بات کی اور نہ ہی ملاقات کی۔ حالانکہ ثنا میری کزن بھی تھی اور اس رشتے سے میں ہر وقت مل سکتا تھا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔"

"برا نہیں لگتا تھا یا دل نہیں چاہتا تھا؟"

"نہیں برا نہیں لگا۔ کبھی کبھی دل چاہتا تھا کہ بات چیت کریں مگر پھر سوچا کہ یہ خاندان کی خوبصورت روایات ہیں تو میں انہیں کیوں توڑوں۔ شادی ہو جائے گی تو پھر ساری عمر ساتھ ہی تو رہنا ہے۔"

"واہ بھئی بڑے روایت پسند ہیں۔ شادی کی کوئی خاص بات جو بتانا چاہتے ہوں یا کوئی رسم جو سوچ کر ہنستے ہوں۔"

"ایک تو یہ کہ جب شادی کا کھانا کھلا تو سب کو اپنی اپنی پڑ گئی اور دلچسپ بات کہ ہم دولہا دلہن کی طرف کسی کا خیال ہی نہیں گیا کہ بھئی یہ بے چارے بھی بھوکے ہیں۔ تو اس وقت ہنسی بھی آئی اور برا بھی لگا کہ دیکھو ذرا اک ایک کھانے نے اپنوں کو بھی پرایا کر دیا۔

اور ایک رسم کا بھی ذکر کرنا چاہوں گا جو شادی کی رسومات میں سے ایک ہے۔ ہمارے یہاں روایت ہے کہ ایک تھال میں دودھ ڈال کر گلاب کی ڈھیر ساری پتیاں ڈال دی جاتی ہیں اور ایک انگوٹھی بھی' پھر کہا جاتا ہے کہ جو اس انگوٹھی کو پہلے نکال لے گا' وہ ساری عمر اپنے پارٹنر کی غلامی کرے گا۔ یہ عمل تین بار دہرایا گیا میں نے اشاروں اشاروں میں اپنی بیگم سے کہہ دیا کہ تم انگوٹھی نہیں نکالو گی۔ اور یوں پہلے دن سے ہی میں نے اپنا رعب رکھا بیگم پہ۔ تھال میں اس کے ہاتھوں کو پکڑے رکھا تاکہ وہ ڈھونڈ ہی نہ سکے۔" (قہقہہ)

"بیگم سلیقہ مند ہیں؟ کیا اچھا پکا لیتی ہیں؟"

"بہت سلیقہ مند ہیں اور سب کچھ بہت اچھا پکا لیتی ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہ اپنے گھر میں بڑی تھیں اور ساری ذمہ داری ان پر تھی اس لیے خاصی سگھڑ واقع ہوئی ہیں۔"

"کیا بیوی کو بھی جاب کرنی چاہیے۔"

"میرا نہیں خیال کہ بیوی کو جاب کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر گھر میں خوش حالی ہے تو کیا ضرورت ہے جاب کرنے کی۔ ویسے ہی گھر کی ذمہ داریاں بہت ہوتی ہیں اور اب تو ماشاء اللہ ہماری بیٹی بھی ہے تو بچوں کی اچھی تربیت کے لیے ان کی دیکھ بھال کے لیے ماں کا ہر وقت ان کے پاس ہونا بہت ضروری ہے۔"

"ثنا کی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں۔"

"مجھے تو سب عادتیں ہی اچھی لگتی ہیں۔ بری کی طرف تو میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا ہے اور پرفیکٹ کون انسان ہوتا ہے۔ اگر ہم بری باتوں کو بری عادتوں کو نظر انداز کر دیں تو اس سے اچھی بات ہی کوئی نہیں ہے۔ ثنا بہت محبت کرنے والی بیوی ہے۔"

"ایک روایتی بیگم کی طرح ثنا آپ کے سارے کام خود کرتی ہیں یا آپ بھی ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں؟"

"میں روایتی بیوی کی طرح ثنا سے کوئی کام نہیں

کرواتا۔ کیونکہ مجھے ہمیشہ سے اپنے کام خود کرنے کی عادت ہے اور شادی کے بعد بھی میں نے اپنی اس عادت کو برقرار رکھا ہوا ہے۔ بلکہ میں اکثر اپنی بیگم کا ہاتھ بٹا دیتا ہوں گھر کے کاموں میں۔ صرف کھانا پکانے کی ذمہ داری اس پر سونپی ہوئی ہے اور کچھ نہیں۔"

"فضول خرچ کون ہے؟"

"میں ہی ہوں۔ ثنا زیادہ فضول خرچ نہیں ہے۔ جس طرح عام طور پر لڑکیاں ہوتی ہیں۔ میں خوش ہوں کہ مجھے ایک سگھڑ اور سلیقہ شعار بیوی ملی ہے۔"

"سسرال کو کیسا پایا؟"

"وہ سسرال کہاں ہے۔۔۔ وہ تو اپنی خالہ کا گھر ہے اس لیے سسرال والا تو حساب کتاب ہی نہیں ہے۔ جو پہلے صرف کزن تھے اب سالے سالیوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ جب دل چاہتا ہے' سالے سالیاں بن جاتے ہیں اور جب دل چاہتا ہے کزن بن جاتے ہیں۔"

"اور آپ بھی جب دل چاہتا ہو گا داماد بن جاتے ہوں گے اور جب دل چاہتا ہو گا بھانجے بن جاتے ہوں گے۔"

"قہقہہ "ایسا تو چلتا ہی ہے۔"

"چلیں جی۔ اب ذرا اپنے بارے میں کچھ بتائیں!"

"میں 19 اپریل کو کراچی میں پیدا ہوا۔ انٹرنیشنل ریلیشنز میں ماسٹرز ڈگری حاصل کی ہے۔ والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ دو بڑی بہنیں اور دو چھوٹی بہنیں ہیں مجھے اتنا پیار اور اتنی محبت ملی ہے کہ بیان سے باہر ہے مگر شکر ہے کہ لاڈ پیار نے مجھے بگاڑا نہیں ہے۔"

ثنا ریحان اسعدی

"کیسی ہیں ثنا آپ؟ اور آج کل دن کیسے گزر رہے ہیں؟"

"جی الحمد اللہ بالکل ٹھیک ٹھاک۔ ماشاء اللہ سے دن بہت اچھے گزر رہے ہیں۔ جب سے بیٹی ہماری

زندگی میں آئی زندگی حسین بھی ہوگئی ہے اور مصروفیات میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔"

"آپ کے فیملی تعارف کی تو ضرورت نہیں کیونکہ آپ کی خالہ کے بیٹے ہیں ریحان۔ آپ کتنے بہن بھائی ہیں؟"

"جی ہم تین بہنیں اور تین بھائی ہیں اور میں خالہ کے گھر بڑی بہو بلکہ اکلوتی بہو بن کے آئی ہوں۔"

"پھر تو آپ کو ماحول نیا نہیں لگا ہوگا؟"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ خالہ کا گھر میرے لیے بالکل بھی نیا نہیں تھا خالہ اور میں تو بالکل دوستوں کی طرح ہیں، بہت بے تکلفی ہے میری ان سے۔ اور اپنی کزنز بہنوں سے بھی بہت بے تکلفی اور پیار ہے۔"

"جوائنٹ فیملی ہے؟"

"جی جوائنٹ ہی کہہ لیں۔ ساس سسر ہیں اور بہنیں ہیں اور مجھے جوائنٹ فیملی اچھی لگتی ہے۔ مل جل کر رہنے میں بہت برکت بھی ہے اور محبت بھی ہے۔"

"تین سال منگنی رہی۔ کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ پھر ان کے مزاج سے واقفیت تو شادی کے بعد ہی ہوئی ہوگی۔"

"ویسے ہمارے گھر ان کا آنا جانا تھا اور میرا بھی آنا جانا تھا تو تھوڑی بہت واقفیت تو تھی میری ان سے۔ ہاں! منگنی کے بعد ہم ہیلو ہائے سے بھی گئے اور تین سال کے بعد جب ہماری شادی ہوئی تو میں نے ان کو پہلے جیسا ہی پایا۔ ریحان بہت ٹھنڈے مزاج کے انسان ہیں۔ بالکل بھی غصہ نہیں کرتے اور بہت ہی اچھے انسان ہیں۔"

"آپ غصے کی تیز ہیں کیا؟ اور میکہ چھوڑتے وقت کیا تاثرات تھے آپ کے؟"

"غصہ تو مجھے بھی کم ہی آتا ہے، بہت مہینوں بعد یا سالوں بعد آتا ہے مگر بہت تیز آتا۔ ہے پھر جلدی ٹھنڈا بھی ہوجاتا ہے۔ اور جہاں تک میکہ چھوڑنے کی بات ہے تو کون سی ایسی لڑکی ہوگی کہ جس کو میکہ چھوڑتے وقت رونا نہ آیا ہو۔ میں بھی بہت روئی تھی۔ جہاں زندگی کا اتنا عرصہ گزارا ہو اس گھر کو چھوڑتے وقت دکھ تو ہوتا ہی ہے۔"

"نکاح اور رخصتی ایک ہی دن ہوئی تھی کیا؟ اور کون سی رسم اچھی لگی تھی؟"

"نہیں ایسا نہیں ہوا تھا۔ نکاح 16 فروری کو ہوا تھا اور رخصتی 23 فروری کو ہوئی تھی۔ اتنے دن گیپ کے باوجود بھی رخصتی کے وقت مجھے بہت رونا آیا تھا۔ رسمیں تو سب ہی اچھی تھیں۔ میں نے بہت انجوائے کیا ہر رسم کو۔"

"کوئی یادگار لمحہ؟"

"وہ تو بہت سارے ہیں۔ انگوٹھی والا قصہ تو انہوں نے سنا ہی دیا آپ کو۔ ہاں میں رخصتی کے دن بور بہت ہوئی تھی۔ کیونکہ ایسے موقعوں پر فوٹو سیشن کچھ زیادہ ہی لمبا ہوجاتا ہے میں اس قدر تھک گئی تھی کہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ جلدی سے یہ فوٹو سیشن ختم ہو اور میں یہاں سے جاؤں۔"

"شادی کے بعد کوئی ایسی بات جو جان کر خوشی ہوئی ہو؟ اور کوئی ایسی بات جو بری لگی ہو؟"

"مجھے معلوم تھا کہ لڑکیاں ان کی بہت بڑی فین ہیں۔ شادی کے بعد لڑکیوں کے فون آنا بالکل بند ہوگئے۔ شاید ان کی آس ٹوٹ گئی تھی (ہنستے ہوئے) پھر جب ان کو پرکھا تو اندازہ ہوا کہ یہ تو اندازے سے بھی زیادہ اچھے انسان ہیں۔ ہاں ان کی ایک بات یا ایک عادت بری کہہ سکتی ہوں کہ یہ نیند کے بہت رسیا ہیں۔ جہاں جب موقع ملتا ہے سوجاتے ہیں۔ مزے کی بات یہ کہ میرا دل چاہتا ہے کہ جب یہ گھر آئیں تو میں ان سے ڈھیر ساری باتیں کروں لیکن انہیں تو نیند اتنی آتی ہے کہ کچھ باتیں نہیں کرسکتی۔"

"منہ دکھائی میں کیا ملا تھا اور آپ کا کون سا روپ ریحان کو پسند ہے؟"

"منہ دکھائی میں سونے کا لاکٹ اور چین دی تھی انہوں نے اور میں انہیں ہر روپ میں ہی اچھی لگتی ہوں۔ ان کا دل چاہتا ہے کہ میں ہر وقت صاف ستھری اور سجی بنی رہوں۔"

"کھانا گھر کھانا پسند کرتے ہیں یا باہر؟"

"جب کوئی خاص موقع ہوتا ہے تو ہم باہر بھی چلے جاتے ہیں کھانے کے لیے۔ ویسے زیادہ تر گھر پر ہی پکاتی ہوں۔"

"شوقین ہیں کھانے کے؟ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں؟"

"کوئی خاص نہیں بس جو مل جائے ہنسی خوشی کھالیتے ہیں۔ اور چونکہ میں کھانا پکانے کی شوقین ہوں اس لیے انہیں اچھے اچھے کھانے پکا کر کھلاتی رہتی ہوں اور یہ تو مجھے خود ہی اچھا نہیں لگتا کہ ان سے گھر

کے کام کرواؤں۔ یہ پہلے ہی اتنے تھکے ہوئے آتے ہیں کہ پھر ان کی خدمت کرنے کو دل چاہتا ہے۔ خدمت کروانے کا نہیں۔"

"کھانا مل کر کھاتے ہیں آپ دونوں؟"

"یہ کہتے ہیں کہ تمہیں بھوک لگے تو کھالیا کرو۔ مگر مجھے ان کے ساتھ کھانا اچھا لگتا ہے۔ اس لیے میں کھانے پر ان کا انتظار کرتی ہوں۔"

"آپ کی تعریف میں کوئی ایک جملہ جو پہلی بار دیکھنے پر بولا ہو۔"

"تم بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے انٹرویو کا اختتام کیا۔

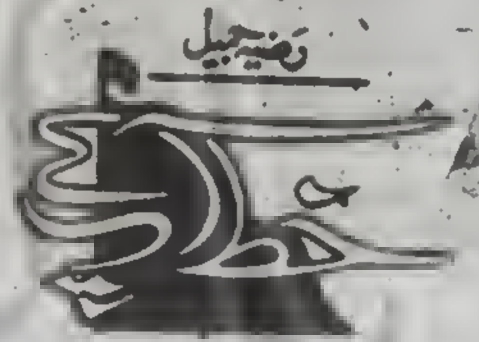

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع۔37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔
اللہ تعالیٰ سے آپ کی سلامتی' عافیت اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔
اللہ تعالیٰ آپ کو' ہم کو اور ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ (آمین)

پہلا خط بلال کالونی ملتان سے حرا قریشی کا ہے' لکھتی ہیں

کسی سلسلے میں بھی اپنا نام نہ پایا تو دل کی کیا حالت ہوئی؟ بس یہی کہوں گی۔

کھلکھلاتی اب کے اپنی عید نہ تھی
شعاع تم سے یہ امید نہ تھی

"حمد ونعت" نے دل پہ چھائی افسردگی کی گرد کو کسی حد تک کم کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں پڑھ کر ذہن کی آغوش میں پنہاں احادیث کے اسرار و رموز یک بیک روشن ہوگئے۔ "حیا ایمان کی شاخ ہے" پڑھ کر بے اختیار وہ حدیث یاد آگئی جو ازبر ہے۔ "جب تم حیا نہ کرو' تو جو چاہے کرو" کس قدر گہرے اسرار ور موز چھپے ہیں احادیث کے اس نایاب خزانے میں سحر ساجد نے "ابھی کچھ وقت باقی ہے" میں مثلث کے کونوں زر' زرمینے اور مجتبیٰ کو بخوبی مکمل کیا۔ حیدر صاحب نے صحیح وقت پر صحیح فیصلہ کیا۔ مجتبیٰ کی اعلا ظرفی نے تو کے ٹو کو بھی مات کردیا۔ عید 66 میں نصیحت کی پٹاری پر مرکوز تحریر ایک اچھوتا انداز لیے ہوئے تھی۔ راشدہ رفعت کی "عید خوب صورت سی" ہلکی پھلکی عید کے حوالے سے اچھی تحریر تھی۔ سارہ کی سنجیدگی اور علیزے کی باتوں سے محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ شیریں ملک "عید تیرے سنگ" میں حیدر کا کریکٹر بہنوں کے لیے محبت بھرا بے لوث جذبہ قابل دید تھا۔ سکندر کا بصورت عید اپنے پیار کا اظہار مریم کے لیے سونے کی چوڑیاں اور کانچ کی سبز چوڑیاں ہمیں بھی خوشی کے احساس سے دوچار کرگیا۔ عید اور ڈھیر ساری عیدی' مزا آجاتا ہے "عید اور عیدیاں" رضیہ مہدی کی تحریر میکے اور سسرال کا خوب صورت امتزاج دکھایا۔ نظیر فاطمہ کی "دہرا معیار" موجودہ دور کا المیہ خاص ہے۔ اب ہر فرد کو یاسمین کی طرح راہ دکھانے والا تو نہیں ملتا نا؟ سنیعہ مرزا کی تحریر "سو گئی ہر گزر" پڑھ کر دل لمحوں میں اداسی سے بھر گیا۔ بیسٹ افسانہ: میڈ ا عشق' قانتہ رابعہ کا بازی لے گیا۔ "خاوند میں ہزار عیب اور برائیاں ہوں۔ وہ تمہاری عزت کا محافظ تو ہوتا ہے نا۔" بہت خوب صورت جملہ بہت خوب صورت تحریر کا۔ قسط وار ناول کے علاوہ سحر ساجد کی تحریر ماسٹر پیس رہی' آنسو بس پلکوں کے باڑ پھلانگنے کے لیے بے تاب تھے کہ مجتبیٰ اور زر مل گئے۔ ایک بار پھر بہت خوب پھولوں کے سلسلے میں سب کے معمولات اور جوابات جان کر خوشی ہوئی۔ خصوصاً "مسکان قریشی کا جملہ "شعاع نے اس سال شاہکار ناول تخلیق کیے" کروڑ روپے کی بات کی ہے۔ بہت پسند آئی۔ باقی سلسلے بھی اپنی جگہ رنگ بکھیرنے میں ناکام نہیں رہے۔ "تاریخ کے جھروکوں سے" مسلمانوں میں آتش بازی کی ابتدا پڑھ کر معلومات میں حیرت انگیز اضافہ ہوا۔ ایک سوال، "کیا شعاع میں نظمیں' غزلیں' ہماری اپنی ذاتی

شاعری کو جگہ مل سکتی ہے؟"
ج پیاری حرا! آپ کی شاعری قابل اشاعت ہوئی تو ضرور جگہ ملے گی۔ شعاع پر تفصیلی تبصرے کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ معذرت کہ پچھلے ماہ آپ کا خط شامل نہ ہوسکا اور آپ کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔

اقرا ملک بھاول پور سے شریک محفل ہیں' لکھتی ہیں

جب سے میں نے آنکھ کھولی ہے' تب سے شعاع اور خواتین ڈائجسٹ کو اپنے گھر میں موجود پایا۔ میری امی اور پیاری آپی جان ہر ماہ بڑی باقاعدگی سے لے کر پڑھتی ہیں۔ آپی اب تین بچوں کی ماں ہیں اور اب بھی بڑی باقاعدگی سے ان کو پڑھتی ہیں۔ فرق یہ ہے پہلے بھائی لاکر دیتے تھے۔ اب میرے بہنوئی لے آتے ہیں۔
ٹائٹل گرل کچھ خاص پسند نہیں آئی۔ سب سے پہلے دوڑ لگائی "دیمک زدہ محبت" پر۔ صائمہ اکرم صاحبہ کا یہ ناولٹ اپنی قارئین کے لیے بلاشبہ کسی تحفے سے کم نہیں۔ ابھی وقت باقی ہے۔ سحر ساجد کا ناول اچھی تحریر تھی۔ اس میں مجھے زرمینے کا رول بہت اچھا لگا۔ سائرہ رضا کا "عید 1966ء میں" بہت ہی اچھا ناولٹ تھا۔ ویلڈن ان کا یہ ناولٹ کتابی شکل میں ضرور آنا چاہیے۔ ساجدہ شکور کے خطوط کی طرح۔ سائرہ رضا کا اپنا لکھنے کا انداز ہے جو بہت خوب صورت ہے۔ رقص بسمل نبیلہ عزیز۔ میں پہلی مرتبہ ان کا کوئی ناول پڑھ رہی ہوں۔
ج اقرا! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ شعاع اور خواتین کی پسندیدگی کا جان کر خوشی ہوئی۔ اپنی امی اور آپی جان کا ہماری طرف سے شکریہ ادا کردیں اور آپ کے بہنوئی اور بھائی بھی قابل تعریف ہیں جنہوں نے آپ کے شوق کو پورا کرنے میں تعاون کیا اور آپ کے پڑھنے پر پابندی نہیں لگائی۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

شافیہ نے پسوال سے لکھا ہے

آپ مجھ سے رسالے کی' تحریروں کی' ادارے کی اور اپنے اسٹاف کی تعریفیں سننے کی منتظر ہوں گی۔ مگر افسوس میں ایسا کچھ بھی نہیں کرپاؤں گی۔ میں نے دو کہانیاں بھجوائی تھیں ان کے بارے میں بتادیں۔
ج شافیہ! ہم تعریف کے ہی نہیں تنقید کے بھی منتظر رہتے ہیں۔ آپ تعریف نہ سہی کوئی تبصرہ تو کرلیتیں۔ آپ کی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں گئیں۔ پڑھنے کے بعد ہی کوئی رائے دے سکتے ہیں۔

صدف خالد سونڈھا شریف بھاول پور سے تشریف لائی ہیں

خط لکھنے کی بہت سی وجوہات ہیں اور ان میں سب سے بڑی وجہ شعاع کی پسندیدگی ہے۔ یقین مانیے مجھے شعاع بہت پسند ہے۔ ہر دفعہ کوئی نہ کوئی کہانی جینے کا ڈھب سکھا دیتی ہے۔ میں ام دعا (میرپور) اور طاہرہ بتول کی ہم نوا ہوں کہ بغیر کسی چیز کو جانے پڑھے یا پرکھے ہم غلط کیسے کہہ سکتے ہیں۔ "دیوار شب" عالیہ جی کیا خوب صورت اختتام ہے۔ ہماری مرضی کے عین مطابق۔ سب کچھ پرفیکٹ ہوگیا۔ کاش زندگی میں بھی ایسا ہو کہ اختتام ہماری مرضی کے عین مطابق ہو۔ نبیلہ جی رقص بسمل کا آغاز تو بہت اچھا ہے۔ امید ہے کہ ناول بھی زبردست ہوگا۔ صائمہ اکرم کا "دیمک زدہ محبت" میں مائی جمیلہ اور ان کے شوہر کا کردار بہت پسند ہے۔ صابر اور قانع۔ ماہم جیسے لوگ مجھے بالکل پسند نہیں خود غرض۔ ہمارے گاؤں میں بھی پانی کا بہت مسئلہ ہے۔ بوند بوند تماشا پڑھ کر لگا جیسے سمیرا حمید ہمارے گاؤں کا وزٹ کرکے گئی ہوں۔ کیا حسب حال لکھا ہے۔ سلائی مشین سلوی علی بٹ نے بالکل صحیح لکھا ہے۔ ہمارے اردگرد بہت سے گھرانے ایسے ہیں جن کی حیات کا دارومدار سلائی مشین پر ہے۔ بڑے شہروں میں تو سلائی کا ریٹ زیادہ ہوتا ہے۔ مگر دیہات میں بہت کم ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے جو سلائی کرتے ہیں انہیں ان کی محنت کے دام بھی صحیح سے نہیں ملتے۔ نایاب جیلانی' کنیز نبوی' عمیرہ احمد' عنیزہ سید' نگہت عبداللہ' آسیہ رزاقی یہ سب بہت اچھا لکھتی ہیں۔ کنیز نبوی اور نایاب جیلانی تو بہت دن سے غائب ہیں۔ برائے مہربانی ان سے کچھ لکھوائیں۔ انیقہ انا کی تحریریں اور خطوط زبردست ہوتے ہیں۔
ج پیاری صدف! انیقہ انا کا تبصرہ واقعی اچھا ہوتا ہے۔ ہمیں بھی ان کے خطوط کا انتظار رہتا ہے۔ بوند بوند تماشا'

سمیرا حمید کا مشاہدہ اور مطالعہ واقعی قابل داد ہے۔ ہمیں تو ان کی تحریریں پڑھ کر حیرانی ہوتی ہے۔ اتنی کم عمری میں اتنا زبردست مشاہدہ اور پھر اسے لفظوں میں اتنی خوب صورتی سے بیان کرنا۔ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ کنیز نبوی ناول لکھ رہی ہیں۔ آپ جلد ہی ان کی تحریر پڑھ سکیں گی۔

مریم ٔاسماء ظہیر ٔفقیر والی ضلع بہاولنگر سے شریک محفل ہیں ٔلکھا ہے

اس ماہ ٹائٹل بہت خوب صورت تھا۔ پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور مہندی کے ڈیزائن بہت اچھے لگے۔ جو ناول جاری ہیں ان میں رقص بسمل اور دیمک زدہ محبت بہت اچھے ہیں۔ پلیز صائمہ اکرم عائشہ کے ساتھ کچھ برا مت کیجیے گا۔ اسے علی کا پیار ہی ملے۔

ج مریم اور اسماء ظہیر! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ اتنے عرصہ تک آپ نے صرف یہ سوچ کر خط نہیں لکھا کہ شائع نہیں ہوگا۔ آخر آپ نے ہمت کرکے خط لکھ ہی ڈالا جو شائع ہو گیا ہے۔ ایک بات بتاؤں کسی بھی کام کو کرنے سے پہلے ناکامی کا سوچ کر ہمت ہار دینا کسی طور بھی درست رویہ نہیں۔ کوشش ضرور کریں۔ کامیابی یا ناکامی اہم نہیں۔ محنت اور کوشش بڑی بات ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

رضوانہ شکیل راؤ نے لودھراں سے لکھا ہے

ایک افسانہ ارسال کیا تھا۔ کیا وہ قابل اشاعت ہے ٔ ضرور بتایئے گا۔

ج رضوانہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کا افسانہ موصول نہیں ہوا۔

عشاء بھٹی ڈیرہ غازی خان سے شریک محفل ہیں ٔلکھا ہے

اگست کا شمارہ سالگرہ نمبر حسب معمول دو تاریخ کو موصول ہوا۔ سرورق انتہائی دیدہ زیب و دلکش تھا۔ پنک کلر ماڈل پر کافی جچ رہا تھا۔

حمد و نعت سے مستفید ہو کر پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں پڑھیں اور ان پر عمل کرنے کا عہد کیا۔ بندھن میں شائستہ اور فرید بھائی کی شادی میں شرکت کی۔ اس کے بعد نبیلہ عزیز کا ناول رقص بسمل میں جہاں نبیلہ نے ولید کے دل پر محبت کی واردات کردی۔ وہ اپنے دوست تیمور حیدر کی بہن عزت کا اسیر ہو گیا ہے ٔ اچھا لگا۔ آفاق کی منطق ہی نرالی ہے۔ جونی الحال سمجھ سے باہر ہے۔ تیمور حیدر کے خوابوں کی شہزادی ماورا مرتضیٰ ہی ہوگی۔ تیمور حیدر کی شان دار پرسنالٹی دل میں کھب کر رہ گئی ہے۔

دوسرا سلسلے وار ناول "ایک تھی مثال" جس کی تعریف سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ رخسانہ نگار اپنی مثال آپ ہیں۔ مکمل ناول میں "ابھی وقت باقی ہے" میں سحر ساجد نے سحر طاری کردیا۔ مجتبیٰ ایک پاور فل کردار تھا جو مجھے بہت اچھا لگا۔ سحر جی! اتنا خوب صورت ناول لکھنے پر آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دینے کو دل چاہتا ہے "دیمک زدہ محبت" میں صائمہ اکرام تسی چھا گئے ہو۔ ماہم کا کردار کافی نفسیاتی ہے۔ حالانکہ وہ خود اس شعبہ سے منسلک ہے۔ دنیا میں کوئی انسان مکمل نہیں ہوتا۔ کسی نہ کسی میں کوئی نہ کوئی خامی ضرور ہوتی ہے۔ مجھے ثنائلہ اور موحد کا کردار بہت اچھا لگتا ہے۔ سائرہ رضا کی کاوش نے شعاع میں چار چاند لگا دیے۔ اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ سائرہ جی! آپ کی تحریروں نے دل میں گھر کرلیا ہے۔ آخر میں شاہین رشید سے ریکویسٹ ہے کہ ہمایوں اشرف کا انٹرویو ضرور لیں ٔ پلیز پلیز۔

ج عشا! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کا پہلا خط شعاع نہ ہو سکا۔ تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

کوثر خالد نے جڑانوالہ فیصل آباد سے لکھا ہے

دو سال کے رسالے میرے پاس پڑے ہیں۔ مگر میں نے کبھی سرورق کے بارے میں قلم اٹھانے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ جبکہ اس بار کی ٹائٹل گرل نے میرے دل کو اتنا متوجہ کرلیا کہ میں اس کا ماتھا چومنے کی گستاخی کر بیٹھی۔ بھئی یہ ہے کون؟ صفحہ صفحہ دیکھ لیا تعارف ندارد۔ نعت و حمد تو میری جند جان ہیں۔ سروے میں غزالہ کنول گوجرانوالہ نے ہمارے دل کے دکھتے راگ پکڑ لیے۔ مسلسلوں کے بارے میں ان کا شعر دل کو چھو گیا۔

چلو عہد محبت کی ذرا تجدید کرتے ہیں
چلو تم چاند بن جاؤ ہم پھر سے عید کرتے ہیں

ثانیہ مشعل اشرف آپ کی اداسیوں اور پابندیوں پر دل و قلم سے دعا نکل رہی ہے۔ نازیہ اظہر ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ آپ کو اللہ کا گھر دیکھنا مبارک ہو۔ مسرت الطاف ٔ بہت خوشی ہوئی کہ آپ کا اللہ تعالیٰ سے گہرا اور مضبوط تعلق ہے۔ مسکان قریشی کا ہر لحاظ سے نمبرون تھا۔ کھلتا کسی پر کیوں میں جن کے شعر اچھے لگے۔ ان کے نام یہ ہیں۔ انیقہ انا ٔ فوزیہ ثمر بٹ ٔ انیتا شمیم ٔ افشاں خان ٔ شازیہ فاروق ٔ عریشہ ورک ٔ ندا فضا ٔ شمع مسکان ٔ افشاں خان کا خط سب سے اچھا لگا۔ عفیفہ کا خط پڑھ کے میرے جذبات بھی مجروح ہوئے۔ افسانوں میں سوگئی نے جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ بس نہیں چلتا ایسے ظالم لوگوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دوں۔ باقی افسانے ہمارے جیسے مڈل کلاس طبقے کے عکاس تھے اور بھرپور سبق آموز ٔ سحر ساجد کا ناول ابھی وقت باقی ہے ٔ اپر کلاس کا المیہ تھا۔ جسے پڑھ کر توبہ کی ضرورت ہے۔ "ایک تھی مثال" حقیقت کی عکاسی کرتی ہے۔ رقص بسمل دلچسپ ہے۔ جبکہ "دیمک زدہ محبت" کی جمیلہ مائی میری ہم زاد ہے۔ ایک خوب صورت عید ناولٹ راشدہ کا اچھا رہا۔

اب بات کرتے ہی سائرہ جی کی عید 66 کی۔ اسے میں نے جان بوجھ کر آخر میں پڑھا۔ کیونکہ جانتی تھی کہ ہمیشہ کی طرح ان ہی کی تخلیق نمبر لے جائے گی۔ میرے حساب سے ایک ایک سطر ٔ ایک ایک ناول کی حیثیت رکھتی ہے۔ اینڈ پر سائرہ جی کی مایوسی نظر آئی۔ کیونکہ ان کی 2012ء کی ہیروئنز نے کوئی سبق حاصل نہ کیا۔ یہ زمانے پر گہرا طنز تھا۔ میں بتانا چاہتی ہوں کہ "میں ہوں نا" آپ کے خیالات کی تصویر۔ میں ہو بہو آپ کی ہیروئن ساجدہ ہوں۔ مگر فرق صرف یہ ہے کہ وہ پاس رکھ کر دیتی تھیں جبکہ میں بالکل خالی ہاتھ رہتی ہوں اور پھر بھی بساط بھر دیتی ہوں۔ پیسہ نہ سہی یا کم سہی۔ ہنر ہی سہی ٔ خیالات ہی سہی۔ اور ایک بات سب ہی کہتے ہیں۔ تمہارے آگے تو کوئی بول نہیں سکتا ایک دن میرے چھوٹے بیٹے رضا نے کہا کہ ممی۔ چنگ چوں ٔ چنگ چوں کا بھی کوئی مطلب نکال سکتی ہو۔ تو میں بولی بیٹا۔ صوفیہ لورین نے لکھا تھا جو شخص اپنی فطری عادت چھوڑ کر دوسروں کی عادتیں اپنانے کی کوشش کرے وہ چنگ چو کا مربہ بن جاتا ہے۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے بس میری نعت و حمد اک بار شعاع میں آجائے تو سمجھوں گی کہ سرخرو ہو گئی۔

میں تصاویر کو غور سے نہیں دیکھتی تھی کیوں کہ ہمارے دادا ابو تصاویر کو حرام کہتے تھے۔ بڑے افسوس سے لکھتی ہوں کہ اس بار اسکیچز کی تعریف لکھ رہی ہوں۔ شائستہ کے نمبر 1 اور صبا کے نمبر 2 اگر میری مانیں تو اسکیچز نہ بنایا کریں اور ٹائٹل پر بھی قدرتی مناظر دیا کریں تاکہ میں ان میں انوالو ہونے سے بچ سکوں۔

واحد شعاع ہے اور شعاع کے لیے خطوط کے ٹکٹ ہیں جن پر میں پیسے خرچنا اپنا حق سمجھتی ہوں۔ پورا خاندان زور لگالے تو بھی عید پر نئے کپڑے پہننا بھی ضروری نہیں سمجھتی نہ ہی اپنی خوب صورتی کے لیے کبھی میک اپ کی کوئی چیز۔ صابن اور شیمپو ٔ سرمہ اور داتن ہی مجھے مرغوب ہیں سوائے شادی کے شروع میں۔ بعد میں اپنے میاں کو منالیا تھا کہ میں حد درجہ سادہ رہوں گی اور آپ بھی۔

ج کوثر! اپنے اوپر پیسے خرچ کرنا یا میک اپ کرنا بری بات تو نہیں۔ البتہ اسراف سے بچنے اور بے اعتدالی سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے اور شوہر کی خوشی کے لیے زیب و زینت تو بہت اچھی بات ہے آپ چاہیں تو عام ڈاک سے بھی اپنی شاعری ٔ خط اور دیگر تحریریں بھجوا سکتی ہیں ٔ عام ڈاک سے چیزیں مل تو جاتی ہیں ٔ لیکن ٹائم زیادہ لگتا ہے اور اکثر گم ہونے کا بھی اندیشہ ہوتا ہے۔ آپ نے تمام سلسلوں پر تفصیلی تبصرہ کیا جو بہت اچھا لگا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔

زندگی احمد ڈیرہ غازی خان سے لکھتی ہیں

میں نے دو تحریریں بھجوائی تھیں۔ پلیز پڑھ کر رائے دیں۔ کہانیوں کے نام ہیں۔ 1 بھرم ٔ 2 سیاہ داغ۔

ج زندگی! آپ کی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں۔ اس لیے کوئی رائے دینے سے قاصر ہیں۔ آپ اپنا فون نمبر بھجوا دیں۔ ہم فون کر کے بتادیں گے۔

ملتان سے شیریں ظفر نے لکھا ہے

نبیلہ عزیز کا ناول گرچہ دوسری قسط پڑھی مگر آغاز ہی زبردست ہے۔ رخسانہ نگار کا "ایک تھی مثال" بہت تیز ٹیمپو والی کہانی ہے۔ شعاع کے قسط وار ناولز اس وقت

سب سے نمبرون ہیں۔

سائرہ رضا کا ناولٹ "عید 66ء میں کیا غضب کا لکھتی ہو سائرہ آپ۔ آپ کے ہاتھ چومنے کو جی کرتا ہے

ایک کہانی میری بھی لکھ دیں۔ اگر شعاع والے آپ کو میرا نمبر دے دیں تو!

پہلی شعاع میں پڑھ لیا کہ "سحر ساجد" ایک نیا اضافہ ہیں۔ سو اس ناول کی جانب بڑھے "ابھی کچھ وقت باقی ہے" واقعی ایک نیا طرز تحریر' نیا موضوع مجھے تو پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ "زر" اور "زرمینے" ایک نام۔ دو عورتیں دونوں کی محبت کے رنگ جدا۔ کئی مقامات پر منظر نگاری بہت زبردست تھی۔ یعنی مصنفہ نئی ہیں' مگر قلم پر گرفت بتاتی ہے کہ اس میدان میں لمبی ریس میں حصہ لیں گی۔ ویلکم سحر ساجد!

افسانے چاروں ہی زبردست تھے۔ گرچہ افسانے سب سے آخر میں پڑھتی ہوں' مگر تین چار صفحے کا افسانہ دل موہ لے۔ کمال ہی تو ہے۔

"رضیہ مہدی صاحبہ" کا "عید اور عیدیاں" جلدی جلدی میں لکھا ایک سبق آموز افسانہ تھا اچھا لگا۔ جولائی کا ماہنامہ شعاع کے چاروں افسانے "سپرڈوپر" ہٹ افسانے تھے۔ "بوند بوند تماشا" کی نوشی کی تھکن نے رلا دیا۔ "دہی بھلے" اور "سلائی مشین" بھی لاجواب افسانے تھے۔

عفیفہ محمود کا لاہور سے خط پڑھ کر مجھے بھی حیرانی ہوئی کہ ایک عورت کی پوری زندگی ایک ذرا سے مسئلہ سے ختم ہوئی جارہی تھی' تھکن ہی تھکن تھی اور اس قدر اوریجنل منظر نگاری تھی کہ نوشی کی تھکن تو اپنے جسم میں محسوس ہوئی 80٪ مڈل کلاس عورتوں کا المیہ ہے کہ صبح سے شام تک ہر روز ایک ہی جیسی ذمہ داریاں نبھاتے نبھاتے قبروں کے دہانے پر جا پہنچتی ہیں' مگر کوئی تعریف کے دو لفظ نہیں ادا کرتا ایسے واقعے یا سانحہ پر ہنسی؟

ج ... شیریں! آپ کے والد کی وفات کا جان کر دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ ہر شخص کے سوچنے دیکھنے اور محسوس کرنے کا انداز جدا ہوتا ہے۔ کچھ لوگ دوسروں کے بڑے سے بڑے دکھ کو اس طرح محسوس نہیں کرپاتے جس طرح اپنی چھوٹی سی تکلیف کو محسوس کرتے ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

طلعت خان نے کوٹ فضلا' سہارن چھٹہ سے لکھا ہے

ماڈل پہ نظر پڑتے ہی دل ایک دم سے رک گیا۔ اتنی خوب صورت اتنی معصوم۔ لہنگا' جیولری' میک اپ ہر چیز کمال تھی۔ "پھولوں کے سلسلے" میں نازیہ اظہر نے کمال ہی لکھا تھا' پڑھتے ہوئے آنکھیں بار بار نمکین پانی سے بھر رہی تھیں۔ "دستک" اور "بندھن" اچھے نہیں لگے۔ آپ نے بہت بور شخصیات کے بارے میں لکھا تھا۔ "دیمک زدہ محبت" اب کی بار دلچسپ لگی' موحد اور شائلہ ایک دوسرے کے قریب آرہے ہیں اور موحد کی ماہم جیسی لڑکی سے جان چھوٹ گئی۔ موحد میرا موسٹ فیورٹ کردار ہے' کیوں کہ وہ آرمی سے ہے۔ سکینہ اور خاور کی اسٹوری تو ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھی' لگتا ہے صائمہ جی کا اسٹار پلس کے ڈرامے سے مقابلہ کرنے کا ارادہ ہے۔ چھ اقساط گزرنے کے بعد بھی بات وہیں کی وہیں۔ رقص بسمل میں ولید اور عزت کی جوڑی اچھی لگے گی اور میرے خیال میں تیمور کی ہیروئن ماورا ہو گئی۔ آفاق' فارہ سے کیوں نفرت کرنے لگا ہے اس کے بارے میں کچھ تو بتاتے۔ کیا پتا اس کی کوئی مجبوری ہو۔ "عید خوب صورت سی" واقعی خوب صورت لگی۔ میٹھی سی' پیاری سی اسٹوری مزا دے گئی۔ سحر ساجد نیا نام تھا شعاع میں' لیکن انہوں نے شروعات ہی بہت بور اور خشک ٹاپک سے کی۔ پڑھتے ہوئے بار بار نیند آرہی تھی۔ کوئی تجسس ہی نہیں تھا کہانی میں۔

افسانے' عید اور عیدیاں' عید تیرے سنگ اچھا لگا۔ باقی کچھ خاص نہیں لگے۔ سائرہ رضا اس دفعہ سب سے پیچھے تھیں۔ ان کی محنت اب کی بار رنگ لے کے نہیں آئی۔ باقی سب پرفیکٹ تھا۔

ج ... پیاری طلعت! آپ کی تعریف اور تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ تفصیلی تبصرے کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

سمعیہ مشتاق نے خانقاہ ڈوگراں سے لکھا ہے

اس دفعہ شعاع 31 جولائی کو ہی مل گیا۔ ناقابل یقین۔ سخت روزے میں اتنا ٹھنڈا ٹھنڈا ٹائٹل بہت خوب صورت لگا۔ یوں جیسے اسٹرابری آئس کریم۔

سب سے پہلے "دیمک زدہ محبت" پڑھی۔ آؤٹ اسٹینڈنگ "ایک تھی مثال" ہم بہن بھائیوں کو بہت پسند ہے۔ "عید 1966ء میں" سائرہ رضا تو جب بھی لکھتی ہیں کمال کا لکھتی ہیں۔ "دوہرا معیار" پرانا موضوع تھا۔ افسانے اتنے اچھے بہرحال نہیں لگے۔ (معذرت) اب بات ہو جائے "ابھی وقت باقی ہے" یہ اتنا منفرد انداز میں لکھا گیا تھا کہ یقین ہی نہیں آیا کسی نئی رائٹر نے لکھا ہے۔

جب عمیرہ احمد کا "زندگی گلزار ہے" شائع ہوا تھا تو پہلی شعاع میں آپ نے لکھا تھا کہ یہ نئی مصنفہ بہت جلد شہرت کے آسمان کو چھوئیں گی۔ مجھے اب بھی آپ کے یہ الفاظ یاد ہیں۔ پھر سحر ساجد کا اتنا اچھا ناول پڑھ کر آپ نے ایسا تبصرہ کیوں نہیں کیا۔

تاریخ کے جھروکے مجھے ہمیشہ سے بہت پسند ہے۔ مہندی کے ڈیزائن بھی بہت اچھے تھے۔

اب آپ سے ایک فرمائش کرنا تھی کہ پلیز پلیز پلیز شاہین رشید کا انٹرویو ضرور شائع کریں اور شاہین رشید سے درخواست ہے کہ جاوید چوہدری کا ضرور انٹرویو لیں۔

میں نے پوچھنا تھا کہ کیا نبیلہ عزیز اور مریم عزیز بہنیں ہیں۔ تنزیلہ ریاض اور آمنہ ریاض بھی بہنیں ہیں' مزید یہ کہ کیا دونوں محمود ریاض کی رشتہ دار ہیں۔ میرے بھائی نے میرے کان کھائے ہوئے ہیں کہ یہ محمود ریاض کی رشتہ دار ہیں۔

ابن انشا کی شاعری خواتین اور شعاع دونوں میں ہر ماہ دیا کریں۔ وہ مجھے بہت پسند ہیں۔ ایک خط میں بوند بوند تماشا کو دعا نور بہن نے "ٹپ ٹپ بہا" لکھا تھا اور آپ نے شائع بھی کردیا۔ (اسٹرینج)

ج ... پیاری سمعیہ! آپ نے خط لکھا' بہت خوشی ہوئی۔ ہمیں ہر ماہ بڑی تعداد میں خطوط موصول ہوتے ہیں۔ تمام خطوط ہم شامل نہیں کرپاتے پھر بھی ہماری کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ خطوط شامل کیے جائیں ان خطوط سے قارئین کی ذہانت' ان کی ذہنی سطح ان کی سنجیدہ مسائل کے بارے میں رائے' ان کی نرم دلی' حساسیت اور دوسروں کے دکھ کو محسوس کرنے کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر کافی حد تک ان کا تبصرہ ہمارے معاشرے کی ذہنی سطح اور سوچ کا عکاس ہوتا ہے۔ "بوند بوند تماشا" میں ایک بہت تکلیف دہ حقیقت کو سامنے لایا گیا پانی کی عدم فراہمی اور کمیابی ملک کی بہت بڑی آبادی اس مسئلہ کا شکار ہے اور خواتین کو ہی اسے بھگتنا پڑتا ہے۔ اس کو ہماری قارئین نے جس طرح سمجھا اور محسوس کیا' وہ ہم نے شائع کیا' لیکن ضروری نہیں کہ ہم ان کی رائے سے متفق بھی ہوں۔

نبیلہ عزیز اور مریم عزیز کے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے۔ آمنہ ریاض اور تنزیلہ ریاض بہنیں ہیں' لیکن محمود ریاض صاحب سے ان کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ سوائے اس کے ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی بہت اچھی مصنفین ہیں۔

سحر ساجد بھی ان شاء اللہ شہرت کے آسمان کو چھوئیں گی اور ان کا شمار صف اول کی مصنفین میں ہوگا بشرطیکہ وہ باقاعدگی سے لکھتی رہیں۔

نجمہ انور' چونڈہ ضلع سیالکوٹ سے لکھتی ہیں

اگست کا شمارہ کیا زبردست ٹائٹل تھا۔ ماڈل پنک کلر میں بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ "دیمک زدہ محبت" کیا ہی شاندار ناول ہے۔ ماہم کو اتنا خود پسند نہیں ہونا چاہیے۔ رخسانہ جی کا "ایک تھی مثال" بھی بہت اچھا ہے۔ بس رخسانہ جی بشریٰ کے ساتھ کچھ برا نہ ہو۔ "عید کے پکوان" اور انٹرویو پڑھ کے بہت مزا آیا۔

افسانے سب ہی بہت اچھے تھے۔ ناولٹ بھی زبردست تھے' لیکن پورے رسالے کی جان بنا رہا' سحر ساجد کا مکمل ناول "ابھی وقت باقی ہے" مجھے اتنا پسند آیا کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ ویسے بھی مجھے پختون اور شاہ وغیرہ کے کردار بہت اٹریکٹ کرتے ہیں' میں نے اک ناول کے بارے میں پوچھنا تھا مجھے یہ تو یاد نہیں کہ وہ کہانی کس رسالے میں شائع ہوئی تھی بس اتنا یاد ہے کہ لڑکی کا نام پرواز گل تھا اور وہ شاعرہ تھی اگر آپ یا کوئی قارئین بہن بتا سکے کہ وہ کون سے رسالے میں کہانی شائع ہوئی تھی اور مہینہ بھی بتا دیں تو بڑی مہربانی ہوگی اور اگر کوئی کتابی صورت میں ناول منگوانا

ہوتو کیا طریقہ کار ہے اور پے منٹ کا بھی طریقہ بتادیں میں نے ایک ریکویسٹ کی تھی بورک کی ترکیب۔ پلیز جلدی سے شائع کردیں۔

ج پیاری نجمہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ بشریٰ خود اپنے ساتھ برا کررہی ہے تو اس کے ساتھ اچھا کیسے ہوسکتا ہے۔ زندگی کے کڑے مراحل صبر ضبط اور تحمل سے طے کیے جاتے ہیں۔ انہیں جذباتیت کی نذر کردیا جائے تو پھر خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے۔

کوئی بھی کتاب منگوانے کے لیے آپ کتاب کی قیمت درج ذیل ایڈریس پر منی آرڈر کردیں۔ کتاب آپ کو بھجوا دی جائے گی۔ ایڈریس یہ ہے۔

مکتبہ عمران ڈائجسٹ۔ 37 اردو بازار کراچی۔

بورک کی ترکیب کی فرمائش جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

عائشہ اختر بٹ نے لکھا ہے

میں آپ لوگوں کو بہت دل برداشتہ ہوکر خط لکھ رہی ہوں۔ میری کہانی عشق دی گلی کے بارے میں بتادیں۔

ج پیاری عائشہ! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کی کہانی قابل اشاعت نہیں ہے۔ فی الحال آپ صرف مطالعہ پر توجہ دیں۔

سونیا خان اور شبنم نے لکھا ہے

السلام علیکم! ہم شعاع اور خواتین باقاعدگی سے پڑھتی ہیں۔ ہمیں شعاع کے سلسلے وار ناول "دیوار شب" کا اینڈ بہت پسند آیا۔ اگست کے شعاع کا ٹائٹل پسند نہیں آیا۔ شبنم کا کہنا ہے کہ ماڈل کے کپڑے خوب صورت ہیں۔ "ایک تھی مثال" اچھی تحریر ہے۔ صائمہ اکرم کے ناولٹ کے بارے میں کیا کہیں۔ ہمیں ایسا لگتا ہے کہ علی اور رامس دونوں بھائی ہیں۔ ہمیں ماہم کا کردار بالکل بھی پسند نہیں۔

پلیز ایف ایم 96 ساہیوال کے آر جے کاشف شہزاد کا انٹرویو بمعہ تصویر شائع کریں اور نور حسن کا بھی تفصیلی انٹرویو کریں۔

ہماری کاسٹ "لک" ہے، لیکن کچھ لوگ اس سے بالکل بھی واقف نہیں۔ ہڑپہ شہر کے بارے میں تو آپ جانتے ہوں گے کہ یہ بہت تاریخی شہر ہے۔ بہت دور دور سے لوگ یہاں پر واقع میوزیم دیکھنے آتے ہیں۔ خواتین میں شائع ہونے والی تحریر جو کہ نگہت سیما کی ہے "زمین کے آنسو" یہ ہماری فیورٹ ہے۔ جب میں نے شازیہ اور نادیہ (کزنز) کو بتایا کہ ہم شعاع میں خط بھیج رہے ہیں تو انہوں نے کہا ہمارا ذکر ضرور کرنا ہم آپس میں بہت اچھی دوستیں بھی ہیں۔

ج سونیا اور شبنم! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ شازیہ نادیہ کا صرف ذکر کافی نہیں۔ وہ خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کریں۔

ٹائٹل آپ کو پسند نہیں آیا۔ اسے مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔ انٹرویو کی فرمائش نوٹ کرلی گئی ہے جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

فرح ناز اور رخسانہ بشیر نے گاؤں سکیانہ ضلع گجرات سے شرکت کی ہے۔ لکھتی ہیں

اگست کا "شعاع" 9 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل گرل کا ڈریس اور مہندی پسند آئی۔ بات کرتے ہیں نبیلہ عزیز کے "رقص بسمل" کی۔ آغاز تو کافی اچھا ہے آگے ماورا مرتضیٰ کو میری طرح "خلیل جبران" کا فلسفہ پسند ہے۔ "عید اور عیدیاں" میں تابندہ کی بیچاری لڑکیوں کی طرح ہے جو اپنی ناک اونچی رکھنا چاہتی ہیں۔ بغیر گنجائش دیکھے۔ "دیمک زدہ محبت" کی ہر قسط دھماکے پہ دھماکہ کیے جاتی ہے۔ اس میں مجھے سکینہ مائی اور ماہم منصور کا رول بہت امپریس کرتا ہے۔ صائمہ جی عائشہ جیسی سویٹ گرل کو ماہم کے عتاب سے بچائیے ورنہ!!! ورنہ کیا؟ کچھ بھی تو نہیں..... ابھی کچھ وقت باقی ہے۔ (سحر ساجد) اگر اس طرح کے ناولز آتے رہے تو..... سحر جی کچھ ہلکا پھلکا لے کے آئیں نا تاکہ مائنڈ فریش ہوجائے۔ ثمرہ بخاری سے ریکویسٹ ہے کہ اب شبلی جوادی کو لے آئیں اور فوزیہ ثمر آپ گجرات کے کون سے گاؤں میں رہائش پذیر ہیں؟

ج فرح اور رخسانہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔ ہمارے خیال میں تو سحر ساجد نے ایک سماجی مسئلے پر بہت ہلکے پھلکے اور دلچسپ انداز میں لکھا۔ پتا نہیں آپ کو مشکل کیوں لگا۔ ثمرہ بخاری کے شبلی اور جوادی کی کمی ہم بھی محسوس کرتے ہیں اور ان تک آپ کا پیغام ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

اقصیٰ بتول نے نیا لاہور سے لکھا ہے

السلام علیکم! عید سے پہلے شعاع نے عید کی خوشیوں کو دوبالا کردیا، مگر یہ خوشیاں اس وقت ادھوری محسوس ہوئیں جب شعاع نے دھوکہ دیا بھئی آپی جان یہ کیا؟ جب میں سحر ساجد کے ابھی کچھ وقت باقی ہے میں پوری طرح کھوئی ہوئی تھی تو درمیان سے آدھا رسالہ ہی غائب۔ Page 194 سے لے کر Page 226 تک درمیان سے سارے ہی Pages غائب تھے اس طرح کیوں ہوا۔ اب آپ کہانی بتادیں۔

ج پیاری اقصیٰ! ہمیں افسوس ہے کہ آپ ناول پورا نہ پڑھ سکیں۔ بسا اوقات بائنڈنگ کی غلطی کی وجہ سے ایسا ہوجاتا ہے۔ ایسی صورت میں اپنے بک اسٹال والے سے پرچا تبدیل کرالیں۔ ہم کہانی تو نہیں بتاسکتے البتہ آپ ایڈریس بھجوادیں تو پرچا بھجوادیں گے۔

آسیہ شبری ڈرگہ گجرات سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

آپی میں نے افسانہ لکھا ہے۔ وہ کس ایڈریس پر بھیجوں۔ پلیز ذرا تفصیل سے بتائیے گا۔

سرورق پر براجمان دوشیزہ گلابی رنگ میں ملبوس نفاست سے کیے گئے میک اپ کے ساتھ بہت زبردست لگ رہی تھی۔ "رقص بسمل" کی دوسری قسط بھی بہت زبردست تھی۔ رضیہ مہدی کا عید اور عیدیاں عید کی خوشیوں کے ساتھ ہمیں بہت کچھ سکھا کر گیا۔

اس ماہ کا ٹاپ آف دی لسٹ افسانہ "میڈا عشق دی تو" قانتہ رابعہ میرے پاس لگتا ہے کہ الفاظ کی قلت ہوگئی ہے۔ موسم کے پکوان سارے ہی زبردست ہیں۔ آپی اس دفعہ شعاع اتنا خوب صورت، اتنا اچھا ہے کہ واقعی ہماری عید کو دوبالا کرگیا۔

ج آنسہ! افسانہ اسی ایڈریس پر بھجوائیں جس پر خط لکھا ہے۔

شعاع 37 اردو بازار کراچی۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

فہمیدہ اجمل نے ساہیوال سے لکھا ہے

رسالے کی تعریف دریا کو کوزے میں بند کرنے والی بات ہے۔ میرا خیال ہے کہ پہلے شمارے سے پڑھنا شروع کیا تھا۔ جب ہماری امی جان پڑھتی تھیں اور ہم ویٹنگ لسٹ میں ہوتے تھے اور اب خیر سے خود کالجیئٹ بچوں کی ماں ہوں جب پہلا شمارہ پڑھا تو شعاع نام ہی بڑا منفرد لگا۔ شعاع اور خواتین وغیرہ سے پہلے ہماری امی حور اور زیب النساء پڑھا کرتی تھیں، لیکن امی جان نے برملا کہا کہ ان رسالوں نے حور، زیب النساء کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

ج فہمیدہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ اتنے طویل عرصے سے شعاع کا ساتھ ہے اور کبھی آپ نے خط نہیں لکھا؟ اور خط میں صرف شعاع کی تعریف اور کوئی تبصرہ بھی نہیں۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔ اپنی امی کو ہماری طرف سے سلام کہیے گا۔

رافعہ ارشد اور عارفہ ارشد نے لیاری کراچی سے لکھا

اگست کے شمارے کا ٹائٹل اچھا تھا۔ سب سے پہلے اپنا پسندیدہ ناول "دیمک زدہ محبت" پڑھا۔ ویلڈن صائمہ جی۔ "رقص بسمل" نبیلہ عزیز جی آپ کا نیا ناول اچھا لگا۔ دوسری قسط بھی اچھی رہی ہے۔ "ابھی کچھ وقت باقی ہے" سحر ساجد نیا اور ایک اچھا اضافہ۔ "عید 66 میں" سائرہ جی آپ کی یہ تحریر بھی ہمیشہ کی طرح بیسٹ رہی۔ "عید اور عیدیاں" رضیہ مہدی۔ "عید تیرے سنگ" شیریں ملک۔ "دوہرا معیار" نظیر فاطمہ۔ "سوگئی ہو ایک رہ گزر" سینحہ مرزا۔ سارے افسانے اور مستقل سلسلے بھی اچھے رہے۔ "میڈا عشق" قانتہ رابعہ آپ کا افسانہ بہت اچھا لگا۔ رافعہ! آپ کو سالگرہ مبارک ہو۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

بیٹھ کر سیرِ دو جہاں کرنا

انسانی تاریخ کے عظیم ترین ذہن اور نظریات

مصنف: ول ڈیورانٹ
ترجمہ: یاسر جواد
تبصرہ: آمنہ زریں

ادب اور تاریخ کا مطالعہ کیے بغیر آج کا طالب علم مہذب ہونے کا دعویٰ تو کر سکتا ہے مگر اس کا علم ہندسوں کے ہیر پھیر، خدمات کی قیمت وصول کرنے اور دوسروں کی جیب اور اپنے مفاد پر گہری نگاہ رکھنے کے علاوہ بھی ہو سکتا ہے؟

یہ کافی مشکل تصور ہے کہ ہم آج جس تندہی سے معاشرے میں جمع تفریق، تقسیم اور ضرب کا کلچر رائج کر رہے ہیں۔ آنے والے وقتوں میں ان ہی بچوں سے ہم اعلیٰ اخلاقی اقدار کی توقع کیسے کریں گے؟

تاریخ کو محض اعداد و شمار کا روکھا پھیکا مجموعہ سمجھ کر اغماض برتنا سہل پسندی اور عین انسانی دلچسپی کا معاملہ ہے، مگر کچھ صاحب علم اشخاص کو خصوصی وجدان ودیعت کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کا استعمال مشکل کو آسان بنانے میں صرف کریں۔ تحقیق و جستجو کے کٹھن مرحلوں سے خود گزریں اور دریافت کے گہر کو سب پر آشکار کر دیں۔

ایسے ہی ایک صاحب علم کے نادر خیال اور منفرد اسلوب پر مشتمل، مختصر حجم کی گراں قدر کتاب پیش خدمت ہے، دنیا جسے ول ڈیورانٹ کے نام سے جانتی ہے! دیکھیے تاریخ کے بارے میں اس کا ادراک۔

"انسان کی حقیقی تاریخ قیمتوں اور اجرتوں میں نہیں، نہ ہی انتخابات اور جنگوں یا حتیٰ کہ عام آدمی کے طور طریقوں میں، یہ مجموعی انسانی تہذیب و ثقافت میں جینئس لوگوں کی پائیدار حصہ داریوں میں مضمر ہے۔"

"فرانس کی تاریخ اس کے غیر معمولی مرد و خواتین، اس کے موجدوں، سائنس دانوں، ریاست کاروں، شعراء، اہل فن، موسیقاروں، فلسفیوں اور اولیاء کا ریکارڈ ہے اور اپنے لوگوں اور نوع انسانی کی ٹیکنالوجی اور دانائی، فنکاری اور تمدن میں کیے ہوئے اضافوں کا ریکارڈ بھی۔

ساری دنیا میں ایسا ہی ہے۔ اس کی تاریخ اصل میں اس کے عظیم لوگوں کی تاریخ ہے۔ ہم باقی ماندہ لوگ ان کے ہاتھوں میں اینٹ اور گارے کے سوا کیا ہیں؟

چنانچہ میں تاریخ کو سیاست اور قتل و غارت کے ایک ریکارڈ کی صورت میں نہیں دیکھتا بلکہ یہ جینئس کے توسط سے مادے کے کڑیل جمود اور ذہن کی بوکھلا دینے والی اسراریت کے ساتھ جدوجہد ہے۔ تفہیم پانے، قابو کرنے اور خود کو اور دنیا کو نئے سرے سے ڈھالنے کی جدوجہد۔"

جانیے جینئس کے بارے میں اس کا نکتۂ نظر۔

"ہم آبشاروں اور پہاڑوں کی چوٹیوں یا خاموش سمندر پر موسم گرما کے چاند کے سامنے ہاتھ باندھ کر کیوں کھڑے ہوں، سب سے اعلا کرشمے کے سامنے کیوں نہیں، ایک انسان جو عظیم بھی ہے اور اچھا بھی۔

ہم میں سے کتنے ہی لوگ محض باصلاحیت ہیں، زندگی کے کھیل میں طاق ہیں، کہ جب جینئس ہمارے سامنے کھڑا ہوتا تو ہم صرف خدائی کام، تخلیق کا ایک تسلسل سمجھ کر اس کے سامنے جھک سکیں۔ یہی انسان تاریخ کا حیات بخش خون ہیں اور سیاست و صنعت ان کا محض ڈھانچہ اور ہڈیاں ہیں۔"

"عظیم کتاب، ہر واشگاف فن پارہ، ایک بھگتی میں گزاری ہوئی زندگی کا ہر ریکارڈ، ایک پکار، باطنی مسرت کے میدانوں کے لیے کھل جا سم سم ہے۔ ہم اپنی امید اور تقدیس کا شعلہ بجھانے میں بہت عجلت کرتے ہیں۔"

دنیا مغرب اور مشرق کی فکر کا امتزاج ہے۔ نہ یہ صرف مشرق کی میراث ہے اور نہ یہ صرف مغرب کا طرۂ امتیاز۔ انسانی تاریخ کے ارتقائی عمل میں دنیا کا ہر خطہ شامل ہے اور ول ڈیورانٹ ہمیں دنیا کے اس حصے کی شمولیت سے متعارف کرواتا ہے، جو ہمارے لیے اجنبی اور دور دراز کے بسنے والے ہیں۔ ایک مؤرخ کی محنت، لگن اور جستجو کا عظیم جذبہ اس کی شاندار ذہنی صلاحیتوں کو تو ہم پر منکشف کرتا ہی ہے، مگر ساتھ ہی ساتھ ہمیں بھی اس نشاط انگیز تجربے میں شامل ہونے کا لطف عطا کرتا ہے، جو اس کی بے مثل انفرادیت کا مرہون منت ہے۔

دنیا کی ہزار ہا سالہ پرانی تاریخ سے دس عظیم ترین ذہنوں کے تدبر کا انتخاب یقیناً "ایک مشکل مرحلہ ہوتا" مگر ڈیورانٹ نے فہرست سے آرٹ، مذہب، سیاست اور جنگ سے منسلک لوگوں کو اپنے قائل کر دینے والے استدلال کے ذریعے خارج کر دیا اور کہا۔

"ہم ان انسانوں کو تلاش کریں گے جنہوں نے اپنی سوچ، نہ کہ عمل یا جذبے کے ذریعے نوع انسانی کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ ہم انہیں دنیا کے ان پرسکون کونوں میں تلاش کریں گے جہاں ان کے ذہنوں میں عظیم افکار آئے اور جہاں انہوں نے پل بھر کے لیے صداقت کا چہرہ دیکھا۔"

پسندیدہ ترین کے بجائے اہم ترین کا انتخاب ہی اس کے حسین انتخاب کا معیار ہے اور اپنے انتخاب کی حمایت یا مخالفت میں خود پیش کردہ دلائل، موازنے اور تجزیے کا خوبصورت امتزاج ہے۔

مثلاً "دس مفکرین کی فہرست میں افلاطون اور ارسطو تو شامل ہیں، مگر مشہور زمانہ سقراط کیوں نہیں؟ کنفیوشس سرفہرست ہے اور گوتم بدھ شامل نہیں۔ یہ جاننا نہایت خوش کن اور قوت استدلال کا متاثر کن مظاہرہ ہے۔

"ہم افلاطون سے محبت کیوں کرتے ہیں؟ کیوں کہ افلاطون خود بھی محبت کرنے والا تھا۔ ساتھیوں کا عاشق، جدلیاتی نشاط انگیزی کے خمار کا عاشق، افکار و اشیا کی تہہ میں موجود چھپا حقیقت کا متلاشی، ہم اس کی فیاض توانائی، اس کے تخیل کی سیلانی ترنگ، زندگی میں اس کی حاصل کردہ تمام مسرت کی وجہ سے اسے محبت کرتے ہیں۔ ہم اسے چاہتے ہیں کیوں کہ وہ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ جیا اور کبھی بھی آگے بڑھنے کا عمل نہ روکا۔"

"اس کے "مکالمات" نوع انسانی کی بیش بہا املاک

میں سے ایک ہیں۔ یہاں پہلی مرتبہ فلسفے کی صورت گری ہوئی اور اس نے اپنے شباب میں ایسی کاملیت پائی کہ بعد کے زمانوں میں کوئی مثال نہیں ملتی۔"

"کیا آپ ذہن کی الجھنوں، علم کی اسراریت میں دلچسپی رکھتے ہیں؟ "جمہوریہ" پڑھیں۔ یہاں آپ کو مابعد الطبیعات، دینیات، اخلاقیات، نفسیات، نظریہ تعلیم، نظریہ ریاست کاری، نظریہ آرٹ ملے گا۔ یہاں آپ نسوانیت پسندی اور ضبط تولید، کمیونزم اور سوشلزم اپنی تمام تر خوبیوں اور مشکلات سمیت، انتخابی بنیادوں پر نسل کشی، ارستقراطیت اور جمہوریت پائیں گے۔ کیا ہے جو آپ کو اس میں نہ ملے؟ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ ایمرسن نے "جمہوریہ" کے متعلق کہا تھا "کتب خانوں کو جلا دو، کیوں کہ ان کی تمام قابل قدر باتیں اس کتاب میں ہیں۔"

"افلاطون کے اثرات پر ہم کیسے شک کر سکتے ہیں؟ اس کی قائم کردہ اکیڈمی پر غور کریں۔ دنیا کی پہلی اور سب سے زیادہ عرصہ تک قائم رہنے والی یونیورسٹی۔"

"یہ وولٹیئر ہی تھا جس نے فرانس کو نیوٹن کے مکنیکس اور لاک کی نفسیات سے متعارف کروایا اور یوں روشن خیالی کا عظیم عہد شروع ہوا۔ متکلمانہ اذہان یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ وولٹیئر کا نام بھی نوع انسانی کے عظیم ترین مفکرین کی فہرست میں شامل ہے۔ وہ احتجاج کریں گے کہ اس کی فکر اچھوتی ہونے کے بجائے مستعار لی ہوئی تھی، لیکن ہم میں سے اچھوتا کون ہے؟ ماسوائے ہیئت کے؟ آج ہم کون سا ایسا تصور کر سکتے ہیں جس کا پہلے ہی کسی نہ کسی صورت میں لطف نہ اٹھایا جا چکا ہو؟ صداقت کی نسبت خطا کاری میں اچھوتا ہونا زیادہ آسان ہے کیوں کہ ہر صداقت ایک ہزار ہرزہ سرائیوں کو بے دخل کرتی ہے۔"

"چلیے مان لیتے ہیں کہ بیکن کی طرح وولٹیئر نے بھی اپنی شمع ہر آدمی کی مشعل سے آگ لے کر جلائی تھی۔ مگر اس کے باوجود اس نے مشعل کی روشنی کو اس قدر تیز کر دیا کہ ساری نوع انسانی منور ہو گئی۔ اسے چیزیں مدھم حالت میں ملیں اور اس نے انہیں ضوفشاں بنا دیا۔ اسے ابہام ملا اور اس نے اسے صراحت سے معمور کیا۔ اسے ملنے والی چیزیں بے کار متکلمانہ لبادے میں تھیں اور اس نے انہیں ایسی زبان عطا کی کہ ساری دنیا انہیں سمجھنے اور مستفید ہونے کے قابل ہو سکی۔ واحد آدمی نے کبھی اتنے بہت سے انسانوں کو تعلیم نہیں دی تھی یا اس قدر ناقابل مدافعت فنکاری نہیں دکھائی تھی۔"

کتاب ذہنی ارتقا کے شاندار عمل کا مظاہرہ ہے اور ہر پڑھنے والا اس میں شریک ہو سکتا ہے اگر وہ تخیل کو تعصب اور قید کی حد سے ماورا کر دے۔

اگلی فہرست دس عظیم شعراء کی ہے۔ جہاں کیٹس کا انتخاب کرتے وقت ڈیورانٹ کا انداز دیکھیے۔

"آیئے ایک لمحے کو رکتے ہیں اور گنتے ہیں کہ ہم کتنے عظیم آدمیوں کو نظر انداز کر آئے۔ سائفو، السکائی لس اور سوفوکلیز، جنہوں نے ڈایونشائی انعام یوریپڈیز سے کہیں زیادہ مرتبہ جیتا۔ لطیف کیٹولس، شاہانہ ہوریس، زندگی سے بھرپور اووڈ اور خوش گوار ورجل، پیٹرارک اور تاسو، عمر خیرالڈ، چوسر اور دلوں۔ لیکن یہ خطا ان گناہوں سے بہت چھوٹی ہے جو ابھی ہم کرنے والے ہیں، حتیٰ کہ ملٹن اور گوئٹے کو بھی نہیں چنا گیا۔ حتیٰ کہ بلیک اور برنز، بائرن اور ٹینی سن، ہوگو اور پال ورلین، ہائنے اور پوپ کو چھوڑ دیا گیا۔ نظم کا جن ہائنے اور شاعری کا نصف بہتر پو۔ ان سے دامن بچانا ناقابل معافی معلوم ہوتا ہے۔ ٹینی سن جس کا ہر گیت خوب صورت تھا اور بائرن جس کی زندگی ایک غنائی ٹریجڈی تھی۔ آخر وہ عظیم تر کون ہیں جن کی خاطر انہیں چھوڑ دیا گیا۔ بدترین بات یہ کہ ملٹن کو بھی منتخب نہ کیا گیا، جس نے بادشاہوں اور حاکموں کی طرح لکھا۔ گوئٹے کو چھوڑ دینا اور بھی بری بات ہے۔ جرمنی کی روح، جس نے جوانی میں ہائنے کی طرح لکھا اور پختہ عمر میں یوریپڈیز والا انداز اختیار کیا اور بڑھاپے میں گو تھک کر جا گھر جیسا بن گیا۔ ژولیدہ خیال اور غیر معتمم طور پر حیرت انگیز۔۔۔ کون سا اچھا جرمن یا یورپی اس چیز کو معاف کرے گا؟"

چلیں کوئی بات نہیں، آیئے یہ گناہ جرأت مندی سے کرتے ہیں اور فلسفی گوئٹے کے بجائے شاعر جان کیٹس کا نام لیتے ہیں۔

"1819ء میں دق زدہ کیٹس نے ہفتوں بستر سے لگے رہنے کے بعد صحت مند ہونے پر فینی بران کے نام خط لکھا۔ "اب مجھے بے قرار اور بیدار راتیں گزارنے کے مواقع ملے تو ان سوچوں کو جان کر جو میرے سر پر منڈلاتی رہتی ہیں، میں خود سے کہتا ہوں، اگر میں مر گیا تو میرا کوئی لافانی کام پیچھے نہیں ہوگا۔ کوئی بھی ایسی چیز نہیں جس پر میرے دوست فخر کر سکیں، لیکن میں نے تمام چیزوں میں اصول حسن سے محبت کی ہے اور اگر مجھے وقت ملتا تو خود کو یادگار بنا دیتا۔"

"آخری دنوں میں اس کا ذہن بالکل شانت اور پرسکون ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا تعویذ قبر لکھوایا۔ "یہاں ایک شخص محو آرام ہے جس کا نام پانی پر تحریر ہے۔" آخر کشمکش میں اس نے کہا "مجھے اوپر اٹھاؤ کیوں کہ میں مر رہا ہوں۔ میں آسانی سے مروں گا۔ خوف مت کھاؤ۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ لمحہ آگیا۔"

"یہ 23 فروری 1821 کا دن تھا۔ اور اس کی عمر پچیس برس تھی۔ اگر مجھے وقت ملتا۔"

"اس شاعر حسن کی المناک موت کا تذکرہ ہمیں دل گیر تو کرتا ہے مگر 25 برس کی عمر میں اس دنیا کو خیرباد کہہ جانے والے خوب صورتی کے شاعر کے کلام میں کیا تاثر تھی کہ وہ آج بھی اپنی تابانی سے لوگوں کو مسحور کیے ہوئے ہے۔"

اگلا باب ڈیورانٹ کی منتخب کردہ سو کتب کی تفصیل پر مشتمل ہے، جو وہ ہماری ذہنی بلوغت کے لیے تجویز کرتا ہے۔ ہر کتاب کے پڑھنے کا طریقہ، مشکل پیش آنے پر مستقل مزاجی کی نصیحت اور تھکے ہوئے قلب و ذہن کی فرحت کے لیے قدرے دلچسپ کتابیں۔ حتیٰ کہ کتابوں کی قیمت خرید اور سیکنڈ ہینڈ قیمت بھی بتا کر ہمارا بجٹ تیار کر دیا۔

مطالعے کی اہمیت اور ترغیب دلاتے ہوئے "مجھے ہفتے میں سات گھنٹے دیں اور میں آپ میں سے ایک دانشور اور فلسفی نکال لوں گا۔ چار سال میں آپ ملک کے نوخیز ڈاکٹر آف فلاسفی جتنے بہتر تعلیم یافتہ ہوں گے۔"

"جب زندگی تلخ ہو یا دوستی چھوڑ جائے، یا شاید ہمارے بچے ہمیں چھوڑ کر نئے مسکن اپنا لیں تو شیکسپئر اور گوئٹے کے ہمراہ میز پر بیٹھیں گے۔ ہم رابلیس کے ہمراہ دنیا پر خندہ زن ہوں گے اور جان کیٹس کے سنگ اس کے پت جھڑ کا حسن دیکھیں گے۔ کیونکہ یہی دوست ہمیں اپنا بہترین خزانہ دیتے ہیں، جو بدلے میں کبھی کچھ نہیں مانگتے اور ہمیشہ ہماری آواز پر لبیک کہنے کو تیار رہتے ہیں۔ ان کے ہمراہ تھوڑی چہل قدمی کر لیں تو ہماری کمزوریاں دور ہو جائیں گی اور ہم تفہیم کی بدولت حاصل ہونے والی طمانیت سے آشنا ہوں گے۔"

"انسانی ترقی کی دس چوٹیاں" کے نام سے مرتب باب میں ہم ڈیورانٹ کی نگاہ انتخاب کے ذریعے ایسے واقعات سے روشناس ہوتے ہیں جو تہذیب کے ارتقائی مراحل میں سنگ میل ثابت ہوئے۔

ان میں گفتار یعنی زبان کی تشکیل، آگ، جانوروں پر فتح، زراعت، سماجی تنظیم، اخلاقیات، سائنس، تعلیم، تحریر اور چھپائی، سائنس جیسے موضوعات کو نہایت دلچسپ اور آسان انداز میں قلم بند کیا گیا ہے۔ ترقی کے ارتقائی مرحلے کا حصہ بن کر ان عوامل نے "کیا اور کیسے" تک کا کٹھن سفر کس طرح طے کیا اور یوں ہماری آج کی جدید اور مہذب دنیا کے لیے وہ سب کچھ ممکن ہوا جو کہ اس کا خاصہ سمجھا جاتا ہے۔

"تاریخ عالم کے بارہ اہم ترین موڑ" کے نام سے مرتب باب میں کچھ ایسے واقعات کا جائزہ لیا گیا ہے، جنہوں نے تاریخ انسانی پر گہرے اور پائیدار اثرات مرتب کیے۔ ان میں کنفیوشس کی موت کا تذکرہ کرتے ہوئے۔ "مجھے اسکول کے چینی طلبا پر رشک ہے۔ جنہیں کنفیوشس کا ہر لفظ ازبر کروا دیا جاتا

ہے۔ مجھے اس کی ہر سطر معنی سے لبریز اور قابل اطلاق معلوم ہوئی۔ اور کبھی کبھی سوچا کہ اگر یہ مقولے بیس سال تک میرے حافظے میں سرایت کر گئے ہوتے تو میری روح کو کچھ قرار آجاتا۔ مجھے سادہ و قار، پر اطمینان تفہیم اور کردار اک عمق اور بے پناہ خوش اخلاقی نصیب ہو جاتی جو ہر جگہ کے تعلیم یافتہ چینیوں میں پائی جاتی ہے۔ کبھی کسی آدمی نے اپنا نام لوگوں کے چہرے اور روح پر اس طرح نقش نہیں کیا جیسے کنفیوشس نے چین میں کیا۔"

غیر محسوس انداز میں گہرے طنز اور دلچسپ اظہار خیال کا نمونہ دیکھیے۔

"راجر بیکن ہی تھا جس نے پہلی بار قطعی انداز میں اس دھماکہ خیز مواد کو بیان کیا۔ بارود نے دنیا میں انقلاب بپا کردیا اور تمام متقی ریاست کاروں کو ضبط تولید کا ایک متبادل پیش کیا۔

"بارود نے ہی جنگ کو شرفا کے ایک کھیل (جو کبھی کبھار مہلک ثابت ہوتا) سے بدل کر بڑے پیمانے پر باضابطہ تباہی بنا دیا۔ اس کی بدولت چند منٹ کی بمباری کے ذریعے لاکھوں فنکاروں کی تین سو سال پر محیط محنت کو ملیامیٹ کردینا ممکن ہو گیا۔"

شاید انسان کی بہشت بدری کے بعد سب سے اہم تاریخ بنتی ہے۔ البتہ کچھ سنکی لوگ دیگر تاریخیں زیادہ اہم قرار دیں گے۔ فکر کی ایجاد، عقل کی جبلت سے آزادی، جنس کی تولید سے علیحدگی اور ہر ملک میں نسل کشی کو گنے چنے بدھوؤں پر چھوڑ دینا......"

کچھ منفرد اور گہرے ادراک کا اظہار دیکھیے۔

"ہم تعلیم کو ناپسند کرتے ہیں کیونکہ جوانی میں یہ ہمیں اصل صورت میں نہیں پیش کی جاتی تھی۔ اسے حقائق اور تاریخوں کا ایک دردناک مجموعہ نہ سمجھیں بلکہ عظیم لوگوں سے باعث تحلیل قرابت کا ذریعہ خیال کریں۔ اسے "روزی کمانے" کی تیاری کے بجائے اپنی دنیا کی تفہیم، کنٹرول اور قدر افزائی کے لیے ہر ممکنہ استعداد کو ترقی دینے کے طور پر لیں۔

"ہم پیدائش کے وقت بمشکل ہی انسان ہوتے ہیں۔ ہم انسان بنتے ہیں۔ انسانیت سینکڑوں راستوں سے ہم پر وارد ہوتی ہے اور ماضی ہمارے حال میں وہ ذہنی اور ثقافتی ورثہ انڈیلتا ہے۔ جسے محفوظ رکھنا، جمع کرنا اور آگے منتقل کرنا نوع انسانی کو (تمام نقائص اور جہالتوں کے باوجود) کسی بھی سابقہ نسل کی نسبت بلند تر سطح پر قائم رکھے ہوئے ہے۔"

ترقی بے ترتیبی پر ذہن اور مقصد کے غلبے، مادے پر ہیئت اور عزم کے غلبے کا نام ہے۔ ول ڈیورانٹ کی سالوں محنت، لکھی گئی کتابوں کا نچوڑ، مختصر مگر اہم ترین اس کتاب کے مترجم کا شکریہ ہم پر واجب ہے۔

آخر میں ڈیورانٹ کے اختتامی الفاظ۔ جو اس کی ایماندارانہ اور آزادانہ رائے کو نہ صرف ظاہر کرتے ہیں بلکہ اپنے تمام پڑھنے والوں کو بھی اس کا حق اور اختیار دے کر اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہیں۔

"میں جانتا ہوں کہ یہ تمام فہرستیں کسی قدر جانب دارانہ اور مخصوص علاقے سے متعلق ہوں گی۔ ہم سب زمان و مکان کی سرحدوں کے اندر پیدا ہوتے ہیں اور چاہے کتنی بھی جدوجہد کرلیں مگر اپنے ڈبوں سے کبھی باہر نہیں نکل پاتے۔ ہمارے لیے تہذیب کا مطلب ہے یورپ اور امریکا اور ہمیں بربری خیال کرنے والے مشرق کو ہم بربری سمجھتے ہیں۔ قاری کو چاہیے کہ وہ اپنی فہرستیں بنائے اور دیکھے کہ میری بنائی ہوئی فہرستوں میں اسے کیا پسند ہے۔ آپ اپنے لیے ایک اور تناظر اور یگانگت تعمیر کریں، جو انسانی ترقی کو عیاں کرے۔ وہ الفاظ یاد رکھیں، جو نپولین نے سینٹ ہیلنا کے مقام پر ڈیوک سے کہے تھے۔

"خدا کرے کہ میرا بیٹا تاریخ کا مطالعہ کرے۔ کیونکہ یہ واحد حقیقی نفسیات اور واحد سچا حقیقی فلسفہ ہے۔"

نبیلہ عزیز

رقص بسمل

ماورا مرتضیٰ عافیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ فارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عافیہ بیگم اس کا اپنی سہیلیوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگاتی ہیں جبکہ ماورا خود اعتماد اور اچھی لڑکی ہے۔ عافیہ بیگم اکثر اس سے ناراض رہتی ہیں۔ البتہ بی گل اس کی حمایتی ہیں۔

فارہ اپنی ثمینہ خالہ کے بیٹے آفاق یزدانی سے منسوب ہے۔ دو سال پہلے یہ نسبت آفاق کی پسند سے ٹھہرائی گئی تھی مگر اب وہ فارہ سے قطعی لاتعلق ہے۔ فارہ کی والدہ منزہ رحیم اپنی بہن ثمینہ سے ملنے کراچی جاتی ہیں۔ آفاق انہیں ایئرپورٹ پر لینے نہیں جاتا۔ مجبوراً "ساشا کو انہیں لینے جانا پڑتا ہے۔

منزہ اور ثمینہ کے بھائی رضا حیدر کے دو بچے ہیں تیمور حیدر اور عزت حیدر۔ تیمور حیدر بزنس مین ہے اور بے حد شاندار پرسنالٹی کا مالک ہے۔ ولید رحمٰن اس کا بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس سے حیثیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان اسٹیٹس حائل نہیں ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے یونیورسٹی میں بم دھماکا ہوتے دیکھ کر اپنے حواس کھو دیتی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے۔ اسے سنبھال کر وہ تیمور کو فون کرتا ہے۔ تیمور اسے اسپتال لے جاتا ہے۔ عزت کے ساتھ یہ حادثاتی ملاقات ولید کو ایک خوشگوار حصار میں باندھ لیتی ہے۔ منزہ رحیم آفاق کی بدتہذیبی پر اس سے خفا ہو کر واپس لوٹ آتی ہیں۔ آفاق مسلسل شش و پنج کا شکار ہے۔

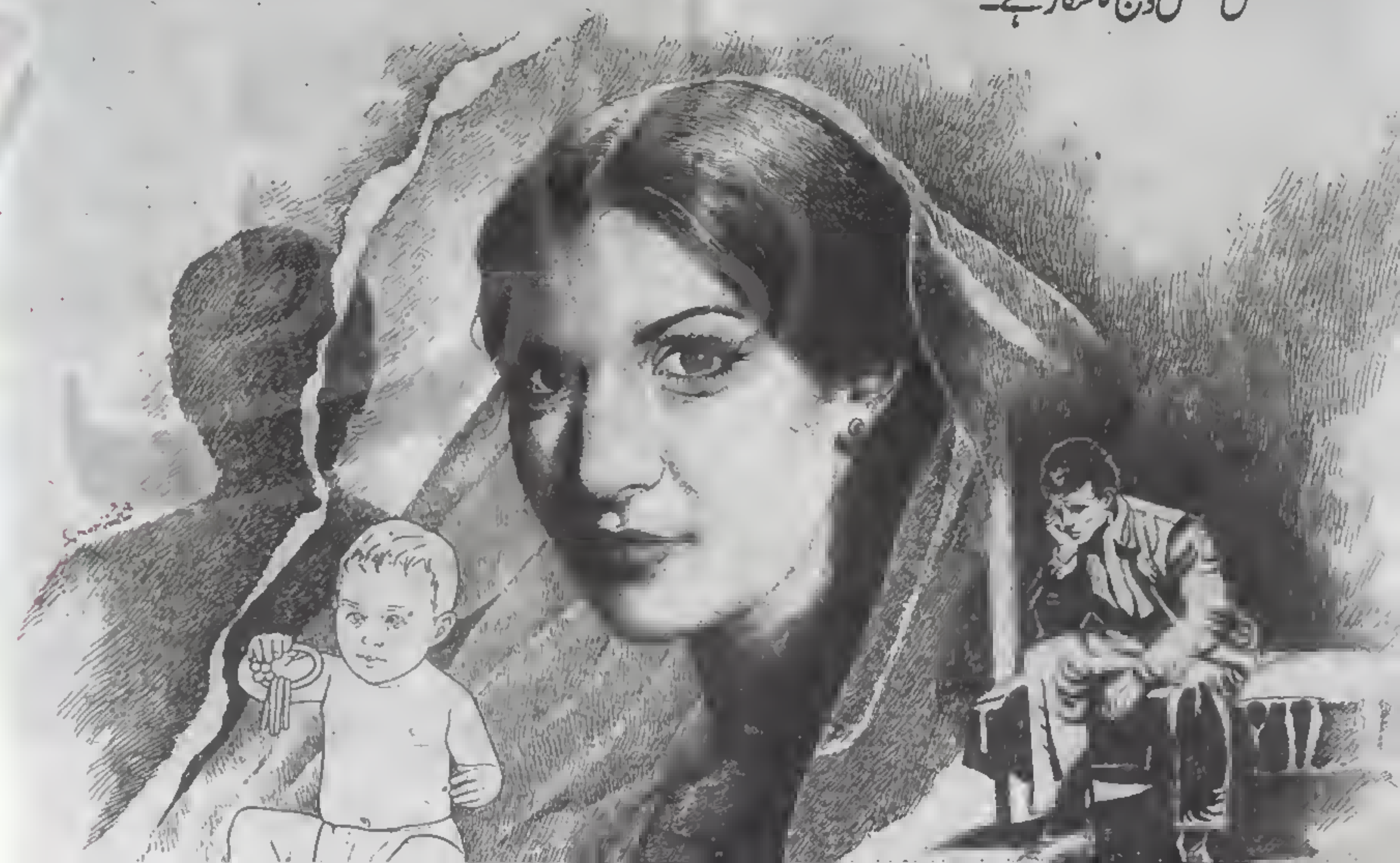

صبح آٹھ بجے کا وقت تھا' جب اس کی آنکھ کھلی۔ اس نے اپنے سر کو ذرا سی جنبش دیتے ہوئے اپنے دائیں طرف دیکھا اور بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھی تصویر دیکھ کر سمجھ گئی کہ وہ اپنے بیڈ روم میں ہی ہے۔ ورنہ کل سے دوائیوں کے زیر اثر اس کا ذہن اور اس کے اعصاب پوری طرح سے بیدار نہیں ہو پا رہے تھے۔ اس لیے رات بھی گہری اور بے سدھ نیند کی آغوش میں گزر گئی تھی۔

لیکن اب اس کا ذہن اور اس کے اعصاب پوری طرح سے بیدار ہو چکے تھے۔ اس نے دوبارہ اپنے سر کا زاویہ درست کرتے ہوئے بیڈ کے بالکل سامنے والی دیوار پہ لگے کلاک کی طرف توجہ کی اور پھر نظریں کلاک پہ جیسے جم سی گئیں۔

کلاک کی سوئیوں کی ٹک ٹک اس کے ذہن کو وقت کے ساتھ ساتھ آگے لے جانے کے بجائے پیچھے لے جا رہی تھی اور وہ آج کی صبح آٹھ بجے کی بجائے گزشتہ کل صبح کے آٹھ بجے تک جا پہنچی تھی۔

جہاں آج کی صبح جیسا سکون نہیں تھا... جہاں شور تھا... ہنگامہ تھا... قیامت تھی۔

جہاں آج کی طرح وہ چپ نہیں تھی۔ بلکہ چیخ رہی تھی... چلا رہی تھی... پاگل ہو رہی تھی۔

اور اس اذیت کے عالم میں اور قیامت کے میدان میں کوئی ایک مہربان ایسا بھی تھا جو صرف اس کے لیے ہلکان ہو رہا تھا۔ جس کی توجہ صرف اسی کی طرف تھی۔ جو صرف اسے ہی سمیٹ رہا تھا اور جو صرف اسے ہی سنبھال رہا تھا۔

"وہ کون تھا آخر؟" عزت نے اپنے خالی ذہن پہ زور دیا۔

"میں ولید ہوں... ولید... ولید رحمان... تیمور کا دوست... آپ نے یقیناً" پہلے بھی مجھے دیکھا ہو گا۔ شاید آپ کے گھر پہ ہی..." وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اسے اپنی پہچان کا حوالہ دے رہا تھا۔ اس کے خالی ذہن میں ولید کی آواز گونجی۔

"ولید... ولید رحمان؟" اس نے زیر لب دہرایا تھا۔ اس نام کو دہرانے کے ساتھ ہی کل والا واقعہ رفتہ رفتہ اپنی پوری جزئیات سمیت اس کے ذہن میں تازہ ہو گیا۔

اسے وہ منظر بھی یاد آ گیا' جب وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر ایک دم زمین بوس ہوئی تھی اور اس کے منہ سے شاید اسی کا نام نکلا تھا۔

"ولید!" عزت بے ساختہ اسے پکارتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ لیکن جب خود کو زمین کے بجائے اپنے بستر پہ پایا تو ٹھٹک سی گئی۔ وہ "کل" کو "آج" تصور کر بیٹھی تھی۔ اس کے ذہن سے یہ نکل گیا تھا کہ کل گزر چکا ہے اور آج موجود ہے اپنی تمام حقیقتوں سمیت۔

"ہیلو! گڈ مارننگ۔" وہ اپنے بیڈ پہ گم صم سی بیٹھی تھی۔ جب ساشا اچانک اس کے بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ عزت نے چونک کر دیکھا۔

"شکر ہے! تم ہوش و حواس میں نظر آ رہی ہو۔ ورنہ میں تو اتنا پریشان ہو رہی تھی کل سے۔" ساشا نے اسے بیڈ پہ بیٹھے دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا۔

"کیوں؟ ایسا کیا ہو گیا تھا مجھے کہ تم اتنی پریشان ہو گئی تھیں؟" عزت نے ذرا تلخ سے لہجے میں کہتے ہوئے ساشا کو دیکھا اور اپنے بال سمیٹ کر بیڈ سے اتر آئی۔ اس کا رخ کھڑکی کی طرف تھا۔

"واٹ؟ کل جو کچھ ہوا' کیا تمہاری نظر میں وہ کچھ بھی نہیں تھا؟" ساشا کو حیرت کا شدید ترین جھٹکا لگا تھا۔ اس نے حیران نظروں سے کھڑکی میں کھڑی عزت کو دیکھا۔

"کل جو کچھ ہوا' میری نظر میں وہ بہت کچھ ہے' اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ مجھے کیا ہوا ہے بھلا؟ ہوا تو ان لوگوں

کو ہے' جو آج قبر میں سو رہے ہیں یا پھر جو اس وقت اسپتال میں تڑپ رہے ہیں۔ میرا کیا گیا ہے بھلا؟ میں تو کل بھی ٹھیک تھی اور آج بھی ٹھیک ہوں۔ بس وقتی طور پہ ان لوگوں کی تکلیف اور اذیت برداشت نہیں کر پائی تھی اور تو کچھ نہیں ہوا مجھے۔" عزت کا تلخ لہجہ بھیگ رہا تھا۔ ساشا اس کی کیفیت بخوبی سمجھ گئی تھی۔ اسی لیے خاموش بھی ہو گئی۔

"ہوں! تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں سمجھ سکتی ہوں تمہاری فیلنگز کو..." ساشا نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا۔

"ساشا! وہ... وہ دونوں میڈیکل کے اسٹوڈنٹس... وہ زیب اور جہاں زیب کا کپل... وہ دونوں بھی اس دھماکے کا شکار ہو گئے... مم... میری آنکھوں کے سامنے ان کی ڈیڈ باڈیز..." عزت روتے ہوئے اسے بتا رہی تھی اور پھر آخر میں دونوں ہاتھ اپنے چہرے پہ رکھے پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی کھڑکی کے قریب ہی دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔

اس کا پورا وجود ہچکیوں کی زد میں تھا۔ ساشا اٹھ کر اس کے قریب آ گئی۔

"عزت! پلیز سنبھالو اپنے آپ کو۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اگر زیادہ ٹینشن لو گی تو طبیعت اور زیادہ خراب ہو گی پلیز۔ اٹھو! بیڈ پہ بیٹھو۔" ساشا روتی بلکتی عزت کو سہارا دے کر بیڈ پہ لے آئی۔

کچھ ہی دیر میں رابعہ بیگم اور رضا حیدر بھی آ گئے۔ انہوں نے بڑی مشکل سے بہلا پھسلا کر روتی بلکتی عزت کو ٹھنڈا جوس پلایا اور پھر اسے دوبارہ بیڈ پہ لٹا دیا۔ ان سب کو اس کی طرف سے تشویش ہو رہی تھی۔ ساشا اس کی ابتر سی حالت پہ تاسف بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی اٹھ کر واپس گھر آ گئی۔

☼ ☼ ☼

"امی! کہاں ہیں؟" ماورا نے گھر میں داخل ہوتے ہی بی گل سے استفسار کیا۔ صحن میں بچھی چارپائی پہ بیٹھی بی گل حیران پریشان رہ گئیں۔ کیونکہ وہ دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کو اتنی چاہ سے بہت کم ہی یاد کرتی تھیں۔

"بی گل! آپ اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں؟" ماورا خفگی سے بولی۔

"ماں صدقے پتر! میں دیکھ کر یقین کر رہی ہوں کہ میں اسی دنیا میں ہوں ابھی یا پھر...؟" انہوں نے عینک کے شیشوں کے پار سے بغور دیکھتے ہوئے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

"اف بی گل! کیسی باتیں کرتی ہیں آپ؟ اللہ نہ کرے کہ آپ کو کچھ ہو۔" ماورا ناراضی سے کہتی ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

"بیٹا! اللہ کے کرم سے مجھے کبھی کچھ بھی نہیں ہوتا۔ جب بھی جو بھی ہوتا ہے تم دونوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ابھی بھی پتا نہیں کیا ہو رہا ہے؟ تم نے گھر میں آتے ہی اپنی ماں کا پوچھا ہے تو میرا دل بے چینی سے بیٹھا جا رہا ہے کہ خدا خیر کرے۔ آج کیا معجزہ ہو گیا ہے؟" بی گل اپنے دل پہ ہاتھ رکھے اپنی حیرت کا اظہار کر رہی تھیں۔

"اتنا گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس! وہ آج مجھے دو مہینے کی سیلری ایک ساتھ ملی ہے تو اسی لیے اتنی خوش ہو رہی ہوں۔" ماورا نے انہیں اصل وجہ بتائی۔

"ہائیں! سیلری ملنے پہ اتنی خوش ہو رہی ہو؟" اب کی بار بی گل کو اور زیادہ حیرت ہوئی۔

"اف اللہ! آپ بھی نا بس! بات کا الٹا مطلب ہی نکالتی ہیں۔ میں سیلری ملنے پہ خوش نہیں ہو رہی۔ سیلری تو مجھے پہلے بھی ملتی ہی رہی ہے۔ میں تو صرف اس لیے خوش ہو رہی ہوں کہ میں نے پچھلے مہینے سیلری نہیں لی تھی۔

"اس لیے اس بار دو مہینے کی سیلری ایک ساتھ ملی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ یہ سیلری امی کو دوں گی۔ وہ اپنی پسند سے اپنے لیے شاپنگ کریں گی۔" اس نے جھنجلا کے بتایا۔

"اوہ! اچھا اچھا...! یہ بات ہے؟ جاؤ! عافیہ کچن میں ہے۔" بی گل کو بھی سن کر خوشی ہوئی تھی۔ اس لیے فوراً کچن کی طرف اشارہ کیا۔

"اوکے! میں ابھی آتی ہوں۔" ماورا اپنے بیگ سے لفافہ نکال کے بیگ وہیں بی گل کے پاس چارپائی پہ چھوڑ کر چلی گئی۔ آج وہ کافی پرجوش لگ رہی تھی۔

"السلام علیکم!" اس نے کچن کی دہلیز پہ رکتے ہوئے سلام کیا۔ اسٹیل کی چھوٹی سی پرات میں چاول دھوتی عافیہ بیگم چونک گئیں۔

"وعلیکم السلام!" انہوں نے کافی آہستگی سے اس کے سلام کا جواب دیا۔

"کیا بنا رہی ہیں آج؟" ماورا کہتی ہوئی اندر آگئی۔ وہ اپنے اور ان کے درمیان حائل دو دن کی خاموشی کا اثر زائل کرنے کی کوشش میں تھی۔

"چنے اور چاول۔" عافیہ بیگم رومال سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولیں۔

"واہ! تو آج بی گل کی پسند کا کھانا بن رہا ہے۔" ماورا نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

"ہوں! کافی دنوں سے فرمائش کر رہی تھیں۔"

"ہاں تو ٹھیک ہے نا! ان کی پسند کا کھانا بھی بننا چاہیے۔ ہماری پسند کا تو روز بنتا ہے۔" ماورا نے جلدی سے کہا۔

"تمہیں کچھ چاہیے؟" عافیہ بیگم نے ماورا کے بے سبب کچن میں آنے کی وجہ جاننا چاہی۔

"جی! وہ دراصل مجھے آپ سے کچھ کہنا تھا۔" ماورا نے تمہید کا سہارا لیا۔ حالانکہ وہ بلا کی منہ پھٹ اور بلا جھجک بات کہہ دینے والی لڑکی تھی۔

"ہوں! سن رہی ہوں۔" عافیہ بیگم ذرا ٹھٹک کر متوجہ ہوئیں۔

"یہ آپ کے لیے۔" ماورا نے چھوٹے سے سفید لفافے میں بند رقم ان کی طرف بڑھائی۔

"یہ کیا ہے؟" انہوں نے چونک کر دیکھا۔

"یہ میری طرف سے گفٹ ہے آپ کے لیے۔ آپ کو اس سے اپنی شاپنگ کرنی ہے۔" ماورا کے کہنے کے باوجود انہیں کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

"کیا مطلب؟ کیا ہے یہ؟"

"اف امی! سیلری ہے میری... اور کیا ہو گا بھلا؟ میں نے صرف آپ کے لیے جمع کی تھی۔" ماورا اچھلا گئی۔

"میرے لیے؟ مگر کیوں؟" انہیں حیرانی ہوئی۔

"کیونکہ آپ ہمیشہ میری، بی گل کی اور گھر کی ضرورتوں کا خیال رکھتی ہیں۔ اپنے لیے کبھی کچھ بھی نہیں خریدا آپ نے... ٹھیک ہے کہ آپ کی سیلری ہم سب پہ خرچ ہو جاتی ہے، لیکن میری سیلری تو آپ پہ خرچ ہو سکتی ہے نا؟"

ماورا کے کہنے پہ عافیہ بیگم نے بے ساختہ اس کے چہرے کی سمت دیکھا۔ وہ کم عمر بچوں کی طرح اپنی ماں کے لیے فکر میں مبتلا نظر آ رہی تھی۔ ان کا دل ایک دم خوش ہو گیا اور انہوں نے اس کے ہاتھ سے وہ لفافہ تھام لیا۔

"تم نے یہ سیلری میرے لیے، میری خوشی کی خاطر جمع کی ہے نا؟" انہوں نے ماورا سے پوچھا۔

"جی بالکل!" اس نے کندھے اچکائے۔

"تو پھر میں یہ پیسے جیسے چاہوں، جہاں چاہوں خرچ کر سکتی ہوں نا؟" وہ جیسے یقین چاہ رہی تھیں۔

"ارے! آپ اس طرح کیوں پوچھ رہی ہیں؟ یہ آپ کے لیے گفٹ ہے۔ آپ کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں بھلا؟" ماورا نے خفگی سے کہا۔

"اوکے! تو پھر یہ لو پیسے... اور تم اپنے لیے ایک اچھا سا موبائل فون لے آؤ۔" انہوں نے لفافہ ماورا کے ہاتھ پہ رکھتے ہوئے کہا۔

"موبائل فون؟" ماورا کو حیرت ہوئی۔ کیونکہ عافیہ بیگم تو موبائل استعمال کرنے کے سخت خلاف تھیں۔

"ہاں! موبائل فون۔ کیونکہ یہ آج کل ہر آدمی کی ضرورت بن چکا ہے۔ اور آگے جا کر تمہیں بھی اس کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم ابھی لے لو۔" عافیہ بیگم کی بات پہ ماورا کی حالت یوں ہو گئی تھی جیسے ابھی غش کھا کے گر جائے گی۔

"لیکن امی! آپ تو..." وہ بات مکمل نہیں کر پائی۔

"ہاں! میں موبائل فون کے خلاف تھی اور اب بھی ہوں۔ لیکن اگر محض ضرورت کے وقت استعمال کیا جائے تو بری چیز نہیں ہے۔ بلکہ سائنس کی ایک بہترین اور کارآمد ایجاد ہے۔ ہمیں گھر بیٹھے بہت سی چیزوں سے باخبر رکھ سکتی ہے۔" عافیہ بیگم پہ شاید بی گل کے لیکچر کا اثر ہوا تھا کہ وہ اپنی سوچ میں تھوڑی بہت تبدیلی لانے پر مجبور ہو گئی تھیں اور انہوں نے بیٹی پہ بھروسا رکھنے کی تھوڑی سی ہمت کر ہی لی تھی۔

"لیکن یہ پیسے تو میں نے آپ کو آپ کے لیے دیے ہیں۔" ماورا حیرت کے مارے گنگ تھی۔ اس لیے زیادہ بول ہی نہیں پائی۔

"تم نے دیے... اور میں نے لے لیے۔ اب میں جہاں جی چاہے خرچ کروں۔ بس بات ختم۔" انہوں نے ماورا کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

"لیکن امی! مجھے موبائل فون کا کیا کرنا ہے بھلا... نہ مجھے کسی کو کال کرنی ہے، نہ میسجز۔ میرے کون سے فرینڈز ہیں۔ جن سے میرا کانٹیکٹ ہو گا؟ میرا کام صرف کمپیوٹر سے ہوتا ہے اور کمپیوٹر تو آل ریڈی ہے میرے پاس۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"وہ سب بھی ٹھیک ہے بیٹا! مگر ایگزامز کے بعد جب تم اچھی جاب کے لیے کوشش کرو گی تو موبائل فون ہی تمہیں زیادہ کام دے گا اور جب جاب پر جانے لگو گی تو میں بھی باآسانی تم سے کانٹیکٹ کر لیا کروں گی۔ اس طرح مجھے تمہاری طرف سے پریشانی نہیں رہے گی۔" وہ اسے موبائل فون کے فوائد گنوا رہی تھیں۔ مجبوراً ماورا کو چپ ہونا ہی پڑا۔

جب وہ خود چاہ رہی تھیں کہ ماورا موبائل فون لے تو پھر وہ بار بار انکار کر کے ان سے اختلاف کیوں کرتی؟ انہوں نے اپنی سوچ بدلی تھی تو یہ تو ماورا کے لیے ایک خوش آئند بات تھی۔ لہٰذا اسے خوش ہونا چاہیے تھا۔

"چلو! اب یہ لو پیسے اور الماری میں رکھو جا کر۔ کل یونیورسٹی سے واپسی پہ اپنا موبائل اور نمبر لے آنا۔" انہوں نے لفافہ اس کے ہاتھ میں دباتے ہوئے کافی ہلکے پھلکے سے لہجے میں کہا۔

ماورا چپ چاپ قدرے حیران اور بے یقین سی کچن سے باہر نکل آئی۔ بی گل نے اسے دیکھا تو پاس بلا کر اس کی حیرانی کی وجہ دریافت کی۔ جس پہ ماورا نے من و عن سب کچھ سنا دیا۔ وہ سن کر مسکرا دیں۔

☼ ☼ ☼

وہ آج صبح سے بہت مصروف تھا۔ پورا دن فائلز، لیپ ٹاپ اور میٹنگز میں الجھتے ہوئے گزر گیا تھا۔

آج کل گرمیوں کے موسم کا کپڑا دھڑا دھڑ تیار کیا جا رہا تھا۔ اس لیے آج کل کام کافی زیادہ تھا۔ فیکٹریز کی رونق

بھی عروج پہ تھی۔ ہر طرف، ہر جگہ مصروفیت اور کام ہی کام نظر آرہا تھا۔ اتنے وسیع کاروبار کو اکیلے سنبھالنے کے لیے تیمور حیدر کی ہمت تھی کہ دن رات ایک کیے رکھتا تھا۔ وہ ہروقت، ہر کام کے لیے چاق وچوبند نظر آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے بابا کے بزنس کو چند سال میں ہی بہت اوپر لے آیا تھا۔ مارکیٹ میں اس کی کمپنی کی اپنی ایک ساکھ تھی۔ پہچان تھی۔

کپڑے کی کوالٹی، کلر اسکیم، ڈیزائننگ اور پرنٹنگ کا معیار اور کوئی بھی کمپنی مارکیٹ کو مہیا نہیں کررہی تھی۔ سوائے اس کی کمپنیز کے۔

اس لیے سیزن میں سب سے زیادہ اسی کے کام کی ڈیمانڈ ہوتی تھی اور وہ اس ڈیمانڈ کو کیش کرتا تھا۔ کیونکہ اس کی کمپنی کا نام مارکیٹ میں ہاتھوں ہاتھ بکتا تھا اور یہی اس کی کامیابی تھی۔ اس نام کو، اس ساکھ کو اور اس کامیابی کو برقرار رکھنے کے لیے اسے دن رات محنت کرنی پڑتی تھی۔ ہروقت کام میں مصروف رہتا تھا۔ اسے تو سر اٹھانے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ آج بھی اس کی مصروفیت کا یہی عالم تھا۔ صبح سے شام ہوگئی تھی اور وہ ابھی آفس میں ہی تھا۔

"مے آئی کم ان سر۔۔۔؟" وہ کسی فائل میں الجھا ہوا تھا۔ جب اس کی پی اے سحرش زمان نے دروازے پہ دستک دے کر اجازت طلب کی تھی۔ وہ چونک گیا۔

"یس کم ان۔۔۔" اس نے اثبات میں جواب دیا اور سحرش زمان اندر آگئی۔

"فرمائیے۔۔۔" وہ کافی مصروف سے انداز میں گویا ہوا۔

"سر! میٹنگ کنفرم ہوگئی ہے۔" اس نے اطلاع دی۔

"اچھا۔۔۔ کہاں ہوئی ہے؟" تیمور نے فائل بند کرتے ہوئے پوچھا۔

"فیصل آباد۔۔۔" سحرش زمان نے مختصراً" بتایا۔

"فیصل آباد۔۔۔؟" تیمور حیدر ٹھٹک گیا۔

"یس سر! کل تین بجے آپ کو میٹنگ اٹینڈ کرنے کے لیے فیصل آباد جانا ہوگا۔" سحرش نے اسے مزید آگاہ کیا۔

"اف۔۔۔ پھر فیصل آباد؟" تیمور جھنجلا گیا۔

"کیوں سر۔۔۔؟ کیا آپ کو فیصل آباد جانا پسند نہیں ہے؟" سحرش نے اس کی جھنجلاہٹ پہ دلچسپی سے دیکھا۔

"ہوں۔۔۔ کہہ سکتی ہیں۔" تیمور نے سر جھٹکا۔ سحرش اس کی کوفت پہ مسکرادی۔

"تو آپ نہ جایا کریں؟"

"میرا جانا نہ جانا، اگر میری پسند پہ ڈیپینڈ کرے تو شاید میں نہ ہی جاؤں۔۔۔ لیکن مجبوری ہے۔ ہر بار جانا ہی پڑتا ہے۔" تیمور اپنے سامنے پھیلی تمام ضروری فائلز سمیٹ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"لیکن میں نے تو سنا ہے کہ کافی اچھا شہر ہے۔"

"نو ڈاؤٹ! شہر اچھا ہے۔۔۔ لیکن میں جب بھی وہاں گیا، مجھے بوریت ہی محسوس ہوئی ہے۔" وہ اپنا لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے بولا۔ پھر موبائل اور چابیاں اٹھا کر اپنے روم سے باہر نکل آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے سحرش بھی باہر آگئی۔

"اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟" تیمور نے گھڑی دیکھتے ہوئے سحرش سے پوچھا۔

"جی سر! میں بھی بس نکل ہی رہی ہوں۔" وہ اپنے کیبن سے اپنا بیگ وغیرہ لینے کے لیے مڑ گئی۔

تیمور نے اپنی تمام فی میل ورکرز کے لیے پک اینڈ ڈراپ کی سہولت مہیا کررکھی تھی۔ اس لیے سب کو آنے جانے کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ اگر لیٹ بھی ہوجاتی تھیں تو انہیں پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ جیسے ہی سحرش کو

ڈراپ کرنے کے لیے پارکنگ سے گاڑی رخصت ہوئی، تب کہیں تیمور نے اپنی گاڑی روڈ پہ نکالی۔

سورج کے غروب ہوتے ہی شہر بھر میں مصنوعی روشنیاں جاگ اٹھتی تھیں۔ اس وقت بھی روڈ پہ ہر طرف روشنیوں کا سیلاب اُمڈا ہوا نظر آرہا تھا۔ تیمور ان دیدہ زیب روشنیوں کی خوب صورتی کو انجوائے کرتا بڑے سکون سے اپنے گھر کی سمت رواں دواں تھا۔ جب اچانک وہ چونک گیا۔

"ولید۔۔۔؟" اس نے زیرلب کہا بے پناہ تشویش کا شکار ہوگیا۔ کیونکہ اس کی گاڑی کے قریب سے ہی ولید کی بائیک خاصی تیز رفتاری سے گزری تھی۔ تیمور نے گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں اس کا چہرہ واضح دیکھا تھا۔ اس لیے شک وشبے کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں نکلتی تھی۔ پھر اس کی بائیک کے تعاقب میں اتنی ہی رفتار میں پولیس جیپ دیکھ کر تیمور کی پریشانی اور تشویش مزید بڑھ گئی۔ جس کے نتیجے میں تیمور بھی اپنی گاڑی کی رفتار بڑھانے پہ مجبور ہوگیا تھا۔

اب ولید کی بائیک، پولیس جیپ اور تیمور حیدر کی گاڑی روڈ پہ ایک ہی لائن میں ایک دوسرے کے تعاقب میں بھاگ رہی تھیں۔ اس دوران تیمور نے ولید کے نمبر پہ کال بھی ملائی تھی۔ مگر ولید کو بھلا کب ہوش تھا؟

تب تنگ آکر اس نے اپنی گاڑی کی رفتار بڑھائی اور ولید کی بائیک کے برابر آگیا تھا۔ اس کو متوجہ کرنے کے لیے ہارن پہ ہاتھ رکھا۔

اب کی بار ولید نے چونک کر دیکھا اپنے برابر تیمور کی گاڑی دیکھ کر اس کی بائیک کی رفتار کم ہوگئی۔ اتنے میں پولیس جیپ ان کے قریب سے زناٹے سے گزر گئی اور ولید اپنی بائیک اس کی گاڑی کے قریب لے آیا۔

"ولید۔۔۔ کیا ہوا ہے؟ کیا بات ہے؟ تم اس وقت کہاں جارہے ہو اور یہ پولیس جیپ؟ یہ سب کیا چکر ہے آخر؟" تیمور گاڑی کا شیشہ نیچے کرتے ہی شروع ہوگیا تھا۔ اس کے لہجے میں پریشانی تھی۔

"ڈونٹ وری یار۔۔۔ کچھ نہیں ہوا۔ سب ٹھیک ہے۔ میں بس ایک کام سے جارہا تھا۔ تم سے بعد میں ملوں گا۔" ولید عجلت میں تھا۔

"ولید! مجھے صاف صاف بتاؤ کیا چکر ہے؟ آخر کس کام سے جارہے ہو تم؟" تیمور کو غصہ آگیا۔ وہ اتنا پریشان ہورہا تھا اور ولید کو وہاں سے بھاگنے کی جلدی تھی۔

"پلیز۔۔۔ بتاؤں گا۔۔۔ سب بتاؤں گا۔۔۔ بس ابھی مجھے جانے دو۔" ولید نے اپنی جاں بخشی کروانا چاہی۔

"کب بتاؤ گے؟ تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔۔۔ اسی لیے ٹال دیتے ہو؟" تیمور گاڑی سے نیچے اتر آیا۔

"یار۔۔۔ تم جب کہو گے۔۔۔ تمہیں بتادوں گا۔ لیکن ابھی نہیں۔" ولید کو بے چینی ہورہی تھی۔

"ٹھیک ہے! تم جاؤ۔ میں تمہارے واپس آنے تک یہیں انتظار کررہا ہوں۔" تیمور نے بات ہی ختم کردی۔ ولید ٹھٹک گیا۔

"ارے یار۔۔۔ کیوں پاگل ہورہے ہو؟ سنسان علاقہ ہے۔۔۔ کروڑ، دو کروڑ کی گاڑی ہے تمہارے پاس۔۔۔ کیوں بیٹھے بٹھائے اپنے ہی دشمن ہورہے ہو تم؟ تمہاری گاڑی دیکھ کر تو اچھے بھلے معزز لوگوں کے منہ میں پانی آجاتا ہے۔ کوئی چور، ڈاکو بھائی دیکھ بیٹھا تو اچھا نہیں ہوگا۔ اس لیے بہتر ہے کہ یہاں ٹھہرنے کے بجائے تم اپنے گھر جاؤ۔ میں تم سے ملنے آجاؤں گا۔" ولید نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"ہرگز نہیں۔۔۔ جو بھی ہوگا۔ دیکھا جائے گا۔ تم کو اگر اتنی پروا ہوئی تو جلدی آجاؤ گے۔" تیمور وہاں سے جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"اوکے! تو پھر ایسا کرو کہ تم اسی ریسٹورنٹ میں چلو۔ وہیں ملتے ہیں۔" ولید نہیں چاہتا تھا کہ تیمور اس کا یہاں انتظار کرے۔

"ولید۔۔۔" تیمور نے اسے گھورا۔

"پرامس یار۔۔۔ میں بس آرہا ہوں۔" ولید نے یقین دہانی کروائی۔ تیمور لب بھینچتا ہوا، پلٹ کر گاڑی میں جا بیٹھا تھا۔

"تھینکس۔۔۔" ولید مسکراتا ہوا بائیک کو کک لگا کے ہوا ہو گیا تیمور واپس مصروف شاہراہ کی سمت لوٹ آیا۔

☆ ☆ ☆

پورے پچاس منٹ گزر چکے تھے اسے ولید کا انتظار کرتے ہوئے۔ لیکن وہ تھا کہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ تیمور کا سوچ سوچ کر دماغ شل ہو گیا تھا کہ ولید آخر کن کاموں اور کن چکروں میں الجھا ہوا ہے؟ ایسا کون سا کام ہے، جو وہ اسے نہیں بتا رہا۔ جو وہ اس سے چھپا رہا ہے۔ کیا وہ کسی غلط کام میں پڑ گیا ہے؟

سچ کہوں اپنی محبت پہ ندامت سی ہوئی
جب بھی دیکھی تیری اتری ہوئی صورت میں نے

ولید اس کے عقب سے شعر پڑھتا ہوا اس کے سامنے ہی ٹیبل کی دوسری جانب کرسی پہ آبیٹھا۔ تیمور چونک کر متوجہ ہوا۔

ولید اس کے سامنے بڑے پرسکون انداز میں براجمان تھا۔ جبکہ تیمور کے چہرے پہ تناؤ نظر آرہا تھا۔

"کیا بات ہے؟ کیوں اتنے پریشان ہو رہے تھے؟" ولید نے کافی اطمینان سے پوچھا۔ اصل میں وہ بات کو غیر سنجیدگی سے لینا چاہتا تھا۔

لیکن تیمور کی طرف ایسے کوئی بھی آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ وہ مکمل سنجیدگی اور خاموشی کے لبادے میں تھا اور اپنے سامنے بیٹھے ولید کو تنقیدی اور کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"کھانا آرڈر کروں؟ کھاؤ گے؟" ولید نے بات کو گھمانے کی کوشش کی۔

"نہیں۔۔۔" تیمور کا لہجہ بہت سخت تھا۔

"کیوں نہیں؟ تمہارے ڈنر کا ٹائم تو تقریباً" ہو ہی چکا ہے۔" ولید نے نارمل سے انداز میں کہا۔

"ولید! یہ تم کھا کس کو رہے ہو؟" تیمور نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ جس پہ ولید ایک دم قہقہہ لگا کے ہنسا۔

"ہاہاہا۔۔۔ تم کو اور بھلا کس کو؟" ولید کے لہجے میں بھرپور شرارت تھی۔

"کیا ایسا ممکن ہے؟" تیمور نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ہے بھی۔۔۔ اور نہیں بھی۔۔۔ آخر دوست کس کے ہو؟ ویسے یار! بلا کے ذہین ہو۔۔۔ تمہاری ذہانت کا تو معترف ہو گیا ہوں میں۔۔۔" ولید نے اس کی ذہانت کا اعتراف کیا۔ لیکن تیمور کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ اس وقت ولید کی باتوں کا نوٹس لینے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"ذہین تو تم بھی بلا کے ہو۔۔۔ ہاتھ نہیں آتے۔" تیمور طنزیہ بولا۔

"کہاں یار؟ تمہارے جیسی ذہانت پھر بھی نہیں ہے۔" اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"کیوں نہیں ہے؟ پولیس کو اپنے پیچھے پیچھے بھگائے پھر رہے ہو۔۔۔ پھر بھی ذہین نہیں ہو؟ حیرت ہے؟" تیمور نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے اسے خفگی سے دیکھا۔

"یہ ذہانت نہیں ہے میرے دوست۔۔۔ ضرورت ہے۔۔۔ اور تم جانتے ہو، ضرورت بڑے بڑے کام کروا لیتی ہے انسان سے۔ اس لیے یوں سمجھ لو کہ پولیس والوں سے دوستی ہو گئی ہے اپنی۔" ولید کافی ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا تھا۔

"ہونہہ۔۔۔ پولیس والے تو اپنی سگی ماں سے دوستی نہیں کرتے۔ تم اپنی بات کر رہے ہو؟" تیمور ہنوز خفا تھا۔

"تم شاید نہیں جانتے کہ کبھی کبھی شیر اور بکری بھی ایک ہی گھاٹ پر پانی پینے پہ مجبور ہو جاتے ہیں۔" اب کی بار ولید کا لہجہ استہزائیہ سا تھا۔

"لیکن اس مجبوری کا پتا بھی تو چلے۔" تیمور جھنجلا گیا۔

"ہونہہ۔۔۔ چھوڑو یار۔۔۔ کیا کرو گے جان کر؟" ولید نے سر جھٹکا۔

"ولید! میں جاننا چاہتا ہوں۔۔۔ تم آخر کام کیا کرتے ہو۔۔۔ اس روز تم نے مجھے یہ تو بتا دیا تھا کہ تمہیں جاب ملی ہے۔ لیکن تم نے یہ نہیں بتایا تھا کہ کیا جاب ملی ہے اور کہاں ملی ہے۔" تیمور کو غصہ آگیا۔ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ورنہ وہ غصے سے ذرا پرہیز ہی کرتا تھا۔

"حال دل کہنے سے خودداری نے روکا ہم کو
اس نے پوچھا تو بہت، ہم نے بتایا ہی نہیں"

ولید نے ایک اور شعر کو درمیان میں گھسیٹا۔ تیمور لب بھینچ کے رہ گیا۔ وہ اپنا غصہ بمشکل ضبط کر رہا تھا۔ ولید سنبھل کے بیٹھ گیا اور ایک گہری سانس کھینچی۔

"مجھے ایک نیوز چینل میں جاب ملی ہے۔۔۔ ایز اے کرائم رپورٹر۔" ولید نے تیمور کے سر پہ دھماکا کیا۔ تیمور اس دھماکے کے زیر اثر شاکڈ سا رہ گیا۔ کیونکہ وہ شروع سے ہی جرنلزم کو ناپسند کرتا تھا۔

"ایز اے کرائم رپورٹر؟" تیمور نے زیر لب دہرایا۔

"ہوں۔۔۔ ایز اے کرائم رپورٹر۔" ولید نے دوبارہ ایک گہری سانس کھینچی۔

اور پھر اتنے بڑے ریسٹورنٹ کی گہما گہمی اور رش کے باوجود ان دونوں کے درمیان گہری خاموشی چھا گئی۔ تیمور کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا اور ولید اس کی کیفیت دیکھ کر چپ تھا۔ اسے تیمور کے ایسے رد عمل کا پہلے سے ہی اندازہ تھا۔ اسی لیے تو اتنے دنوں سے اسے بتا نہیں پا رہا تھا۔

"میں جانتا ہوں تیمور! تمہیں یہ سب پسند نہیں ہے۔ لیکن یار! یہ بھی تو دیکھو کہ حالات کیسے چل رہے ہیں آج کل۔ میں اکیلا ہوتا تو بات اور تھی۔ لیکن میرے ساتھ تین اور لوگ بھی ہیں، جو صرف میری ذمہ داری ہیں اور ان کے لیے مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا نا؟" ولید بھی سنجیدگی کے دائرے میں آچکا تھا۔

"کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا تو میری آفر کی ہوئی جاب کیوں نہیں کی تم نے؟ مجھے بھی تو تم سے ریلیٹڈ ان تین لوگوں کا ہی خیال تھا نا۔ اسی لیے میں تمہیں بار بار فورس بھی کرتا تھا۔ یہاں تک کہ تمہیں جاب دینے کے لیے الٹا میں نے منتیں کی ہیں تمہاری۔ مگر تم نے قبول نہیں کی۔" تیمور ذرا تیز لہجے میں بولا۔

"تیمور! میں یہ دوستی قائم رکھنا چاہتا ہوں۔۔۔ ختم نہیں کرنا چاہتا۔" ولید کا لہجہ مضبوط تھا۔

"ہونہہ۔۔۔ بھاڑ میں گئی ایسی دوستی۔ جس کے ختم ہونے کا ڈر بھی ساتھ ہو۔" تیمور غصے اور تلخی سے کہتے ہوئے ایک دم کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔

"تیمور! پلیز یار۔۔۔ بیٹھو تو سہی۔۔۔ میری بات تو سنو۔" ولید پریشانی سے خود بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"سب سن چکا ہوں۔ اب کیا باقی ہے؟ تم اپنی مرضی سے جو جی چاہے کرو۔ میں کون ہوتا ہوں تمہیں روکنے والا؟" وہ اپنی پینٹ کی جیب سے والٹ نکال کر بل پے کر کے اپنا موبائل اور چابیاں اٹھا کر آگے بڑھ گیا تھا۔

"تیمور۔۔۔" ولید نے اسے روکنا چاہا تھا۔

"سوری۔۔۔ میں پہلے ہی کافی لیٹ ہو چکا ہوں، اللہ حافظ۔" وہ کہہ کر مزید وہاں رکا نہیں تھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا سیڑھیاں اتر گیا تھا اور ولید وہیں کھڑا دیکھتا رہ گیا تھا۔ پھر غصے اور بے بسی سے پلٹ کر قریب پڑی کرسی کو ہی ٹھوکر

دے ماری تھی۔

اگلی ہی گلی میں رہتا ہے
اور ملنے تک نہیں آتا ہے
کہتا ہے تکلف کیا کرنا
ہم تم میں تو پیار کا ناتا ہے

وہ ٹی وی لاؤنج میں صوفے پہ ساکت بیٹھی سامنے ٹی وی اسکرین کی سمت دیکھ رہی تھی۔ لیکن ذہنی طور پہ غیر حاضر تھی۔ اس کا ذہن کہیں سے کہیں پہنچا ہوا تھا۔ کیونکہ منزہ رحیم آج ہی کراچی سے واپس آئی تھیں اور اندر سے کافی پریشان اور ڈسٹرب سی لگ رہی تھیں۔ لیکن بظاہر انہوں نے ایسا کچھ بھی محسوس نہیں ہونے دیا تھا۔ مگر فارہ پھر بھی بھانپ چکی تھی کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوئی ہے اور وہ اس سے چھپا رہی ہیں۔ اسی لیے اس کے دل کو بھی دھڑکا سا لگ گیا تھا اور وہ گم صم سی ہو گئی تھی۔

"فارہ... فارہ۔" منزہ رحیم کے پکارنے پہ فارہ ایک دم ہڑبڑا کے متوجہ ہوئی۔

"جی ممی!" اس نے بڑی مشکل سے اپنے ذہن کو حاضر کیا تھا۔

"تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟ ٹائم دیکھا تم نے؟" منزہ رحیم کسی کام سے اپنے بیڈ روم سے باہر نکلی تھیں۔ لیکن ٹی وی لاؤنج کی لائٹ جلتی دیکھ کر اس طرف آگئیں۔

"اوہ سوری ممی... مووی دیکھتے ہوئے ٹائم کا احساس ہی نہیں ہوا۔" فارہ سامنے وال کلاک پہ ایک بجے کا ٹائم دیکھ کر فوراً" صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور منزہ رحیم حیران رہ گئیں۔ کیونکہ سامنے ٹی وی اسکرین پہ کوئی مووی نہیں' ٹاک شو چل رہا تھا اور وہ بھی بے آواز۔ کیونکہ ٹی وی کا والیوم بند تھا۔

"فارہ!" انہوں نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی بند کرتے ہوئے اسے پکارا۔ لاؤنج سے باہر نکلتی فارہ کے قدم تھم گئے

"جی ممی؟"

"کیا کوئی پریشانی ہے تمہیں؟" وہ اس کے قریب آگئیں۔

"نہیں... کوئی پریشانی نہیں ہے۔" اس نے انکار کر دیا۔

"پھر کیا بات ہے؟" وہ خود بھی پریشان تھیں۔

"کوئی بات نہیں ہے ممی! یو ڈونٹ وری۔ آپ آرام کریں۔ میں بھی سونے کے لیے جا رہی ہوں... گڈ نائٹ۔" وہ لاپروائی ظاہر کرتی آرام سے کہہ کر وہاں سے نکل آئی۔ لیکن اپنے بیڈ روم میں آکر وہ حق دق رہ گئی۔ اس کے بیڈ پہ رکھے موبائل پہ آفاق یزدانی کے نمبر سے گیارہ مسڈ کالز تھیں' فارہ کو یقین نہیں آیا کہ آفاق یزدانی اس کے نمبر پہ کال کر رہا ہے؟

ابھی وہ اپنے موبائل کی اسکرین پہ درج گیارہ مسڈ کالز بغور آنکھیں پھیلا پھیلا کر دیکھنے اور یقین کرنے میں مصروف تھی کہ اچانک اس کے موبائل کی اسکرین جلنے بجھنے لگی۔ جہاں آفاق یزدانی کا نام روشن ہو رہا تھا۔ فارہ رحیم کا دل بند ہونے لگا۔

اور پھر چند لمحے یوں ہی دل کو سنبھالنے میں گزر گئے۔

لیکن پھر اس ڈر سے کہ کہیں کال بند نہ ہو جائے۔ اس نے فوراً" ہی کال ریسیو کرلی۔ مگر پھر بھی اس میں اتنی

ہمت نہیں تھی کہ وہ ہیلو کہتی یا پھر سلام کرتی۔ اسی لیے کال ریسیو کرنے کے باوجود وہ خاموش رہی۔ دوسری طرف آفاق بھی خاموشی کے اس احساس کو محسوس کر چکا تھا۔

"السلام علیکم!" گہری سانس کھینچتے ہوئے آفاق نے خود ہی خاموشی کی اس دیوار کو گرا دیا۔

"وعلیکم السلام!" فارہ نے بمشکل اس کے سلام کا جواب دیا۔ اس کے حلق سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔

"کیسی ہو؟" آفاق کی آواز گمبھیر اور لہجہ کافی ٹھہرا ہوا سا تھا۔

"اچھی ہوں۔" فارہ بھی اپنے آپ کو سنبھالنے میں کامیاب ہو گئی۔

"میں نے ڈسٹرب تو نہیں کیا؟" وہ تھوڑا نارمل ہوا۔

"اب پوچھ رہے ہیں' جب...؟" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"جب؟" آفاق نے اسے بات کا تسلسل قائم رکھنے پہ اکسایا۔

"جب میں پوری طرح سے ڈسٹرب ہو چکی ہوں۔" فارہ کا لہجہ شکوہ آمیز تھا۔

"اوہ... تو پھر ایسے میں کیا کرنا چاہیے مجھے' معذرت یا...؟" اب کی بار آفاق نے بات ادھوری چھوڑی تھی اور فارہ نے اسے اکسایا تھا۔

"یا...؟"

"یا تلافی...؟" آفاق کو جملہ مکمل کرنا ہی پڑا۔

"اس کا فیصلہ میں آپ پہ چھوڑ دوں تو...؟" فارہ نے بڑی آسانی سے اسے مشکل میں ڈالا۔

"فارہ! سارے فیصلے صرف مجھ پہ ہی مت چھوڑو۔ میں پہلے ہی ایک فیصلے کی کشمکش میں الجھا ہوا ہوں۔" فارہ کو آفاق کا لہجہ اس لمحے بکھرتا ہوا سا محسوس ہوا۔

"کیسا فیصلہ؟" وہ اندر سے ٹھٹک گئی۔

"یہی معذرت یا تلافی کا فیصلہ... بڑی مشکل میں ہوں کہ کیا کروں؟ معذرت کروں یا تلافی؟" آفاق حقیقتاً" الجھا ہوا اور پریشان سا لگ رہا تھا۔

"آپ کیا کہہ رہے ہیں آفاق! میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" فارہ کا دل خدشوں اور وسوسوں کی زد میں آگیا۔

"یہی سمجھنا اور سمجھانا تو مشکل ہو گیا ہے مجھ سے... میں پاگل ہو رہا ہوں فارہ... مجھے لگتا ہے کسی روز میرے دماغ کی رگ پھٹ جائے گی۔" آفاق ضبط کے نہ جانے کن مراحل سے گزر رہا تھا۔

فارہ اس کی بات پہ دم بخود سی رہ گئی تھی کہ آفاق کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ یہ سب کیوں کہہ رہا ہے؟ ہوا کیا ہے آخر؟

"کیوں؟ ایسا کیوں ہو رہا ہے آپ کے ساتھ؟ وجہ پوچھ سکتی ہوں؟" فارہ نے ایک بار پھر اپنے آپ کو سنبھالا۔

"وجہ...؟" وہ اس کے سوال پہ چپ سا ہو گیا۔ کیونکہ اس کے پاس اس وجہ کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"بتائیے نا آفاق! ایسا کیوں ہو رہا ہے آپ کے ساتھ؟" فارہ نے اصرار کیا۔

"تمہاری وجہ سے۔" وہ بے ساختہ ہی کہہ گیا۔

"میری وجہ سے؟ کیا مطلب ہے آپ کا...؟" فارہ اس کی ہر بات پہ چونک رہی تھی۔

"فارہ! اگر میں تم سے معذرت کر لوں تو...؟" آفاق کا لہجہ بے حد سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"معذرت... مگر کس چیز کی؟" فارہ روح تک کانپ گئی۔

"تمہارے دل کو مجروح کرنے کی معذرت... تمہاری محبت سے پھر جانے کی معذرت... تم سے شادی نہ کرنے کی معذرت... فارہ میں معذرت خواہ ہوں تم سے۔ مجھے معاف کر دو۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ نہ تم سے محبت کر سکتا ہوں' نہ شادی۔ اگر تمہاری محبت دیکھ کر تم سے شادی کر بھی لوں تو پھر بھی کچھ حاصل نہیں ہو گا...

سوائے عمر بھر کے رونے کے.... اس لیے بہتر ہے کہ ہم ابھی سے الگ ہو جائیں.... دور ہٹ جائیں ایک دوسرے سے.... آج ہی بچھڑ جائیں۔" آفاق کی آواز اور لہجہ کافی گمبھیر ہو رہا تھا۔

جبکہ فارہ کے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ پہ ششدر سی بیٹھی رہ گئی۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا موبائل لرز گیا۔ اس نے بمشکل موبائل پہ اپنی گرفت مضبوط کی۔

"آفاق!" فارہ کو اپنی آواز کسی گہرے پاتال میں سے سنائی دیتی محسوس ہوئی تھی۔

"آیم سوری فارہ.... ایم ریئلی سوری۔ میں بے بس ہوں۔ میں تمہاری محبت کا دم نہیں بھر سکتا۔ میں تو...." اور اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا اسے موبائل کے ایئر پیس سے فارہ کی سسکی سنائی دی۔

"ہیلو.... ہیلو.... فارہ.... میری بات سنو.... ہیلو فارہ!" آفاق بے چینی سے بولا۔ لیکن فارہ کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ موبائل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے قالین پر جا گرا اور وہ دونوں ہاتھ چہرے پہ رکھے بیڈ پہ بیٹھی ہچکیوں سے رو پڑی۔ اس کی ہچکیاں اتنی شدت لیے ہوئے تھیں کہ منہ سے ہلکی ہلکی چیخوں کی آوازیں ابھرنے لگی تھیں۔ جن کو وہ اپنے منہ پہ ہاتھ رکھ کے دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن جب اختیار سے باہر ہوا تو وہ ایک دم اٹھ کر واش روم میں بند ہو گئی۔ تاکہ اس کے رونے کی آواز باہر نہ جا سکے۔ حالانکہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔

☆ ☆ ☆

"ہیلو.... گڈ مارننگ۔" تیمور حیدر نک سک سے تیار بریف کیس ہاتھ میں پکڑے ڈائننگ روم میں داخل ہوا۔

"گڈ مارننگ...." جواباً عزت کی طرف سے کافی دھیما اور سست سا جواب آیا۔

"خیریت....؟ آج مارننگ میں فریش نیس نہیں ہے۔" تیمور نے بریف کیس ٹیبل پہ رکھتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہر مارننگ فریش نہیں ہوتی۔" عزت کا لہجہ اور انداز اب بھی دھیما تھا۔

"ہر مارننگ فریش نہیں ہوتی۔ لوگ اسے فریش بناتے ہیں.... اور ہماری مارننگ تمہاری وجہ سے فریش ہوتی ہے میری جان۔" تیمور کافی نرمی اور پیار سے کہتا کرسی کھینچ کر عزت کے مقابل بیٹھ گیا۔ یہ تو ہمیشہ سے ان دونوں بہن بھائی کی عادت تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل ہی بیٹھتے تھے اور کھانا کھانے کے ساتھ ساتھ عزت کی باتوں، شرارتوں اور چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔

"اور میں اپنے دل و دماغ کی وجہ سے فریش ہوتی ہوں.... جو کہ آج نہیں ہیں۔" عزت نے آہستگی سے جوس کا گلاس قریب کھینچ لیا۔ رابعہ بیگم اس وقت ان دونوں کے لیے فریش جوس بنواتی تھیں۔

"کیوں؟ کیا ابھی تک طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی تمہاری؟" تیمور نے بھی اپنے سامنے رکھا جوس کا گلاس اٹھا لیا۔

"پتا نہیں طبیعت کو کیا ہو گیا ہے.... لگتا ہے ایک ہی جگہ پہ ٹھہر سی گئی ہے۔" عزت کے لہجے میں اداسی گھلی ہوئی تھی۔

"میرے ساتھ چلو گی؟" تیمور نے جوس کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں؟" عزت کا سوال قدرے بے تاثر سا تھا۔

"فیصل آباد...." تیمور نے لاپروائی سے کہا۔

"فیصل آباد؟ آپ فیصل آباد جا رہے ہیں؟" اسے حیرت ہوئی۔

"ہوں.... ایک میٹنگ کے سلسلے میں جا رہا ہوں.... چلو گی؟" تیمور نے اس کی طبیعت کے پیش نظر اسے یہ پیش کش کی تھی۔

"میرا وہاں کیا کام؟" عزت نے کندھے اچکائے۔

"فارہ اور حماد وغیرہ سے مل لینا۔ طبیعت کچھ فریش ہو جائے گی۔" تیمور نے مشورہ دیا۔

"یعنی کہ میں یہ خراب موڈ لے کر وہاں جاؤں؟ ہونہہ.... ضرورت ہی کیا ہے بھلا؟ اس سے تو بہتر ہے کہ گھر ہی بیٹھی رہوں۔" عزت نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے انکار کر دیا۔

"خراب موڈ کو بہتر کرنے کے لیے ہی تو کہہ رہا ہوں۔"

"بٹ ایم سوری! میرا کہیں بھی جانے کو دل نہیں چاہ رہا۔"

"او کے.... ایز یو وش۔" تیمور نے بھی کندھے اچکاتے ہوئے جوس کا گلاس دوبارہ ہونٹوں سے لگا لیا۔

"تم جاؤ گے منزہ کے گھر؟" رضا حیدر نے ان دونوں کی گفتگو ختم ہونے کے بعد اخبار سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

"ٹائم ملا تو ضرور جاؤں گا، ورنہ نہیں۔" اس نے بات ہی ختم کر دی۔

"اس طرح اچھا نہیں لگتا بیٹا! اگر فیصل آباد جا ہی رہے ہو تو ان کے گھر بھی چلے جانا۔ پچھلی بار بھی منزہ خفا ہو رہی تھی کہ تیمور فیصل آباد آ کر بھی ہمارے گھر نہیں آیا۔" رابعہ بیگم نے اسے سمجھایا۔

"لیکن مام! ہر بار ان کے گھر جانا بھی تو اچھا نہیں لگتا نا.... حماد اور رحیم انکل تو اپنے اپنے کام میں بزی ہوتے ہیں۔ کبھی آفس میں، کبھی شہر سے باہر اور کبھی ملک سے باہر گئے ہوتے ہیں۔ ایسے میں گھر پہ صرف منزہ آنٹی اور فارہ ہی ہوتی ہیں۔ مجھے مناسب نہیں لگتا کہ میں جا کر ان کے پاس بیٹھ جاؤں۔ مہینے میں اگر مجھے چار بار فیصل آباد جانا پڑتا ہے تو ضروری نہیں ہے کہ چار بار مجھے ان کے گھر بھی جانا پڑے۔ بس کبھی کبھار کا جانا ہی ٹھیک رہتا ہے۔" تیمور نے کافی سنجیدگی سے انہیں اپنا نقطہ نظر سمجھانے کی کوشش کی۔ جسے رضا حیدر کافی اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔

"ہوں.... ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ اچھی بات ہے۔ کبھی کبھار کا آنا جانا ہی ٹھیک ہوتا ہے۔ جو تمہیں مناسب لگتا ہے تم وہی کرو۔ مناسب لگے تو جاؤ۔ نہ لگے تو نہ جاؤ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" انہوں نے اپنی طرف سے تیمور کو کھلی اجازت دے دی تھی کہ وہ جو جی چاہے، کر سکتا ہے۔

"تھینک یو بابا!" تیمور کافی ممنون ہوا۔

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتے، تیمور کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا تو اسکرین پہ ولید کا نام روشن نظر آیا۔ تیمور کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے لائن کاٹ دی۔

"ہاں تو بابا.... میں آپ سے کہنا چاہ رہا تھا کہ آپ آج ذرا جلدی آفس چلے جایئے گا۔ ایک دو ضروری کام رہ گئے ہیں۔ اپنی نگرانی میں کروائیں تو زیادہ بہتر رہے گا۔" وہ اپنا موبائل ٹیبل پہ رکھتے ہوئے دوبارہ ان کی طرف متوجہ ہوا۔ لیکن رضا حیدر کے کوئی جواب دینے سے پہلے ہی اس کا موبائل دوبارہ بجنے لگا۔

اس نے دوبارہ موبائل اٹھا کر دیکھا۔ اس مرتبہ بھی ولید کا نام ہی نظر آیا تھا اور تیمور نے دوبارہ کال منقطع کر دی۔

"کس کا فون ہے؟" رضا حیدر نے تیمور کو بار بار کال منقطع کرتے دیکھ کر پوچھ ہی لیا۔

"ولید کا...." تیمور نے مختصراً بتایا۔ ولید کے نام پہ عزت نے ایک دم چونک کر دیکھا۔ اس کی نظر بے ساختہ تیمور کے موبائل تک گئی۔ جہاں ولید رحمان کی کال تیسری بار بج رہی تھی اور تیمور اسے تیسری بار کاٹ رہا تھا۔ عزت کو اچنبھا ہوا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟

"تو سن لو نا بیٹا! وہ اتنی بار کال کر رہا ہے۔ بند کیوں کر رہے ہو؟" رابعہ بیگم نے اسے کال بند کرنے سے منع کیا۔

"سن لوں گا۔ فی الحال ٹائم نہیں ہے۔ مجھے جانا ہے فلائٹ کا ٹائم ہو رہا ہے۔" وہ گھڑی دیکھتا ہوا کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔ عزت بے چینی سے دیکھتی رہ گئی۔

"لیکن بیٹا! تم نے ناشتا تو کیا ہی نہیں؟"

"بس مام! جوس ہی کافی ہے۔ ناشتے کا موڈ نہیں ہو رہا۔" وہ ان کی طرف آیا اور ان سے ملنے کے بعد عزت کی طرف متوجہ ہوا۔

"اوکے سوئیٹی! میں چلتا ہوں۔ لیکن میری واپسی تک طبیعت اور موڈ فریش ہونے چاہئیں۔ ٹھیک ہے نا؟" اس نے اس کا سر تھپکتے ہوئے اس کے گھنگھریالے بال بکھیر ڈالے۔ وہ اس کے چھیڑنے والے انداز پہ بمشکل ہلکے سے مسکرائی۔

"اوکے۔"

"ہوں... گڈ۔" وہ مسکراتا ہوا پلٹا اور پھر رضا حیدر سے ہاتھ ملا کر سب کو خدا حافظ کہہ کر بریف کیس اٹھا کے باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

"اف... یہ لائٹ کب آئے گی؟ مجھے دیر ہو رہی ہے۔" ماورا کوفت کے مارے ادھر سے ادھر چکر کاٹتے ہوئے بجلی کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے یونیورسٹی جانا تھا۔ لیکن کپڑے ابھی استری نہیں ہوئے تھے۔

"رات کو جب لائٹ آئی تھی تو میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ کپڑے پریس کر لو۔ مگر مجال ہے کہ تم کسی کی بات پہ دھیان دو۔" عافیہ بیگم نے خفگی سے کہا۔

"امی! آپ کو پتا بھی ہے کہ میں اس وقت کمپیوٹر پہ بزی تھی۔ ایک ضروری کام نپٹانا تھا۔ اگر کپڑے پریس کرنے کے لیے اٹھ جاتی تو اتنے میں لائٹ بھی آف ہو جاتی۔" ماورا جھنجلا گئی۔

"افسوس کہ کبھی کبھی وقت پڑنے پہ دونوں ہی عقل سے کام نہیں لیتیں۔ عقل ہوتے ہوئے بھی بے عقلوں جیسی باتیں؟" بی گل نے اپنے سفید روئی سے بالوں میں کنگھی پھیرتے ہوئے انتہائی افسوس کا اظہار کیا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" ماورا ان کی سمت پلٹی۔

"مطلب یہ ہے کہ جو نئے کپڑے سلوا کے رکھے ہوئے ہیں' وہ پہن جاؤ۔ کیا ضروری ہے کہ تمہیں انہی کپڑوں کو استری کر کے انہی کو پہن کے جانا ہے؟" بی گل نے انہیں اپنی عقل سے مشورہ دیا۔ اور ماورا ٹھٹک گئی۔

"ارے واہ بی گل! کیا کمال کا حل نکالا ہے آپ نے۔ مجھے اپنا نیا سوٹ تو یاد ہی نہیں تھا۔" ماورا حیرت اور خوشی کا اظہار کرتی اندر کمرے کی طرف بھاگی بی گل مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا کے رہ گئیں۔

اور تھوڑی دیر بعد ماورا وائٹ اور گرے امتزاج کے سوٹ میں ملبوس سادگی سے تیار ہو کر باہر نکل آئی۔ لیکن اسے دیکھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھتی عافیہ بیگم کے قدم ٹھٹک کر رک گئے۔ ماورا کی سادہ سی تیاری پہ بھی ان کی نظریں ٹھہر سی گئی تھیں۔ کیونکہ وہ اتنی سادگی کے باوجود بھی بہت خوب صورت اور پرکشش لگ رہی تھی۔ ان کا دل سہم سا گیا۔ شاید اس لیے کہ ان کا دل ایک ماں کا دل تھا۔ سوچوں اور خدشوں سے لبریز۔

"لگتا ہے کہ آج کچھ زیادہ ہی اچھی لگ رہی ہوں۔ مخالف پارٹی کی نظر ہی نہیں ہٹ رہی۔" ماورا نے عافیہ بیگم

کی نظروں کی محویت نوٹ کرتے ہوئے بی گل کے قریب آکر شرارت سے اشارہ کیا۔ جس پہ عافیہ بیگم بھی چونک گئیں۔

"ہوں... لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔" بی گل بھی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکرائیں۔

"پھر یہ کہ اس صورت حال میں نظر اتاری جاتی ہے۔" بی گل نے پھر مشورہ دیا۔

"مخالف پارٹی جس نظر سے بھی دیکھے۔ لیکن پھر بھی مجھے نظر نہیں لگا سکتی۔ اس کا تو مجھے ہنڈرڈ پرسینٹ یقین ہے۔" ماورا نے پورے یقین سے کہا۔ عافیہ بیگم سر جھٹک کر اندر چلی گئیں۔

"لو جی... مخالف پارٹی تو منظر سے ہی ہٹ گئی۔ اس لیے بہتر ہے کہ اب مجھے بھی چلنا چاہیے۔" ماورا مسکراتی ہوئی اپنا بیگ اٹھا کے خود بھی اٹھ گئی۔ اس کے خدا حافظ کہنے کے بعد پیچھے ان دونوں نے ہی "فی امان اللہ" کہا۔

☼ ☼ ☼

آج اس کا موڈ بہت خوش گوار تھا اور اس کے موڈ کی یہ خوشگواریت یونیورسٹی پہنچنے تک اس کے ساتھ رہی تھی۔ لیکن یونیورسٹی پہنچتے ہی اس کی ساری خوشی اور تازگی ماند پڑ گئی۔ کیونکہ اس کی نظروں کے سامنے فارہ کا چہرہ تھا اور اس کے چہرے پہ سجی خوب صورت آنکھیں سرخ اور روئی روئی سی لگ رہی تھیں' جن کو دیکھتے ہی ماورا بھانپ گئی کہ ضرور محبت نے کوئی نیا ستم ڈھایا ہے یا کوئی نئی چال چلی ہے۔ لیکن ماورا نے پھر بھی استفسار کرنے سے گریز کیا اور معمول کی طرح پیش آئی۔

"ہیلو... کیسی ہو؟" ماورا اپنا بیگ گود میں رکھتے ہوئے اس کے قریب ہی سیڑھیوں پہ بیٹھ گئی۔

"ٹھیک ہوں... تم سناؤ کیسی ہو؟ بہت فریش' بہت پیاری لگ رہی ہو۔" فارہ نے اسے سر تا پا دیکھتے ہوئے تعریف کی۔

لیکن ماورا کو اس کی تعریف پہ خوشی نہیں۔ بلکہ اس کی آواز پہ حیرت ہوئی تھی۔ اس کی آواز کافی بھاری اور بوجھل ہو رہی تھی۔ صاف ظاہر ہو تا تھا کہ وہ کافی زیادہ روئی ہے۔ اتنا شدید کہ آنسو اس کی آنکھوں اور حلق میں خراشیں ڈال گئے ہیں۔

"تھینک یو... لیکن تم تو ایکسٹرا پیاری لگ رہی ہو۔ اتنی کہ بار بار دیکھنے کو دل چاہ رہا ہے۔" ماورا بہت کوشش کے باوجود بھی خود کو کچھ کہنے سے باز نہیں رکھ پائی۔

"ہاں... انسان جب تماشا بنتا ہے تو اسے اسی طرح بار بار دیکھنے کو دل چاہتا ہے۔" فارہ کے لہجے میں تلخی اتر آئی یوں جیسے وہ اپنا مذاق خود اڑا رہی ہو۔

"ہونہہ... انسان کی اپنی حرکتیں ہی اسے سب کے سامنے تماشا بناتی ہیں میری جان! ورنہ کس میں اتنی جرات ہے کہ وہ اتنی آسانی سے اٹھ کر آپ کو تماشا بنا دے۔" ماورا کا لہجہ طنزیہ اور تیکھا ہو گیا۔

"انسان کی حرکتیں اسے سب کے سامنے تماشا بناتی ہیں نا؟ لیکن مجھے تو محبت تماشا بنا رہی ہے۔ میں نے تو کوئی ایسی ویسی حرکت بھی نہیں کی... بس صرف محبت کی ہے۔" فارہ بے بس اور گلوگیر لہجے میں کہتے ہوئے پھوٹ پڑی اور آنسو رخساروں پہ بہہ آئے۔

"ہونہہ... بی گل کہتی ہیں کہ محبت سے بڑا مداری تو تمہیں پوری دنیا میں نہیں ملے گا۔ کوئی مر کے بھی اس مداری کے ہاتھ نہ لگے۔ کیونکہ اس کا بنایا ہوا تماشا دس' بیس لوگ نہیں۔ بلکہ پوری دنیا دیکھتی ہے۔ تماشا ایک

انسان بنتا ہے اور تماشائی پوری دنیا اور اس تماشا اور تماشائی کے بیچ مداری کون ہوتا ہے۔ محبت اور صرف محبت۔۔۔؟ محبت ایک ایسا مداری ہے، جو شیر، بندر، ہاتھی، گھوڑے سب کو نچالیتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان کو بھی۔۔۔ اور اس کا سب سے پہلا شکار انسان کا دل ہوتا ہے۔ جس کو نکیل ڈال کر وہ اپنے تماشے کے لیے تیار کرتا ہے۔ عجیب عجیب حرکتیں کرواتا ہے۔ طرح طرح کے کرتب سکھاتا ہے۔ شیر کی طرح بہادر، بندر کی طرح چھچھورا اور ہاتھی کی طرح ضدی بھی بنادیتا ہے۔ رقص کرواتا ہے تو مور کی مانند۔۔۔ انسان کا دل اس کی ڈگڈگی کی لے پہ سدھائے ہوئے جانور کی طرح ناچتا ہے اور یہ مداری دل جیسے بے زبان جانور کو ناچتے ناچتے ایک دم سے پلٹا کھالینا بھی سکھادیتا ہے۔ جس پہ کچھ تماشائی حیران ہوتے ہیں اور کچھ تماشائی خوش ہوتے ہیں اور میں حیران ہونے والے تماشائیوں میں سے ہوں۔ کیونکہ میں اس بات پہ حیران ہوں کہ آفاق یزدانی نے یہ پلٹا کیوں کھایا ہے؟ کیوں ناچتے ناچتے ایک دم سے پلٹ گیا ہے؟"

ماورا کی بات پہ فارہ دم بخود سی رہ گئی تھی۔ کیونکہ اس کی بی گل نے ٹھیک ہی تو کہا تھا۔ لفظ لفظ سچ اور حقیقت۔۔۔ محبت واقعی کسی مداری سے کم تو نہیں تھی۔

"اور ہاں۔۔۔ بی گل نے یہ بھی کہا تھا کہ اس مداری کے کسی اچھے اور دل موہ لینے والے کرتب یا تماشے پہ خوش ہو کر کسی موج میں اپنی رسی اس کے ہاتھ میں مت تھمادینا۔ ورنہ وہ ناچ نچائے گا کہ زمانہ دیکھے گا اور تمہیں اس ناچ اور اس مداری کے سوا کچھ یاد نہیں رہے گا۔ یہ بھی بھول جاؤ گی کہ تم تماشا بن چکی ہو اور دنیا تماشائی۔" ماورا نے کہتے ہوئے فارہ کے چہرے کی سمت دیکھا۔ وہ کسی دکھ کی گہری اور دبیز تہہ تلے دبی گم صم سی پتھر ہوئی بیٹھی تھی۔

"اور میں نے پتا ہے بی گل سے کیا پوچھا؟" ماورا نے اپنی بات کا سلسلہ جاری رکھا۔

"میں نے پوچھا۔ بی گل۔۔۔ اگر کوئی نادانی یا بے دھیانی میں اپنی رسی اس کے ہاتھ میں تھما ہی بیٹھے تو؟" وہ ذرا توقف کے لیے ٹھہری۔

"تو پتا ہے پھر بی گل نے کیا کہا؟" ماورا تو جیسے اسے کوئی قصہ سنا رہی تھی۔

"انہوں نے کہا کہ پھر تو اس کا اللہ ہی حافظ ہے اور آج تمہیں دیکھ کر مجھے لگ رہا ہے کہ انہوں نے واقعی ٹھیک کہا تھا۔ تمہارا بھی اللہ ہی حافظ ہے۔ کوئی اور کچھ نہیں کر سکتا۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ مجھے اب چلنا چاہیے۔ کلاس کا ٹائم ہو رہا ہے۔ البتہ تم ابھی یہیں بیٹھو۔ ہو سکتا ہے کوئی اور بھی تماشا دیکھنے کے لیے آجائے۔" ماورا اپنی کلائی پہ بندھی گھڑی سے ٹائم دیکھتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ کیونکہ پہلی کلاس شروع ہونے میں بس چند ہی منٹ رہ گئے تھے۔

"اور میں یہ سب مذاق میں نہیں کہہ رہی۔ سیریسلی کہہ رہی ہوں۔ یہ رونی صورت لے کر غم کا اشتہار بنی یوں بیچ راستے میں بیٹھو گی تو تماشا ہی بنوگی۔ اس لیے بہتر ہے کہ کسی اور جگہ کا انتخاب کرلو۔ اوکے! سی یو لیٹر۔" ماورا طنزیہ لہجے میں کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔

فارہ کا دل چاہا کہ چیخ چیخ کر روئے اور پوری دنیا کو اکٹھا کرلے اور اپنی ذات کا خود ہی تماشا بنادے۔ لیکن افسوس کہ وہ ایسا بھی نہیں کرسکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ ایئرپورٹ سے نکل کر ابھی باہر لاؤنج میں آیا ہی تھا کہ حیران رہ گیا تھا۔ اس کے عین سامنے ہی حماد کھڑا تھا۔

تیمور حیران ہوا کہ وہ اسے ریسیو کرنے کے لیے آیا ہے۔

"السلام علیکم! کیسے ہیں جناب؟" حماد نے قریب آتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"وعلیکم السلام! تم یہاں کیسے؟" تیمور نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

"کیوں؟ کیا میں دہشت گرد ہوں، جو یہاں ایئرپورٹ پہ نہیں آسکتا۔" جواباً حماد نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

"ارے نہیں یار۔۔۔ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میرے یہاں آنے کا تو کسی کو بھی پتا نہیں تھا۔" تیمور نے اپنی حیرانی کی وجہ بتائی تھی۔

"بے شک پتا نہیں تھا۔ لیکن ہماری سورس بھی بہت دور تک ہے جناب۔" حماد پُرمعنی اور مبہم سے انداز میں مسکرایا۔

"کیا مطلب ہے؟ کیا ساشا نے۔۔۔" تیمور نے بے ساختہ پوچھا۔ جس پہ حماد بھی بے ساختہ ہی قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"ہاہاہا۔۔۔ "بالکل کریکٹ پہنچے ہو یار۔۔۔ کراچی میں میری سب سے بگ اینڈ فاسٹ سورس وہی تو ہے۔" حماد کافی محظوظ ہوا۔

"امیزنگ یار۔۔۔ اتنی شان دار سورس۔۔۔" تیمور خاصا متاثر ہوا۔

"تمہیں کیا پتا یار! کتنے فائدے ہیں اس چیز کے۔" وہ تیمور کی حیرانی انجوائے کرتا اس کے ساتھ چلتے ہوئے پارکنگ کی سمت بڑھا۔

"کس چیز کے؟"

"یہی منگنی اور محبت وغیرہ کے۔" حماد بڑے سکون میں تھا۔

"ہاہاہاہا۔ منگنی اور محبت وغیرہ کے۔" اب ہنسنے کی باری تیمور کی تھی۔

"کیوں؟ تم کیوں ہنس رہے ہو؟ میں نے کچھ عجیب کہہ دیا کیا؟" حماد کو اس کے ہنسنے پر حیرت ہوئی۔

"عجیب نہیں، بلکہ بہت عجیب۔" تیمور مسکرا رہا تھا۔

"وہ کیسے؟" حماد نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"وہ ایسے کہ منگنی اور محبت وغیرہ کے کتنے فائدے ہیں۔۔۔ یہ سب بابا مجھے چند روز پہلے ہی بتا چکے ہیں۔ بلکہ گنوا چکے ہیں اور میرا ان فوائد وغیرہ سے فیض یاب ہونے کا فی الحال کوئی ارادہ نہیں ہے۔۔۔ اور نہ ہی کوئی خواہش ہے۔" تیمور نے کندھے اچکائے۔

"بہت بورنگ انسان ہو یار۔۔۔! اچھے بھلے ہینڈسم اور شاندار پرسنالٹی والے بندے کو کم از کم ایسا بھی نہیں ہونا چاہیے۔" حماد منہ بناتے ہوئے گاڑی کا لاک کھولنے لگا۔

"نہیں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔۔۔!" تیمور بے حد مطمئن تھا۔

"ہونہہ۔۔۔ بورنگ۔۔۔" حماد منہ ہی منہ میں کہتا ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گیا۔ جبکہ تیمور وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔

"اب بیٹھو ناں۔۔۔ باہر کیوں کھڑے ہو؟" حماد گاڑی اسٹارٹ کرتے کرتے رک گیا۔

"لیکن یار! میں نے گاڑی بک کروا رکھی تھی۔" تیمور نے اپنا مسئلہ بتایا۔ حماد گاڑی کی بکنگ کا سن کر اچھل کر گاڑی سے باہر نکل آیا۔

"واٹ؟ تم نے گاڑی بک کروا رکھی ہے؟ ہمارے شہر میں آکر ہمارے ہوتے ہوئے تم گاڑی رینٹ پہ لوگے؟" حماد کو شاک لگا تھا۔

"سوری یار۔۔۔! ایسی بات نہیں ہے۔ میرا خیال تھا کہ شاید آپ لوگ گھر پہ نہ ہوں۔ اس لیے میں خود ہی انتظام کروالیتا ہوں۔" تیمور نے بات سنبھالی۔

"کیوں...؟ ہم گھر پہ کیوں نہیں ہوں گے؟"

"یہی کام وغیرہ کے سلسلے میں..." تیمور کو صفائی دینا پڑ گئی۔

"ہونہہ... کیا خوب کہی تم نے بھی... ہم اگر گھر پہ نہیں ہوں گے تو کیا ممی یا فارہ بھی گھر پہ نہیں ہوں گی؟ تم ممی کو فون کر کے بتا دیتے کہ تم فیصل آباد آ رہے ہو۔ وہ تمہیں گاڑی بھیج دیں یا پھر میرے لیے پیغام ہو دیتے۔ یہ بھی کوئی طریقہ ہے بھلا... ؟ خود ہی گاڑی بک کروالی۔" حماد کو کافی برا لگا تھا۔ جس پر تیمور نے دوبارہ سوری کیا۔

"او کے او کے سوری یار... ! میں گاڑی کی بکنگ کینسل کروا دیتا ہوں۔" تیمور نے کہتے ہوئے اپنے موبائل سے نمبر ڈائل کیا اور گاڑی کی بکنگ کینسل کروا دی۔ پھر حماد کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ تب جا کے حماد کا موڈ کچھ بہتر ہوا تھا اور اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

✲ ✲ ✲

ماورا کلاس اٹینڈ کرنے کے بعد سیدھی فارہ کے پاس آئی تھی۔ فارہ کو ہنوز وہیں جوں کا توں بیٹھے دیکھ کر اس نے اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیں۔

"چلو! اب اٹھو یہاں سے... آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔" ماورا نے ذرا سا جھکتے ہوئے اس کی کلائی پکڑی اور اسے اپنے سامنے کھڑا کر دیا۔

"چلو... !" ماورا نے اسے چلنے کا اشارہ کیا اور وہ اس کے ساتھ چلنے لگی۔ ماورا کا رخ کینٹین کی طرف تھا اور اس کے ساتھ ساتھ فارہ کا بھی...

"بیٹھو... !" ماورا نے خود ہی آگے بڑھ کے اس کے لیے کرسی کھینچ کے اسے بیٹھنے کے لیے کہا اور وہ چابی کی گڑیا کی طرح اس کے اشارے پہ ہی کرسی پہ بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد ماورا ویٹر کو آرڈر دینے کے بعد فارغ ہو کر کافی فرصت سے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"ہاں! اب بولو... کیا ہوا ہے؟ کیوں تماشا بنی بیٹھی ہو... ؟" ماورا کی نظریں فارہ کے چہرے پہ تھیں۔

"رات کو اس کا فون آیا تھا۔" فارہ کی آواز بے حد دھیمی تھی۔

"کس کا فون؟" ماورا نے کافی سنجیدگی سے استفسار کیا۔

"اسی کا، جو محبت میں غلام نہیں ہو سکا۔" فارہ کی کیفیت بہت عجیب سی ہو رہی تھی۔

"کیا کہنے کے لیے؟" ماورا نے بے چینی سے پوچھا۔

"یہی کہ میں معذرت خواہ ہوں۔" فارہ کے لہجے میں تلخی اور نمی کی آمیزش گھل رہی تھی۔

"معذرت خواہ؟ مگر کس لیے؟" ماورا الجھ سی گئی۔

"محبت میں غلام نہ ہونے کے لیے۔" وہ بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کر رہی تھی۔

"مطلب...؟" ماورا اٹھکی...

"مطلب یہ کہ وہ کسی بھی طور میرا غلام نہیں ہو سکتا۔ نہ مجھ سے محبت کر کے۔ نہ مجھ سے شادی کر کے۔ اس لیے وہ فون کر کے معذرت خواہ ہو رہا تھا۔" وہ نجانے کیسے خود پہ ضبط کیے بیٹھی تھی اور اس کی باتوں کے جواب دے رہی تھی۔

"اوہ... ! تو پھر تم نے کیا کیا؟ اس کی معذرت قبول کر لی؟ بخش دیا اسے؟" ماورا کا لہجہ اور انداز بدل چکا تھا۔

"اس نے میری محبت قبول نہیں کی۔ میں اس کی معذرت کیسے قبول کر سکتی ہوں بھلا؟ بخش دینا آسان تو نہیں بخشنے میں بھی کچھ وقت لگتا ہے۔"

فارہ نے اپنے آنسو چھپانے کے لیے ایک دم پلکیں جھکا لیں۔

"یعنی مستقبل میں بخش دو گی؟" ماورا کا انداز تمسخرانہ تھا۔

"تو اور کیا کروں؟ کیا سزا دوں اسے؟ اس نے نہ سہی میں نے تو محبت کی ہے نا؟ دو سال محبت کی ہے اس سے... اور اب یہ دو سال کی محبت تیسرے سال میں نظر آنے لگی ہے سب کو۔ اس کے گھر والوں کو بھی اور میرے گھر والوں کو بھی... اس دو سال کی محبت میں وہ میرا غلام نہیں بن سکا۔ لیکن میں تو اس کی کنیز بن چکی ہوں نا؟ اور میں تو وہی کروں گی نا، جو وہ کہے گا۔ آخر میں اس کی کنیز جو ٹھہری۔" فارہ روتے روتے جذباتی ہو گئی اور اس جذباتی پن میں اس کی آواز اتنی بلند ہو چکی تھی کہ آس پاس کی میزوں پہ بیٹھے اسٹوڈنٹس بھی ان کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔

"مزید تماشا مت بنو فارہ... ! سب دیکھ رہے ہیں۔" ماورا نے اسے دبے لہجے میں تنبیہہ کی۔

"تماشا بن چکا ہے ماورا... تماشا بن چکا ہے۔ اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ سب دیکھ رہے ہیں... اور یہ بھی جانتی ہوں کہ ابھی اور بھی بہت سے لوگ دیکھیں گے۔" اب کی بار وہ بمشکل خود پہ قابو پاتے ہوئے گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔

"دیکھو فارہ! میرا خیال ہے کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تمہیں اس وقت گھر جانا چاہیے۔" ماورا نے اس کی حالت کے پیش نظر اسے وہاں سے بھیجنا چاہا۔

"نہیں... ! میں ٹھیک ہوں اب... بس! تم مجھ سے اس ٹاپک پہ کوئی بھی بات مت کرو۔ مجھے جتنا رونا تھا، رو لیا۔ اب اور نہیں۔" فارہ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے رگڑ رگڑ کر آنسو پونچھتے ہوئے ایک گہری سانس کھینچی اور محض چند لمحوں میں ہی خود کو سنبھالنے کی ایک کامیاب کوشش کی۔

اور پھر واقعی باقی کا پورا دن ان دونوں کے درمیان دوبارہ اس موضوع پہ کوئی اور بات نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے باقی کا دن قدرے اچھا گزر گیا۔ انہیں چار بجے یونیورسٹی سے فارغ ہونا تھا تو وہ دونوں گیٹ سے باہر نکل آئیں۔

"آؤ! میں تمہیں ڈراپ کر دیتی ہوں۔" فارہ نے گیٹ سے نکلتے ہی اسے پیش کش کی۔

"نو تھینکس یار! مجھے ابھی مارکیٹ جانا ہے۔" ماورا نے نفی میں سر ہلایا۔

"مارکیٹ؟" فارہ نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ہوں... ! وہ دراصل مجھے موبائل سیٹ اور سم کارڈ لینا ہے۔" ماورا نے کافی نارمل سے انداز میں بتایا تھا لیکن فارہ کو حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

"رئیلی؟ تم موبائل لے رہی ہو؟"

"آف کورس یار! بتایا تو ہے۔"

"لیکن یار... ! مجھے یقین نہیں آ رہا۔ آنٹی نے تمہیں اجازت کیسے دے دی؟" فارہ حد سے زیادہ حیران تھی۔

"میں نے موبائل لینے کے لیے ان سے اجازت نہیں لی۔ بلکہ انہوں نے خود مجھ سے کہا ہے کہ تم موبائل لے لو۔" ماورا نے اسے مزید حیران کیا۔

"حیرت کی بات ہے یار! یہ سب کیسے ہو گیا؟" فارہ کو ماورا کے موبائل لینے کا سن کر جہاں بے حد حیرت ہوئی تھی، وہیں بے انتہا خوشی بھی ہوئی تھی۔ کیونکہ اس کی ایک ہی تو دوست تھی اور اس کے پاس بھی موبائل کی سہولت موجود نہیں تھی۔

"کب ہوا؟ کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟ یہ تو نہیں پتا۔ بس ہو گیا ہے۔ اتنا ضرور جانتی ہوں۔" ماورا نے کندھے اچکائے۔

"او کے او کے۔۔۔! جو بھی ہوا ہے اچھا ہوا ہے تم بس جاؤ اور موبائل لے آؤ اور سم کارڈ ایکٹیویٹ کرتے ہی مجھے میسج کر کے بتا دینا۔" قارہ نے فوراً اس کا راستہ چھوڑ دیا۔ اور بے ساختہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

ساڑھے پانچ وہ میٹنگ سے فارغ ہو کر میٹنگ ہال سے باہر نکلا ہی تھا کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔

"ہیلو۔۔۔!" کال کرنے والا حماد تھا۔ اس لیے اس نے فوراً کال ریسیو کی۔

"میٹنگ ختم ہوئی؟" حماد کو کسی کام سے جانا پڑ گیا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کا دھیان تیمور کی طرف ہی تھا۔ اسے اسی کی فکر ہو رہی تھی۔ اسی لیے بار بار ایس ایم ایس اور فون کالز کر رہا تھا۔

"ہاں! ابھی فارغ ہوا ہوں۔" تیمور اس سے بات کرتا پارکنگ میں آ گیا۔

"ڈرائیور کو بھیجوں؟" حماد اپنی گاڑی بھی تیمور کے پاس ہی چھوڑ گیا تھا۔

"ارے نہیں یار! اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود ڈرائیو کر لوں گا۔" تیمور نے اسے منع کیا تھا۔

"تو پھر گھر پہنچ رہے ہو ناں؟"

"ظاہر ہے بھئی۔۔۔ اور کہاں جانا ہے؟" تیمور گاڑی کا دروازہ کھول کر بریف کیس فرنٹ سیٹ پہ رکھ کر خود ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گیا۔

"او کے۔۔۔! تو پھر میں بھی گھر ہی پہنچ رہا ہوں۔" حماد نے کہہ کر فون بند کر دیا۔ تیمور گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے روڈ پہ لے آیا۔

اجنبی شہر کی اجنبی سڑکیں اور اجنبی گاڑی کا اجنبی ماحول۔ اسے بہت عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ کیونکہ اس شہر کے باسیوں میں وہ خود بھی ایک اجنبی تھا۔

لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ اجنبی شہر چند لمحوں میں ہی اس کے لیے بہت خوب صورت، پُرکشش اور اپنے پن کا روپ دھار جائے گا اور اسے اس شہر، اس ماحول، اس گاڑی اور ان سڑکوں سے بھی رغبت ہو جائے گی۔

اس کی زندگی میں یہ شام سے پہلے کا وقت ٹھہر جائے گا۔

اس کی سوچوں کا جہان آباد ہو جائے گا اور وہ ان سوچوں سے فرصت کے لیے بھی ترسے گا۔۔۔ یا پھر یہ کہ اس حبس زدہ دن کا یہ تنگ اور قلیل وقت اس کی دنیا بدل کے رکھ دے گا۔

بہر حال جو بھی تھا۔ بس چند لمحوں کا دورانیہ اور ایک نظر کی بھول تیمور حیدر سے سب کچھ سمیٹ کر لے گئی۔

برسوں سے قید پنچھی اڑ چکا تھا۔۔۔ اور وہ خالی ہاتھ رہ گیا۔

ہوا بس اتنا تھا کہ اس کی گاڑی ٹریفک جام میں پھنس گئی تھی۔ کیونکہ اس روڈ پہ گندم سے لدا ٹرالر الٹ گیا تھا اور روڈ بلاک ہو چکا تھا۔ اس لیے اب اس روڈ پہ گاڑیوں کا ایک اژدحام جمع تھا۔

شہری اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھے راستہ صاف ہونے کے انتظار میں جھنجلا رہے تھے۔ کیونکہ ٹریفک کا اژدحام اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ اب نہ آگے کا راستہ سجھائی دے رہا تھا۔ نہ پیچھے کا۔ بس ہر طرف شور ہی شور سنائی دے رہا تھا۔

ایسے میں تیمور نے باہر کے ماحول سے آگاہ ہونے کے لیے ذرا کی ذرا گاڑی کا شیشہ نیچے کیا تھا اور اس کی نظر شیشے کی قید سے رہا ہوتے ہی آسمان تک جا پہنچی تھی۔ تیمور حیدر کو تو وہ آسمان کی مانند ہی لگی تھی۔

اپنی جگہ پہ قائم دائم، اٹل اور پُرسکون یوں جیسے دنیا اس کے نیچے، اس کے تابع تھی۔ کیونکہ اس کی شخصیت اور اس کی ذات کا غرور اس کے لاتعلق انداز سے ہی جھلک رہا تھا۔

اور تیمور حیدر ذرا فاصلے پہ کھڑی بس کی بڑی سی کھڑکی کی سمت دیکھتا رہ گیا تھا۔۔۔!

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

عنیقہ محمد بیگ

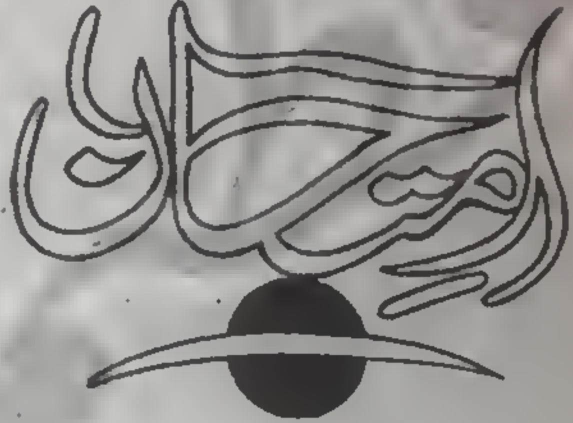

وہ گاڑی سے اتری، بلیو جینز اور پنک کلر کی کڑھائی والی قمیص میں وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ مگر اس کے چہرے سے خفگی جھلک رہی تھی۔ اس نے حویلی کے گیٹ کو اپنے نازک ہاتھوں سے کھولا۔ وہ کھلتا چلا گیا۔ اس نے گاڑی کی چابی چوکیدار کی طرف پھینکی اور سیدھی اندر چلی گئی۔ ہال میں نمو صفائی کروا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر گرم جوشی سے اس کی طرف بڑھی۔

"بی بی جی! آپ آ گئیں۔" اس نے نمو کی گرم جوشی کا کوئی جواب نہ دیا۔

"بابا سائیں گھر پر ہیں کیا؟" اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"بڑے سائیں جی اپنے کمرے میں ہیں۔"

عظمٰی ہال کے سامنے سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ نمو نے اسے پکارا۔

"بی بی جی۔۔۔" اس نے سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے مڑ کر غصے سے دیکھا۔ "کیا بات ہے؟"

"میں آپ کے لیے اورنج جوس لے آؤں؟" نمو اس کی خاص ملازمہ تھی۔ اسے اس کی پسند ناپسند کا اندازہ تھا۔

"ہاں۔۔۔" اس نے غصے سے جواب دیا اور سیڑھیاں چڑھ گئی۔

اس نے ایک گہری سانس لے کر خود کو نارمل کیا اور

دروازے پر دستک دی۔۔۔ شاہ احمد کی رعب دار آواز ابھری۔

"کون؟"

"میں۔۔۔ میں۔۔۔ عظمیٰ۔"

"اندر آجاؤ۔۔۔" شاہ احمد نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ کمرے میں داخل ہوگئی۔ وہ فون پر کسی سے بات کررہے تھے۔ انہوں نے اسے دیکھ کر فون بند کردیا اور اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ اب تک کھڑی تھی۔ وہ اس کے چہرے پر خفگی دیکھ کر مسکرائے اور نرمی سے بولے۔

"ہماری بیٹی کھڑے ہوکر بات کریں گی؟"

وہ ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی اور خفگی سے بولی۔ "آپ سب جانتے ہیں' پھر بھی۔۔۔ آپ نے ایسا کیوں کیا؟"

"آپ ہم سے لڑائی کی غرض سے آئی ہیں کیا؟" شاہ احمد مسکرائے۔

"آپ جانتے ہیں کہ میں کسی اور سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ پھر آپ نے اپنے بیٹے سے میری شادی کا اعلان کیوں کیا؟" اس نے غصے سے کہا۔

شاہ احمد سنجیدہ ہوگئے۔

شاہ احمد کو یوں لگا جیسے وہ ان کو احساس دلانا چاہتی ہو کہ وہ صرف طلحہ کے والد ہیں' اس کے نہیں۔

"طلحہ اگر میرا بیٹا ہے تو تم بھی میری بیٹی ہو۔ بے شک! تم مجھے باپ کی جگہ نہ دو۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر تمہاری بھلائی کے لیے یہ فیصلہ کیا ہے۔" شاہ احمد نے سنجیدگی سے کہا۔

"پلیز بابا۔۔۔ میرا کہنے کا مطلب وہ نہیں تھا۔" وہ اپنی غلطی پر شرمندہ ہوگئی۔ اس کے والدین کار حادثے میں انتقال کرگئے تھے۔ اس کے بعد شاہ احمد ہی اس کے لیے سب کچھ تھے۔

"میں فرید سے تمہاری شادی نہیں کرسکتا۔" وہ حتمی لہجے میں بولے۔

"کیوں۔۔۔ کیا کمی ہے فرید میں؟" اس کے لہجے میں تلخی آگئی۔

"جو کمی میں دیکھ رہا ہوں۔ شاید وہ تمہیں نظر نہیں آرہی۔"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔ اس میں ایک ہی کمی ہے نا کہ وہ غریب ہے۔۔۔ تو یہ بات میرے لیے اہمیت نہیں رکھتی۔"

اس سے پہلے شاہ احمد کچھ بولتے' نمو کمرے میں جوس لے کر آگئی۔

"یہ جوس لو۔" نمو جوس رکھ کر کمرے سے باہر نکل گئی تو شاہ احمد نے گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

"نہیں۔۔۔ مجھے نہیں پینا۔" وہ غصے سے بولی۔

"او کے۔۔۔ آپ کو فرید کی کمی بتادوں گا۔۔۔ تو آپ اس جوس کے گلاس پر رحم کریں گی؟" شاہ احمد نے پھر سے گلاس اس کی طرف بڑھا کر پوچھا۔

اس نے گلاس تھام لیا۔

"آپ کی پسند میں یہ کمی ہے کہ وہ آپ سے محبت نہیں کرتا۔" شاہ احمد نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"میں جانتا ہوں۔" وہ رعب سے بولے۔

"اچھا۔۔۔ مگر میں بھی جانتی ہوں کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہ آپ کی اور طلحہ کی چال ہے کہ میرے حصے کی جائیداد مجھے نہ دینی پڑجائے۔ اس لیے آپ فرید پر الزام لگارہے ہیں۔" اس نے لفظ چبا چبا کر ادا کیے۔

شاہ احمد کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔ چہرے پر شدید غصے کے آثار نظر آئے' پھر ضبط کرکے بولے۔

"آپ کی عقل اس وقت کام نہیں کررہی ہے۔ اپنے کمرے میں جائیے۔ میں آپ سے صبح بات کرتا ہوں۔"

وہ خاموشی سے ان کے کمرے سے نکل گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اس نے اپنے چچا کا دل دکھا دیا ہے جنہیں وہ بابا سائیں کہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

"کیا میں اندر آسکتا ہوں۔" طلحہ نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

"تم اندر آچکے ہو۔" اس نے خفگی سے جواب دیا۔

"میری کزن حویلی آئی ہے اور مجھے کسی نے اطلاع تک نہیں دی۔" وہ اس کے بیڈ کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"تمہیں نہیں پتا کہ مجھے یہاں بابا سائیں نے کس لیے بلوایا ہے۔" اس نے گھور کر پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ مجھے نہیں پتا۔۔۔ تمہارا تو ایم بی اے کا آخری سمسٹر چل رہا ہے نا؟" طلحہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"کیا تم نہیں جانتے کہ بابا سائیں نے ہم دونوں کی شادی کا اعلان کیا ہے؟" اس نے طلحہ کو گھورا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ یہ بات تو میں جانتا ہوں۔" وہ مسکرایا۔

"شٹ اپ!" وہ اس کے مسکرانے پر بولی۔

"تمہیں غصہ کس بات پر ہے۔۔۔ میرے مسکرانے پر۔۔۔ یا مجھ سے شادی کرنے پر؟" اس نے ڈریسنگ ٹیبل سے اس کے برش کو اٹھایا اور بالوں میں پھیرنے لگا۔

"میرا برش استعمال مت کرو۔" اس نے برش پکڑنے کی کوشش کی۔ طلحہ نے برش اپنی پیٹھ کے پیچھے کرلیا۔

"شادی ہورہی ہے کزن۔۔۔ اب یہ تیرا۔۔۔ میرا نہیں چلے گا۔" وہ مسکرایا۔

"میں تم سے شادی نہیں کرنے والی۔" وہ تڑپ کر بولی۔

"اوہو۔۔۔ تم اتنی زیادہ اپ سیٹ کیوں ہورہی ہو؟"

"میں اپنے یونیورسٹی فیلو سے محبت کرتی ہوں۔ پلیز تم شادی سے انکار کردو۔" اس نے منت بھرے لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟" اس کا چہرہ بجھ سا گیا۔

"ہاں۔۔۔ طلحہ۔۔۔ میں اور فرید۔۔۔" اس نے بات کو ادھورا چھوڑ دیا اور نظریں جھکا کر رونے لگی۔ طلحہ نے خود کو سنبھالا اور سنجیدگی سے پوچھا۔

"کیا بابا سائیں یہ بات جانتے ہیں؟"

"ہاں۔۔۔ وہ فرید کے متعلق جانتے ہیں۔ مگر انکار کررہے ہیں۔" اس نے روتے روتے بتایا۔

"کیوں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"میں نہیں جانتی۔" اس نے آنسو پونچھے۔

"میں بابا سائیں سے بات کرتا ہوں۔ تم فکر مت کرو۔" طلحہ نے کرسی سے اٹھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

عظمیٰ کی کب آنکھ لگی۔ یہ وہ نہیں جانتی تھی۔ اس کو نیند سے بیدار نمو کی دستک نے کیا۔

"بی بی جی! رات کے کھانے کا وقت ہورہا ہے۔ آپ کھانا کمرے میں کھائیں گی یا پھر سب کے ساتھ؟" نمو نے اردگرد پڑی چیزوں کو اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"کمرے میں لے آؤ۔" اس نے جمائی لے کر حکم جاری کیا۔

"بی بی جی! ایک بات بولوں؟" نمو نے سنجیدگی سے پوچھا۔ نمو گھر کی پرانی ملازمہ تھی۔ بچپن میں اس کی ماں اسے یہاں چھوڑ گئی تھی۔ وہ اس گھر کے فرد کی طرح تھی' ہر بات سے واقف۔

"بولو۔۔۔" عظمیٰ سمجھ گئی کہ وہ بابا سائیں کی بات کرے گی۔

"بی بی جی! بڑے سائیں آپ کو اپنی سگی بیٹی سے بھی زیادہ پیار کرتے ہیں۔"

"ہاں۔۔۔ میں جانتی ہوں۔ اس لیے میں انہیں چچا جان نہیں۔۔۔ بابا سائیں ہی پکارتی ہوں۔" عظمیٰ نے ان کی محبت کا اعتراف کیا۔

"بڑے سائیں۔۔۔ فرید کے لیے انکار اس لیے

کررہے ہیں کہ انہیں آپ سے زیادہ آپ کی دولت سے پیار ہے۔" نمو نے ڈرتے ڈرتے اسے سچ بتایا۔
عظمیٰ کے چہرے پر خفگی چھا گئی۔
"یہ وہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟"
"نہیں یہ غلام اکرم نے بتایا ہے۔" نمو نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔
"کیا...؟" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "اس کا مطلب ہے کہ بابا سائیں نے فرید کی جاسوسی کروانی بھی شروع کردی۔"
"بی بی جان... ہم غریب لوگ ہیں۔ آپ یہ بات شاہ احمد تک نہ پہنچانا۔ وہ ہم دونوں بہن بھائی کو واپس گاؤں بھیج دیں گے۔" نمو نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ نمو کے یوں ہاتھ جوڑنے پر وہ سنبھلی اور بولی۔
"پلیز نمو... بیٹھو اور غلام اکرم جو خبر لے کر آیا ہے مجھے وہ بتاؤ۔"
"وہ فرید صاحب نے صرف دولت کی وجہ سے آپ کے ساتھ میل جول رکھا ہے۔" نمو نے نظریں جھکا کر ڈرتے ڈرتے بتائی۔
"اچھا... تو غلام اکرم نے بابا سائیں کے کان بھرے ہیں۔" اس نے کچھ سوچ کر زبان کھولی۔
"نہیں بی بی جی... غلام اکرم نے جو سنا، جو دیکھا اس نے وہی بتایا ہے۔" نمو نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔
"اچھا... ٹھیک ہے۔ میں خود دیکھتی ہوں۔ تم میرا کھانا لے آؤ۔" وہ بستر سے اٹھ کر باتھ روم کی طرف بڑھی۔
"بی بی جی... میں بہت غریب ہوں اور یہ حویلی ہی ہم دونوں کا آسرا ہے۔"
"نمو! تم فکر مت کرو۔ تم پر اور غلام اکرم بھائی پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔" وہ یہ کہہ کر باتھ روم میں گھس گئی اور نمو کو پریشان کر گئی۔
اس نے تھوڑے سے چاول کھائے اور پھر اپنی پیاری دوست بینش کو فون ملایا۔ تیسری بیل پر اس نے فون اٹھالیا۔
"ہیلو... عظمیٰ! تم کہاں ہو؟" وہ بے چینی سے بولی۔
"حویلی..." عظمیٰ نے افسردگی سے کہا۔
"کیوں... وہاں کیوں؟ اور تم اطلاع دے کر بھی نہیں گئیں۔ ایسی بھی کیا ایمرجنسی تھی؟" بینش نے خفگی سے پوچھا۔
"بس بینش! میں بہت اپ سیٹ ہوں۔"
"کیوں کیا ہوا ہے؟ کیوں اپ سیٹ ہو؟" بینش چونکی۔
"بابا سائیں نے میری شادی طلحہ سے طے کردی ہے۔" اس نے بے زاری سے بتایا۔
"کیا... طلحہ سے...؟ اور فرید... فرید کو اس بات کا علم ہے کیا؟"
"نہیں! میں نے فرید سے کوئی بات نہیں کی۔ میں اسے اپ سیٹ نہیں کرنا چاہتی۔" اس کی آواز میں نمی بھر آئی۔
"تم بابا سائیں کو اپنی پسند بتاؤ۔" بینش نے اسے مشورہ دیا۔
"وہ میری پسند جانتے ہیں۔ مگر مان نہیں رہے۔ بابا سائیں یہ سمجھتے ہیں کہ فرید مجھ سے نہیں۔ بلکہ میری دولت سے محبت کرتا ہے۔ جبکہ وہ تو جانتا تک نہیں کہ میں کس خاندان سے ہوں۔" اس نے افسردگی سے کہا۔
"یار! تم بھی تو فرید کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں تم دونوں کو ملے ہوئے ابھی چھ ماہ ہی تو ہوئے ہیں نا!" بینش نے محتاط انداز میں کہا۔
"ہاں... میں اس کی فیملی کے بارے میں نہیں جانتی۔ مگر اس کو تو جان چکی ہوں کہ اس کے نزدیک دولت کوئی معنی نہیں رکھتی۔" اس نے غصے سے کہا۔
"میں فرید کے متعلق کچھ معلومات حاصل کروں؟" بینش نے پوچھا۔
"نہیں... مجھے خود کچھ کرنا چاہیے۔" وہ پر اعتماد ہو کر بولی۔

"کیا کروگی؟" بینش نے حیرت سے پوچھا۔
"دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کروں گی۔"
"میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔" بینش نے گہری سانس لے کر کہا۔ پھر عظمیٰ نے ادھر ادھر کی باتیں کر کے فون رکھ دیا۔

☆ ☆ ☆

رات کے ایک بجے اس نے فرید کو فون کیا۔ وہ خفا تھا کہ وہ اس سے مل کر کیوں نہیں گئی۔
اس نے اپنے یوں اچانک گھر لوٹ آنے کی اپنی مجبوری بتائی تو وہ گھبرا کر بولا۔
"سب ٹھیک ہے نا؟" عظمیٰ نے گہری سانس لی اور سنجیدگی سے بولی۔ "فرید! میں تمہیں اپنی زندگی کا ایک سچ بتانا چاہتی ہوں۔ اس کے بعد شاید ہم دونوں کوئی بہتر فیصلہ کر پائیں۔"
"کیسا سچ؟" فرید گھبرا کر بولا۔
"میں شاہ احمد کی رشتے میں بھتیجی نہیں ہوں۔"
اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ فرید کہہ دے کہ اس سے اسے کیا فرق پڑتا ہے۔
لیکن فرید نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ اس نے تابڑ توڑ کئی سوالات کر ڈالے۔
"پھر تم کون ہو؟ اور ان کے ساتھ تمہارا کیا رشتہ ہے؟ اس خاندان کا نام تمہارے ساتھ کیسے ہے؟ پھر تم ان کی گاڑی بھی تو استعمال کرتی ہو۔"
اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نمو کی چھوٹی بہن ہوں اور بی بی جی کی عنایت ہے تو ان کے کپڑے اور گاڑی وغیرہ استعمال کرلیتی ہوں۔ مجھے پڑھنے کا شوق تھا اس لیے بی بی جی نے مجھے پڑھنے کی اجازت دی اور تمام اخراجات بھی وہی اٹھا رہی ہیں۔" یہ سب کہتے ہوئے عظمیٰ کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔
"مگر... ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ یونیورسٹی کے سب دوست تمہیں، شاہ احمد کی بھتیجی کے طور پر جانتے ہیں۔" اس نے گھبرا کر پوچھا۔
"ہاں! میرے کچھ خاص دوستوں ہی کو یہ سچ معلوم ہے۔ باقی سب لوگ تو یہی سمجھتے ہیں کہ میں شاہ احمد کی بھتیجی ہوں۔"
"کیا... میں جان سکتا ہوں کہ وہ خاص دوست کون ہیں؟" فرید نے پوچھا۔ اس کا دل ڈوبتا جارہا تھا۔
"بینش کو پتا ہے اور بھی کئی لوگ ہیں۔" اس نے اپنے آنسوؤں پر قابو پایا۔ وہ تو یہ سمجھ رہی تھی کہ اس کے یوں کہنے پر وہ تمام بات ختم کردے گا کہ ایسے اس کے خاندان سے کوئی غرض نہیں وہ صرف اس سے محبت کرتا ہے۔
"کیا... یہ سب جاننے کے بعد بھی تم مجھ سے شادی کرسکتے ہو؟" وہ افسردگی سے بولی۔
"ہاں... ہاں... ہاں...!" فرید نے دوسری طرف سے بوکھلا کر جواب دیا۔
"ٹھیک ہے! میں کورٹ میں تمہارا انتظار کروں گی۔" فرید نے "ہاں ہاں" کر کے فون رکھ دیا۔ مگر اس

کی آواز میں وہ پہلے جیسی گرم جوشی نہ تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم پاگل ہوگئی ہو کیا؟ اگر وہ مان گیا تو اسی وقت تمہیں نکاح کرنا پڑے گا۔ میں بابا سائیں کو کیا جواب دوں گا۔" طلحہ نے فکر مندی سے کہا۔ اسے عظمیٰ نے صبح تمام بات بتائی تھی اور اب اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہہ رہی تھی۔

"میں اس کی حقیقت جاننا چاہتی ہوں۔ اگر تم میری مدد نہیں کرسکتے تو میں اکیلی چلی جاتی ہوں۔" اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور غصے سے نکل گئی۔

طلحہ فکر مندی سے اس کی طرف لپکا۔ "کزن رکو!" وہ گاڑی میں بیٹھنے والی تھی کہ طلحہ نے ڈرائیونگ سیٹ پر اپنا قبضہ جمایا۔ وہ دوسری سیٹ پر پرسکون ہوکر بیٹھ گئی۔

گاڑی چل رہی تھی۔ عظمیٰ آنکھیں بند کیے سوچوں میں ڈوبی بیٹھی تھی۔ تب ہی اس کا فون بج اٹھا۔ بینش کا نمبر دیکھ کر اس نے اٹھایا۔ دوسری طرف بینش گھبرائی ہوئی تھی۔

"ہیلو... عظمیٰ! فرید ہر کسی کو فون کرکے تمہاری اصلیت پوچھ رہا ہے۔ میں نے تمہارے کہنے پر سب کو جھوٹ بولنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ اس نے مجھ سے بھی سچ جاننے کی کوشش کی تھی۔ میں نے بھی وہی کہا۔ جس طرح تم نے سمجھایا تھا۔" بینش کو فرید کی ذہنیت پر دکھ ہو رہا تھا۔

اس نے فون بند کردیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

"کیا ہوا؟" طلحہ نے پوچھا۔

"فرید ہر کسی کو فون کرکے میرے متعلق دریافت کر رہا ہے۔" وہ خود پر قابو پاکر بولی۔

"اوہ نو... حوصلہ رکھو۔ وہاں جاکر دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔" اس نے تسلی دی۔

پھر اس نے گاڑی کورٹ سے تھوڑی دور روکنے کو کہا۔

"تم یہیں ٹھہرو۔ میں اکیلے جانا چاہتی ہوں۔" اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور کورٹ کے اندر داخل ہوگئی۔

طلحہ فکر مند سا ہوگیا اور گاڑی میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

"وہ کورٹ نہیں پہنچا۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ وہ تم سے نہیں۔ بلکہ تمہاری دولت سے..." طلحہ نے غصے سے کہا۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ کورٹ سے نکلی تھی اور گاڑی میں بیٹھ کر اس نے طلحہ کو فرید کے گھر جانے کا کہا۔ جس پر وہ چیخ اٹھا۔

"میرے دل کو سکون نہیں آرہا۔ میں ایک بار اس کے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔" اس کی آواز میں نمی بھر آئی۔

طلحہ خاموش ہوگیا اور گاڑی کی رفتار تیز کردی۔ آدھے گھنٹے کے بعد اس نے گاڑی فرید کے گھر کے پاس روکی تو وہ تیزی سے اتر کر اس کے گھر میں چلی گئی۔

طلحہ خاموشی سے گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ وہ اس کو خوش دیکھنا چاہتا تھا' صرف خوش... محبت تو اس نے بھی عظمیٰ سے بے پناہ کی تھی۔ مگر وہ اس کی محبت کے لیے دعائیں مانگ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"تم..." وہ اسے دیکھ کے گھبرا سا گیا۔ عظمیٰ نے سنجیدگی سے کہا۔

"فرید! تم کورٹ نہیں آئے؟" فرید نے شرمندگی سے سر جھکالیا۔

"عظمیٰ! میں یہ شادی نہیں کرسکتا۔"

"کیوں...؟" وہ تڑپ کر بولی۔

"ہم دونوں شادی کرلیں گے تو ہمارا مستقبل کیا ہوگا؟"

"مگر تم ہی تو شادی کے لیے اصرار کر رہے تھے۔" اس نے چیخ کر کہا۔

"پہلے بات اور تھی۔" اس نے نظریں چرالیں۔

"پہلے کیا اور بات تھی؟" اس نے ایک گہری نظر فرید پر ڈالی۔

"دیکھو عظمیٰ...! تم سے شادی کرلوں گا تو ہمارا مستقبل کیا ہوگا۔ میں تو ابھی پڑھ رہا ہوں۔" اس نے تلخی سے بات کی۔

"تو تم صرف شاہ احمد کے نام کی وجہ سے مجھے اپنانا چاہتے تھے؟" وہ غصے سے چیخی۔

"نہیں... نہیں... میرا مطلب یہ نہیں تھا... مگر اگر ایسا ہوتا تو ہم بہت جلدی شادی کرسکتے تھے۔" اس نے عظمیٰ کا ہاتھ تھامنا چاہا۔

"پلیز... مجھ سے دور رہو۔ تم نے صرف دولت کی خاطر مجھ سے دوستی کی اور شادی بھی تم اپنے روشن مستقبل کے لیے کرنا چاہتے تھے۔"

وہ بے زار ہوکر بولا۔ "دیکھو عظمیٰ! بچی مت بنو۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ زندگی میں محبت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔"

"مگر تم تو کہتے تھے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے؟"

"میں نے شاہ احمد کی بھتیجی سے محبت کی تھی۔ کسی بھکارن سے نہیں..." اس نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"اف خدایا... تو اس کا مطلب ہے کہ بابا سائیں نے تمہیں ٹھیک پہچان لیا تھا اور میں... میں..." اس کو رونا آنے لگا۔

"کیا مطلب...؟" فرید اس کی بات پر چونکا اور گھبرا کر بولا۔

"تو کیا تم سچ میں شاہ احمد کی بھتیجی ہو؟"

"ہاں! میں شاہ احمد کی بھتیجی ہوں۔ میں نے تمہاری اصلیت جاننے کے لیے جھوٹ بولا تھا۔"

فرید نے اس کا بازو تھام لیا اور گھبرا کر بولا۔ "نہیں... نہیں... میں واقعی تم سے محبت کرتا ہوں... پلیز! مجھے مت چھوڑ کر جاؤ۔" مگر وہ بازو چھڑا کر باہر نکل آئی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے طلحہ سے کہا۔

"چلو...!"

"کیا ہوا...؟" طلحہ نے پوچھا۔

"جو ہوا... اچھا ہوا..." اس نے سنجیدگی سے کہا۔

طلحہ نے مزید پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ گاڑی حویلی کی طرف جارہی تھی کہ اچانک عظمیٰ نے زبان کھولی۔

"مجھے حویلی نہیں جانا۔"

"کیا...؟" طلحہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"مجھے حویلی نہیں جانا..." اس نے پرسکون ہوکر کہا اور طلحہ کو تکنے لگی۔

اس نے حیرت سے پوچھا۔ "تو کہاں جاؤ گی۔" وہ پریشان سا ہوگیا۔

"تمہارے پاس پیسے ہوں گے کیا؟" اس نے اکڑ کر پوچھا۔

"نہیں... میں جلدی میں بٹوا لانا بھول گیا۔ کیوں پیسوں کی ضرورت ہے کیا؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"ہاں... پیسوں کی ضرورت ہے۔ بہت زیادہ پیسوں کی۔" اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"اس نے حیرت سے عظمیٰ کو دیکھا۔ جس کے چہرے سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ پرسکون ہے۔ طلحہ نے مسکرا کر پوچھا۔

"کہیں پیسے لے کر بھاگنے کا سوچ رہی ہو؟"

اس نے لبوں پر مسکراہٹ سجا کر کہا۔ "شادی کی شاپنگ دولہا کے پیسوں سے ہوتی ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ طلحہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"کزن... تم... سچ کہہ رہی ہو...؟" اس نے ہنس کر پوچھا۔

"ہاں..." وہ شرما سی گئی۔

طلحہ جو چند لمحے پہلے یہ سوچ رہا تھا کہ اس کے پاس عظمیٰ کی محبت نہیں تو اس کے پاس کچھ نہیں رہا۔ عظمیٰ کی "ہاں نے" اسے اک پل میں شہنشاہ بنا دیا۔ ورنہ وہ تو خود کو غریب سمجھ رہا تھا... محبت کا غریب۔ ☼

ارمایہ خان

اِک شام کہیں آباد ہوتی

کتنی برسوں بعد اس راہ نے میرے قدموں کی آہٹ سنی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا سڑک کا ہر پتھر آنکھ بن گیا ہو۔ ان لاتعداد ان گنت آنکھوں میں انتظار کی اذیت ختم ہونے کا اطمینان صاف دکھ رہا تھا۔ وہ آنکھیں جا بجا میرے وجود سے لپٹ رہی تھیں۔

میں بے اختیار رک گئی۔ گلی کے سرے پر موجود پرانا مکان میرا منتظر تھا۔ مدت بعد ایک آشنا نظر آیا تھا اسے میرا دل لپک کر سرخ اینٹوں کی بوسیدہ دیوار سے جا چمٹا جس پر کی گئی سفید اور زرد قلعی کی پرتیں جگہ جگہ سے جھڑ چکی تھیں۔

ڈرائیور کو گاڑی کے پاس رکنے کا کہہ کر میں آگے بڑھ گئی۔ اس پتلی سی گلی میں وہی پرانے مکانات کی لمبی سی قطار اخیر تک چلی گئی تھی۔ بچپن میں وہ گلی اس قدر طویل کیوں دکھتی تھی، جیسے کبھی پار نہ کی جا سکے گی اور اب...... میں سوچتی ہوئی ایک بار پھر اس مکان کو نظر بھر کے دیکھنے لگی۔

میرے آس پاس آوازوں کا ہجوم تھا۔ خالی گلی میں مجھے قدموں کے دوڑنے بھاگنے کی آواز ہمیر بھائی اور سبین کی ہنسی و کھلکھلاہٹ، ہمارے ناموں کی پکار، دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

یادوں کا بہتا ریلا میری آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب لے آیا۔ چہرہ تر ہونے لگا۔ ایک گہری سانس لے کر میں نے مزید آنسوؤں کو بہنے سے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے چہرہ صاف کیا اور بیل کی تلاش میں دروازہ کے ارد گرد دیکھا۔

چوکھٹ کے ساتھ بیل نظر آگئی مجھے۔ میں نے فوراً" ہی بٹن دبا دیا۔

ایک ایک پل جیسے رینگ رہا تھا، پھر دروازہ کی گڑگڑاہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ دروازہ کھولنے والا ایک دس، بارہ سال کا لڑکا تھا۔ میں نے غور سے نہیں سنا، اس نے مجھ سے کیا پوچھا۔ اور کچھ پوچھا بھی یا نہیں۔ میں نے بس جلد سے جلد اس گھر میں داخل ہونے کی اجازت چاہی تھی۔

"بیٹا! میں بیس سال بعد یہاں آئی ہوں۔ یہ میری نانی کا گھر تھا، کیا میں کچھ دیر کے لیے اندر آ کر اسے دیکھ سکتی ہوں؟"

"میں ابا سے پوچھ کر آتا ہوں۔" وہ اندر واپس چلا گیا۔

دہلیز پر کھڑے کھڑے میں نے مکان کی سوختہ جاں دیواروں کی طرف دیکھا۔ باہر گلی میں ریت اور ٹوٹی اینٹوں کے ڈھیر نے مجھ پر واضح کیا کہ اندرونی حصے میں مرمت کا کام چل رہا ہے۔ وہ بچہ دروازہ کھلا چھوڑ گیا تھا۔ میں نے دیکھا گھر میں جا بجا لکڑیاں، سیمنٹ کی بوری اور اینٹوں نے چلنے پھرنے کا راستہ روک رکھا تھا۔

جانے کیا کچھ توڑ دیا ہے؟

میں نے اپنے آپ کو ممکنہ تبدیلیوں کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنا چاہا، تاکہ مجھے افسوس نہ ہو۔ میں نے ایک ترکھان کو ہاتھ میں آرا لیے کھڑا دیکھا۔ وہ یقیناً" اس بچے کا باپ تھا، جو بہت غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے اندر آنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اس کا انداز خیر مقدمی تھا۔ سادہ لوح انسان میری آمد کی وجہ یقیناً" اپنے بیٹے کی زبان سے سن چکا تھا۔

"آجائیں باجی! اندر آجائیں، دیکھ لیں گھر۔"

اس دہلیز سے اندر قدم رکھتے ہوئے میں نے کچھ کہنا چاہا، پر کہہ نہیں پائی۔

"آپ یاسر صاحب کی کیا لگتی ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں...... میرے مرحوم ماموں نے یہ گھر انہیں بیچا تھا۔ دوست تھے ان کے۔" میں نے اپنی امی سے جو سنا تھا وہی کہہ دیا۔

"وہ تو جی اب ملک سے باہر ہوتے ہیں۔ جانے سے پہلے ہمیں یہ گھر بیچ دیا تھا انہوں نے۔"

"اچھا......" میں نے بے دھیانی میں سر ہلایا اور زمین کو دیکھنے لگی۔ میرے پیروں تلے اینٹوں کے فرش کی جگہ ماربل کی ٹائلز تھیں۔ شاید اسی لیے میرے

بچپن کی چاپ سنائی نہیں دے رہی تھی۔

میں نے سر اٹھایا۔ یہ وہ گھر تو نہیں تھا جہاں میری نانی رہا کرتی تھیں۔ انہوں نے سب کچھ توڑ پھوڑ دیا تھا۔ میں چپ چاپ ارد گرد کسی پرانے منظر کو تلاش کررہی تھی۔

"باجی! اس گھر میں کچھ تھا کیا؟" اس کے مبہم سوال کی گہرائی کو پل میں جالیا میں نے۔

"ہاں..." میرے جواب نے اسے خوف زدہ نہیں کیا تھا' نہایت عام سے لہجے میں پوچھنے لگا۔

"کبھی کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا اس نے؟" وہ شاید کوئی کہانی سننا چاہتا تھا' جو میرے پاس نہیں تھی۔

"نہیں..." میں نے مختصر جواب دیا۔

"محلے والے کہتے ہیں یہاں جنات کا بسیرا ہے۔ ہم نے کہا کوئی بات نہیں' جیسے ہم رہتے ہیں' وہ بھی رہ لیں گے۔" کوئی جواب دیے بغیر میں نے پکی سیڑھیوں کے اس موڑ کی جانب دیکھا' جہاں سے ہمیشہ کوئی جھانکتا محسوس ہوتا تھا میری نانی کو۔

اپنے آخری دنوں میں انہوں نے پہلی بار امی کو بتایا۔ جب وہ ان سے گھر آنے کے لیے اصرار کررہی تھیں۔ یہ ان کے انتقال سے ایک ہفتہ پہلے کی بات تھی۔

میری امی نے یقین دہانی کے بعد فون رکھ دیا۔ تب میں نے ان سے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"تمہاری نانی کا فون تھا۔ کہہ رہی تھیں مجھے اکیلے گھر میں ڈر لگتا ہے' ایسا لگتا ہے سیڑھیوں سے کوئی نیچے دیکھ رہا ہے' میں دیکھوں تو چھپ جاتا ہے۔"

مجھے ہلکا سا خوف محسوس ہوا۔ "آپ ان کے پاس چلی جائیں۔"

"بڑی باجی کا گھر نزدیک ہے' وہ کیوں نہیں چلی جاتیں امی جی کے پاس' میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔"

امی نے نہایت سخت جواب دیا تھا۔ ان سے مزید کچھ کہنا اگلے ایک گھنٹے تک بڑی خالہ کی برائیاں سننا ہوتا۔ میں خاموش ہوگئی۔

دو دن گزرنے کے بعد میں نے دوبارہ امی کو یاد دلایا' تب بھی انہوں نے گول مول جواب دے کر ٹال دیا۔

"پوچھوں گی تمہارے ابو سے۔" حالانکہ مسئلہ ابو کی اجازت کا نہیں' امی کی مرضی کا تھا۔ میں سمجھ گئی انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جانے اب کس بات پر ان کی ناراضی تھی نانی اور خالہ سے' جو ملنا جلنا ترک کیے بیٹھی تھیں۔ نانی تو اکثر فون کرلیتی تھیں پر بڑی خالہ سے بالکل ہی قطع تعلق تھا۔

ایک بار جب دونوں بہنیں نانی کے گھر اکٹھی ہوئی تھیں اور میری امی اپنے نئے ہیروں کا ہار فخریہ انداز میں سب کو دکھاتے ہوئے اس کی قیمت بتا رہی تھیں۔ تب بڑی خالہ نے شاید ازراہ مذاق انہیں نقلی ہیروں کا ہار کہہ دیا تھا۔ میری امی فوراً" غصے میں آگئی تھیں۔ انہوں نے بڑی بہن کا لحاظ کیا نہ اپنی ماں کا۔ ہمیں بلایا اور وہاں سے واپس آگئیں۔ بڑی خالہ نے بھی اپنی بات کی وضاحت کرنے کے بجائے ایک کی چار سنائی تھیں امی کو۔

یہ جھگڑا ہوئے دو سال ہوگئے تھے۔ نانی سے تو ملنے جاتے رہے ہم مگر خالہ سے ترک کردیا۔ نانی کے فون کے بعد مجھے یقین تھا کہ امی ضرور جائیں گی' لیکن پورا ہفتہ یوں ہی گزر گیا۔

پھر دوبارہ فون آیا اور امی ہمیں لے کر فوراً" نانی امی کے گھر چل پڑیں۔ اس بار نانی نے نہیں' ان کی پڑوسن نے فون کیا تھا' نانی کے انتقال کی خبر دینے کے لیے۔

ایک گہری سانس لے کر میں حال میں خود کو واپس لائی۔ "اب یہاں کچھ بھی نہیں ہے' آپ بے فکر رہیں۔"

"اچھا جی؟" وہ میری یقین دہانی پر اعتبار کرنے میں متامل ہوا۔

"جی ہاں... کچھ آسیب گھر والوں کے ساتھ ہی ختم ہوجاتے ہیں۔"

نانی امی کی تنہائی کا آسیب تو ان کے ساتھ ہی ختم ہوگیا تھا۔ بھلا وہ اس غریب آدمی کو کیا نقصان پہنچاتا۔ پتا نہیں وہ میری منطق سمجھ پایا یا نہیں۔ ہاں مگر سر بڑے زور سے ہلا دیا اس نے۔ میں دوبارہ اس کمرے کی طرف متوجہ ہوئی' جو سیڑھیوں کے ساتھ بنا ہوا تھا۔

"یہاں دو چھتی پر میرے نانا کی کتابیں رکھی تھیں۔" ادھر جانے کا جواز پیش کرتے ہوئے میں کمرے کے سامنے پڑی لکڑیوں کے ڈھیر کو پھلانگ کر اندر داخل ہوگئی۔ دو چھتی اب وہاں نہیں تھی' میرا دل بھر آیا۔

"اسے کیوں ختم کردیا؟" میں نے مڑ کر پوچھا' پھر فوراً" مجھے اپنے سوال کے احمقانہ ہونے کا احساس ہوا۔ وہ گھر بک چکا تھا۔ اس کی ملکیت تھا' چاہتا تو مکمل توڑ کر نئے سرے سے بناتا۔ مجھے کوئی حق نہیں تھا سوال کرنے کا۔

سختی سے لب بھینچ کر میں کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس نئی نکور اینٹوں کی دیوار کو دیکھنے لگی' جس نے گھر کو دو حصوں میں تقسیم کردیا تھا۔ "یہاں بھی تو ایک کمرا تھا۔"

"جی... یہ گھر دو حصوں میں بٹ چکا ہے باجی! ہم دو بھائیوں نے مل کر خریدا تھا۔"

تو نہ صرف ٹوٹ پھوٹ تھی' بلکہ بٹوارا بھی تھا۔ کاش یہ گھر نہ بکا ہوتا' میرا دل بھر آیا۔ ماموں نے نانی کی وفات کے بعد یہ گھر بیچ دیا تھا اور واپس پردیس جا کر بس گئے تھے۔ دس سال پہلے ان کا بھی انتقال ہوگیا تھا۔ میرا ننھیال تو جیسے تب ہی ختم ہوگیا تھا۔ بڑی خالہ سے امی کی بنتی نہ تھی۔ نانی کی وفات نے رہی سہی کسر بھی ختم کردی۔ ہم تو ان کی صورت بھی بھول چکے تھے۔ ویسے وہ بالکل نانی جیسی تھیں' صورت شکل اور باتیں بھی ویسی ہی۔ بس تھوڑی غصے کی تیز تھیں۔ کم تو ہماری امی بھی نہ تھیں۔

قدرے مایوسی کے عالم میں میں نانی امی کے کمرے کی طرف بڑھی۔ وہاں فقط ایک ہی دیوار بچی تھی۔ جس کے ساتھ ان کا نماز کا تخت بچھا تھا۔ اپنے گھٹنوں کی تکلیف کی وجہ سے وہ تخت پر نماز پڑھا کرتی تھیں۔ ہماری آنکھ تب کھلتی جب بیل بجنے کی آواز سنائی دیتی۔ امی کے دروازے کھولنے پر نانی امی اپنا سیاہ برقعہ اوڑھے ہاتھ میں حلوہ پوری کا تھیلا اور اسٹیل کے ڈول میں تازہ دہی لیے اندر آتی دکھائی دیتیں۔

"آجاؤ بچو!" ان کی پکار باورچی خانے سے ہمارے کانوں تک پہنچتی اور ہم بھاگتے ہوئے ان کے پاس پہنچ جاتے۔ وہ ہمیشہ ہمارے آنے پر یہ اہتمام ضرور کرتی تھیں۔ گرما گرم حلوہ پوری کے ساتھ تازہ دہی کی لسی' یخ ٹھنڈی اور میٹھی... میرے منہ میں ایک دم مٹھاس بھر گئی۔

باورچی خانے کی بیرونی دیوار میں آتش دان کے اوپر پکے سیمنٹ کا وہ گملا خالی پڑا تھا۔ یہاں موتیے کے پھول خوب آتے تھے' جب نانی زندہ تھیں۔

"سبین کاش! تم میرے ساتھ ہوتیں' ہم دونوں مل کر پرانی یادیں تازہ کرتے۔"

ایک گہری سانس لے کر میں نے وہ ٹھنڈک' وہ خوشبو خود میں سمونی چاہی' پر اس کا وجود تھا ہی نہیں۔ وہ خوشبو تو اس صحن میں تب تھی' جب نانی اور خالہ ہوا کرتی تھیں۔ ہم گرمیوں کی رات صحن میں کھلے آسمان تلے چارپائیاں ڈال کر لیٹتے تھے اور چار سو بھینی بھینی خوشبو رقص کرتی۔

سفید کھڑکھڑاتے سوتی کھیس کی خوشبو۔

گھرر گھرر کرتے کولر کی ٹھنڈی ہوا کے ساتھ بھیگے خس کی خوشبو۔

سفید موتیے اور چنبیلی کی مہک۔

اب تو فرش پر بکھرے تعمیراتی سامان کے نیچے دبی ہر یاد کھنڈر میں تبدیل ہوچکی تھی۔ میرا دل چاہا میں سب بکھیڑا ہٹا کر اس فرش پر بیٹھ جاؤں اور خوب روؤں۔ کتنے ٹکڑوں میں بٹ چکا تھا میرا وجود... اچانک ہی کھوکھلی ہوگئی تھی میں اندر سے... میرا بچپن' تو کبھی واپس نہیں آسکتا تھا۔ نہ آتا' پر وہ یادیں یوں برباد تو نہ ہوتیں' توڑی پھوڑی تو نہ جاتیں۔

میں نے احساس زیاں سے مغلوب ہو کر دوبارہ نانی امی کے کمرے کی جانب مڑ کر دیکھا۔ آدھے سے زیادہ گھر منہدم کیا جاچکا تھا۔ بچ رہنے والے در و دیوار میری جانب حسرت سے تکتے معلوم ہو رہے تھے۔ وہ مجھے پہچانتے تھے' میرا وجود ان کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اپنی

عمر کے کتنے برس میں نے ان کے درمیان گزارے تھے۔ ان کا حق تھا مجھ پر۔۔۔ مگر آج میں ان سے زیادہ بے بس کھڑی تھی۔

کاش! میں ان دیواروں کو گرنے سے بچا سکتی۔

بے چینی میرے جسم میں لہو بن کر دوڑنے لگی۔

آدھی سیڑھیاں چڑھ کر میں نے دیواروں میں بنے طاق کے اندر ہاتھ ڈالا‘ جہاں میں اپنی گڑیاں رکھ کر کھیلتی تھی۔ اس لمحے پھر وہ مجھے ٹوٹ کر یاد آئی۔ میرے چاروں طرف اتنی یادیں بکھر گئیں کہ مجھے قدم بڑھانا دشوار محسوس ہونے لگا۔ مگر میں رک نہیں سکتی تھی۔ اپنے قدموں تلے ہر یاد کو روندتی میں بقیہ زینہ طے کرنے لگی۔

چند لمحوں بعد میں چھت پر پہنچ گئی۔ ایک بار پھر میرا وجود آنکھ بن گیا۔ میں یک ٹک تب تک وہیں کھڑی بس دیکھے چلی گئی۔ جب تک میرا حوصلہ جواب نہ دے گیا۔ اس کے بعد میں نے رخ موڑ لیا۔ اب وداع لینے کا وقت آگیا تھا۔

بیس سال کے طویل عرصے بعد میں اس گھر میں پہلی بار آئی تھی اور اپنی زندگی میں شاید آخری بار۔

بہت دقت ہوئی مجھے دروازے سے باہر نکلنے میں۔۔۔ میرا وجود پیچھے رہ جانے والی ہر یاد سے الجھا پڑا تھا۔

میں اگرچہ اس گھر کی یوں تباہی میں نہ تو حصہ دار تھی اور نہ ہی ذمے دار۔۔۔ پھر بھی‘ کچھ نہ کچھ تو شاید میں کر ہی پاتی۔ اگر چاہا ہوتا تو۔۔۔

ڈرائیور نے مجھے آتا دیکھ کر فوراً پچھلا دروازہ کھول دیا۔

میرے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے مستعدی سے دروازہ بند کیا‘ پھر اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہی گاڑی اسٹارٹ کر دی اور پھر ایک عجیب سوال پوچھا اس نے۔ جسے سنتے ہی میں ایک دم جیسے ہوش میں آگئی۔ اس نے پوچھا۔

"اب کہاں جائیں گی باجی۔۔۔ اپنی خالہ جی کے گھر؟"

میرا چونک جانا لازمی امر تھا۔ میں اتنی حیرت زدہ تھی کہ کوئی جواب ہی نہ دے سکی۔ اس نے دوبارہ کہا۔

"باجی! تو انوں جانا اے اوتھے۔۔۔ گڈی موڑ لوواں؟"

"کیا تم جانتے ہو میری خالہ کا گھر کہاں ہے؟"

"جی باجی! اک واری چھڈن آیا سی اونہاں نوں۔"

مجھے حیرت ہوئی اور خوشی بھی۔ یعنی امی اور خالہ میں صلح ہو گئی تھی۔ تب ہی تو آنا جانا شروع ہوا ہو گا۔

"اچھا؟ تو بڑی باجی بھی تو آتی ہوں گی ادھر۔" میں نے امی کے متعلق استفسار کیا۔ وہ لمحہ بھر کو رکا‘ پھر بولا۔

"نہیں باجی۔۔۔ او تاں نہیں آندی اتھے۔" ہماری باتوں کے دوران ہی وہ ازخود گاڑی کو بڑی خالہ کے گھر کی طرف موڑ چکا تھا۔

"پھر تمہیں ان کے گھر کا پتا کیسے معلوم ہوا؟"

"او باجی! تہاڈی خالہ جی آئے سن اوتھے بنگلے تے۔۔۔ بڑی باجی نے دروازہ ای نئیں کھولیا۔۔۔ فیر صاب آگئے سن۔ اونہاں کولوں معافیاں منگ کے مینوں آکھیا‘ توں اینہاں دے کار چھڈ آ۔"

میں دنگ رہ گئی‘ امی کی بے حسی اور بے اعتنائی کی بھی انتہا تھی کوئی؟ اتنی پتھر دل کیوں تھیں آخر وہ؟

میرا دل پہلے ہی عجیب سے احساسات کا شکار تھا۔ یہ بات سن کر مزید دکھ گیا۔ میں اگر خالہ کے گھر جاتی تو یقیناً اپنی امی کی ناراضی مول لیتی۔ کیونکہ ڈرائیور کے ذریعے انہیں آخرکار معلوم ہو جاتا کہ میں کہاں کہاں گئی۔ یہ سوچ کر میں ڈرائیور کو وہاں جانے سے منع کرنے ہی لگی تھی کہ سامنے خالہ کی گلی نظر آنے لگی اور میرے الفاظ میرا ساتھ چھوڑ گئے۔ میری وہی کیفیت ہو گئی جو نانی امی کے گھر کے سامنے جا کر ہوئی تھی۔

ان کے لمحہ بہ لمحہ نزدیک آتے گھر کی طرف نظر جمائے میں نے دل میں اٹھتے تمام اندیشوں کو پس پشت ڈال دیا۔

"دیکھا جائے گا۔" میں اپنی امی کے بارے میں سوچنے کے بجائے خالہ اور سمیر بھائی کی صورتیں یاد کرنے لگی۔ یہ تو شرمندگی کی بات‘ مگر جب ملنے جلنے میں سالوں کا وقفہ پیدا ہو جائے تو اکثر خونی رشتوں کی صورتیں بھی ذہن سے محو ہو جاتی ہیں۔

گاڑی رک گئی۔ آنکھوں میں امڈتے آنسو روکتی لوہے کے اس گیٹ کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے بیل پر انگلی رکھی اور بٹن دبا دیا۔

دروازہ کھلا تو سامنے سمیر بھائی کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کی آنکھیں جگمگا سی اٹھیں۔

"مہرین! تم کب آئیں؟"

السلام علیکم کہہ کر میں آگے بڑھی تو انہوں نے میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے نہایت شفقت سے آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور مجھے ساتھ لے کر اندر داخل ہو گئے۔

"پاکستان کب آئیں؟"

"ابھی دو دن پہلے ہی آئی ہوں۔"

میں پچھلے پندرہ سال سے کینیڈا میں مقیم تھی۔ شادی کے فوراً بعد میں اور سجاد وہاں چلے گئے تھے۔ میری شادی میں بڑی خالہ اپنی ناراضی کے سبب شریک نہیں ہوئی تھیں اور امی نے اپنی شکایتوں کی لسٹ میں ان کے اس جرم کے آگے ناقابل معافی لکھ چھوڑا تھا۔ وہ تو سمیر بھائی سے بھی اچھی طرح پیش نہیں آئی تھیں جو میری شادی میں خالہ کو بغیر بتائے شریک ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ میں نے بھی ان کا ایسا پرجوش خیر مقدم نہیں کیا تھا‘ جیسا کہ مجھے کرنا چاہیے تھا۔ میں نئے رشتوں کے ہجوم میں گھری آنے والے خوب صورت دنوں کے تصور میں سرشار ان کے خلوص کو سمجھنے سے قاصر رہی۔ شادی کے بعد بھی میرا سوائے گھر والوں کے کسی سے رابطہ نہ رہا تھا۔ سراسر میرا ہی قصور تھا‘ میں نے کبھی کوشش ہی نہیں کی تھی جاننے کی خالہ‘ سمیر بھائی وغیرہ کیسے ہیں؟ کہاں بس رہے ہیں؟ اپنی نئی زندگی میں مصروف میں کئی رشتوں کو فراموش کر بیٹھی تھی۔ مگر اب ازالہ کرنے کا وقت آگیا تھا۔

"خالہ کیسی ہیں؟" میرے سوال پر دو قدم آگے چلتے سمیر بھائی نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔ ان کے چہرے پر کچھ عجیب سے تاثرات تھے۔ شاید ناراضی تھی اور بالکل بجا تھی۔ مگر کچھ بھی کہے بغیر انہوں نے میرے لیے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا۔

"تم یہاں بیٹھو‘ میں فارحہ کو بلا کر لاتا ہوں۔"

"پلیز سمیر بھائی! آپ خالہ کو بلائیے۔۔۔ یا پھر مجھے ان کے پاس لے چلیے‘ وہ امی سے خفا ہیں‘ مجھ سے تو مل لیں گی۔"

"وہ تم سے بھی نہیں مل سکتیں۔"

"کیوں؟" مجھے ایسا قطعی جواب سن کر حقیقتاً دکھ ہوا‘ کیا خالہ بھی میرے ساتھ وہی کریں گی جو امی نے ان کے ساتھ کیا۔

"آپ ان سے کہیے نا مجھ سے مل لیں۔ کتنے سال گزر گئے ہیں۔ اب ختم کریں ناراضی‘ معاف کر دیں ہمیں۔ میری کوتاہی‘ میرا گناہ‘ میں تسلیم کرتی ہوں‘ مجھے پہلے آنا چاہیے تھا۔ پلیز سمیر بھائی! مجھے معاف کر دیں۔" میں سمیر بھائی کا بازو پکڑ کر لجاجت سے بولی۔

پھر شاید سمیر بھائی کا ضبط جواب دے گیا اور وہ چیخ اٹھے۔ "مر گئی ہے میری ماں۔"

ان کے بازو پر میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ مجھے یقین نہیں آیا تھا۔

"امی کا پانچ دن پہلے انتقال ہو گیا ہے۔ مر گئیں میری امی۔۔۔ چلی گئیں ہمیشہ کے لیے۔" سمیر بھائی بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے زمین پر بیٹھ گئے۔

"اب تم ان سے کبھی نہیں مل سکتیں‘ کبھی نہیں مہرین!"

میں گونگوں کی طرح انہیں دیکھے چلی گئی۔ کوئی پہاڑ سا بوجھ آگرا تھا۔ پچھتاوا‘ شرمندگی‘ دکھ‘ ملال سب ایک ساتھ حملہ آور ہوں تو اس کیفیت کو کیا کہتے ہیں؟ میں تو رونے کے بھی قابل نہیں رہی تھی‘ بس پتھر کی ہو گئی تھی۔

چند گھنٹوں بعد ڈرائیور مجھے لے کر ابو کے گھر جا رہا

تھا۔ دوپہر ہو چکی تھی، سڑک پر ہر طرف چہل پہل تھی۔ ارد گرد لوگ ہی لوگ، سب ساتھ ساتھ تھے یا تنہا، کسے خبر؟ ساتھ بھی ہوں تو ہم خود کو تنہا کر لیتے ہیں، ہم انسان اپنی ناراضی کو زندگی سے زیادہ طویل کیوں کر لیتے ہیں؟

امی کو خالہ سے اتنا عرصہ ناراض رہ کر کیا ملا؟ اپنی انا کا جھنڈا اٹھائے خود غرضی کے کون سے پہاڑ سر کیے تھے؟ بیک وقت مجھے اپنی ماں پر غصہ اور ترس آ رہا تھا۔ میں انہیں کیسے بتاؤں کہ ان کی اکلوتی بہن اب اس دنیا میں نہیں رہی۔ کوما کی حالت میں دو ہفتوں تک اسپتال میں رہیں اور پھر زندگی سے منہ موڑ گئیں۔

''سمیر بھائی! آپ کو اطلاع تو کرنی چاہیے تھی۔'' میں خود کو شکوہ کرنے سے روک نہیں پائی تھی۔

''کس کو بتاتا مہرین! چھ ماہ پہلے جب امی کو معلوم ہوا کہ وہ کینسر کی لاسٹ اسٹیج پر ہیں، تب ہی وہ خالہ سے ملنے ان کے گھر گئیں۔ مجھ سے کچھ کہے بغیر ٹیکسی لی اور وہاں پہنچ گئیں اور خالہ نے کیا، کیا اپنی بہن کے ساتھ؟ انہوں نے گھر کے اندر بھی آنے نہیں دیا تھا، جانتی ہو؟ وہ یوں ہی واپس آ گئیں، کوئی شکوہ نہیں کیا۔ مجھے تو تمہارے ڈرائیور نے بتایا جو انہیں چھوڑنے آیا تھا کہ میری ماں کے ساتھ وہاں کیا سلوک ہوا۔ اس قدر تذلیل کے بعد میں خالہ سے امید رکھتا؟ کہ وہ میری ماں کے مرنے پر روئیں گی یا مجھے دلاسا دیں گی؟''

''وہ ان کی بہن تھیں سمیر بھائی!'' میں بلک کر رو پڑی تھی۔

''ہاں وہ ان کی بہن تھیں، اکلوتی بہن، مگر اپنوں سے توقعات تب ہی رکھی جاتی ہیں مہرین! جب وہ اپنے بن کر دکھائیں اور مجھے خالہ سے کوئی توقع نہیں رہی تھی۔''

''میں آج نانی امی کے گھر گئی تھی سمیر بھائی! وہ گھر تو بالکل اجڑ کر رہ گیا ہے، ہم اسے بچا نہیں سکے۔''

''یہ گھر بھی اجڑ گیا ہے۔'' سمیر بھائی نے عجیب دل گرفتی کے عالم میں حسرت آمیز نگاہوں سے خالہ کے اپنے ہاتھوں سے سجے گھر پر جیسے آخری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''میں اپنی فیملی کو لے کر جا رہا ہوں یہاں سے، یہ گھر بک چکا ہے اور خریدار اسے بھی منہدم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ کہتا ہے۔ اس کی بنیادیں بہت کمزور ہو گئی ہیں۔''

میں صدمے کی کیفیت میں تھی۔ سمیر بھائی نے بے حد دکھی نظروں سے میری جانب دیکھا اور بولے۔

''ہماری بنیادیں بھی بہت کھوکھلی ہو چکی ہیں، بے حد کمزور.... کسی بھی لمحے ڈھے جائیں گی....''

ہارن کی آواز نے مجھے چونکایا۔ ڈرائیور گھر کے سامنے گاڑی روک کر چوکیدار سے گیٹ کھلوانے کے لیے ہارن دے رہا تھا۔ میں چپ چاپ بیٹھی خالی خالی نظروں سے اپنے ماں و باپ کے گھر کو دیکھتی رہی۔ میرے ذہن میں سمیر بھائی کی آواز گونج رہی تھی۔

گاڑی سے اترتے ہی میں نے سر اٹھا کر اس مکان کی طرف دیکھا جو اپنی باہیں وا کیے مجھے آغوش میں بھرنے کے لیے بے چین تھا۔ میرے ماں، باپ کا گھر! جس کی حیثیت میرے لیے میرے ماں، باپ سے کم ہرگز نہیں تھی۔ جو سکون یہاں آ کر ملتا تھا وہ دنیا میں کہیں اور نہیں مل سکتا تھا۔

لیکن.... اگر....

میں دہل گئی۔ جس خیال کی ٹھیس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا، وہ حقیقت بن کر میرا کیا حشر کرتا۔ مجھے بس ایک ساعت بھر کے لیے یوں ہی خیال آیا کہ یہ میرے ماں، باپ کا گھر.... کیا یہ بھی کھنڈر ہو جائے گا.... کہ بنیادیں تو اس کی بھی کھوکھلی ہو چکی تھیں۔

اپنے ماں، باپ کو کون مرتے دیکھنا چاہتا ہے؟ مگر میں کیا کروں؟ چشم زدن میں اس گھر کو بھی اجڑا اور ویران دیکھ رہی ہوں۔ بالکل نانی امی کے گھر کی طرح، ایک دم ہی ڈھیر ساری تھکن میرے وجود میں بس گئی۔ قدم لڑکھڑائے تو میں نے برآمدے کے ستون کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچایا۔ وگرنہ اس گھڑی احتساب کے بھنور میں پھنسی میری ذات مسلسل ڈوب رہی تھی۔

کتنے ارمانوں سے نیا مکان بنانے والے اپنے خاندان کے ساتھ اس میں رہتے بستے ہیں۔ کتنے موسم ایک ساتھ بیتتے ہیں، کتنی یادیں کیسے کیسے غم، کتنی خوشیاں ایک ساتھ مناتے ہیں۔ اس مکان کو گھر بنانے کے لیے کیا کیا جتن کرتے ہیں اور پھر....

میں اور سبین، اپنے والدین کی بس دو ہی بیٹیاں۔ دونوں کی شادی ہو گئی۔ صرف یہ گھر ہی نہیں، میرا تو دیس بھی چھٹ گیا۔ یہ قسمت میں تھا، میں بدل نہیں سکتی، پر اور بہت کچھ تھا، جو بدلا جا سکتا تھا، مگر میں نے کوشش ہی نہیں کی۔

''مہرین سبین....'' ہم دونوں کے نام امی ہمیشہ ساتھ ساتھ ہی لیا کرتی تھیں۔ ہم دونوں نے بھی ہمیشہ ہر کام ایک ساتھ ہی کیا۔ عمر میں تو میں اس سے دو سال بڑی تھی مگر سبین قد کاٹھ میں ابو پر گئی تھی لمبی اور دبلی پتلی، سو بچپن سے ہی لوگ ہمیں جڑواں سمجھتے رہے۔ کبھی کسی سہیلی کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے کافی تھیں۔

بارش میں اکٹھے بھیگتے اور پھر اکٹھے ہی بیمار پڑ جاتے تھے۔ گڈے گڑیا کی شادی کرتے۔ کچن میں رکھے مرتبانوں سے اچار اور مربے کھانا، امی سے چھپ کر، جب وہ سو جاتیں دوپہر میں ہم دونوں یہ واردات کیا کرتے تھے۔ اکثر وہ کڑی دوپہر میں املی کے درخت پر چڑھ کر میرے لیے املیاں توڑتی تھی۔ ایک بار تو اترتے ہوئے اس زور سے پاؤں مڑا کہ حکیم کے پاس لے جانا پڑ گیا۔ بہت زیادہ ڈانٹ بھی کھائی صرف اس نے.... حالانکہ سبین کو املیاں پسند نہیں تھیں۔ وہ فقط میرے لیے اتنا تردد کیا کرتی تھی۔ پر اس دن اپنی بہن کی تکلیف نے اتنا تڑپایا کہ میں نے بھی ہمیشہ کے لیے املی کھانے سے توبہ کر لی۔

اتنی محبت تھی ہمیں ایک دوسرے سے....

تھی؟ میں نیم جان ہو کر وہیں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

چھ سال.... میں نے انگلیوں پر گننا چاہا، ہاں شاید چھ سال ہو گئے ہیں، ہماری آخری ملاقات کو۔ آخر ہم نے بھی وہی کیا، جو ہماری ماں نے کیا تھا۔ ان ہی کا پرتو ثابت کیا ہم نے خود کو۔

فاصلے کبھی اچانک پیدا نہیں ہوتے، انہیں قدم بہ قدم بڑھایا جاتا ہے۔

ہم دونوں کے درمیان دوری نے جنم لیا پہلی بار.... آج سے قریباً دس سال پہلے جب میں اپنے دو چھوٹے بچوں کے ساتھ ایک مہینے کی چھٹیاں گزارنے لاہور آئی تھی، چند دن بعد سبین مجھ سے ملنے امی کے گھر آئی۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ اور رات ہوتے ہی اس نے واپس جانے کی تیاری پکڑ لی۔

''میں اتنے سالوں بعد آئی ہوں سبین! ابھی تو ٹھیک سے ملے بھی نہیں۔ تم رات کو یہیں رک جاؤ نا۔ بچے سو جائیں تو ہم اطمینان سے باتیں کریں گے۔'' میں نے بہت محبت سے اسے روکنے کی کوشش کی، مگر اس کا جواب قطعی تھا۔

''نہیں باجی! میں رات میں رک نہیں سکتی۔ عدیل کو میرے بغیر رہنے کی عادت نہیں ہے۔ انہوں نے فون کر دیا ہے، بس آ جائیں تو میں ان کے ساتھ ہی چلی جاؤں گی؟''

''اوہو! اب ایسا بھی کیا؟ چلو میں تمہارے شوہر سے کہہ دیتی ہوں کہ آج رات کے لیے اجازت دے دیں۔''

مجھے یقین تھا وہ ضرور ٹھہرنا چاہتی ہے، مگر شوہر کے دباؤ میں صاف کہنے سے کترا رہی ہے شاید۔ اسی لیے میں نے زور دیا۔

''نہیں باجی! اس کی ضرورت نہیں، میں کبھی عدیل کے بغیر رات میں کہیں ٹھہرتی نہیں ہوں، مجھے جانا ہے۔'' اس کا یہ انداز میرا دل دکھا گیا اور مزید اصرار کے بجائے میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ کچھ دیر بعد عدیل آیا تو وہ چلی گئی۔

میری بہن، جو میری آنکھوں سے میرے دل کا حال جان لیا کرتی تھی، آج اس نے میری محبت بھری التجا پر بھی کان نہیں دھرے تھے۔ یہ بھی جاننے سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ اس کے روکھے رویے نے

میرا کس قدر دل دکھایا ہے۔ بے شک امی نے بتادیا تھا کہ شادی کے ڈیڑھ سال گزر جانے کے باوجود وہ کبھی امی کے پاس بھی رات میں نہیں ٹھہری تھی۔ مگر امی تو اسی شہر میں تھیں نا' وہ تو ان سے جب چاہے مل سکتی تھی۔ میں سالوں بعد آئی تھی۔ مجھے مان تھا کہ وہ میرے لیے ضرور رکے گی' مگر ایسا نہیں ہوا۔

ایک گہری سانس لے کر میں نے ستون سے اپنا سر ٹکالیا۔ ٹھنڈے پتھر کے چھوتے ہی جیسے خود بخود آنکھوں کے سامنے فلم سی چلنے لگی۔ اس ستون کے گرد ہم دونوں کھیلتے ہوئے گول گول چکر لگایا کرتی تھیں۔ کبھی ایک دوسرے کو پکڑنے کی کوشش میں کسی ایک کو دھکا لگ جاتا اور وہ گر جاتی۔ تھوڑا رک کر پھر کھیل شروع ہو جاتا تھا۔ ان دنوں تو کبھی دل میں ایسی بدگمانی پیدا نہیں ہوتی تھی کہ بہن نے جان بوجھ کر چوٹ پہنچائی ہے۔ تب ہمیں عقل نہیں تھی اور شاید سارا قصور اسی سمجھ داری کا ہوتا ہے۔

"میں نے تمہاری ویڈنگ اینی ورسری پر اتنے مہنگے ایر رنگز گفٹ کیے اور تم نے اٹھا کر اپنی نند کو پکڑا دیے۔"

میرا غصہ برحق تھا' اسی لیے میری آواز بھی اونچی تھی۔ یہ دوسری بار تھا جب میری بہن نے میرا دل توڑا۔

"باجی! پلیز آہستہ بولیں۔ وہ لوگ سن لیں گے۔"

سبین کو صرف ان ہی کی فکر تھی' یہ جان کر مجھے مزید غصہ آیا۔

"مجھے اس کی پروا نہیں' پہلے تم میری بات کا جواب دو' تمہیں میری دی ہوئی چیزوں کی کوئی قدر ہے بھی یا نہیں' ہمیشہ اٹھا کر اپنے سسرال والوں کو بانٹ دیتی ہو۔"

اس دن سبین نے اپنے گھر میری دعوت کی تھی۔ سلام دعا کے بعد وہ تو کچن میں چلی گئی' سبین کے جاتے ہی اس کی ساس نے بے حد پیار سے مجھے اپنے ساتھ بٹھالیا' پھر اپنی بیٹی نازیہ کو آواز دے کر اپنا پرس لانے کو کہا۔ وہ پہلی بار میرے بچوں سے مل رہی تھیں' اسی لیے کچھ روپے ہاتھ پر رکھنا چاہتی تھیں۔

"یہ لیں امی آپ کا پرس۔" ہماری باتوں کے دوران ہی نازیہ نے ان کا پرس انہیں پکڑایا تو مجھے جیسے کرنٹ لگ گیا۔ وہ پرس برانڈڈ تھا اور میں نے سبین کو گفٹ کیا تھا۔ میں ہی جانتی ہوں کس طرح سنبھالا میں نے اپنے آپ کو۔ اس کی ساس میری حالت سے بے خبر ہنستی مسکراتی بچوں کے ہاتھ پر پانچ' پانچ سو کے نوٹ رکھتے ہوئے انہیں دعائیں دے رہی تھیں۔ بدقت مسکرا کر میں نے ان کا شکریہ ادا کیا تو بولیں۔

"اس میں شکریے کی کیا بات ہے؟ اللہ تمہارے بچوں کو صحت و زندگی عطا فرمائے' ان کی خوشیاں دیکھو۔" پھر اپنی بیٹی سے مخاطب ہوئیں۔

"جاؤ... جا کر بھابھی کی مدد کرواؤ۔" ان کی نازیہ کو کچن میں سبین کے پاس جانے کی ہدایت سن کر میں بھی نازیہ کی طرف متوجہ ہوئی تو اس کے کانوں میں جھولتے آویزوں نے جیسے میرا دل جکڑ لیا۔ کتنے چاؤ سے اپنے اور سبین کے لیے میں نے ایک ہی ڈیزائن کے آویزے خریدے تھے' جنہیں میرے سامنے اس کی نند پہن کر بیٹھی تھی۔

اب میری برداشت جواب دے گئی تھی۔ اپنے بیٹے کو واش روم لے جانے کا کہہ کر میں نے سبین کے کمرے کا رخ کرتے ہوئے نازیہ سے کہا کہ دو منٹ کے لیے ذرا سبین کو میرے پاس بھیج دیجیے۔ وہ فوراً اسے بلانے چلی گئی تھی۔ میرا تو خون کھول رہا تھا' جیسے ہی سبین نے کمرے میں آئی میں اس پر برس پڑی۔

"یہ اوقات ہے تمہاری نظر میں میری' جواب دو؟" میرے غصے کی وجہ جان کر وہ فوری طور پر کوئی وضاحت پیش نہ کر سکی۔ بس بار بار مجھ سے آواز نیچی رکھنے کی التجا کرتی رہتی' تاکہ کوئی اور سن نہ لے' مگر شاید... کوئی سن چکا تھا۔

اس کے بعد میں وہاں زیادہ دیر رکی نہیں تھی۔

امی میرے خراب موڈ کی وجہ جان کر کہنے لگیں۔

"اس کا شوہر ذرا الگ مزاج کا ہے' بیوی کی کوئی بھی چیز اٹھا کر اپنی ماں' بہن کو دینے میں عار نہیں سمجھتا۔

سبین کو دی ہوئی رقم بھی اسی کی جیب میں جاتی ہے۔"

امی بھی مجھے نالاں نظر آئیں۔

"تو آپ سبین کو سمجھائیے' وہ اسے منع کرے' کم از کم ہمارے دیے تحائف کو تو بانٹنے مت دے۔ عدیل کو دینے کا اتنا ہی شوق ہے تو اپنے پیسوں سے خریدی اشیا بھینٹ چڑھائے۔ سب سبین کا قصور ہے۔" مجھے اب سبین کی کم ہمتی پر افسوس ہوا۔

"میں تو کہتی رہی مگر سبین پر تمہارے ابو کا زیادہ اثر ہے' جو ہمیشہ یہی تلقین کرتے رہے کہ تمہارا شوہر اگر ہاتھ کے کنگن کی طرف اشارہ کرے کہ میری ماں کو دے دو تو دے دو' کیونکہ پہنانے والا وہ ہے اور دلا دے گا' انکار کرو گی تو ساری زندگی وہی ایک کنگن پہن کر بیٹھی رہو گی۔"

"اسی لیے وہ اس کا فائدہ اٹھاتا ہے اور صحیح تو ہے' سبین کو بھی اپنے خونی رشتوں سے زیادہ ان کی پروا ہے۔" مجھے رہ رہ کر سبین پر ہی غصہ آ رہا تھا۔ امی نے حتی الامکان میرا دل سبین کی طرف سے صاف کرنا چاہا' جیسے نانی امی کیا کرتی تھیں۔ وہ بھی تو کوشش کرتی تھیں کہ دونوں بہنوں میں پیار بنا رہے۔ نہ وہ کامیاب ہو سکیں اور نہ ہی میری ماں' یہ فاصلے مسلسل بڑھتے جا رہے تھے۔

میرا کئی کئی مہینوں بعد پاکستان چکر لگتا۔ پردیس کی دوڑتی بھاگتی زندگی سے چند لمحات فراغت کے چرانا آسان تو نہیں۔ یوں ہی چھ سال پہلے میں محض ایک ہفتے کے لیے پاکستان آئی تھی' بچے بھی ساتھ نہیں تھے۔ وہ جولائی کا مہینہ تھا اور سبین کی سالگرہ قریب تھی۔ میں نے اس کے لیے ڈھیر ساری شاپنگ کی۔ کئی طرح کے تحفے خریدے' پھول لیے اور اسے وش کرنے کے لیے اس کے گھر پہنچ گئی۔

پتا نہیں کیوں؟ مجھے دیکھ کر وہ اتنی خوش نہیں ہوئی جتنا اسے نظر آنا چاہیے تھا' یا جس کی مجھے توقع تھی۔ ایک تو یہ توقعات... ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑتیں۔

میں نہایت گرم جوشی سے اسے وش کرنے کے بعد تحائف کا ڈھیر ہاتھوں میں اٹھائے اس کے گھر کے اندر

داخل ہوگئی۔ اس نے میرے لیے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا اور نہایت پر تکلف انداز میں میرا حال چال پوچھنے لگی۔

"میں ٹھیک ہوں' تم بس عدیل کو جلدی سے بلالاؤ' تاکہ تمہارا برتھ ڈے سیلیبریٹ کرسکیں۔"

"عدیل تو گھر پر نہیں ہیں۔" وہی انداز تھا اس کا' جیسا اس رات میرے پاس ٹھہرنے سے انکار کرتے ہوئے اس نے اختیار کیا تھا' بے مہر۔۔۔ دوٹوک' مجھے حیرت ہوئی۔

"میں نے باہر عدیل کی گاڑی دیکھی ہے۔" میں کہے بغیر رہ نہ سکی اور وہ کچھ کہنے کے بجائے بس ہونٹ کاٹنے لگی۔ پھر میں سب کچھ سمجھ گئی۔

"تمہارا شوہر مجھ سے ملنا نہیں چاہتا؟"

"نہیں۔" مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی بے حسی دکھائے گی۔

"اور صحیح بھی تو ہے باجی! آپ اس دن میرے گھر دعوت پر آئیں تو اپنی چیزوں کو لے کر آپ نے کیا کیا نہیں کہا۔ وہ سب کچھ عدیل نے اپنے کانوں سے سنا۔ بہت دکھ ہوا تھا انہیں۔ بھلا ٹکے ٹکے کی چیزوں کے لیے کوئی ان کی ماں' بہن کو بے عزت کرے تو کیا وہ اسے سر آنکھوں پر بٹھائیں گے؟"

میں حق دق اپنی بہن کی تلخ بیانی سنتی رہی۔ جسے ہمیشہ کی طرح صرف اپنے شوہر کے احساسات کی پروا تھی۔

"یہ تو ان کی بڑائی ہے کہ انہوں نے مجھے آپ سے ملنے سے نہیں روکا۔ نہ آپ کے لیے اپنے گھر کے دروازے بند کیے۔ بس یہی کہا کہ تم ضرور ملو اپنی بہن سے' مگر میں سامنے نہیں آؤں گا۔" اتنی بے عزتی' ذلت کے شدید احساس سے میری آنکھیں بھر آئیں۔

"بہت عظیم ہے تمہارا شوہر' اسی کے ساتھ رہو' بسو۔" میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ "آئندہ مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔" اپنی بہن سے ہر قسم کا ناتا توڑ کر میں وہاں سے چلی آئی۔ وہ آخری دن تھا۔ آخری ملاقات تھی ہم دونوں کی۔

امی کو کسی بھی قسم کی تفصیل سنائے بغیر میں نے اپنا قیام مختصر کرلیا۔ جہاں مجھے ہفتہ بھر رکنا تھا' وہاں محض تین دن بعد ہی میں واپس کینیڈا چلی گئی۔ اس قدر دل دکھایا تھا سبین نے میرا۔ اسے اپنے شوہر کے جذبات کا اتنا خیال تھا کہ میری کوئی وقعت ہی نہیں رہی تھی۔ اس دن کے بعد ہم پھر کبھی نہیں ملے۔ میں اپنے والدین سے ملنے آتی اور ان ہی تک محدود رہتی۔ سبین کو میرے آنے جانے کا علم امی کے ذریعے ہوا کرتا' مگر میرے ہوتے وہ بھی امی کی طرف نہیں آتی تھی۔

دو سال یوں ہی گزر جانے کے بعد امی نے جب صلح صفائی کی بات کرنا چاہی تو میں نے بنا لحاظ کیے نہایت سختی سے انہیں منع کردیا۔

"ان دونوں کو مجھ سے معافی مانگنی چاہیے امی! میں عمر میں بڑی ہوں۔ انہیں میرا احترام کرنا چاہیے تھا اور عدیل نہ سہی' میری بہن کو تو احساس ہونا چاہیے' وہ ہر غلط بات پر اپنے شوہر کا ساتھ دیتی ہے۔ اسے میری کوئی پروا نہیں ہے' تو میں کیوں کروں؟"

اور شکایتیں تو امی کو بھی عدیل سے بے حد تھیں' مگر بہرحال انہوں نے سبین سے ناتا نہیں توڑا تھا۔ یہ کام تو میں نے کیا تھا۔

اپنے آنسوؤں سے تر چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھے ادراک ہوا کہ آج ان آنکھوں نے بے حساب آنسو بہائے ہیں۔ اتنے کہ دل کی ساری کثافتیں دھل دھلا گئیں پر دکھ۔۔۔ وہ ابھی تک دل میں جاگزیں تھا۔ بدن توڑ کر رکھ دیا تھا' اپنی عمر کے آغاز سے حال تک کے' بے حد تھکا دینے والے سفر نے' پھر بھی کسی نہ کسی طرح میں اپنے آنسوؤں کو صاف کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

آسمان کی جانب دیکھا تو شام تھکے ہوئے مسافر کی طرح پژمردگی سے قدم اٹھاتی اندھیرے کی جانب بڑھ رہی تھی۔ میں بھی پلٹ کر تھکے تھکے قدموں سے چلتی ہوئی گھر کے اندر داخل ہوگئی۔ تمام روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔ شاید امی' ابو گھر پر نہیں تھے۔

ابھی میں نے سوئچ کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میرے موبائل کی بیل بجنے لگی۔ میں نے ہینڈ بیگ سے نکال کر دیکھا' ابو کی کال تھی' میں نے فوراً" ریسیو کی۔ "السلام علیکم ابو!"

"ہاں بیٹا! وعلیکم السلام۔۔۔ گھر پہنچ گئیں؟" ابو کا ہشاش بشاش لہجہ سن کر میں بے اختیار مسکرادی۔

"جی ابو! آپ لوگ کہاں ہیں؟"

"بیٹا وہ۔۔۔" ابو کہتے کہتے رکے۔ پھر جب انہوں نے اپنا فقرہ مکمل کیا تو میں ان کی ہچکچاہٹ کی وجہ سمجھ گئی۔

"ہم سبین کی ساس کی عیادت کے لیے یہاں آئے ہوئے ہیں اس کے گھر' آج صبح انہیں ایمرجنسی میں اسپتال لے جانا پڑگیا تھا۔ تم آرام کرو' ہم بس کچھ ہی دیر میں یہاں سے روانہ ہوجائیں گے۔" ان کی بات پوری ہوتے ہیں میں نے "جی ٹھیک ہے" کہہ کر فون بند کردیا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں سبین کے گھر سے نکل رہے تھے کہ انہوں نے مجھے ہاتھوں میں سفید پھولوں کا گلدستہ تھامے آتے دیکھا اور جہاں کے تہاں ٹھہر گئے۔ انہیں گیٹ تک چھوڑنے آئے عدیل کے چہرے پر بھی حیرت صاف نظر آرہی تھی۔ میں نے سلام میں پہل کی۔ جس کا جواب میرے والدین نے تو میرے سر پر دست شفقت پھیر کر دیا' جیسے شاباش دے رہے ہوں اور عدیل نے نہایت گرم جوشی سے مجھے گھر کے اندر چلنے کی دعوت دی۔ امی' ابو تو خوشی خوشی مجھے خدا حافظ کہہ کر وہاں سے روانہ ہوگئے اور میں عدیل سے اس کی والدہ کی طبیعت کے بارے میں پوچھتی اس کے ساتھ گیٹ سے اندر داخل ہوگئی۔ عدیل نے مجھے تفصیلاً" بتایا۔

"اچانک صبح صبح امی کا شوگر لیول بہت کم ہوگیا تھا اس لیے ایمرجنسی میں لے جانا پڑا۔ اب تو اللہ کا شکر ہے پہلے سے بہتر محسوس کررہی ہیں۔ آپ پلیز اندر چلیے۔" ہم دروازے کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ عدیل نے وہیں سے سبین کو آواز دے ڈالی۔

"سبین دیکھو! کون آیا ہے؟" جیسے اسے یقین تھا مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوگی' شاید اتنا یقین مجھے بھی نہیں تھا۔ کیا پتا ابھی تک ناراض ہو؟ آواز سن کر وہ اپنی ساس کے کمرے سے جیسے ہی باہر نکلی مجھے دیکھ کر ٹھہر گئی' مگر میں نہیں رکی۔ اپنے قدم بڑھانے میں چھ سال لگادیے تھے میں نے' اب مزید دیر کی گنجائش ہی کہاں تھی؟

آداب' سلام' ہاں ہوتے ہیں ضروری' مگر فی الحال تو مجھے اسے گلے لگانا تھا۔ جانے کتنی دیر لپٹائے کھڑی رہی میں اسے۔ خود سے الگ کرنے کا دل ہی نہیں چاہا' یہاں تک کہ دونوں کی آنکھیں بھر آئیں اور پھر ہنستے ہنستے الگ ہوکر حال چال پوچھنے میں کس نے پہل کی۔۔۔ معلوم نہیں' کیا فرق پڑتا ہے؟

فاصلے سمٹ گئے تھے' یہ کیا کم تھا؟

اسی ساون بھادوں کیفیت میں گھری' ہم دونوں ایک ساتھ عدیل کی والدہ کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ نقاہت کے باوجود وہ مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھیں۔ ڈھیروں دعائیں دیتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ کر ساتھ بٹھالیا انہوں نے۔ میں نے نازیہ کا حال چال پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ تین سال پہلے اس کی شادی کردی تھی۔ امی نے تذکرہ کیا تو تھا خیر۔۔۔ اب نازیہ دو بچوں کی ماں تھی اور ابوظہبی میں رہتی تھی۔ سبین پھولوں کو ٹیبل پر رکھے گلدان میں سجانے کے بعد چائے بنانے کچن میں چلی گئی۔ میں نے دیکھا' ایک لمحے کے لیے بھی مسکراہٹ اس کے لبوں سے جدا نہیں ہوئی تھی۔ مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ عدیل کی والدہ بھی سبین کو مسکراتا دیکھ کر مسکرارہی تھیں۔

"بہت گھبراگئی تھی سبین میری طبیعت خرابی سے۔ ڈر جاتی ہے۔ بہت محبت کرتی ہے۔" ان کے کہنے پر میں نے جواب دیا۔

"آپ لوگ بھی تو اس کا اتنا خیال رکھتے ہیں' محبت تو کرے گی ہی۔"

"میں سبین کو دین و دنیا کی دولت عطا ہونے کی دعائیں دیتی ہوں۔ اس نے میری بہت خدمت کی ہے۔" انہوں نے کہا اور پھر۔۔۔ گزرے چھ برسوں کی

روداد شروع کی۔
جانے کیوں مجھے اندیشہ ہوا اپنی بہن سے لاتعلقی پر وہ مجھے شرمندہ کرنے کی کوشش کریں گی۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا' اور اگلے دس منٹ تک جو بھی انہوں نے کہا' اس کے ایک ایک لفظ کو سن کر میں حقیقتاً" خود سے نظر ملانے کے قابل نہ رہی۔
میں ان کے ساتھ ہی بستر پر بیٹھی تھی۔ بات کرتے کرتے وہ رک کر کبھی میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیتیں تو کبھی چھوڑ کر اپنے آنسو پونچھتیں کہ بار بار ان کی آنکھیں بھرا رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے تمام حقائق سے آگاہ کیا' جن کا ذکر سبین نے کبھی امی' ابو سے بھی نہیں کیا تھا۔
عدیل کے والد جب حیات تھے' انہوں نے اپنے خاندان کو کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی تھی۔ شان دار گھر' تمام سہولیات اور ہر قسم کی آسائش' مگر دنیا سے جاتے ہوئے وہ جوان بیٹے کے لیے قرضوں کے پہاڑ چھوڑ گئے۔ عدیل تو شادی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا' مگر سبین اس کی امی کو بے حد پسند آگئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا امی' ابو ان کے اصرار اور بار بار چکر لگانے کا ذکر کیا کرتے تھے۔
اس وقت کسی کو بھی معلوم نہ ہو سکا تھا کہ ظاہری شان و شوکت کے پیچھے اصل کہانی کیا ہے۔ عدیل کی امی نے میرے والدین کو نہیں بتایا تھا کہ ان کا گھر بھی بینک کے پاس گروی پڑا ہے اور قرض ادا نہ ہونے کی صورت میں اسے ضبط کر لیا جائے گا۔ ابتدائی چند سال بہت تنگی کے تھے' پر سبین نے حوصلے سے نہ صرف گزارا کیا' بلکہ ان کی بھی ہمت بندھاتی رہی۔ عدیل کی والدہ ان کے حالات میں بہت چڑچڑی اور بد مزاج ہوتی جا رہی تھیں۔ ظاہر ہے ہمیشہ کھلے ہاتھ سے پیسہ خرچ کیا تھا' اب ہاتھ روک کے خرچ کرنا ان کے لیے آسان نہ تھا۔ سبین نے نازیہ اور اپنی ساس کو کبھی غیر نہیں سمجھا۔ وہ امی' ابو سے ملنے والی رقم اور میرے دیے تحائف بھی خوش دلی سے انہیں دے دیا کرتی تھی' جبکہ عدیل اسے روکا کرتا تھا۔

سبین کے خلوص اور نیک نیتی کے باعث آج وہ ہر قسم کی فکروں سے آزاد تھیں۔ نازیہ کی اچھی جگہ شادی ہو چکی تھی۔ اس کے جہیز کا بھی زیادہ تر سامان دراصل سبین کا ہی تھا۔ عدیل تمام قرض ادا کر چکا تھا اور گھر میں کسی قسم کی کوئی تنگی نہ تھی۔
میں نہیں جانتی' مگر میں روک نہیں سکی خود کو اور ان کے ہاتھوں پر سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ کتنی خود غرضی دکھائی تھی میں نے۔ میری بہن جب تک میرے لیے ایثار کرتی رہی' تکلیف سہتی رہی' مجھے اس سے محبت رہی اور جب یہی سب کچھ اس نے اپنے شوہر اور گھر والوں کے لیے کیا تو میں اس کا ساتھ دینے کے بجائے اپنا حصہ مانگنے کھڑی ہو گئی۔
میں ہمیشہ یہی سوچتی رہی کہ سبین نے میری محبت کا حق ادا نہ کیا اور آج میں صرف اور صرف خود کو لعنت ملامت کر رہی ہوں۔ میں نے بے حسی کی انتہا کر دی۔ کیا مجھے سبین صرف اسی لیے عزیز رہی کہ میرے لیے قربانی دیا کرتی تھی؟ جب اس کے سامنے نئے رشتوں کے تقاضے پورے کرنے کا کٹھن وقت آیا تو میں اپنی توقعات کے ٹوکرے اٹھائے اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ مجھے سمجھنا چاہیے تھا۔ اس کا ساتھ دینا چاہیے تھا۔ اگر میں ناراضی دکھانے کے بجائے تھوڑے سے تحمل کا مظاہرہ کرتی تو شاید..... شاید وہ بھی اپنے مسائل' اپنی پریشانی مجھ سے کہہ پاتی۔ کیسی معمولی شکایتوں کو بلاوجہ اہمیت دے کر میں اتنے سال برباد کر دیے۔ اپنی بہن کو اکیلا کر دیا۔ محض اپنی انا کی خاطر۔
مگر آج بہت اہم دن تھا۔ مجھ سے منسلک تمام رشتے میری انا سے کہیں زیادہ اہم اور معتبر ہو چکے تھے۔ بے شک خونی رشتوں کی بے قدری نے ہماری بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ ان سہاروں کے بنا ہم زندگی کو صحیح معنوں میں جی نہیں پاتے' مشکلات کا سامنا نہیں کر پاتے' ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں' شکست و ریخت کے عمل سے دوچار میں بھی ٹوٹ کر بکھر جاتی۔ اگر ابو کا فون نہ آیا ہوتا۔ ایک لمحہ سوچے بغیر میں سبین کے گھر چلی آئی تھی۔

میری بہن نے ہمیشہ مجھ سے محبت کی۔ آج بھی کرتی ہے' تب ہی تو مجھے اپنی ساس کے پاس یوں بلک بلک کے روتا دیکھ کر اتنا پریشان ہو گئی' عدیل بھی گھبرا گیا۔
"سبین! باجی کو اپنے کمرے میں لے جاؤ۔" عدیل کے کہنے پر سبین میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے کمرے میں آئی۔
"مجھے معاف کر دو سبین!" میں کمرے میں آتے ہی دوبارہ اس کے گلے لگ گئی۔ "میں نے تمہیں بہت دکھ پہنچایا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" سبین سے میرا رونا دیکھا نہیں جا رہا تھا۔
"کچھ نہیں کیا آپ نے۔ پلیز اس طرح مت روئیں' میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔" روتے روتے میری ہچکی بندھ چکی تھی۔
"ہر بری یاد کو بھول جائیے' سب کچھ ٹھیک ہو گیا نا۔"
"سب کچھ ٹھیک نہیں ہوا سبین! خالہ کا انتقال ہو گیا ہے پانچ دن پہلے اور امی کو خبر ہی نہیں۔ میں انہیں کس طرح بتاؤں؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا' تم میرے ساتھ چلو۔" اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی' عدیل کی آواز نے ہمیں پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔
"چلی جاؤ سبین! باجی ٹھیک کہہ رہی ہیں' اس وقت تمہاری امی کو تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔" میں نے شکر گزاری سے عدیل کی جانب دیکھا۔ "بلکہ ایسا کرو' تم دو دن کے لیے ان کے پاس رہنے چلی جاؤ۔" اب کی بار سبین کو بھی حیرت ہوئی۔
"مگر امی کی طبیعت؟" سبین نے پریشانی سے کہا۔
"اب وہ ٹھیک ہیں اور یہاں میں ہوں نا' تم باجی کے ساتھ جاؤ' یہی بہتر رہے گا۔" سبین سر ہلا کر اٹھی اور اپنا بیگ تیار کرنے لگی۔ عدیل نے اپنی رواداری سے بدگمانی کا ہر بت پاش پاش کر دیا تھا۔ میں نے دل سے اسے ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔
گھر پہنچنے تک سبین مجھے خود سے لگائے بیٹھی رہی۔ اس کے محبت بھرے لمس نے مجھے بہت سہارا دیا۔ نئی طاقت بھر دی تھی مجھ میں۔ اب میں خود کو کھوکھلا محسوس نہیں کر رہی ہوں۔
میں نے دانستہ گھر کی تمام روشنیاں جلا دی ہیں۔ اب امی کے پاس آکر بیٹھی ہوں جنہیں سبین دلاسے دے رہی ہے۔ وہ اپنی بڑی بہن کے انتقال کی خبر سن کر بالکل ٹوٹ گئی ہیں لیکن انہیں صبر آجائے گا' میں جانتی ہوں' چاہے کتنا ہی عزیز شخص اس دنیا سے چلا جائے' صبر آ ہی جاتا ہے۔ انہیں بھی اپنے غم پر صبر آجائے گا' مگر شاید.....
شاید خالہ کے لیے دروازہ نہ کھولنے کا افسوس انہیں زندگی بھر رُلاتا رہے۔
دل کے دروازے ہمیشہ کھلے رکھنے چاہئیں۔ معافی مانگ لینی چاہیے۔ معاف کر دینا چاہیے۔ صلہ رحمی گھروں کو آباد رکھتی ہے۔ انہیں ویران نہیں ہونے دیتی۔
اب میں اور سبین ہمیشہ ملنا جلنا رکھیں گے تاکہ ہمارے والدین کا گھر ہمیشہ آباد رہے۔

ناولٹ

صدف آصف

پیا من بھائے

"ہماری نئی نسل زندگی کو گلستان ہی سمجھتی ہے۔ بھئی! سمجھو کس نے منع کیا ہے؟ مگر اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں، سو شاہراہ زندگی پر آگے کی جانب بڑھتے ہوئے ان کی چبھن سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بھی ضروری ہے۔"

سائرہ بھابھی نے نفاست سے گلابی بنارسی کپڑے کو قطع کرتے ہوئے پاس بیٹھی سنبل کو ٹیڑھی نگاہوں سے گھورا اور لپیٹے بنا کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر سنبل جن کو بے جا ناز نخروں کے باعث "نازو بیگم" بھی کہا جاتا تھا "پرواہ نہیں" کا لیبل چہرے پر سجائے ہاتھوں پر لگی خشک مہندی کے بیل بوٹوں پر چینی کا پانی لگا رہی تھی۔ اس وقت اس سے اہم کام اور تھا بھی نہیں۔

سائرہ بھابھی مشین کی سوئی کے ناکے سے کئی بار کوششوں کے بعد بالآخر گلابی دھاگا گزارنے میں کامیاب ہو گئیں۔ یہ نہیں تھا کہ ان کی نظر کمزور ہو گئی تھی بلکہ بھیگی آنکھوں سے بڑی سے بڑی چیزیں بھی دھندلا رہی تھیں۔ یہ تو سوئی کا مہین سا سوراخ تھا۔ شادی بیاہ کے موقع پر اکثر ان کی یہ ہی کیفیت ہو جاتی۔ جو کبھی بھی ہی بیوگی کا چولا جو پہنا تو بھول ہی گئیں کہ کبھی وہ بھی شوخ رنگوں کی شیدائی تھیں۔ دل راحیل کی موت کے بعد خود بخود بجھ گیا تھا۔ ایک ہی سوٹ کئی تقریبات میں بغیر کسی پریشانی کے پہن لیتیں۔ مگر بچوں

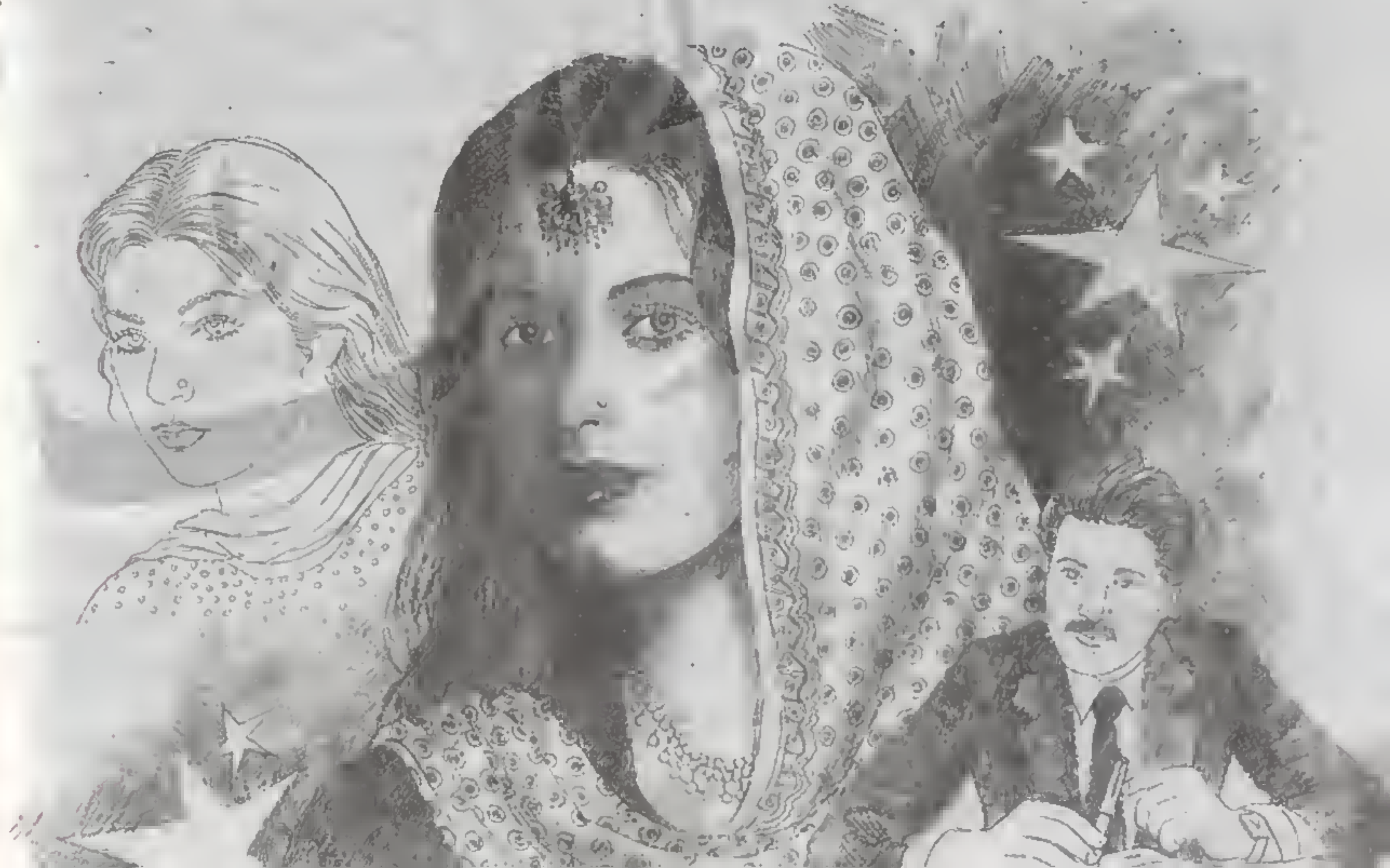

کی ضد کا کیا کرتیں، جو دوسروں کی دیکھا دیکھی نئے جوتوں اور کپڑوں کا تقاضا کررہے تھے۔ خالد امان نے سنبل کی شادی کی تیاری کے سلسلے میں زبردستی پانچ ہزار تھمائے تھے۔ مگر بجلی کا دو مہینے کا بل جمع ہوگیا تھا سو پہلے اسے بھر آئیں۔

سائرہ قہقہے کی آواز پر اپنی سوچوں سے باہر نکل آئی۔ چونک کر کامنی سی نند کو دیکھا، جو بھائیوں کے مذاق پر ہنستے ہنستے دہری ہورہی تھی۔ اس کی شرارتیں دیکھ کر اس کے دل سے سارے گلے شکوے خود بخود ختم ہوگئے، جو مہندی والے دن اس کی انار کلی سوٹ سینے کی ضد کے باعث پیدا ہوئے تھے۔

مایوں کے زرد لباس میں سنبل کی سونے سی دمکتی رنگت ہنستے ہوئے سرخی مائل ہوگئی۔ اس کی نرم گوری باہیں اوپر تک لگی ہوئی راجستھانی مہندی کے ڈیزائن سے سج رہی تھیں۔ سائرہ نے جلدی سے مشین چھوڑی۔ بنارسی کپڑا ایک طرف احتیاط سے رکھا اور پیار سے نازو کا ماتھا چوم ڈالا۔ دل ہی دل میں چاروں قل پڑھ کر اس کی صبیح پیشانی پر پھونک ماری۔

سنبل نے بھی موقع کا فائدہ اٹھایا اور بھابھی کے گلے لگ گئی۔ وہ اس کے مرحوم خالہ زاد بھائی راحیل کی بیوی تھیں۔ شوہر کی زندگی میں بلبل کی طرح چہچہانے والی بھابھی، اب ہونٹوں پر خاموشی کی مہر ثبت کیے سر جھکائے ایک ایک کے بتائے ہوئے کام سرانجام دیا کرتیں۔ سنبل کا حساس دل ان کے لیے بہت کڑھتا۔

یہ ہی صحیح موقع تھا۔ اس نے اپنی دوست صائمہ کو کچھ اشارے کیے۔ وہ اٹھی اور دوسرے کمرے سے ایک بڑا سا تھیلا لا کر سائرہ کے سامنے لا دھرا اور کمرے سے نکل گئی۔

"بھابھی پلیز...... ڈانٹیے گا نہیں...... اتنا ارجنٹ اور خوبصورت سوٹ سینے کا شکریہ میں اسی طرح سے ادا کرسکتی تھی۔" سنبل نے بڑے پیار سے وہ سامان بھابھی جی کو تھمایا اور بڑے مان سے بولی۔

"یہ...... سب کیا ہے نازو؟" انہوں نے حیران نظروں سے دیکھا، پھر اس کے اصرار پر تھیلا کھولا تو دق رہ گئیں۔ اس میں ان کے اور بچوں کے شادی کی تقریب میں پہننے کے قیمتی لباس موجود تھے۔

"پلیز...... یہ ساڑھی میری شادی کے دن ضرور پہنیے گا۔ سسرال جانے والی ہوں۔ اتنی چھوٹی سی بات منوانے کا حق تو رکھتی ہوں نا؟" اس نے شاپر میں سے ساڑھی نکال کر ان کی گود میں رکھتے ہوئے مان سے کہا۔

وہ پیچ کلر کی میرون بارڈر والی قیمتی بنارسی ساڑھی تھام کر بری طرح سے رو دیں۔ ایسے کپڑے تو وہ مرحوم شوہر کی زندگی میں پہنا کرتی تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد ایک نجی اسکول میں نوکری کررہی تھیں۔ تنخواہ قلیل تھی۔ پھر چار بچوں کا ساتھ بھی تھا۔ لہٰذا اتنی مہنگائی میں گزارا مشکل ہی سے ہوتا تھا۔ اسی لیے خاندان بھر کے کپڑوں کی سلائی کرکے گھر کے بقیہ اخراجات پورے کرنے کی کوشش کرتیں۔ ساس سسر تھے نہیں۔ اماں ابا خود بھائیوں کے آگے مجبور۔ سو زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے پورے خاندان میں جس گھر شادی ہوتی، جہیز کے کپڑوں کی سلائی ٹکائی سے لے کر مہمانوں کی تواضع کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیتیں۔ اس طرح ان کی سال میں دو ایک بار الگ سے معقول آمدنی ہوجاتی، مگر سنبل کی بات اور تھی۔ اس گھر کے ان کے کاندھوں پر بہت احسانات تھے۔ ان کے منع کرنے کے باوجود بچوں کی پڑھائی کا خرچا سنبل کے ابا نے زبردستی اٹھایا ہوا تھا۔ ان کی خوددار طبیعت پر یہ بہت گراں گزرتا، مگر "مجبوری کا نام شکریہ۔" اسی لیے اکثر وہ چھٹی والے دن یہاں آکر زبردستی سنبل کی اماں جنہیں وہ خالہ اماں کہتی تھیں کے کئی کام نمٹا جاتیں، جانتی تھیں، نازو ایک نمبر کی موڈی ہے، دل چاہا تو خوب کام کرلیا۔ ورنہ اماں کی ڈانٹ پھٹکار کے باوجود کمرے میں بند اپنی پسندیدہ کتابوں سے ناتا جوڑے رکھتی، بہنیں سب شادی شدہ تھیں۔ اس لیے بھائیوں سے لاڈ اٹھانے کے لیے گھر میں یہ ایک ہی

پیس بچا تھا۔ اپنی اس اہمیت کا اندازہ بھی تھا، جس کا وہ خوب فائدہ اٹھاتی۔

اب شادی میں دن ہی کتنے رہ گئے تھے۔ تیاریاں اختتامی مراحل میں داخل ہوچکی تھیں۔ جہیز کے جوڑے بڑی نفاست سے پیک کردیے گئے تھے۔ اچانک سنبل ایک میگزین میں ماڈل کو گلابی بنارسی چوڑی دار پاجامہ اور دھانی شیفون کا کلیوں والے کرتا پہنے دیکھ کر مچل اٹھی۔

"میں چوتھی کے دن یہ ہی لباس پہنوں گی۔ ورنہ دعوت میں نہیں آؤں گی۔"

سب سمجھا سمجھا کے ہار گئے کہ وقت کم ہے، اس سے اچھا اور بھاری سلا سلایا جوڑا بازار سے آجائے گا مگر وہ نازو تھی۔ جہاں اٹک جاتی، وہاں سے نکلنا مشکل ہوجاتا۔ کھانا پینا چھوڑ کے بیٹھ گئی، یہ الگ بات ہے کہ صائمہ کی جانب سے برگر، جوس اور فرنچ فرائز کی بیرونی امداد جاری تھی۔ نازو چپکے چپکے یہ چیزیں اڑاتی اور گھر والے سمجھتے کہ وہ بھوک ہڑتال پر ہے۔

سائرہ جو پہلے ہی بچوں کی شاپنگ کی ضد کی وجہ سے چڑچڑی ہورہی تھیں۔ انہیں سنبل کی بے وقت کی راگنی بالکل نہ بھائی۔ مگر حکم نامے کے آگے مجبور ہوگئیں۔ ایسے وقتوں میں اپنی مجبوریوں کا احساس بڑھ جاتا تھا۔ پھولے منہ سے دو دن میں سلائی مشین کے سامنے جت کر ایسا شاندار جوڑا تیار کیا کہ جس نے دیکھا سراہا۔ چوڑی دار پاجامے اور کلی والے کرتے کی سلائی مکمل ہوچکی تھی۔ دوپٹے میں نفیس سی بیل کی ٹکائی کا کام زاہدہ نے اپنے ذمہ لے لیا۔ ہر ایک سنبل کی پسند اور اعلا ذوق کو سراہ رہا تھا۔ اس پر سائرہ بھابھی کی سلیقہ مندی کا کمال۔ مگر جوڑا تیار ہونے کے بعد نازو نے نظر بھر کر بھی نہ دیکھا۔ اس کی نگاہیں تو راحیل بھائی کے بچوں کے چہروں سے ہٹ نہیں رہی تھیں، جہاں نئے کپڑے حاصل کرنے کی خوشی چہروں پر انوکھی چمک بن کر ابھری ہوئی تھی۔

سائرہ بھابھی بھی کافی دنوں کے بعد مطمئن نظر آرہی تھیں۔ ان کے دل سے سنبل کے لیے بس دعائیں ہی نکل رہی تھیں۔ وہ ایسی ہی تھی۔ بظاہر لاابالی۔ لیکن ہمیشہ اپنے اردگرد والوں کے لیے حساس۔ بچوں کی ضد اور پھر بھابھی کا دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھنا کئی دن سے اس کے مشاہدے میں تھا۔ جانتی تھی کہ سائرہ بھابھی کی خودداری اس سے ایسے ہی کپڑوں کے لیے پیسے لینے پر رضامند نہیں ہوگی۔ یوں اس نے ایک بیچ کی راہ نکالی۔

مہندی والے دن سنبل راج ہنس کی طرح گردن اٹھائے تخت پر بیٹھی سب کی محبتیں وصول کررہی تھی۔ اس کی گود میں سائرہ بھابھی کا گڈو تھا۔ جسے وہ اپنے ہاتھوں سے ناشتا کرا رہی تھی۔ وہ بھی بڑی رغبت سے اپنی پیاری آپا سے کھا رہا تھا۔

”اے اللہ جی جیسے اس بچی نے یہاں میرا اور میرے بچوں کا بھرم رکھا ویسے ہی زندگی کے ہر موڑ پر تو بھی اس کا بھرم رکھنا۔ سسرال میں اس کا دل رکھنے والوں سے واسطہ پڑے۔ یہ ہمیشہ خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھولے۔“

سائرہ نے کھلکھلاتی ہوئی نازو کو دیکھ کر دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے۔ آنسو لڑیوں کی طرح ایک کے بعد ایک ان کے شفاف گالوں پر بہے چلے جا رہے تھے جنہیں انہوں نے اپنے نماز کے سفید دوپٹے میں جذب کر ڈالے۔ ہمیشہ رونا دکھی نہیں کرتا۔ کبھی کبھی رونے سے من کو بڑا قرار حاصل ہوتا ہے۔ سائرہ بھی اس وقت ایسی ہی کیفیت سے دوچار تھیں۔

✡ ✡ ✡

”آپی! میرا موبائل فون نہیں مل رہا۔ کیا آپ نے کہیں دیکھا ہے؟“ سفیان عالم الجھا ہوا سا پوچھ رہا تھا۔

”اس وقت تمہارے لیے صرف اپنی دلہن اہم ہونی چاہیے.... ناکہ باقی چیزیں۔ فی الحال ساری باتوں کو چھوڑ دو اور اس کی فکر کرو، جو تمہارے سہارے اپنے پیاروں کو چھوڑ کر یہاں آئی ہے۔“ انہوں نے ناراضی سے کہا۔

”کیا ہے آپی .... آپ کی بات مان لی نا؟ لے آیا نا آپ کی پسند کی لڑکی... پلیز اب آپ مجھ سے مزید کسی اور بات کی امید نہ رکھیں۔“ وہ روٹھا روٹھا سا بولا تو وہ مسکرائیں۔ اس نے چڑ کر باہر کی جانب قدم بڑھایا تو وہ گھبرا کر اس کے پیچھے لپکیں۔

”پلیز بیٹا.... ہمارے بندھے ہوئے ہاتھوں کی لاج رکھ لو۔ نئی دلہن کے سامنے ہمیں شرمندہ مت کروا دینا، آج اس کے کمرے میں چلے جاؤ۔“

ریحانہ عالم نے سفیان کے آگے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے تو وہ شرمندہ ہو گیا۔ دماغ تو آپی کے فیصلے کو صحیح مانتا تھا، مگر اس دل کا کیا کرتا، جو اس کے قابو میں نہ رہا تھا۔ ہمک ہمک کے سحرش درانی کی جانب لپکتا تھا۔ ریحانہ نے نظر بھر کر بھائی کی ذہنی کیفیت کو جانچا۔

سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے سفیان انہیں اولاد کی طرح عزیز تھا۔ سفیان کی وجاہت میں کوئی کلام نہ تھا، اس پر سفید شیروانی پر ڈل گولڈن کڑھائی، میرون پٹکا، پیروں میں سفید کھسہ پہنے وہ کسی اور ہی دیس کا شہزادہ لگ رہا تھا، روٹھا ہوا شہزادہ جسے فوری طور پر منانا بہت ضروری تھا۔

انہوں نے بڑی منت سماجت کر کے اسے حجلہ عروسی میں بھیجنے کے لیے تیار کیا، جہاں اس کی شہزادیوں سی آن بان والی کم عمر دلہن محو انتظار تھی۔ سنبل کا انتخاب انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔

آخر بڑی بہن کے بندھے ہاتھوں پر اسے ترس آ ہی گیا۔ وہ کمرے کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔

انہوں نے سکون کی سانس لی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ مسلسل ایک ہفتے سے جاری شادی کی گہما گہمی میں وہ سونے کو ترس گئی تھیں۔ آج کمرے کی خاموشی بہت بھلی لگ رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے نرم و ملائم بستر پر نیم دراز ہو گئیں۔

اچانک فضا میں چھائے ہوئے سکوت کو موبائل کی تیز آواز نے توڑا انہوں نے بیڈ کے سائیڈ میں رکھا ہوا موبائل ناگواری سے اٹھایا، اس پر ”سحر کالنگ“ چمک رہا تھا۔ سحر کا نام پڑھتے ہی ان کے منہ میں کڑواہٹ سی گھل گئی۔ انہوں نے موبائل آف کر کے اپنے تئیں سحرش کا منہ بھی بند کر دیا۔ یہ سفیان کا موبائل تھا، جو وہ اپنے کمرے میں بھول گیا تھا۔ جب وہ دلہن کو وہاں بٹھانے گئیں، تو خاموشی سے موبائل ہاتھوں میں دبائے باہر آ گئیں۔

”یا اللہ! ہم نے اپنے بھائی کی بھلائی کے لیے بڑا رسک اٹھایا ہے۔ تو غیر بچی کے سامنے ہمیں سرخرو رکھنا۔ کہتے ہیں نکاح کے بولوں میں بڑی طاقت ہے تو ہمارے بھائی کو عقل سلیم عطا فرما۔ وہ اپنی منکوحہ کے سحر میں ایسا گرفتار ہو جائے کہ اس کو گناہ کی جانب راغب کرنے والی ساحرہ کا جادو دھرا کا دھرا رہ جائے۔“

ریحانہ نے اللہ سے بعد خشوع و خضوع سے دعا مانگی۔ تب کہیں جا کر ان کے بے قرار دل کو سکون حاصل ہوا۔

✡ ✡ ✡

سنبل نے دروازہ کھلنے پر گھبرا کر گھونگھٹ نکالا، مگر سفیان اس کے پاس آنے کے بجائے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

”دولہا میاں.... تو عجیب ہیں۔ لگتا ہے اپنی شادی کی بریانی کچھ زیادہ ہی کھالی ہے۔ جب ہی تو مسلسل ٹہل کر ہضم کر رہے ہیں۔ ویسے تصویر سے بھی زیادہ ڈیشنگ ہیں۔ کاش! یہاں صائمہ ہوتی تو مل کر ریکارڈ لگاتے۔“ سفیان کے ٹہلنے پر سرخ سنہری شیفون کے زرتار دوپٹے سے چپکے چپکے جھانکتے ہوئے سنبل نے دل ہی دل میں عادت کے مطابق تبصرہ کیا، اور پھر اپنی بے تکی خواہش پر بے اختیار اس کا قہقہہ نکل گیا۔ کسی دلہن نے اپنے شادی کی پہلی رات ایسی خواہش کی ہوگی کہ دوست کے ساتھ مل کر اپنے دولہا کا مذاق اڑائے۔ مگر وہ نازو تھی، کچھ بھی کر سکتی تھی۔

سفیان چونک اٹھا۔

”یہ ہنسی تھی یا رونی تھی؟“ وہ پریشان ہو کر گلاب کے پھولوں سے سجے بستر پر جا بیٹھا اور دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ سحرش کی بابت نئی دلہن کو بتائے۔ پھر خیال آیا کہ پہلے آپی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے جو منہ دکھائی دی تھی۔ وہ تو دلہن کے حوالے کی جائے۔ سرخ ڈبا کھول کر دیکھا تھا تو، سونے کی چین میں چھوٹا سا جڑاؤ ”ایس“ کا لاکٹ جگمگا رہا تھا۔ دل ہی دل میں ان کی پسند کو داد دی۔ پھر ایک دم خیال آیا کہ ہم دونوں کے نام ایک ہی حرف تہجی سے شروع ہوتے ہیں۔ اس اتفاق پر مسکراہٹ خود بخود ہونٹوں پر بکھر گئی۔ بڑی ہمت کر کے دلہن کا گھونگھٹ اٹھایا تو دم بخود رہ گیا، وہ تو تصویر سے بھی زیادہ سبک نقوش کی حامل، نازک اندام تھی۔ سفیان بھول گیا کہ کیا کہنے آیا تھا۔ ایک ٹک من موہنی صورت کو تکے گیا۔ دل کا موسم ایک دم ہی خوشگوار ہو گیا۔ اتنی دیر کی چھائی خاموشی سے سنبل، گھبرا اٹھی۔

بھاری پلکوں کی چلمن اٹھائی۔ اپنے وجیہہ دولہا کو دیکھا تو نشیلی آنکھوں کا جادو چل گیا۔ اس کا دل پھڑپھڑا کر اپنی نئی نویلی دلہن کے مہندی لگے پیروں میں لوٹنے لگا۔

سفیان کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی انجانی طاقت اسے باور کرا رہی ہو کہ ”یہ ہی جائز اور سچا رشتہ ہے“ جو نکاح کے مقدس بولوں کے بعد ان دونوں کے بیچ قائم ہو چکا ہے۔ پھر کہاں کا غصہ اور کہاں کا احتجاج۔ وہ تو پہلی رات ہی بیوی پر ایسا فدا ہوا کہ ’سحرش درانی کی بناوٹی محبت ہوا ہو گئی۔

✡ ✡ ✡

ریحانہ نے جب صبح بھائی بھاوج کو ہنستے مسکراتے کمرے سے باہر آتا دیکھا تب جا کر ان کے پھڑپھڑاتے دل کو سکون حاصل ہوا۔ وہ پوری رات انہوں نے کانٹوں پر بسر کی تھی۔ تاہم اب وہ خوش تھیں کہ سفیان نے ان کے بندھے ہاتھوں کی عزت رکھ لی تھی۔ انہیں ابھی اس بات کا اندازہ نہیں ہوا تھا کہ سنبل کی من موہنی صورت نے سفیان کو پہلی نظر کی محبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ رہی سحرش کی محبت تو وہ محبت نہیں بچپنا تھا۔ ایسے ہی جیسے کسی بچے کو آگ کے پاس جانے سے روکا جائے اور وہ ہمک ہمک کے اس طرف بڑھتا رہے۔

✡ ✡ ✡

”آپی..... لائیے میں سفیان کا ناشتا تیار کر دوں۔“ لاپروا سی سنبل اپنی عادت کے مطابق سلوٹ زدہ سوٹ میں سر جھاڑ منہ پہاڑ کچن میں آ کھڑی ہوئی۔

”نہیں بیٹا..... ناشتا تیار ہے۔ آپ پہلے کمرے میں جا کر اپنا حلیہ درست کریں۔ پھر ٹیبل پر آئیے گا۔“

انہوں نے سر تا پا اس کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیا اور سنجیدگی سے گویا ہوئیں۔ سنبل خواہش کے باوجود کچھ نہ کہہ سکی اور خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ سنبل کو کبھی کبھی ریحانہ آپی کی

شخصیت اسرار میں لپٹی ہوئی نظر آتی تھی یا ہو سکتا ہے کہ یہ سب کا وہم ہو۔ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ وہ جہاں تک چاہتیں، سامنے والا ان سے بے تکلف ہو پاتا۔ مگر جہاں سے ان کی حدود و قیود کا آغاز ہوتا مخاطب کو احساس ہو جاتا اور اسے پسپائی اختیار کرنی پڑتی۔

شادی کو مہینہ سے زیادہ ہو چکا تھا۔ مگر سنبل ابھی تک ان کے مزاج کو سمجھ نہیں پائی تھی۔ بظاہر اس کے ساتھ ان کا رویہ بہت محبت آمیز تھا۔ مگر جب کئی جگہوں پر اس کی لاابالی فطرت ان کے اصولوں سے ٹکراتی تو وہ اسے یوں پیار سے گھیرتیں کہ اس کے پاس سوائے ان کی بات ماننے کے کوئی چارہ نہیں رہتا۔ خاص طور پر اس کی تیاری اور سنگھار کے حوالے سے وہ بہت فکر مند رہتیں۔ وہ اسے ہمیشہ نک سک سے درست دیکھنا چاہتی تھیں۔ اکثر وہ کپڑے بھی آپی کے انتخاب کیے ہوئے پہنتی۔ ساری زندگی بے فکری سے گزارنے والی نازو کو اس مقام پر آکر تھوڑی مشکلات کا سامنا تھا۔ اسے لگتا کہ وہ ایک کٹھ پتلی میں تبدیل ہو چکی ہو، جس کی ڈور اس کی نند کے ہاتھوں میں چلی گئی ہو۔ مگر جب وہ شوہر کی پیار لٹاتی نگاہوں کو اپنے آس پاس مچلتے دیکھتی تو دل پر چھائی ساری کدورت دور ہو جاتی۔

ریحانہ آپی سب بھائی بہنوں میں بڑی تھیں۔ دو بہنیں شادی کے بعد امریکا اور کینیڈا سدھار گئی تھیں۔ یہاں یہ تینوں بھائی بہن ہی تھے۔ سفیان کے دوسرے بھائی فرقان کی خواہش کے باوجود آپی اپنے لاڈلے کے پاس رہنے کو ترجیح دیتیں۔ وہ بظاہر بے ضرر سی تھیں۔ مگر سنبل کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ "سفیان ہاؤس" کا پتا بھی ان کی مرضی کے بغیر نہیں ہلتا۔ یہاں سارے کاموں کے لیے نوکر چاکر موجود تھے۔ بس کھانا پکانے کی ذمہ داری گھر کی عورتوں پر تھی۔ ریحانہ بڑی خوشی سے ان دونوں کے لیے نت نئے پکوان پکاتیں اور پیار سے کھلاتیں۔ سفیان بھی آپی کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔

شادی کے شروع دنوں میں اس کی جٹھانی نے اس

کے پوچھنے پر بتایا تھا کہ "آپی کی شادی دو سال تک قائم رہی تھی۔" مگر اس سے زیادہ تفصیل نہ انہوں نے بتائی۔ نہ اس کی پوچھنے کی ہمت ہوئی۔

اب دوبارہ سے تجسس نے سر اٹھایا تو اس نے آپی کی شادی شدہ زندگی کے بارے میں شوہر کو کریدا۔ مگر اس معاملے پر اس نے ہمیشہ کی طرح خاموشی اختیار کر لی اور محبوب بیوی کو ٹال دیا۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو نند کی اتنی اہمیت پر بیر باندھ لیتی۔ مگر وہ بھولے دل والی مست ملنگ نازو تھی۔ اسی لیے زندگی خوشگوار طریقے سے گزر رہی تھی۔

"ارے آپی..... سنبل کہاں ہے؟" سفیان آفس جانے کے لیے تیار ہو کر ناشتے کے لیے ٹیبل پر آیا تو بہن کو گرم گرم پراٹھے میز پر رکھتے دیکھ کر پوچھا۔ آج اس نے صبح خصوصی طور پر سنبل کو اٹھایا تھا کہ آفس کے پہلے دن اسے سنبل کے ہاتھوں کا ناشتا چاہیے۔

"بس بیٹا..... شاید تم لوگ رات کو بہت دیر سے سوئے تھے۔ وہ بے چاری کچن میں آئی تو اس کی آنکھیں نیند سے بند ہو رہی تھیں۔ ہم نے اسے واپس کمرے میں بھیج دیا۔ ویسے بھی تم ہمارے ہاتھوں کے پراٹھے کھانے کے عادی ہو نا۔" انہوں نے پھولا پھولا پیاز والا آملیٹ اس کی پلیٹ میں رکھتے ہوئے اتنے مان سے کہا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی خاموش ہو گیا۔ ورنہ اس کی خواہش تھی کہ دفتر جاتے ہوئے بیوی اپنی پیاری مسکراہٹ سے نوازے۔

وہ مایوس سا گاڑی میں بیٹھنے لگا۔ اچانک دوسری طرف سے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھلا۔ خوشبوؤں میں بسی سنبل جدید انداز میں سلا ہوا میرون کرتا اور ٹراؤزر پہنے گاڑی میں داخل ہوتے ہی دل میں اترتی چلی گئی۔

"کیا بات ہے تمہاری..... بیوی! اب کس ظالم کا آفس جانے کو دل چاہے گا۔" ہاتھوں میں گلاب کی کلی لیے پیار بھرے انداز سے رخصت کرنے پر سفیان کے دل کی کلی کھل اٹھی۔ اسے کھینچ کر نزدیک کر لیا۔ سنبل کے بالوں سے اٹھنے والی مسحور کن خوشبو سے وہ مدہوش ہونے لگا۔ پھر اس کے دھکیلنے پر ہوش کی دنیا

میں واپسی ہوئی۔

"اب آفس جائیے بھی..... دیر ہو رہی ہے۔" سفیان کے التفات پر وہ محجوب ہو کر بولی۔ شرم کی لالی نے صبح کی روشنی میں اس کے حسین گالوں کو اور جاذب نظر بنا دیا تھا۔

"ہاں! جانا تو ہے۔ آج آفس کا پہلا دن ہے چھٹی بھی نہیں کر سکتا۔ ورنہ فرقان جان سے مار دے گا۔ خیر تم شام تک یوں ہی مہکتی رہنا۔ میں واپس آکر تم سے نبٹتا ہوں۔" سفیان نے بیوی کا ہاتھ نرمی سے دبا کر معنی خیز انداز میں ایک آنکھ دبائی۔ وہ مزید سرخ ہو گئی تو سفیان کا قہقہہ بلند ہوا۔ بڑی مشکلوں کے بعد اسے گاڑی سے اترنے کی اجازت ملی۔ وہ متوالی چال چلتی ہوئی گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہوئی۔ ریحانہ نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے میاں بیوی کو چونچلے کرتے دیکھا سفیان کی گاڑی گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ انہوں نے آیت الکرسی پڑھ کر ہوا میں پھونک ماری۔

☼ ☼ ☼

"آپی..... آج میں لنچ میں ہرے مسالے کی بریانی بنا لوں؟ سفیان کا ہاف ڈے ہے نا، خوش ہو جائیں گے۔" سنبل فارغ رہتے رہتے بے زار ہو گئی تھی، تو ہمت کر کے ان سے اجازت مانگی۔

"ارے واہ..... ہم دونوں کی سوچ کتنا ملنے لگی ہے..... ہم نے بھی آج کے مینو میں یہ ہی پکانے کا سوچا تھا۔ صبح اٹھ کر پہلا کام یہ ہی کیا کہ ہرے مسالے کی گریوی بنا کر رکھ دی۔ ایسا کرنا تم سفیان کے آنے سے قبل چاول کی تہہ لگا کر گرم گرم بریانی تیار کر لینا۔" انہوں نے پیار سے کہا تو وہ ان کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

"یہ کیا..... تم ابھی تک نائٹ گاؤن بس پھر رہی ہو؟ سفیان کے آنے سے قبل نہا دھو کر وہ والا بے بی پنک کرتا اور ٹراؤزر پہن لینا، جو ہم اس دن طارق روڈ سے لائے تھے۔" اس نے ان کی بات دھیان سے سنی ہی نہیں۔

"اف! کیا میں اپنی مرضی سے شوہر کی پسند کا کھانا بھی نہیں پکا سکتی۔" ان کے کمرے سے نکلتے ہوئے یہ سوچ اس کے چہرے پر واضح نظر آ رہی تھی۔ ریحانہ سوچ میں پڑ گئیں۔

وہ کافی دیر بعد جب نہا دھو کر اپنے کمرے سے باہر نکلی تو اسے اپنے بدصورت رویے کا احساس ہوا۔ دل میں کچھ ڈر بھی گئی ریحانہ آپی کو ڈھونڈنے لگی۔ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ کچن میں چولہے کے پاس کھڑی بریانی کا مسالا بھون رہی تھیں۔ اس کا دل ان کی غلط بیانی پر خراب ہو گیا۔ وہ ان کو مخاطب کیے بغیر کچن کے دروازے سے ہی لوٹ گئی۔

ریحانہ نے میز پر کھانا لگانے کے بعد بھائی بھاوج کو بلوایا۔ سنبل سرخ سوٹ میں پھولے منہ کے ساتھ کھانے کی میز پر پہنچی۔ سفیان بھی چپ چپ سا تھا۔ ریحانہ کی تجربہ کار نگاہوں سے یہ بات چھپی نہ رہ سکی کہ ان دونوں کے درمیان کچھ ان بن ہوئی ہے۔

آج پہلی بار سنبل نے اپنی پسند کے کپڑے پہنے تھے۔ یہ جانے بغیر کہ اس شدید گرمی میں اس کا سرخ جوڑا دیکھنے والی آنکھ کو بھلا لگنے کی جگہ برا لگ رہا تھا۔ دونوں خاموشی سے کھانا کھا کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ریحانہ ٹیبل پر گم صم سی بیٹھی رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

ریحانہ ایک ہفتے سے محسوس کر رہی تھی کہ وہ سنبل کو جس کام کا بھی کہتیں، وہ اس کا الٹ کرتی۔ سفیان کا رویہ ان کے ساتھ نارمل تھا۔ لیکن اس نے اپنے سارے ذاتی کام سنبل سے کرانے شروع کر دیے تھے۔ ایک دن وہ کسی کام سے ان کے کمرے کے آگے سے گزریں تو اپنا نام سن کر رک گئیں۔ اندر سے ہلکی ہلکی تکرار کی آواز آ رہی تھی۔

سنبل مسلسل ان کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھی اور سفیان اسے ڈانٹ رہا تھا۔ انہیں پوری بات تو سمجھ میں نہیں آئی۔ مگر یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ جھگڑے کی وجہ وہ ہی ہیں۔ ان کا دل ٹوٹ گیا۔ وہ مرے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔ رات بھر جاگ

کرایک فیصلے پر پہنچیں۔ جلدی جلدی اپنا سامان پیک کرنے لگیں۔

چھٹی والا دن تھا۔ صبح ہوتے ہوتے بھی بارہ بج گئے۔ انہوں نے فرقان کو فون کیا۔ دوپہر تک وہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ خوشی خوشی بڑی بہن کو لینے پہنچ گیا۔ ریحانہ کے ہاتھوں میں بہت ذائقہ تھا۔ وہ اعلا درجے کی منتظم تھیں۔ جہاں بھی جاتیں، گھر والوں کی چاندی ہوجاتی۔ اسی لیے فرقان کی بیوی بھی انہیں خوش آمدید کہتی۔ مگر انہوں نے ہمیشہ سفیان کے گھر رہنا پسند کیا تھا۔ تاہم بعض وجوہات کی بنا پر ان کا یہاں سے جانا ناگزیر ہوگیا تھا۔

آپی کو یوں اچانک سامان باندھے، جانے کے لیے تیار دیکھ کر سفیان کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ اس نے خونخوار نظروں سے بیوی کو گھورا اور آپی کی منت سماجت کرنے لگا کہ وہ نہ جائیں۔ سنبل کو بھی عجیب سے احساس نے آگھیرا۔ بہرحال وہ دل کی بری نہ تھی، آپی کا ہاتھ تھام کر ان سے رکنے کی درخواست کرنے لگی تو انہوں نے اسے گلے لگا کر پیار کیا اور جانے کی اجازت طلب کی۔ سفیان کی حالت دیکھ کر ان کا دل پسیجا۔ مگر دماغ نے اپنے فیصلے پر ڈٹے رہنے کی صلاح دی اور وہ اب دل سے زیادہ دماغ کی سنتی تھیں۔ اس لیے ان دونوں کو پیار کرکے فرقان کی گاڑی میں جا بیٹھیں۔

☼ ☼ ☼

"اف! آٹھ بج گئے۔ میری تو خیر نہیں..... آج پھر دیر ہوگئی۔"

سنبل نے جلدی سے سفیان کو اٹھا کر باتھ روم بھیجا۔ رات کو ٹی وی پر ان کی پسندیدہ فلم آرہی تھی رات گئے تک جاگنے کی وجہ سے آنکھ دیر سے کھلی۔ جلدی جلدی کچن کی طرف دوڑ لگائی۔ فریج کھولا تو یاد آیا کہ گندھا ہوا آٹا ختم ہوگیا تھا۔ سوچا تھا، صبح جلدی اٹھ کر گوندھ لوں گی۔ جانتی تھی کہ سفیان ناشتے میں ہمیشہ گرما گرم پراٹھے کھاتا ہے۔ فریج میں نظر دوڑائی۔

شکر ہے، ڈبل روٹی موجود تھی۔ دودھ اور انڈا پھینٹ کر ابھی فرنچ ٹوسٹ بنانا شروع ہی کیے تھے کہ سفیان دفتر سے لیٹ ہوجانے کا شور مچانے لگا۔ اس نے جلدی سے چائے دم کی اور ڈرتے ڈرتے ناشتا ٹیبل تک لے کر پہنچی۔

"یہ کیا ہے؟ اتنا پھیکا۔ لگتا ہے، چینی ڈالنا بھول گئی ہو۔" سفیان نے توس پلیٹ میں پٹخا اور جلدی جلدی چائے پی کر ٹشو سے ہاتھ پونچھا۔ ایک نگاہ غلط انداز بیوی پر ڈالی اور کوفت میں مبتلا ہوگیا۔ قمیص پر جابجا تیل کے دھبے، بکھرے بال اور پھیکے چہرے کے ساتھ سفیان کا چھوڑا ہوا توس دانتوں سے کتر کر چیک کررہی تھی۔ وہ شادی کے شروع کے دنوں والی سنبل کو ڈھونڈتے ہوئے بیگ اٹھا کر باہر نکل گیا۔

"سو..... سوری سفیان! میں جلدی میں انڈے دودھ کے آمیزے میں چینی ملانا بھول گئی۔ دو منٹ رکیے گا۔ میں دوسرے بنا کر لاتی ہوں۔"

وہ آواز دیتی رہ گئی۔ مگر سفیان نہیں رکا۔ وہ شوہر کی بے اعتنائی پر حیران رہ گئی۔ شدید غصہ آیا تو زور سے توس والی پلیٹ زمین پر دے ماری۔ اچانک زور کا رونا آیا۔ میز پر سر ٹکایا اور پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

آپی کے جانے کے بعد اس نے سارے کام اچھے طریقے سے کرنے کی بڑی کوشش کی۔ مگر کوئی نہ کوئی کسر رہ ہی جاتی۔ نازو نے زندگی کو ہمیشہ ہلکے پھلکے انداز میں جیا تھا۔ میکے میں اس سے محبت کرنے والے لوگ بستے تھے، جو اس کی ہر غلطی کو بچپنا کہہ کر بھول جاتے۔ میکے میں تو اس کے ہاتھ کے بنائے ہوئے شوقیہ پکوانوں کی اس طرح تعریفیں کی جاتیں، جیسے وہ کسی ماہر شیف نے پکائے ہوں۔ وہ اسی پر پھولے نہ سماتی۔ تاہم سسرال میں اتنے دباؤ میں کام کرنا اس کے لیے بہت مشکل ثابت ہورہا تھا۔ بڑی احتیاط سے کام کرنے کی وجہ سے شاید اس سے غلطیاں سرزد ہوجاتی تھیں۔

اتنا وقت چولہے کے سامنے کھڑے رہنے اور ڈر ڈر کے کھانا پکانے کے بعد میاں جی کو کھلانا ایک نیا امتحان

ثابت ہوتا۔ اتنے مسئلے مسائل سے نمٹنے کے بعد کس کے پاس اتنا وقت ہوتا کہ خوب بجے سنورے۔ اسے جو کپڑے سامنے نظر آتے، پہن کر تیار ہوجاتی، کبھی کبھی تو جو صبح جوڑا پہنتی تو رات تک اسے بدلنے کا ہوش نہیں ہوتا، یہاں تک کہ دوبار سفیان نے اسے ٹوکا کہ "کپڑے بدل کر آؤ، تمہارے پاس سے پیاز، لہسن کی مہک آرہی ہے۔" اور وہ شرمندہ سی کپڑے تبدیل کرنے چل پڑتی۔

☼ ☼ ☼

سفیان، ریحانہ آپی کے ہاتھوں بگڑا ہوا تھا، ان کے ساتھ رہ کر وہ ہر چیز میں پرفیکشن کا اتنا عادی ہوچکا تھا کہ اسے بیوی کی چھوٹی سی غلطی بھی بہت بڑی نظر آتی۔ ریحانہ بھائی کی مزاج آشنا تھیں۔ اسی لیے سنبل کو آہستہ آہستہ اس کے رنگ میں ڈھالنے کی کوشش کررہی تھیں۔ مگر وہ ان کے بے حد خلوص کو سمجھ نہ پائی۔

سفیان کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ ماں کے انتقال کے بعد سے آپی سے خاصا مانوس رہا تھا۔ ایک طرح سے ان دونوں کے بیچ بھائی، بہن کا نہیں، ماں بیٹے جیسا رشتہ قائم تھا۔ ان کے یوں گھر سے چلے جانے پر وہ بہت بے چین رہنے لگا۔ ویسے بھی چھوٹا ہونے کے باعث وہ پہلے ہی بہت جذباتی تھا۔ کوئی بھی فیصلہ کرتے ہوئے دماغ کی جگہ دل کی سنتا تھا۔ اب آپی کے اس گھر سے چلے جانے کی وجہ سنبل ہی کو سمجھتا تھا۔ اسی بات پر دل ہی دل میں بیوی سے خفا تھا۔

سنبل جی جان سے شوہر کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتی تھی۔ مگر جب میاں جی اس کے ہر کام کا موازنہ اپنی آپی سے کرتے تو وہ ہار سی جاتی۔ اپنے تئیں سوچتی تھی کہ "اس کی بس یہ ہی غلطی ہے نا کہ وہ اپنے شوہر کے معاملات میں کسی تیسرے کی دخل اندازی برداشت نہیں کرپارہی تھی، تو یہ کوئی ناجائز بات تو نہیں تھی۔" نئی نئی شادی کا نشہ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اپنے آگے کوئی دوسرا نظر ہی نہیں آتا۔ اسی لیے اسے

اس وقت بہت سی باتوں کا صحیح طور پر ادراک نہیں ہوا تاہم ہم اب آہستہ آہستہ آپی کی قدر محسوس ہونا شروع ہوچکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اف اماں..... مجھے تو آپ کے ہاتھوں کا آلو قیمہ اور پوڑی کھانی ہے۔" وہ بہت دنوں بعد میکے آئی تو اماں کی گود میں لیٹ کر فرمائشیں کرنے لگی۔

"میری گڑیا..... جو بھی کھائے گی، میں پکاؤں گی"

زاہدہ نے بیٹی کے روکھے بالوں کو سلجھایا اور اس کے چیخنے کے باوجود کس کر چوٹی باندھ دی۔ وہ ہاتھ دھو کر آئیں، تو سنبل تخت پر بیٹھی لال تربوز کاٹنے سے بچوں کی طرح خوش ہو ہو کر کھا رہی تھی۔ شادی کے بعد بھی اس کے چہرے کی ملائمت اور معصومیت میں کمی نہیں آئی تھی۔ تاہم چہرے کی رنگت پھیکی پڑگئی تھی۔ انہیں اپنی نازو پر پیار آگیا۔

"ایک بات پوچھوں بیٹا؟" انہوں نے اسے اپنے ہاتھوں سے تربوز کھلاتے ہوئے پوچھا۔

"ہیں اماں..... یہ آپ کو مجھ سے کوئی بات پوچھنے کے لیے اجازت کب سے درکار ہونے لگی؟" وہ کھلکھلا کر بولی۔

"بس بیٹا..... شادی کے بعد بیٹی میکے میں مہمان جیسی ہوجاتی ہے، خیر یہ بتاؤ! تمہاری نند کا کیا قصہ ہے؟"

سنبل کو اندازہ تھا کہ اماں جی یہ سوال ضرور کریں گی۔ اسی لیے اس نے سچ سچ ساری کتھا سنا ڈالی۔ اپنی غلطیوں کا بھی اعتراف کیا۔ ان کے داماد میاں کی بے رخی کی بھی شکایت کی۔ زاہدہ کی پرسوچ نگاہیں سنبل کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ وہ ایک حقیقت پسند خاتون تھیں۔ چاہتیں تو بیٹی کی پیٹھ تھپک کر تسلی دے دیتیں، لیکن وہ ایسے ہی تو اتنا بڑا سسرال لے کر نہیں چل رہی تھیں، سو بیٹی کو حقیقت کا آئینہ دکھانے لگیں۔

"دیکھو نازو..... شادی کے بعد زندگی صرف ایک

مرد کے سہارے نہیں گزرتی۔ بلکہ یہ تو ایک ایسے بندھن کا نام ہے، جو دو خاندانوں کے ملاپ کا ذریعہ بنتا ہے۔ ایک لڑکی یا لڑکا کئی طرح کے نئے رشتوں کی ڈور میں بندھ جاتے ہیں اور وہ لڑکیاں خوش قسمت سمجھی جاتی ہیں جنہیں سسرال میں کوئی ایسا پرخلوص رشتہ میسر آجائے، جن کی وجہ سے زندگی میں آسانیاں پیدا ہو سکیں نہ کہ مشکلات۔ یقیناً" اس کے پس منظر میں پیاروں کی دعاؤں کا بہت عمل دخل ہوتا ہے۔" انہوں نے محبت سے اس کے بال سنوارے وہ بہت غور سے ماں کی باتیں سن رہی تھی۔

"میری ایک بات گرہ سے باندھ لو۔ وہ عورتیں عقلمند ہوتی ہیں، جو شادی کے بعد شوہروں کی مرضی کے تابع ہو کر انہیں بادشاہ بنا دیتی ہیں اور دلوں پر ملکہ بن کر حکومت کرتی ہیں۔ اس لیے اپنے شریک حیات کی خوشنودی کو اولیت دو۔ میرے حساب سے تمہاری نند ایک پرخلوص عورت ہے۔ تمہاری جذباتیت نے اس کے دل کو ٹھیس پہنچائی ہوگی۔ اسی لیے داماد جی بھی خفا ہیں"۔ ماں کا تجربے کا کوئی مول نہیں، بیٹی کو اچھی طرح سمجھا دیا۔

"مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے..... خیر! آپ پریشان نہ ہوں۔ میں کچھ کرتی ہوں۔" اس نے ماں کے اتنے لمبے لیکچر کو ہنس کے سہا، زاہدہ کو لگا آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ برتن سمیٹے اور کچن کی طرف چل دیں۔

سنبل کے لیے سسرالیوں کے نام پر ریحانہ آپی ہی ایسی پرخلوص ہستی تھیں، جنہیں وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔ مگر دو مہینے کے تجربے کے بعد اسے احساس ہوا کہ ان کے زمانے میں وہ کیسے ویلی پھرتی تھی۔ نک سک سے سجی سنوری، خوشبوؤں میں بسی سفیان کے دل کی رانی بنی ہوئی تھی۔ اتنی اچھی گزر رہی تھی، پھر من میں ایسی گرہستن بننے کی کیا سمائی کہ اپنے پیروں پر خود ہی کلہاڑی مار بیٹھی۔ سنبل نے دل ہی دل میں کئی بار اپنے آپ کو کوسا۔ امی کے گھر سے واپسی پر کئی بار آپی کے مسئلے پر سفیان سے بات کرنے کی بھی ٹھانی۔ مگر اس کے بدلتے رویوں کے باعث ہمت جواب دے گئی۔

"فرقان! ہم نے سفیان کی شادی سے قبل تمہارے اوپر ایک ذمہ داری لگائی تھی نا! اب ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمیں اسی بارے میں تازہ احوال سے آگاہی دو۔" رات کو جب فرقان عادت کے مطابق بڑی بہن کے ساتھ کچھ وقت گزارنے آیا تو انہوں نے اس کے سر کا مساج کرتے ہوئے بات چھیڑی۔

"آپی..... میں خود آپ سے اس بارے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔ مگر ہمت نہ ہوئی۔" وہ جھجک کر خاموش ہو گیا۔ ان کے سامنے یوں سر جھکا کر بیٹھنے میں اسے ہمیشہ مزا آتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کی مساج کرنے والی نرم انگلیوں سے سکون کی لہریں نکل کر دماغ میں جذب ہو رہی ہیں۔

"ہاں..... تم کچھ بتا رہے تھے؟" انہوں نے تیل کی شیشی کا ڈھکن بند کر کے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔

"جی..... آج کل دوبارہ سے سفیان اور سحرش درانی میں گاڑھی چھن رہی ہے۔" اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔ بڑی بہن کو اشاروں میں جو سمجھانا چاہ رہا تھا، سمجھا دیا۔ الگ الگ رہائش کے باوجود دونوں بھائی ابھی تک اپنے والد کے مشترکہ خاندانی کاروبار سے جڑے ہوئے تھے۔ اس لیے ایک دوسرے کی خبر رکھنے میں چنداں دشواری نہ تھی۔

"ہوں..... اسی لیے ہم نے دو، تین بار سنبل کو فون کیا تو اس سے پتا چلا کہ سفیان میاں آفس سے کام کی زیادتی کے باعث آج کل گھر لیٹ آرہے ہیں۔" انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے بھائی کو بتایا۔

سحرش ان کے والد کے کاروباری حلیف کی بیٹی تھی۔ دو شوہروں کو بھگتا چکی تھی۔ ایک کی زندگی کم ثابت ہوئی تو دوسرا اس کی بدمزاجی کو زیادہ دن نہ سہار سکا اور علیحدگی اختیار کرلی۔ باپ کے کاروبار اور شوہروں کی جانب سے ملنے والے پیسوں کی وجہ سے

فراوانی کا عالم تھا۔ اولاد کے نام پر ایک بیٹا تھا، جسے وہ آیا کے حوالے کر کے مطمئن ہو گئی تھی۔

سحرش عمر میں سفیان سے اچھی خاصی بڑی ہونے کے باوجود اس کے سامنے گڑیا سی لگتی۔ وہ ہر مہینے ایسے ہی تو ہزاروں روپے اپنی شخصیت کی خوبصورتی برقرار رکھنے کے لیے بیوٹی پارلر اور جم وغیرہ کو ادا نہیں کرتی تھی۔

سفیان اسے پہلی نظر میں ہی بھا گیا تھا۔ جسے اس نے اپنے تئیں تیسرے شوہر کے طور پر منتخب کرلیا تھا۔ وہ بہانے بہانے سے اس سے ملاقاتیں بڑھا رہی تھی۔ اپنی ناکام عائلی زندگی کے خود ساختہ قصے سنا کر اس کے کاندھوں سے سر ٹکا کر آنسو بہاتی۔ سحرش کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ اس لمبے چوڑے، مردانہ وجاہت سے بھرپور شخص کے اندر ایک جذباتی بچہ چھپا ہے۔ جس کا ذوق بہت اعلا ہے۔ وہ اچھی خوشبو شوخ رنگوں کا شوقین اور اچھے پکوانوں کا شیدائی ہے۔ دو شوہروں کو نمٹانے والی ایک گھاگ عورت کے لیے اس کی نفسیات سے کھیلنا کچھ مشکل نہ تھا۔ ہر کام اس کی پسند اور مزاج کے حساب سے کرنے لگی۔ بڑے سے بڑے ریسٹورنٹ کا کھانا بڑے اہتمام سے لنچ میں لاتی اور سفیان کو یہ کہہ کر کھلاتی کہ اس نے خود گرمی میں کھڑے ہو کر سفیان کے لیے پکایا ہے۔ سفیان اپنی اہمیت پر خوش ہو جاتا، یہ جانے بغیر کہ اتنے کم ٹائم میں اتنے مشکل پکوان پکانے کے ساتھ وہ اتنا تیار ہو کر وقت پر آفس کیسے پہنچ جاتی ہے۔ اس پر تو بس سحرش کی سلیقہ مندی کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔

سحرش نے رفتہ رفتہ اس کو اپنی توجہ کا اتنا عادی بنالیا کہ وہ اس سے شادی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ فرقان پہلے تو یہ ہی سمجھتا رہا کہ ان دونوں کے درمیان بے ضرر سی دوستی ہے۔ مگر آفس میں ہونے والی چہ مگوئیوں نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔ پانی سر سے اونچا ہوتا دیکھ کر اس نے فوراً" ریحانہ آپی سے اکیلے میں ملاقات کی۔ ان کے تو ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔

سفیان ابھی صرف پچیس برس کا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ صحیح سے اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے، تو اس کی شادی کے بارے میں سوچیں گی۔ مگر یہاں تو بھائی میاں ہاتھوں سے نکلے جا رہے تھے۔ انہوں نے پہلا کام لڑکی ڈھونڈنے کا شروع کیا۔ آخر رشتہ کرانے والیوں کے ذریعے انہوں نے سنبل نامی گوہر نایاب ڈھونڈ نکالا۔ بات طے کرنے سے قبل انہیں سفیان کی شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے دل و دماغ پر تو سحرش کا نشہ سوار تھا۔ انہوں نے پہلی بار بھائی کی کسی خواہش کو رد کیا تھا۔ اس کے زیادہ شور مچانے پر انہوں نے اسے دھمکی دی کہ

"ٹھیک ہے..... تم سحرش سے شادی کرلو۔ مگر پھر ہم ہمیشہ کے لیے فرقان کے گھر شفٹ ہو جائیں گے اور تم سے کوئی واسطہ نہیں رکھیں گے۔"

یہ سفیان کا ویک پوائنٹ تھا۔ اس بات کو سنتے ہی اس کی محبت سمندر کے جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ ریحانہ جانتی تھی کہ وہ ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی لیے بھائی کو منانے کے لیے انہوں نے یہ داؤ کھیلا اور جیت ان کا نصیب بنی۔

"بعض رشتے وہ ہوتے ہیں جو ہمیں قدرت کی طرف سے ملتے ہیں، جیسے ماں بہن، باپ بھائی وغیرہ ..... اور کچھ رشتے وہ ہوتے ہیں، جو ہم دنیا میں اپنے خلوص و اخلاص کی وجہ سے قائم کرتے ہیں، جیسے پڑوسی، دوست احباب وغیرہ۔ شادی کے بعد قائم ہونے والے رشتوں کا شمار بھی ان ہی میں ہوتا ہے۔ بعض اوقات ہماری محبت، نیک نیتی، تابعداری اور سلیقہ مندی ہمیں ان لوگوں سے یوں جوڑے رکھتی ہے کہ خونی رشتے بھی ان کے آگے دھندلا جاتے ہیں۔ میری مثال تمہارے سامنے ہے۔ میں اپنے گھر والوں سے زیادہ اپنے سسرال والوں کی شیدائی ہوں۔"

سائرہ نے پیار سے سنبل کو سمجھایا۔ ان کی زبان

سے تیز ان کے ہاتھ چل رہے تھے۔ قورمے کے لیے چکن کو بھوننے کے ساتھ شاہی ٹکروں کی تیاری کا کام بھی جاری تھا۔

سفیان نے آفس سے قبل سنبل کو بتایا تھا کہ اس کے دوست کی فیملی کئی سالوں بعد امریکا سے وطن لوٹی ہے۔ ان لوگوں کو سفیان کی دلہن سے ملنے کا اشتیاق ہے۔ اسی لیے اس نے انہیں رات کے کھانے پر مدعو کرلیا ہے۔

سنبل کو تو اتنی گرمی میں دعوت کے بارے میں سنتے ہی چکر آنے لگے۔ ویسے بھی دو چار دنوں سے اس کی طبیعت گری گری سی تھی۔ دن میں ہلکا ہلکا بخار بھی ہو جاتا تھا۔ مگر سفیان کے پاس اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ وہ بیوی کو ڈاکٹر کے پاس لے جائے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس سے پوچھے بغیر دوست کی دعوت رکھ لی۔ نازو سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر تک تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے۔ ایک دم اس کے ذہن میں سائرہ بھابھی کا نام ستارے کی طرح چمکا۔ اس نے مسکراتے ہوئے ان کا نمبر ڈائل کیا اور طبیعت کی خرابی کا بتا کر مدد کی درخواست کی۔ وہ رکشہ پکڑ کر گھنٹے بھر میں اس کے گھر پہنچ گئیں۔

پہلے تو نازو کو ایسے اجڑے بجڑے حال میں دیکھ کر بھونچکا رہ گئیں۔ بے قرار ہو کر اسے گلے لگایا تو وہ ان سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اسے کچن کی ٹیبل پر بٹھایا۔ لیموں پانی بنا کر پلایا۔ اس کے بعد بل دار پراٹھے اور کباب کا ناشتا کرایا۔ جب اس کی طبیعت سنبھلی تو دعوت کی تیاری کے ساتھ ساتھ اس سے ساری باتیں اگلوالیں۔ سنبل کو بھی حال دل سنانے کے لیے کسی ہمدرد کی ضرورت تھی۔ اس نے الف سے ی تک ساری کتھا سنا ڈالی۔

"اب میں کیا کروں؟ سفیان کی ناراضی مجھ سے جھیلی نہیں جارہی۔" اس کا گلوگیر لہجہ سائرہ کے دل پر آرے چلا رہا تھا۔ وہ اس نازو کو یاد کرنے لگیں، جس کے قہقہے پورے گھر میں گونجتے تھے۔

"تم جانتی ہو بیٹا۔۔۔۔ کہ زندگی بھی سکے کے دو پہلوؤں کی طرح ہوتی ہے۔ جس کے ایک طرف خوشی تو دوسری طرف غم کا چہرہ ہوتا ہے۔ وہ لوگ خوش قسمت ہوتے ہیں جن کے حصے میں خوشی کا پہلو نکل آئے۔۔۔۔ تو پھر قدرت کی فیاضیوں کی دل سے قدر کرنی چاہیے نا۔" ان کا لہجہ معنی خیز تھا۔ سنبل نے سرہلا کر ان سے اتفاق کیا۔ وہ جب سے آئی تھیں۔ اسے سمجھانے کا بیڑا اٹھایا ہوا تھا۔

"میں تمہیں ایک بتاؤں ۔۔۔۔ تمہاری شادی کے وقت میرے لبوں پر ایک ہی دعا تھی کہ تمہارا واسطہ قدردان لوگوں سے پڑے۔ جیسے میکے میں تمہارے ناز نخرے اٹھائے جاتے تھے۔ ویسے ہی تم سسرال میں بھی ہنستی مسکراتی رہو۔ ریحانہ آپی کی شکل میں میری دعا کو قبولیت حاصل ہوئی۔ مگر یہ ناقص العقل انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا۔ خیر جو ہوا، سو ہوا۔۔۔۔ اب تم اپنی نند کو پورے مان سمان سے منا کر واپس گھر لاؤ۔۔۔۔ دیکھنا! تمہارے سارے مسئلے خود بخود حل ہو جائیں گے۔"

انہوں نے نصیحتوں کے دوران اس کی وارڈروب سے بری کے جوڑوں سے بہت نفیس سا گہرا نیلا اور آسمانی امتزاج سے بنا ہوا گھیردار انگرکھا اور بنارسی چوڑی دار پاجامہ ہینگر میں لٹکا کر اسے نہانے بھیج دیا۔

"بھابھی! آپ۔۔۔۔ صحیح کہتی ہیں۔ مجھ سے غلطیاں ہوئی ہیں۔ اب میں ان کا ازالہ کروں گی۔ کل ہی جاکر ریحانہ آپی کو جیسے بھی ہوگا، منا کر لاؤں گی۔ اس اکیلے گھر میں رہتے ہوئے اور بیماری کے دوران مجھے احساس ہوا کہ میرے اور اس گھر کے لیے ان کا وجود کتنا اہم ہے۔"

صحیح فیصلے پر پہنچ کر وہ جیسے خود بھی ہلکی پھلکی ہوگئی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اپنے بالوں کو آئرن کرتے ہوئے اس نے اعتراف کیا۔ سائرہ اس کی تیاری میں مدد کروا رہی تھیں۔ انہوں نے مسکرا کر معصوم سی نازو کو دیکھا، جو صاف دل کی تھی۔

"ہاں۔۔۔۔ مگر اس سے قبل ایک اہم کام کرنا پڑے گا۔" انہوں نے اس کے کانوں میں سلور جھمکے پہنائے اور اس کے نازک سے لٹکتے ہوئے موتی کو انگلی کی پور سے چھو کر ہلایا۔

"وہ کیا بھابھی؟" ان کی بے ضرر سی شرارت پر وہ مسکرا دی۔

"کسی گائنا کالوجسٹ سے ملتی جانا۔۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ جب تم انہیں پھوپھی بننے کی نوید سناؤ گی تو وہ خوشی خوشی واپسی کی راہ پکڑیں گی۔" انہوں نے اس کے ہاتھوں میں سفید موتیے کے گجرے پہناتے ہوئے اپنی تجربے کار نگاہیں اس پر مرکوز کیں، وہ جھینپ گئی۔

دعوت بہت اچھی رہی۔ سائرہ بھابھی کی وجہ سے اس کا اعتماد کسی حد تک لوٹ آیا تھا۔ بہت دنوں بعد اسے سفیان کی نگاہوں میں اپنے لیے ستائش نظر آئی۔ وہ اس کا بازو تھامے ہنستی مسکراتی اس کے دوست کی فیملی سے مل رہی تھی۔ اتنا پیارا جیون ساتھی پانے پر اس کے دوست کی بیوی سفیان کو خوش قسمت ٹھہرا رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"فرقان بیٹا۔۔۔۔ رات بھر ہم بہت بے چین رہے۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔ کیا تم ہمیں آفس جاتے ہوئے سفیان کے گھر چھوڑ دو گے؟" وہ ناشتا کر رہا تھا کہ بڑی بہن نے جھجکتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔۔ پھوپھو! ہم ابھی آپ کو جانے نہیں دیں گے۔ کیا آپ کو یہاں رہنا اچھا نہیں لگتا؟" فرقان کے دونوں بچے یونیفارم میں تیار بیٹھے اسکول وین کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک دم ان سے آکر لپٹ گئے۔ وہ دونوں کو چمٹا کر پیار کرنے لگیں۔

"نہیں بچو! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" انہوں نے چھوٹے لڑکے شاہ زیب کو گود میں اٹھا لیا۔ وہ ان سے بہت مانوس تھا۔ وہ اسے پیار کرنے لگیں۔

"آپی۔۔۔۔ کیا میری کوئی بات، ناگوار گزری ہے؟" فرقان کی بیوی فائزہ نے گھبرا کر ان کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کو اپنی بڑی نند سے بہت سہارا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہیں۔ آپی کی موجودگی میں بچوں کی تربیت بھی صحیح خطوط پر ہو رہی تھی۔ ورنہ یہ ہی بچے تھے، جو پہلے ہر بات میں ضد کرتے تھے۔ ہوم ورک میں کام چوری، کھانے سے بے رغبتی۔ مگر آپی کو بچوں کو بڑے اچھے طریقے سے ہینڈل کرلیتیں۔ اسکول میں بھی ان کی پروگریس اچھی ہوگئی تھی۔

"ارے! نہیں۔۔۔۔ ہم نے ہمیشہ بھابیوں کو اپنی چھوٹی بہنوں کی طرح سمجھا ہے۔ ہمیں تم لوگوں سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ بلکہ تم سب کی وجہ سے ہی ہمارا مان قائم ہے۔"

انہوں نے فائزہ کو پیار سے بانہوں کے گھیرے میں لے کر اس کی چمکتی پیشانی کو چوم لیا۔ وہ خود بھی بہت اچھی لڑکی تھی۔ اس نے انہیں کبھی بھی شکایت کا کوئی موقع نہیں دیا تھا۔ ان کو ہمیشہ یہاں رہنے میں کوئی عار نہیں تھا مگر اس دل ناداں کا کیا کرتیں، جو سفیان میں اٹکا ہوا تھا۔

"بس بیٹا۔۔۔۔ تمہارے چاچو کو ہمارے بغیر رہنے کی عادت نہیں ہے نا۔۔۔۔ وہ ہمارے بغیر تھوڑا بگڑ بھی گئے ہیں اس لیے ان کو سدھارنے کے لیے ہمارا وہاں ہونا ضروری ہوگیا ہے۔ فکر نہیں کرو۔ ہمیں تم سب سے بھی بہت پیار ہے۔ اس لیے ہم نے سوچا ہے کہ ہفتے میں ایک دن، ہم یہاں آکر گزاریں گے۔"

انہوں نے دونوں بچوں کے پھولے ہوئے گالوں پر بوسہ دیتے کہا، تو بچے جو ایک دم مایوس نظر آرہے تھے۔ ان کے چہروں کی رونق بحال ہوگئی۔ فرقان ان لوگوں کی محبتوں کو مسکرا کر انجوائے کر رہا تھا۔ وہ بھی آپی کو یہاں سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ مگر سفیان سے بھی بہت محبت کرتا تھا۔ جانتا تھا کہ چھوٹا کتنا متلون مزاج ہے۔ اس کا دماغ ٹھکانے پر رکھنے کے لیے کسی بڑے کا سایہ اس کے سر پر ہونا ضروری ہے۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری گاڑی کی چابی اٹھائی اور آپی کو چلنے کا اشارہ کیا۔

☼ ☼ ☼

"ڈاکٹر صاحبہ۔۔۔۔ کیا آپ سچ کہہ رہی ہیں؟ جانے

کیوں...... مجھے یقین نہیں آرہا۔" ڈاکٹر سمعی خالد شہر کی مشہور گائناکالوجسٹ تھیں۔ انہوں نے سنبل کے ایک ٹیسٹ اور مکمل چیک اپ کے بعد جب سفیان کو باپ بننے کی خوش خبری سنائی تو وہ خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس نے اسی وقت ہزار ہزار کے کئی نوٹ نکال کر ایک نرس کو تھمائے کہ مٹھائی منگوا کر پورے اسٹاف میں بانٹ دی جائے۔

"یہ کافی کمزور ہیں...... آپ کو ان کا خصوصی خیال رکھنا پڑے گا۔ یہ کچھ طاقت کی دوائیں اور ڈائٹ چارٹ بنا کر دے رہی ہوں۔ امید ہے کہ ان پر عمل کروایا جائے گا۔"

ڈاکٹر صاحبہ کے لیے یہ کوئی نہیں بات نہیں تھی ان کا واسطہ اکثر ایسے سرپھروں سے پڑتا تھا' جو پہلی بار باپ بننے کی خوشی میں اسپتال میں ہی بھنگڑا ڈالنے کو تیار نظر آتے۔ انہوں نے پہلے مسکرا کر سنبل کو دیکھا۔ پھر دوائی کا پرچا سفیان کی طرف بڑھایا۔ وہ دونوں مسکراتے ہوئے اسپتال سے باہر آگئے۔

"اف جان...... آج تم نے ہماری زندگی کو مکمل کردیا ہے...... مجھے اتنی بڑی خوشی دی ہے' جس کا کوئی بدل نہیں...... مانگو! تم کیا مانگتی ہو۔ آج تو جان بھی مانگو گی تو دینے سے دریغ نہیں کروں گا۔" اس نے پیار سے سنبل کو تھام کر گاڑی میں یوں بٹھایا' جیسے وہ شیشے میں ڈھل گئی ہو۔ وہ اس وقت شہنشاہ جذبات بنا ہوا تھا۔ سنبل کو لگا کہ اپنی بات منوانے کا یہ ہی صحیح وقت ہے۔

"عالی جاہ...... ایک تو آپ...... بندی کی تمام خطاؤں کو بخش دیں۔ دوسرا فرقان بھائی کو فون ملائیں۔ آپی کو تیاری کے لیے دس منٹ دیں۔ ان سے کہیں' ہم انہیں لینے آرہے ہیں۔ اس خوشی کی وہ ہی سب سے بڑی حق دار ہیں۔"

اس نے بڑی ادا سے جھک کر اسے سلام پیش کیا اور مسکرا کر بولی۔ سفیان بھی یہ ہی سوچ رہا تھا۔ مگر سنبل کے منہ سے یہ بات سننے کے بعد اس کا دل باغ باغ ہوگیا۔ ابھی وہ اس کو کوئی جواب دیتا کہ موبائل بجنے لگا۔

"فرقان کالنگ"

"شیطان کا نام لیا' شیطان حاضر......" اس نے ہنستے ہوئے بیوی سے کہا اور فون پر "یس" کا بٹن دبایا۔

"جی بھائی!"

"ارے کہاں ہو بھائی...... اتنی تیز دھوپ میں آپی اور میں تمہارے دروازے کے باہر کھڑے تالے کو گھور رہے ہیں۔" فرقان کی بات سننے کے بعد ان دونوں کے دلوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

"بس...... بس پندرہ منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔ پاگل آدمی! آنے سے قبل ایک فون کرلیتا' مگر...... خیر...... آپی کو گاڑی میں اے سی چلا کر بٹھا۔ دھوپ میں کیوں کھڑا کیا ہوا ہے؟"

اس کے کھنکتے لہجے پر سنبل نے شکر ادا کیا۔ اچانک موسم خوشگوار ہوگیا۔ کالے بادل امڈ کر برسنے کو بے قرار ہوگئے۔ کراچی کا موسم ایسا ہی تھا۔ ابھی تو کڑکتی دھوپ تھی۔ اب بوندیں برسنے کو تیار۔ ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے اسے مدہوش کیے دے رہے تھے۔

سفیان فون پر فرقان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں لگا ہوا تھا۔ اس کے اونچے اونچے قہقہے اس کی خوشی ظاہر کررہے تھے۔ سنبل نے طمانیت سے آنکھیں موندلیں۔

"آپی! اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک سوال کروں؟" سنبل' ریحانہ آپی کے ساتھ دوپہر کے کھانے کی تیاری کروارہی تھی۔ ان کا اچھا موڈ دیکھا تو پوچھ بیٹھی۔

"تم ہماری ازدواجی زندگی کی داستان سننا چاہتی ہونا؟" انہوں نے پوچھا' تو وہ ان کے اندازے پر ایک دم شرمندہ نظر آنے لگی۔

"اس کے لیے ہمیں شروع سے ساری باتیں بتانا ہوں گی۔ امید ہے کہ سب سننے کے بعد تمہارے ذہن میں موجود بہت سی گرہیں کھل جائیں گی۔" ریحانہ آپی نے لوکی چھیلتے ہوئے کہا تو اس نے اثبات میں سر

ہلایا۔

"یہ داستان ایک ایسی فرض شناس بہو کے اردگرد گھومتی ہے، جو سسرالیوں کو خوش کرنے کی فکر میں بیوی کے فرائض کی ادائیگی میں ناکام ثابت ہوئی۔"

انہوں نے دکھ بھرے کھوئے کھوئے لہجے میں بات شروع کی۔ سنبل نے دو کپ چائے بنالی تاکہ آرام سے ان کی کہانی سن سکے۔

"اماں نے ہماری شادی بہت کم عمری میں کردی تھی، جب ہم ایک بھرے پرے سسرال میں بڑی بہو بن کے گئے، تو شوہر کی منہ دکھائی سے قبل ہی ساس نے اصولوں کی فہرست تھمادی۔ جس میں سرفہرست یہ بات درج تھی کہ یہ غیر شادی شدہ نندوں اور دیوروں کا گھر ہے۔ اس لیے نئی نویلی بہو کو بہت محتاط رویہ اختیار کرنا پڑے گا۔ یہ نہیں کہ ہروقت خراب عورتوں کی طرح سجی سنوری، خوشبوؤں میں بسی پائل چھنچھناتی یہاں سے وہاں پھرو۔

وہاں ایک ٹائم ٹیبل کے تحت کام ہوتے تھے۔ ٹھیک آٹھ بجے ناشتا، ڈیڑھ بجے لنچ اور ساڑھے نو بجے ڈنر ٹیبل پر لگ جاتا تھا۔ اس کے بعد سارا کھانا فریج میں رکھ کر کچن صاف کردیا جاتا۔ اس لیے آپ کو بھوک ہو یا نہ ہو، سب کے ساتھ کھانے کی میز پر موجودگی ضروری ہے۔ گیارہ بجے باہر کے مین گیٹ پر بڑا تالا لگادیا جاتا۔ اس سے قبل سب کی گھر واپسی ضروری تھی۔

ہم حیران و پریشان اپنی ساس کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ کبھی شادی کی پہلی رات کسی دلہن سے ایسی باتیں کی گئی ہوں گی بھلا؟ مگر ہم منہ سے کیا کہتے۔ دل البتہ اندیشوں میں گھر گیا۔ تاہم ظفر اللہ ایک اچھے اور پیار کرنے والے شوہر ثابت ہوئے۔ شادی کے دس دن بعد ہی اماں جی نے ہمارا ہاتھ کھیر میں لگوایا دیا۔ یوں اتنے بڑے ٹبر کی ذمہ داری ہمارے نازک کاندھوں پر آپڑی۔ ہم بڑی کوشش کرتے کہ سب کو خوش رکھ سکیں۔ مگر اتنے سارے لوگوں کو ایک ساتھ خوش رکھنا کہاں ممکن ہوتا ہے، کھانے پینے میں سب کی پسند نا پسند الگ الگ تھی، جس کی پسند کی چیز دستیاب نہ ہو، اس کا منہ پھول جاتا۔

تاہم ہمیں سب سے زیادہ تکلیف اس وقت پہنچتی جب صبح سے ایک پیر پر ناچتے ناچتے تھکن سے چور بدن کے ساتھ رات گئے کمرے میں داخل ہوتے تو میاں جی خانگی معاملات سمجھنے کے بجائے رخ موڑ کر منہ پھلائے لیٹے ہوتے۔ یہاں سے ایک اور امتحان شروع ہوجاتا۔ آدھی رات تو ان کو منانے میں گزر جاتی۔ دوسرے دن فجر سے پھر وہ ہی روٹین شروع ہوجاتی۔ ظفر اللہ کا بھی اتنا قصور نہیں تھا۔ ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ وہ سول انجینئر تھے۔ بہت اچھی سرکاری نوکری تھی۔ ان کے سارے کولیگ اپنی بیویوں کے ساتھ پارٹیوں میں شرکت کرتے۔ ان کی بھی خواہش تھی کہ ہم بھی بن ٹھن کے ان کے ساتھ گھومیں پھریں۔ پارٹیاں اٹینڈ کریں۔ مگر ہماری ساس ایسے ہی موقع پر کوئی نیا کام نکال کر بیٹھ جاتیں۔ یوں شوہر کی ناراضی بڑھتی چلی جارہی تھی۔"

انہوں نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھے۔

"کیوں آپی! کیا آپ کی ساس اس معاملے میں بہت سخت تھیں؟" اس نے انہیں پانی پلاکر حوصلہ دیا، پھر پوچھا۔

"ہاں جی... اب ہم کیا کہیں... ان کی نفسیات ہی عجیب تھی۔ بیٹے کے اصرار پر بظاہر تو جانے کی اجازت دے دیتیں۔ مگر پیچھے سے دوسروں پر رکھ رکھ کر ایسے قصے سناتیں، جس کا لب لباب یہ ہوتا کہ فیشن کرنے والی عورتیں خراب ہوتی ہیں۔ گھومنے پھرنے والی عورتیں کبھی اچھی گرہستن نہیں بن سکتیں اور شوہروں سے شکایتیں لگانے والی عورتیں جہنمی ہوتی ہیں۔ غرض ہم ان ہی طعنوں سے ڈر کر ہم خود ہی جانے سے منع کردیتے۔

ہماری خاموشی پر ساسو جی کے مزے آگئے۔ آئے دن من چاہی خالہ پھوپھیوں کو جمع کرکے خاندان بھر کی بہوؤں کے بخیے اکھاڑے جاتے... اب تو ظفر اللہ بھی ہمارے کمرے میں آنے سے قبل سوچکے ہوتے۔

چھ مہینے میں ہماری نفاست پسندی، خوبصورتی کچن کے مرچ مسالوں کی نذر ہوگئی۔ ایک دن میاں جی سرشام ہی گھر آگئے۔ ہم ان کے لیے ایک کپ چائے بنا کر ان کے پاس جا بیٹھے۔ من ان سے بیٹھ کر باتیں کرنے اور ان کی ناراضی دور کرنے کو بے قرار ہورہا تھا۔

"آپ پلیز... کپڑے بدل کر آئیں، شاید مسالا بھونتے ہوئے کچن سے نکلی ہیں۔ مسالوں کی مہک آرہی ہے۔"

انہوں نے اس طرح رکھائی سے کہا کہ ہمارا دل ہی ٹوٹ گیا۔ ہم ان کے پاس سے خاموشی سے اٹھ گئے۔ اتنی دیر میں پورے گھر میں ہماری ڈھونڈیا مچی ہوئی تھی۔ میاں جی کی خالہ کو ہمارے ہاتھوں کا ہی قہوہ پسند تھا۔ اس لیے وہ ہمیں پکار رہی تھیں۔" بیتے دنوں کی تلخ یادوں کا احوال بیان کرنا ریحانہ کے لیے مشکل ثابت ہورہا تھا۔ سنبل نے ان کے کاندھے کو محبت سے دبا کر اپنے ہونے کا احساس دلایا۔

"ایک دن ہم پر قیامت ٹوٹ پڑی... جب میاں جی نے ہمیں پروانہ آزادی تھمادیا۔ ہم سے یہ غلطی ہوئی کہ پورے سسرال کو اپنا بنانے کی تگ ودو میں اس بات کو بھول گئے کہ جس کا ہاتھ تھام کر اس گھر کی بہو یا بھابھی بنے تھے، اس کا ہم پر سب سے زیادہ حق ہے۔ ظفر اللہ بہت نفاست پسند اور قدرے رنگین مزاج واقع ہوئے تھے۔ جب بیوی سے ان کی توقعات پوری نہیں ہوئیں تو وہ ادھر ادھر بھٹکنے لگے۔ ہمارے بیچ خلیج بڑھتی چلی گئی۔ ہم ایسے بے وقوف کہ شوہر کے من کے تقاضوں کو جان ہی نہ سکے۔ سر جھکائے سب کی خدمت میں لگے رہے۔ آنکھ تو اس وقت کھلی۔ جب انہوں نے اپنے دوست کی بہن سے عقد ثانی کرلیا اور ہمیں آزاد کردیا۔

وہ سارے رشتے جنہیں ہم اپنا بنانے چلے تھے۔ طلاق کے تین بولوں سے پرائے ہوگئے۔ روتے دھوتے گھر لوٹ آئے۔ اماں کا نازک دل یہ دکھ برداشت نہ کرپایا۔ انہوں نے دنیا سے ہی منہ موڑلیا۔ اس وقت سفیان سب سے چھوٹا تھا۔ ہم نے روتے دھوتے بھائی کو اپنی بانہوں میں بھرلیا اور دوبارہ شادی نہ کرنے کا عہد کیا۔ اس طرح زندگی کا یہ باب بند ہوا۔"

ریحانہ نے بڑی دقتوں سے اپنی داستان غم مکمل کی۔ سنبل کا دل بھی ان کے دکھ پر اداس ہوگیا۔

"تم جانتی ہو، ہمیں سفیان کے مزاج میں ظفر اللہ کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ اس لیے تمہیں اس امتحان سے بچانے کے لیے شروع سے ہی چولہا چوکی سے دور رکھا۔ پورے خلوص سے اس کی پسند میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ تب ہی تو تمہیں اس کے پسندیدہ رنگوں کے کپڑے پہننے پر مجبور کرتے، سنگھار کرواتے، خوشبو لگواتے۔ خیال تھا کہ باقی کاموں کے لیے تو زندگی پڑی ہے۔ مگر شادی شدہ زندگی کے ابتدائی خوشگوار پل گزر جائیں تو کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔ جو کچھ ہم نے جھیلا تھا ہم نہیں چاہتے تھے کوئی اور نو بیاہتا جھیلے۔ اسی لیے سب سے پہلے اپنے بھائی بھابھی کی خوشیوں کا خیال رکھنا ضروری سمجھا۔ شاید یہ بھی ہماری ایک غلطی تھی۔ تم نے ہمارے خلوص کو صحیح کسوٹی پر رکھ کر پرکھا ہی نہیں۔"

انہوں نے پہلی بار سنبل سے شکوہ کیا۔ اس نے شرمندگی سے سر جھکادیا۔ کبھی کبھی اندازے کی غلطی سے پیدا ہونے والی بدگمانی ایک انسان کو دوسرے انسان کے سامنے نظریں جھکانے پر مجبور کردیتی ہے۔ سنبل کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

لیکن اس سے اس نے ایک سبق بھی حاصل کیا تھا کہ آئندہ کبھی بدگمانی کے میل سے اپنے دل کو آلودہ نہیں کرے گی۔ کیونکہ بدگمانی سے آلودہ دل رشتوں کو بھی آلودہ کردیتا ہے۔

ایک عزم کے ساتھ سنبل نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور ریحانہ آپی کی طرف دیکھ کر کھلے دل سے مسکرا دی۔

سمیرا عثمان گل

رُجاؤں کا سفر

ہالینڈ کے شہر ڈین ہیگ کے ساحل کی گیلی ریت سورج کی روپہلی شعاعوں سے دمک رہی تھی۔ آج سورج روشن تھا اور ڈین ہیگ کے باسی دھوپ کو کسی رنگین تہوار کی مانند سیلیبریٹ کرتے تھے۔

بیلا کی سرمئی اداس آنکھوں نے دور تک ٹھاٹھیں مارتے سمندر کو دیکھا نیلگوں پانیوں میں جھلکتا اس کا عکس بے پناہ دلفریب تھا جینز کے پائنچوں کو فولڈ کرتے ہوئے اس کا دل چاہا وہ ایک ہی جست میں سارا سمندر پار کر جائے شاید اس کی ذات سے بچھڑا وہ ممتا کی شفقت سے بھرپور ہجر کا مارا وجود لہروں کے اس پار کہیں مل جائے۔ عجیب خواہش تھی سرمئی آنکھوں پر سایہ فگن پلکوں کی جھالر نم آلود ہو گئی۔

"بیلا کم آن۔" وہ چاروں اسے بلا رہی تھیں کیھترین نے فٹ بال اس کی سمت اچھال دیا تھا جسے اٹھانے کو وہ نیچے جھکی تو دور اپنی گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگا کر کھڑے مانیک کی نظریں اس کی گوری سڈول پنڈلیوں پر جم سی گئیں اس نے فٹ بال اٹھایا۔

فٹ بال لہروں پہ اچھلتا رینگتا ہوا اس کی سمت چلا آیا تھا اور وہ سنہری دھوپ سی لڑکی اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے اب اس کے مقابل کھڑی ہانپ رہی تھی۔

مکمل ناول

وہ بلاشبہ بہت حسین تھی یہاں موجود لڑکیوں میں سب سے زیادہ خوب صورت اور ممتاز۔

اس نے آگے بڑھ کر فٹ بال اٹھالیا اگرچہ یہ کافی نازیبا حرکت تھی مگر وہ اسے مزید کچھ پل نظروں کی گرفت میں رکھنا چاہتا تھا۔ نیچے بال اٹھانے کو جھکی بیلا نے اس بے ہودہ حرکت پر قدرے ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔ مانیک کے لبوں پر دوستانہ سی مسکراہٹ تھی۔

"فٹ بال واپس کرو۔" اس کا انداز روکھا سا تھا۔

وہ اپنی ماں الزبتھ کے ساتھ نیویارک میں رہتی تھی اس کا سارا بچپن، لڑکپن اور جوانی کا ابتدائی دور وہیں گزرا تھا۔ الزبتھ استھما کی مریضہ تھی اس کی اچانک ڈیتھ کے بعد چند روز قبل وہ ہالینڈ اپنے ماموں رابرٹ کے گھر شفٹ ہوئی تھی جو اپنی بیوی جینفر اور اکلوتی بیٹی کیتھرین کے ساتھ رہتا تھا۔

مانیک کو پہلی بار اس نے دو روز قبل یونیورسٹی میں دیکھا تھا۔ وہ بلا کا ہینڈسم اور ڈیشنگ تھا لیکن اس کا گیٹ اپ انتہائی لوفرانہ اور لاابالی لڑکوں جیسا تھا۔ وہ چین اسموکر تھا اور بیلا سگریٹ پینے والوں سے سخت الرجک تھی۔

ہاں وہ وائلن بہت اچھا بجاتا تھا اور یونیورسٹی کی ہر لڑکی اس کے وائلن پر فدا تھی۔

وہ اور کیتھرین پری انجینئرنگ کی اسٹوڈنٹس تھیں جبکہ مانیک ایم بی اے کے فائنل سمسٹر میں تھا اور اپنی تمام تر فضولیات کے باوجود وہ یونیورسٹی کا ذہین اور فعال اسٹوڈینٹ تھا۔

جو اپنے اساتذہ کا بے حد احترام کرتا تھا اور بوقت ضرورت ہر کسی کے کام آتا تھا۔

کیتھرین نے یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی اسے مانیک کے متعلق معلومات فراہم کردی تھیں مگر بیلا کو وہ بالکل پسند نہیں آیا تھا تب ہی تو اس کی دوستانہ مسکراہٹ کے باوجود بھی اس کا انداز روکھا سا ہی رہا تھا۔

"ہیلو مانیک! کم آن جوائن از۔" کیتھرین نے دور سے ہاتھ ہلاتے ہوئے اسے اپنے ساتھ کھیل میں شامل ہونے کی دعوت دی تو اس نے فٹ بال ہوا میں اچھال کر لہروں کے سپرد کردیا۔

اب کیتھرین، جولیا، سوزین اور انجلین کے ساتھ وہ بھی کھیل رہا تھا جبکہ بیلا منرل واٹر کی بوتل منہ سے لگائے بنچ پر بیٹھی بے نیازی سے بالوں میں انگلیاں چلا رہی تھی۔

اسے مانیک کا کھیل میں شمولیت اختیار کرنا اچھا نہیں لگا تھا جسے محسوس کرتے ہوئے مانیک کو افسوس سا ہوا۔

☼ ☼ ☼

واپسی پر انہوں نے گاڑی ایک اٹالین پزا شاپ پر روکی تھی۔ بیلا نے رسٹ واچ پر نگاہ دوڑاتے ہوئے آنکھوں کے خفیف سے اشارے کے ساتھ کیتھرین کو روکنا چاہا تھا جسے نظر انداز کرتے ہوئے وہ اس کا ہاتھ کھینچ کر گاڑی سے اتر گئی تھی۔

یہ ریڈ لینڈ کروزر سوزین کی تھی وہ کیتھرین کی سب سے امیر دوست تھی اس کا شمار ڈین ہیگ کی ٹاپ اپر کلاس فیملز میں ہوتا تھا، وہ اپنی دولت بے دریغ دوستوں پر لٹایا کرتی تھی اس کی وجہ سے وہ لوگ ان جگہوں پر بھی گھوم چکے تھے عام حالات میں جہاں جانے کا تصور بھی ناگزیر تھا۔

کیتھرین کو لگ رہا تھا وہ کسی نئی دنیا میں قدم رکھ چکی ہے بوائے فرینڈ، اور ڈسکو پارٹیز اب زندگی کا لازمی جز تھے بہت سی چیزیں تھیں جن کا ذائقہ اس نے پہلی بار چکھا تھا گناہوں کی لذت نے اس قدر مدہوش کیا کہ اب رابرٹ کے اصول اور ان پر لگائی گئی پابندیاں انتہائی دقیانوسی لگنے لگی تھیں۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ نن نہیں بنے گی اب زندگی کو اسے اپنی مرضی سے جینا تھا۔

پزا شاپ سے وہ چاروں اکیلی باہر نہیں آئی تھیں۔

اب ان کے ساتھ ان کے بوائے فرینڈز بھی تھے اور سب کا ارادہ کیسینو جانے کا تھا۔

"سوزین! مجھے راستے میں ڈراپ کردینا۔" بیلا نے کیتھرین کی ڈھٹائی پر کڑھتے ہوئے سوزین سے کہا تو پہلا اعتراض انجلین نے کیا۔

"گھر جاکر کیا کروگی؟ ہمارے ساتھ چلو۔ دیکھنا! تمہیں کتنا انجوائے کرواتے ہیں۔"

"اگر وہ نہیں جانا چاہ رہی تو زبردستی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" جولیا نے اپنے لبوں پر سرخ لپ اسٹک کی تہہ جماتے ہوئے "فوراً" بیلا کی حمایت کی۔ اس نے نوٹ کیا تھا کہ ہیلر کا دھیان اس سے زیادہ بیلا پر تھا وہ تو دل سے چاہ رہی تھی کہ بیلا ان کے ساتھ نہ جائے۔ سوزین نے اسے قریبی اسٹاپ پر اتار دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیتھرین کہاں ہے۔" جینفر آنٹی نے کھانا میز پر لگادیا تھا وہ فریش ہوکر نیچے آئی تو رابرٹ نے اس کے عقب میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ بیلا نے لب کھولے لیکن پھر جھوٹ بولنا پڑا۔

"انکل! ایک ضروری اسائنمنٹ تیار کرنا تھی، وہ انجلین اور جولیا سوزین کے گھر گئی ہیں۔"

"اتنی رات کو.....؟" ان کے ابرو تن گئے۔

"بیلا! یہ سوپ پروفیسر صاحب کو دے آؤ۔ ان کو کل رات سے فلو ہے۔" جینفر آنٹی نے اس کی مشکل آسان کردی تھی۔ وہ جھٹ سے باؤل تھام کر غائب ہوگئی۔ ورنہ رابرٹ انکل بال کی کھال اتارنے والوں میں سے تھے۔ ویسے بھی ان کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے تھا، وہ خود بھی چرچ میں بابو تھے اور ان کی خاندانی روایت کے مطابق کیتھرین کو آگے جاکر نن بننا تھا سو وہ بچپن سے ہی اس کی زندگی کے تمام معمولات پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھے۔

لیکن کیتھرین کے اندر جو بغاوتیں سر اٹھا رہی تھیں، بیلا ان کے متعلق سوچ کر کافی پریشان تھی۔

ان کے اپارٹمنٹ کے سامنے والا گھر پروفیسر ولیم کا تھا۔ وہ اکیلے رہتے تھے اور آج کل ریٹائرڈ لائف کے مزے لوٹ رہے تھے۔ بیلا اکثر فارغ وقت میں ان کے پاس آجایا کرتی تھی، وہ کافی پرخلوص اور خوش مزاج انسان تھے بڑھتی عمر اور بیماری نے بھی ان کے خوش گوار موڈ پر کوئی منفی اثرات مرتب نہیں کیے تھے۔

بیلا کو ان کی پرانی یادیں سننے میں بہت مزا آتا تھا، وہ بھی انتہائی ذوق و شوق سے اپنے قصے سنایا کرتے تھے جس سے دونوں کا بہت سارا وقت اچھا گزر جاتا تھا۔

☼ ☼ ☼

گرمیوں کی چلچلاتی دوپہروں میں جب سب لوگ گھروں میں دبکے آرام دہ ٹھنڈے کمروں میں خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ وہ عقبی صحن کے دالان میں ٹہلتی بے تحاشا بور ہو رہی تھی اسے شانی، ابا اور بی اماں سب یاد آرہے تھے، وہ اس وقت کو کوس رہی تھی جب اس پر میڈیکل کی ڈگری کا بھوت سوار

ہوا تھا اور وہ وادیٔ کوہستان کی نرم ٹھنڈی خوش گوار فضاؤں کو چھوڑ کر یہاں لاہور میں آن بسی تھی حالانکہ اس کے ساتھ پھوپھو ورنایاب اور زریاب بھی تھے۔

درنایاب تو یونیورسٹی سے آتے ہی کھڑکیاں بند پردے برابر کر کے بستر پہ ڈھیر ہو چکی تھی۔ رہا زریاب تو اس سے ابھی تازہ ترین جھگڑا ہوا تھا۔

دالان کے سامنے بڑا سا باغیچہ تھا جہاں آم کے درخت پر لگی کیریاں اسے دور سے ہی دکھائی دے گئی تھیں۔

"علی پور ایلی" کا اس کے بیگ میں تھا جو وہ کل ہی کالج سے لے کر آئی تھی اور اب جھولے میں بیٹھی کیری کو نمک مرچ لگا کر کھاتے ہوئے ناول پڑھنے میں ______ منہمک تھی۔

جھولے کے اوپر بوگن ویلیا کی بڑی بڑی بیلیں تھیں، چمن کے گلابی اور سفید پھول ہوا کے مدھم جھونکوں کے ساتھ اس کے زرد آنچل دامن اور جھولے کے اردگرد خشک گھاس پر گر رہے تھے۔

ابھی اس نے ایک صفحہ بھی ختم نہیں کیا تھا جب کوئی پتلی سی چیز اس کے پاؤں کے اوپر رینگی اور ساتھ ہی زریاب کی چیخ نما آواز۔

"سانپ سانپ۔" وہ ناول پھینک کر اچھلی اور بس پھر اس کی وحشت زدہ چیخوں نے سارا اکمال ہاؤس ہلا دیا۔

گہری نیند میں ڈوبی درنایاب کی آنکھ کھلنے کی وجہ یہ شور اور ہنگامہ ہی تھا اس نے سرعت سے اٹھ کر کھڑکی کھولی اور عقبی لان میں جھانکا۔ مہک ایک ٹانگ پر کھڑی آنکھیں بند کیے مسلسل چیخ رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر کھڑا زریاب اس کی حالت سے محظوظ ہو رہا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے یہ سب؟" اس نے آتے ہی کڑے تیوروں سے دونوں کو گھورا۔

"پھوپھو۔ سانپ" مہک روہانسے لہجے میں بولی۔

"کہاں ہے؟" اس نے ادھر ادھر جھانکا پھر زریاب کا کان کھینچ کر بولی۔

"کہاں ہے سانپ؟"

"کون سا سانپ۔" وہ یوں بولا جیسے سرے سے وہاں موجود ہی نہ ہو یا پھر صورت حال اس کے فہم سے بالاتر ہو یا یہ شوشا کسی اور کا چھوڑا ہوا ہو درنایاب نے کان پر گرفت مضبوط کر دی تھی۔ وہ درد سے بلبلا اٹھا۔

"میرا کان تو چھوڑیں۔" اس نے مصنوعی دہائی دی۔ مہک نے بند آنکھوں کے ساتھ ہی اپنے پیروں کی سمت اشارہ کیا تھا۔ درنایاب نے نیچے جھک کر دیکھا اس کی شلوار کے ساتھ گندم کا سٹہ چمٹا ہوا تھا۔

"مہک تم بھی نا۔" اس نے سٹہ اتار کر دور پھینکا۔

"تو پہلے اس نے ہی شور مچایا تھا۔" وہ کھسیانی سی ہو کر بولی۔

"تو تم نہ مچاتیں۔" وہ مزے سے بولا۔

درنایاب چلی گئی تو مہک خشمگیں نظروں سے گھورتے ہوئے تن فن کرتی اس پر جھپٹی۔

"میں تمہارا منہ نوچ لوں گی۔"

زریاب نے اس کے دونوں بازو اپنی مضبوط گرفت میں جکڑ لیے تھے۔

"نوچ کر دکھاؤ۔" وہ اس کی سنہری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اتنے گمبھیر لہجے میں بولا کہ مہک کی دھڑکنیں اتھل پتھل ہو کر رہ گئیں۔

"میرا بازو چھوڑو۔" ساری اکڑفوں نکل گئی۔

زریاب ہنستے ہوئے پلٹ گیا تھا۔

اور وہ اپنا بازو سہلاتے ہوئے اس کی پشت کو گھورتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ فیس بک پہ بیٹھی مختلف ٹاپکس پر کمنٹس دے رہی تھی۔ جب اچانک ایک ونڈو باکس سامنے کھل گیا جہاں مختلف خاکے بنے ہوئے تھے اور ساتھ لکھی عبارت پر نگاہ پڑتے ہی اس کا چہرہ طیش کے باعث سرخ پڑ گیا ماؤس پٹختے ہوئے اس نے سسٹم شٹ ڈاؤن کر دیا۔

"کیا ہوا؟" کیتھرین اس کے بدلتے موڈ پر چونک

پڑی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا یہودی اور عیسائی ___ مسلم پرافٹ کی شان میں ایسی گستاخانہ حرکتیں کیوں کرتے ہیں۔ کبھی تم نے کسی مسلم شخص کو دیکھا ہے کہ اس نے ہمارے یسوع کی شان میں کبھی کوئی گستاخی کی ہو...... کبھی خاکے بنائے ہوں یا کوئی کالم لکھا ہو؟ جب وہ ہمارے یسوع کا اتنا احترام کرتے ہیں تو پھر ہمیں ایسی سطحی حرکتیں زیب نہیں دیتیں۔" غصے سے اس کا خون کھول رہا تھا۔ بس نہیں چلتا تھا کہ ایسے لوگوں کو گن گن کر شوٹ کر دے۔

"تم اتنی ہائپر کیوں ہو رہی ہو؟ اس لیے کہ تمہارے ڈیڈ مسلم ہیں؟" کیتھرین کو شاید اس کا اتنا شدید ردِعمل عجیب لگا تھا۔ جبکہ وہ اس کی بات پر مزید طیش میں آگئی۔

"مذہب کا تعلق انسانوں سے ہوتا ہے رشتوں سے نہیں۔"

"تم نے ہمارے۔ یسوع کہا۔ انٹرسٹنگ۔ جبکہ تم مقدس انجیل کو نہیں مانتیں۔" کیتھرین کو خوشی ہوئی تھی لیکن انجانے میں پھر طنز کر گئی۔

"میں مقدس انجیل کو تم سے زیادہ مانتی ہوں۔ ہاں کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کو عقل تسلیم نہیں کرتی اور میں لکیر کی فقیر نہیں ہوں، میرے پاس عقل بھی ہے اور شعور بھی۔"

"کیوں خود کو الجھاتی ہو۔" کیتھرین کو اس پر بے پناہ ترس آیا۔

"کیونکہ یہ الجھنیں مجھے وراثت میں ملی ہیں۔" آنکھیں موند کر اس نے منہ پر تکیہ رکھ لیا۔

☼ ☼ ☼

وہ پانچوں یونیورسٹی کے لان میں بیٹھی اپنے اپنے افیئرز ڈسکس کر رہی تھیں۔

"انتھونی سے تو میں اکتا چکی ہوں۔ میری نظر آج کل اس ایشین لڑکے پر ہے اس کے بلیک ہیئر اور بلیک آئیز اتنی اٹریکٹو ہیں اف! میری تو ہارٹ بیٹ بڑھ جاتی ہے اسے دیکھ کر۔" جولیا نے دور کھڑے لڑکے کو دیکھ کر اک سرد آہ بھری۔ اس کی یہی بری عادت تھی، وہ جتنی جلدی کسی سے متاثر ہوتی تھی اتنی ہی جلدی اکتا بھی جاتی تھی۔ ابھی کل تک ایسے ہی انتھونی کے لیے مری جا رہی تھی۔

"میں کل پیٹر کے ساتھ ڈیٹ پر جا رہی ہوں۔" انجلین نے اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ یہ اس کی پہلی ڈیٹ تھی۔ اس وجہ سے وہ کافی پُرجوش ہو رہی تھی۔

بیلا کچھ بددل سی ہو کر اٹھ گئی۔ اسے ان بورنگ باتوں میں قطعاً" کوئی دلچسپی نہیں تھی، اس کا رخ لائبریری کی سمت تھا۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اسے اپنے عقب میں قدموں کی دھمک محسوس ہوئی تھی۔ یوں جیسے کوئی اسے متوجہ کرنے کی خاطر زور زور سے زمین پر پاؤں مار رہا ہو۔ وہ بنا دیکھے بھی جان سکتی تھی کہ یہ کون ہو گا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ یونیورسٹی کے کسی بھی گوشے میں چلی جائے، دو نگاہیں ہمہ وقت اس کے تعاقب میں رہتی ہیں۔

ریک سے اپنی مطلوبہ کتاب نکال کر وہ کارنر والی ٹیبل پر آکر بیٹھ چکی تھی اسے اپنی اسائنمنٹ تیار کرنا تھا۔ فی الحال وہ یکسوئی کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہتی تھی۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟" وہ گہری سرمئی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈالے کہہ رہا تھا۔

"شیور۔" وہ سپاٹ لہجے میں قدرے ناگواری سے کہہ کر دوبارہ سے اپنی کتابوں کی سمت متوجہ ہو چکی تھی۔ وہ اس سے الجھنا نہیں چاہتی تھی۔

اس سے قبل کہ وہ لفظوں کو ترتیب دیتا، حجاب کا آخری پردہ بھی گرا دیتا۔ کنارا ہی بہتر تھا وہ اپنے نوٹس سمیٹ کر اٹھ گئی تھی۔

مانیک کو عجیب سی ہتک کا احساس ہوا، وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ لڑکی یوں بھی اس کی ہتک کر سکتی ہے۔

☼ ☼ ☼

گھر آکر کھانا کھانے کے بعد وہ ٹیرس پہ کھڑی کافی پی رہی تھی جب نظر پروفیسر انکل سے ٹکرا گئی۔ وہ مین ڈور کے باہر کھڑے پوسٹ باکس سے اپنی آج کی ڈاک نکال رہے تھے' بیلا نے دور سے ہی ان کی طبیعت کا پوچھا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ کچھ دیر قبل گروسری کے لیے گیا تھا تمہارے لیے امرود لایا ہوں بس جلدی سے آجاؤ۔" بالوں کو ربڑ بینڈ میں جکڑتے ہوئے اس نے شوز اتار کر سلیپر پہنے' اسکارف اوڑھا اور سیڑھیاں اترنے والی تھی جب اچانک ریک میں رکھی اس سیاہ کتاب کا خیال آیا تو وہ دو قدم پیچھے پلٹی اور اس کتاب کی جلد پر نرمی سے ہاتھ پھیرا۔

یہ اس کے ڈیڈی کی کتاب تھی۔ ممی نے اسے بہت سنبھال کر رکھا تھا نیویارک سے آتے ہوئے وہ اسے اپنے سامان کے ساتھ لے آئی تھی اس نے بارہا اس کتاب کو کھول کر دیکھا تھا لیکن نامانوس زبان کی وجہ سے وہ ان لفظوں کا مفہوم نہیں جان پائی تھی۔ اسے اس کتاب کو پڑھنے کا اشتیاق اس لیے بھی تھا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ضرور اس کا تعلق ہسٹری سے ہوگا اور تاریخ کا مضمون اس کا جنون تھا۔

پروفیسر انکل' ہسٹری کے استاد رہ چکے تھے' اس کے علاوہ وہ کئی زبانوں کے ماہر بھی تھے۔ کچھ سوچ کر اس نے وہ کتاب اٹھالی۔

"بس بہت ہو چکی فراغت' اب آپ کو میرا ایک کام کرنا ہے۔" امرود کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے اس نے پروفیسر انکل کو ذہنی طور پر تیار کرنے کی کوشش کی۔

"اس کتاب کو انگلش میں کنورٹ کرنا ہے۔" وہ اٹھ کر میز پر رکھی کتاب اٹھا لائی۔

پروفیسر انکل نے اس کے عنوان پر نگاہ جمائی۔

"قصص الانبیاء۔"

"ہسٹری سے ریلیٹڈ ہے؟" اسے جاننے کی جلدی تھی۔

"ہاں۔" انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"انٹرسٹنگ! آپ آج سے ہی اپنا کام اسٹارٹ کر دیں۔"

☼ ☼ ☼

"میری شرٹ استری کر دینا۔" پانی پیتی مہک کے سر پر چپت لگاتے ہوئے اس نے آرڈر جاری کیا تھا جبکہ سر پر لگنے والے اس اچانک جھٹکے کے باعث وہ گلا پکڑے زور زور سے کھانسنے لگی تھی۔ کھانستے کھانستے اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا' ناک سرخ ہو گئی۔

"سوری یار۔" وہ باسف سے بولا۔ مگر جواب میں وہ کچھ بھی کہے بغیر اس کی شرٹ اٹھا کر چلی گئی۔ وہ اس قدر تابعداری پر بے ہوش ہوتے ہوتے بچا تھا۔

ورنایاب نے انجو کے ساتھ مل کر میز پر کھانا لگا دیا تھا۔

وہ تینوں تعلیم کے سلسلے میں لاہور میں رہائش پذیر تھے۔ انجو گھریلو کام کاج کے لیے ان کے ساتھ آئی تھی۔ ڈرائیور اور چوکیدار اس کے علاوہ تھے۔

مہک کا بھائی شانی اسکالر شپ پر ایم ایس کے لیے بیرون ملک گیا ہوا تھا۔ وہ اور زریاب میڈیکل کے فرسٹ ایئر میں تھے۔ زریاب اس کے چچا مجتبیٰ کمال کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے چچا اور چچی کا پانچ سال قبل انتقال ہو چکا تھا۔ زریاب حویلی میں ان کے ساتھ رہتا تھا۔

ورنایاب اس کی اکلوتی پھوپھو تھی - وہ پنجاب یونیورسٹی سے سائیکالوجی میں ماسٹرز کر رہی تھی - حویلی میں آج کل بی اماں اور ابا ہی تھے۔

"آج پھر کریلے۔" زریاب نے ڈونگا دیکھ کر منہ بسورا۔

"آج پھر سے تمہاری کیا مراد ہے...... پورے سترہ دن بعد بنائے ہیں' مہک اتنے دنوں سے کہہ رہی تھی۔" ورنایاب اس کے نخروں سے عاجز تھی۔

"نیم چڑھے لوگ ایسی ہی فرمائشیں کرتے ہیں۔ میں دیکھوں اس نے میری شرٹ استری کردی ہے۔" بیٹھتے ہی وہ اچانک ہڑبڑا کر اٹھا اور استری اسٹینڈ کے اوپر

رکھی شرٹ کو دیکھ کر اس کا منہ کھلا اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

اس کی پسندیدہ قیمتی شرٹ کا گریبان سارا جلا ہوا تھا ساتھ ایک نوٹ بھی تھا۔

"شرٹ کا منہ کالا۔" اس نے لب بھینچتے ہوئے بیڈ روم کے بند دروازے کو دیکھا جہاں وہ اب مزے سے بستر پر لیٹی واک مین سن رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ شام سے ہی کیتھرین کی سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے تھی جو اسے کافی مشکوک لگ رہی تھیں۔ اس کے باوجود کہ انکل رابرٹ کبھی بھی اسے نیم برہنہ لباس پہننے کی اجازت نہیں دیں گے' وہ اپنے لیے منی اسکرٹ لے کر آئی تھی۔ یونیورسٹی سے آکر اس نے اپنی اسکن پالش کی تھی اور پھر نہا کر طبیعت خرابی کا کہہ کر سو گئی تھی۔

اور اب رات گیارہ بجے جب سب سو چکے تھے بیلا اپنی نوٹ بک کھولے کچھ لکھنے میں مگن تھی۔ اس نے کیتھرین کو اٹھ کر واش روم کا رخ کرتے دیکھا تھا۔ جب وہ باہر نکلی تو میرون منی اسکرٹ میں ملبوس تھی پھر اس نے اسے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر خوب میک اپ کرتے دیکھا تو پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"کہاں جا رہی ہو۔"

"مارک اور میں آج کی رات ایک دوسرے کے ساتھ انجوائے کرنے والے ہیں۔" وہ سرگوشی نما آواز میں دروازے کی سمت دیکھتے ہوئے مزے سے بولی تو بیلا کا سانس اندر ہی کہیں حلق میں اٹک گیا۔

"کیتھی آر یو کریزی؟" وہ بستر سے اٹھ آئی تھی۔

"تم جانتی ہو یہ کتنا ناپاک کام ہے پلیز مت جاؤ۔" اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے کیسے روکے۔

"میں کیسی لگ رہی ہوں؟" میک اپ کو فائنل ٹچ دیتے ہوئے اس نے بیلا سے پوچھا تو اسے کیتھرین کے حسین چہرے سے کراہیت محسوس ہوئی۔

"بدن کا حسن پاکیزگی ہے۔ ناپاکی کی نجاست - اس کو نہ چھوئے تو یہ چراغ کی مانند روشن رہتا ہے اور روشن چہرے کبھی اتنے بد صورت نہیں لگتے۔"

"بیلا۔" اس کی آواز صدمے سے ٹوٹ گئی۔

بیلا نے رخ موڑ لیا۔

"اپنے باپ سے نہ ڈرو کیتھی! وہ بدن کو قتل کر سکتے ہیں' روح کو نہیں...... اس سے ڈرو جو روح اور بدن دونوں کو جہنم میں ہلاک کر سکتا ہے۔"

کیتھرین نے ایک بار پھر سے پلٹ کر دروازے کی سمت دیکھا۔ رابرٹ اور جنیفر سو رہے تھے - وہ احتیاط سے سیڑھیاں اترنے والی تھی جب بیلا کی آواز سماعتوں سے ٹکرائی تو ایسا لگا جیسے قدموں کو کسی نادیدہ طاقت نے جکڑ لیا ہو۔ وہ چاہ کر بھی دہلیز کے اس پار قدم نہیں بڑھا سکی تھی۔

"کیا مصیبت ہے' یہاں ہر کوئی اپنی مرضی سے جیتا ہے۔ بس ان فضول پابندیوں کے لیے میں ہی رہ گئی ہوں۔" بڑبڑاتے ہوئے وہ بستر پر نیم دراز ہو گئی۔

بیلا کے لیے اتنا کافی تھا کہ وہ اب کہیں نہیں جا رہی تھی اس نے بیگ میں رکھی کتاب باہر نکالی وہ آج یہ کتاب لائبریری سے لے کر آئی تھی پہلے صفحے پر کسی نے گرین انک سے لکھا تھا۔

"BEILA I LOVE YOU" وہ کتنی ہی دیر گم صم سی بیٹھی ان لفظوں کو گھورتی رہی۔

☼ ☼ ☼

آج سوزین کے گھر ان کا ڈنر تھا' وہ جانا نہیں چاہ رہی تھی لیکن جب سے اس نے رابرٹ سے کیتھرین کی خفیہ سرگرمیوں کا دبے لفظوں میں ذکر کیا تھا' انہوں نے سائے کی طرح ہر جگہ اس کے ساتھ رہنے کی ہدایت کی تھی۔

سوزین کا گھر پندرہ منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔ جوں ہی انہوں نے مین روڈ سے ایونیو روڈ کا ٹرن لیا ریڈ فراری کے ٹائر ان کے عقب میں چرچرائے۔ دونوں اچھل گئیں مڑ کر دیکھا مائیک تھا اس نے لب بھینچ لیے تھے جبکہ وہ دوستانہ مسکراہٹ لبوں پر سجائے کیتھرین سے

حال احوال پوچھنے میں مگن تھا۔
"کیسی ہو کیتھی۔"
"اے ون! تم کہاں جارہے ہو۔" کیتھرین کی خوشی کی انتہا نہیں رہی تھی کہ مائیک جیسا خوبرو اور ڈیشنگ لڑکا اس کے راستے میں گاڑی روکے کھڑا تھا۔
"سوزین کے گھر..... انکل سے کچھ کام تھا۔" وہ متانت سے بولا۔ جس پر بیلا نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے مشکوک انداز میں گھورا تھا۔
"اور بیلی؟ ہم بھی وہیں جارہے ہیں۔" کیتھرین نے ہنستے ہوئے بتایا۔
"جب منزل ایک ہے تو کیوں نہ پھر ساتھ چلا جائے؟" وہ بات کیتھرین سے کر رہا تھا لیکن اس کا سارا دھیان بیلا کی سمت تھا۔
ویلوٹ کی بلیک میکسی میں ملبوس وہ کوئی پری لگ رہی تھی سیدھے ریشمی بال سمیٹ کر ایک شانے پر ڈال رکھے تھے۔ کانوں میں آویزاں بڑی بڑی بالیاں صراحی دار اٹھی ہوئی گردن کی ہر جنبش پر ہلکورے لیتی تھیں۔
گہری سرمئی آنکھوں میں کاجل بھرا تھا۔
"تمہارا الفٹ دینے کا انداز مجھے پسند آیا۔" وہ شاہانہ انداز میں کہتی بیلا کا ہاتھ تھام کر اس کی مزاحمت کے باوجود گاڑی میں سوار ہو چکی تھی مائیک نے راستہ بھر بیک ویو مرر کا رخ اس کی طرف کیا ہوا تھا۔
پورچ میں گاڑی رکتے ہی وہ اتر کر تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھ گئی پورا لاؤنج خالی تھا گول زینہ سیدھا فرسٹ فلور تک جاتا تھا اوپر سے نقرئی قہقہوں کی ملی جلی آوازیں نیچے راہداری تک آرہی تھیں اس نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے پہلے کمرے میں جھانکا۔
انجلینا جولیا اور سوزین تینوں نیچے قالین پر رکھے فلور کشن پر بیٹھی گپیں لڑا رہی تھیں۔
"اتنا لیٹ؟ کب سے تمہارا اور کیتھی کا ویٹ کر رہے تھے۔" سوزین اسے دیکھتے ہی اٹھ گئی کیتھرین سیڑھیاں چڑھتے مائیک سے باتیں کرتے ہوئے آرہی تھی۔
"مائیک! ڈیڈ اسٹڈی روم میں ہیں۔" سوزین نے دروازے سے جھانکتے ہوئے مائیک کو اطلاع دی اور کیتھرین کے ساتھ واپس اندر آگئی۔
بیلا کو آج پتا چلا تھا کہ مائیک اور سوزین کزن تھے۔
"آج کچھ ڈفرنٹ ٹیسٹ کریں گے۔" سوزین گلاس میں نشہ آور مشروب انڈیل رہی تھی۔
"بیلا! تم بھی لے لو۔" سوزین نے گلاس اس کی سمت بڑھایا۔
"سوری! میں یہ سب نہیں پیتی۔" اس نے ناگواری سے ناک چڑھائی۔ کیتھرین نے عجیب نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ باقی تینوں کے لبوں پر بھی استہزائیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔
"کیتھی یار! تم میں اور تمہاری کزن میں کچھ بھی کامن نہیں ہے۔"
"منی اسکرٹ' بوائے فرینڈ' ڈسکو کلب' مے نوشی' فحاشی اور عریانیت کو ہم نے اپنا کلچر بنایا' جبکہ ہمارے مذہب میں اس کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ یہ سب یسوع کی تعلیم کا حصہ نہیں ہیں۔" کیتھرین کی خفگی کے باوجود اس نے دو ٹوک جواب دیا تھا۔
ایک لمحے کے لیے تینوں کی رنگت متغیر ہوئی۔ پھر سوزین نے کچھ سنبھل کر کہا۔
"یہ ایک لاحاصل بحث ہے۔ کیتھی! تم اس روز مارک سے ملی تھیں؟" اس نے بات کا رخ موڑ دیا۔
کیتھرین کا چہرہ اتر گیا۔ لاکھ کوشش کے باوجود بھی وہ سوزین جتنی بولڈ نہیں ہو سکتی تھی۔
بیلا وہاں سے اٹھ کر بالکونی میں آن کھڑی ہوئی۔
سامنے ستاروں بھرا' آسمان روشن تھا اور نیچے اسٹریٹ لیمپ کی روشنی میں سارا منظر دمک رہا تھا۔ گلاب کی منہ بند کلیاں ہوا کی سرسراہٹوں سے جھوم رہی تھیں۔
مگر اس کی نظریں ان سب سے بے نیاز خلاؤں میں بھٹک رہی تھیں۔
"کیا مجھے روشنی مل جائے گی؟" اس نے خود سے سوال کیا اور پھر الزبتھ کی یاد آگئی۔ وہ ایک نن تھی۔

جسے رحمت کمال کی محبت گرجا گھر سے نکال کر خارزار وادیوں میں لے آئی تھی۔ اس نے مرنے سے قبل کہا تھا۔
"اچھا بیج بونے والا ابن آدم ہے اور کھیت دنیا ہے۔ اچھا بیج بادشاہی کے بندے اور کڑوے دانے شیطان کے فرزند ہیں۔ کٹائی' دنیا کا آخر ہے اور کاٹنے والے فرشتے ہیں۔ بس جیسے کڑوے دانے جمع کیے جاتے ہیں اور آگ میں جلائے جاتے ہیں' ایسے ہی دنیا کے آخر میں ہوگا۔"

☆ ☆ ☆

بے ہنگم میوزک کی تیز آواز سے بچنے کے لیے مہک نے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس رکھی تھیں۔ مگر سب بے سود اور لاحاصل۔
آواز تھی کہ سماعتوں کے پردے پھاڑنے پر مصر تھی۔
درنایاب نے لاؤنج میں قدم رکھا اور چکرا کر رہ گئی۔ آج دونوں گھر میں تھے اور لاؤنج کا سارا نقشہ ہی بگاڑ رکھا تھا۔
انجو اس سارے ہنگامے سے بے نیاز دور باغیچے کے اس جانب تعمیر شدہ سرونٹ کوارٹر میں جا کر سو چکی تھی۔
لاؤنج میں کشن بکھرے ہوئے تھے۔ نمکو' چپس اور کوکیز کے ریپر ہر کونے میں اڑ رہے تھے۔ فرش پر شاید کولڈ ڈرنک گری تھی۔ وہاں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔
"دیکھ لیں پھوپھو! کل میرا ٹیسٹ ہے اور زریاب کے بچے نے جان بوجھ کر اسپیکر پھاڑ رکھے ہیں۔" مہک کھڑی دانت پیس رہی تھی۔
"تم دونوں کے جھگڑے میری سمجھ میں تو نہیں آتے۔" وہ تپ اٹھی۔
"جھگڑا پہلے وہ شروع کرتا ہے۔" اس نے تنک کر کہا۔
"ہاں..... اور تم تو بہت معصوم ہو جیسے۔" اسی وقت وہ بھی اپنے کمرے سے برآمد ہوا تھا۔ لڑاکا عورتوں کی طرح کمر پر ہاتھ ٹکائے بولا۔
"میں نے تم سے کچھ کہا ہے؟" وہ بل کھا کر پلٹی۔
"کل تم نے میری شرٹ جلائی تھی۔" وہ باقاعدہ جرح پر اتر آیا۔
"اور تم نے پرسوں مجھے گندم کے سٹے سے ڈرایا تھا۔" وہ دوبدو بولی۔
"ہاں! تو تم نے مجھے اپنے نوٹس کیوں نہیں دیے تھے؟"
"تم تو بس اس بات سے جلتے ہو کہ میرے مارکس تم سے زیادہ کیوں آتے ہیں۔" اس نے بھنویں اچکائیں۔
"دو نمبر زیادہ۔" وہ استہزائیہ ہنسا۔
"اگر آگے پیچھے بیٹھی چڑیلوں کو گھورنا بند کردو نا تو ....."
"بس ....." درنایاب نے ہاتھ اٹھا کر دونوں کو خاموش کروایا۔ ورنہ یہ کھاتہ تو شیطان کی آنت کی طرح بڑھ رہا تھا۔
"کہیں سے لگتا ہے کہ تم دونوں کسی مہذب گھرانے کے چشم و چراغ اور شہر کے مہنگے ترین اور بہترین ادارے کے اسٹوڈنٹس ہو؟ نہ بات کرنے کی تمیز' نہ شرم' نہ کوئی لحاظ..... یہ مستقبل کے ڈاکٹروں کا حال ہے۔ اگر ایک آپریشن تھیٹر میں بھی تم دونوں کو آپریٹ کرنا پڑا تو آپس کی بحث میں ہی مریض مرجائے گا۔ تم دونوں مجھے اب ایک دوسرے سے بات کرتے نظر نہ آؤ۔ ورنہ اس بار میں لالہ سے شکایت کروں گی۔" درنایاب نے انہیں تنبیہہ کی۔
"نہیں۔" دونوں احتجاجاً چلائے۔
ان کا یہی مسئلہ تھا کہ ایک دوسرے سے چونچ لڑائے بغیر رہ بھی نہیں سکتے تھے۔
"پھوپھو پلیز! اب نہیں کریں گے لڑائی۔" زریاب کا انداز ملتجیانہ تھا۔
مہک نے بھی چہرے پر زمانے بھر کی مسکینیت طاری کرلی۔ کیونکہ وہ ایک بار لالہ سے ان کی شکایت کر چکی تھی۔ تب لالہ نے حتمی انداز میں کہا تھا کہ اب

کوئی شکایت ملی تو دونوں کو ہاسٹل بھجوا دوں گا۔ ایک تو ہاسٹل کا مخصوص کھانا اور محدود ڈسپلن لائف سوچ کر ہی دم گھٹتا تھا۔

"اوکے! آج شام کا کھانا تم دونوں بناؤ گے اور اگر اس دوران کوئی جھگڑا کیا تو..." وہ کہہ کر رکی نہیں ۔پیچھے دونوں ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔

"اس کتاب میں بہت سی ایسی باتیں لکھی ہیں، جنہیں پڑھ کر تم جیسی کم سن لڑکی بھٹک سکتی ہے۔" پروفیسر انکل نے آج کے ترجمہ کیے ہوئے صفحات اسے نہیں دیے تھے۔ وہ پچھلے دو ماہ سے قصص الانبیاء کا مطالعہ کر رہی تھی۔ حضرت آدم کی پیدائش سے لے کر حضرت سلیمان تک کا سفر کرتے ہوئے اس کی معلومات میں حیرت انگیز اضافہ ہوا تھا۔ پروفیسر انکل بھی اب تک بہت انجوائے کر رہے تھے۔ کہیں بھی کسی بھی مقام پر ایسا محسوس نہیں ہوا تھا کہ اس کتاب میں لکھا کوئی قصہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔

"کیسی باتیں؟" اس نے وضاحت طلب نظروں سے انہیں دیکھا۔

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقدس کنواری مریم علیہ السلام کی گود میں گواہی دینا کہ میں اللہ کا نبی ہوں۔"

"تو کیا شک ہے اس میں؟" اس بار حیران ہونے کی باری پروفیسر ولیم کی تھی۔

"کیا تمہیں نہیں پتا یسوع اللہ کا......"

"پلیز! اس سے آگے کچھ مت کہیے گا۔ کہیں آپ کا شمار گناہ گاروں میں نہ ہو جائے۔" بیلا نے ہاتھ اٹھا کر ٹوک دیا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو تم۔" وہ بے چینی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا نبی مانتی ہوں اور کچھ نہیں اور یسوع کا بھی یہی پیغام تھا کہ اللہ ایک ہے اور اس کی عبادت کرو...... حضرت آدم جو بغیر ماں اور باپ کے پیدا ہوئے تھے تو کیا وہ بھی خدا ہیں؟ نہیں نا... تو پھر حضرت عیسیٰ کو بھی اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہرائیں۔ ان کی ولادت ایک معجزہ تھی بس۔" آخری جملہ اس نے اتنی برہمی سے کہا تھا کہ رخساروں پر سرخی چھلکنے لگی۔ یہی وہ بات تھی، جسے بتیس انجیلوں میں پڑھ کر بھی اس نے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ ایک نبی اللہ کا بیٹا کیسے ہو سکتا تھا۔ عقل تسلیم ہی نہیں کرتی تھی اور اتنے انبیاء علیہ السلام کا احوال پڑھنے کے بعد تو اس کے فہم میں مزید پختگی آچکی تھی۔

"بس! اسی بات کا ڈر تھا مجھے۔ تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ باتیں ہمیں گمراہ کرنے کے لیے ہی تو لکھی گئی ہیں۔ تم اس اسلامی تنظیم کے پروپیگنڈوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔ میری مانو اس کتاب کو مت پڑھو۔ تمہارا ذہن بھٹک جائے گا تم ڈبل مائنڈڈ ہو جاؤ گی۔"

ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس طرح اسے اس کتاب سے دور رکھیں۔

"آپ کو پتا ہے نا! میری ماں کیتھولک تھی اور میرے ڈیڈ مسلم...... میں تو پیدائشی ڈبل مائنڈڈ ہوں۔" وہ سپاٹ لہجے میں کہتی صفحات اٹھا کر چلی آئی۔

"بیلا! ناشتا کر لو۔" کیتھرین نے اس کے سر سے چادر اتاری۔ یونیورسٹی جانے کا ٹائم ہو چکا تھا اور وہ ابھی تک سو رہی تھی۔

"مجھے ناشتا نہیں کرنا۔ میرا فاسٹ ہے۔" کسل مندی سے کہتے ہوئے اس نے کشن منہ پر رکھ لیا۔ کیتھرین نے دیوار گیر کیلنڈر پر نگاہ ڈالی۔ ان کے روزے شروع ہو چکے تھے۔ لیکن اتنا طویل روزہ وہ تو نہیں رکھ سکتی تھی۔ جبکہ بیلا نے روزے کا پورا اہتمام کیا تھا۔

"عجیب بات ہے۔ تم یسوع کو نہیں مانتیں اور ان کی ساری باتیں مانتی ہو۔ روزہ رکھتی ہو، چرچ جاتی ہو، عبادت کرتی ہو، اپنے ہمسایوں کا خیال رکھتی ہو، ممی اور ڈیڈی کی اتنی عزت کرتی ہو، حرام کام نہیں کرتیں، ناپاک چیزیں نہیں کھاتیں، چوری نہیں کرتیں، جھوٹ نہیں بولتیں، مکمل لباس پہنتی ہو۔ کاش! تم میری جگہ ہوتیں تو ایک اچھی نن بنتیں۔ ڈیڈ کی خواہش تو پوری ہو جاتی۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ آج کے اس ماڈرن دور میں اس عجیب خاندانی روایت کی پاسداری کرنا کیوں ضروری ہے۔"

"تمہیں اگر کوئی پسند ہے تو تم شادی کر لو۔ میں انکل سے بات کر لوں گی۔" بیلا نے اس کے گال پہ چٹکی بھری۔

"کیا؟ ابھی سے شادی کر لوں؟ یہ انجوائے کرنے کی عمر ہے یار! میں یونیورسٹی جا رہی ہوں۔ اوکے! بائے۔" تیز تیز بولتے ہوئے اس نے شوز پہنے اور چلی گئی۔

بیلا نے پھر سے کشن منہ پر رکھ لیا۔ ترجمہ کیے ہوئے وہ صفحات ابھی تک ویسے ہی دراز میں رکھے تھے۔ وہ پروفیسر انکل کے خدشات تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھی۔

"وہ اس کتاب کو اسلامی تنظیم کا پروپیگنڈہ کہہ رہے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ یہ کتاب ہمیں گمراہ کرنے کے لیے لکھی گئی ہے۔ لیکن یہ کتاب تو ڈیڈ اپنے ساتھ پاکستان سے لائے تھے اور پھر یہ اردو اور عربی زبان میں تھی۔

قاری محمد یسٰین جو اس کتاب کے مترجم تھے۔ کیا انہیں خواب آیا تھا کہ ڈین ہیگ (Den Haag) شہر کی ایک لڑکی بہتر سال بعد اس کتاب کو انگلش میں کنورٹ کروا کر اس کا مطالعہ کرے گی تو میں اسے گمراہ کرنے کے لیے کچھ تبدیلیاں کر دوں؟"

وہ کتنی ہی دیر لیٹے لیٹے خود سے الجھتی رہی اور پھر اٹھ کر ابھی دراز کھولی ہی تھی کہ جنیفر آنٹی اسے بلانے چلی آئیں۔

"بیلا! تم سے ملنے کوئی لڑکا آیا ہے۔"

"لڑکا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں! اس کا نام مانیک ہے۔ وہ سوزین کا کزن ہے اور بتا رہا تھا کہ تمہارے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔"

"اوہ!" اس نے ہونٹ سکیڑے اور سر کھجاتے ہوئے بولی۔

"آپ اس سے کہہ دیں کہ میں سو رہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے! تم آرام کرو۔" وہ سر ہلا کر چلی گئیں۔ اس کی جگہ اگر کیتھرین ہوتی تو اس سے اچھی خاصی باز پرس کی جاتی۔ لیکن یہ بیلا تھی، جس پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے جنیفر نے مزید کوئی تفصیل طلب نہیں کی تھی۔ جبکہ یہ سوچ کر کہ وہ اس کے گھر تک چلا آیا ہے۔ وہ بے حد پریشان ہو گئی تھی۔

اگلے روز لائبریری کی سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ اس سے ٹکرا گیا۔

"ہیلو! آئی ایم مانیک۔" اس نے رک کر اپنا تعارف کروایا۔ بیلا نے محض ابرو اچکانے پر اکتفا کیا تھا۔

"کیتھرین بتا رہی تھی کہ آپ کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ میں کل آپ کے گھر آیا تھا۔" اس کے سرد سپاٹ تاثرات کے باوجود مانیک نے اپنا بیان جاری رکھا۔

"آپ ہمارے گھر کیوں آئے تھے؟" مروت سے عاری اکھڑ لہجے میں پوچھا۔

"آپ کو اچھا نہیں لگا، میرا آپ کے گھر آنا؟" اس نے الٹا سوال پوچھا۔

"جی بالکل! مجھے آپ کا اپنے گھر آنا ذرا بھی اچھا نہیں لگا۔ میں نے آپ کو انوائیٹ کیا تھا یا میری آپ کے ساتھ کوئی اپائنمنٹ تھی؟" سرمئی آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ لہجے کا تیکھا پن بدستور برقرار تھا۔

مانیک کو زندگی میں کبھی اتنی ہتک محسوس نہیں ہوئی تھی۔

"میں شاپنگ کے لیے نکلا تھا۔ سوچا آپ کی خیریت دریافت کرتا جاؤں۔"

"آپ شاپنگ کرنے آئے تھے تو اپنا کام کرتے۔ آپ کے لیے میری خیریت پوچھنا اتنا ضروری بھی نہیں تھا کہ آپ اس کے لیے میرے گھر آتے۔" وہ کہہ کر آگے بڑھ گئی۔ جبکہ وہ ایک سکتے کی سی کیفیت میں کتنے ہی پل وہاں کھڑا رہا۔ ہاتھ میں پکڑا للی کے پھولوں کا گل دستہ اسے دینے کی ہمت ہی نہیں ہوئی تھی۔

"کریلے بنائیں؟" مہک نے اسے چڑانے کو کہا۔

"اپنی شکل جیسی ہی بات کرنا۔" وہ واقعی تپ گیا۔

"تم سے تو اچھی ہے۔" وہ اترائی۔

"خوش فہمی۔" وہ استہزائیہ ہنسا۔

"خوش فہمی نہیں..... خود شناسی ہے۔" اس نے تصحیح کرنا ضروری سمجھا۔

"بکواس نہ کرو او، کوئی آسان سی ڈش منتخب کرو جلدی سے۔ پھر مجھے جم جانا ہے۔" دونوں لان کی سوکھی گھاس پر گھٹنوں کے بل بیٹھے ہوئے تھے۔ مہک کے ہاتھ میں چاکلیٹ تھی اور زریاب بے زار شکل بنائے تنکے نوچ رہا تھا۔

"رہنے دو یہ مشقت۔ جم وم جانے سے کوئی ہینڈسم نہیں بنتا۔" وہ تپانے سے باز نہیں آئی۔

"یہ جو تمہاری سہیلیاں ہیں نا۔ یہ سب میرے چکر میں تمہارے اردگرد منڈلاتی ہیں۔ سمجھا لینا ان کو، میں ایسی ویسی لڑکیوں کو گھاس نہیں ڈالتا۔" کالر کھڑے کرتے ہوئے اس نے کہا تو مہک سلگ اٹھی۔

"میں تو تمہیں ان سے متعارف کروا کر پچھتا رہی ہوں۔ ایسے گھورتے ہو میری سہیلیوں کو جیسے وہ کوئی چاکلیٹ یا آئس کریم ہوں۔"

"یہ دونوں چیزیں تمہاری فیورٹ ہیں۔ مجھے پزا اور بریانی پسند ہے۔"

"ماش کی دال بنا لیں۔" وہ واپس موضوع پر آئی۔

"نہیں وہ بہت چھوٹی ہوتی ہے۔" اس نے منہ بنایا۔

"تمہیں اس کے چھوٹا ہونے پر کیا اعتراض ہے؟" مہک نے آنکھیں نکالیں۔

"مجھے تو تمہارے چھوٹا ہونے پر بھی بہت اعتراض ہے۔ بمشکل میرے کندھوں تک آتی ہو۔ تمہیں کم از کم ایک فٹ اور لمبا ہونا پڑے گا۔"

"بکو مت! اور بتاؤ کون سی دال؟"

"الف سے انا ہوتی ہے۔ دال میں سے الف نکال دو اور صرف دل کی بات کرو۔" اب اس کی باری تھی۔

"بھاڑ میں جاؤ۔" وہ ریپر پھینک کر اٹھنے والی تھی۔ جب زریاب نے ہاتھ پکڑ کر واپس بٹھایا۔

"سنو! مٹن قورمہ بناتے ہیں۔ پھوپھو کی ناپسندیدہ ترین ڈش..... آخر کچھ سزا تو انہیں بھی ملنی چاہیے۔"

"ہاں! یہ ٹھیک ہے۔" وہ فوراً" متفق ہو گئی۔

"لیکن پیاز تم کاٹو گے۔ میری آنکھیں جلتی ہیں۔"

"تو کیا میں نے آنکھوں میں بٹن فٹ کروا رکھے ہیں۔" وہ تنک کر بولا۔

"لہسن تو چھیلو گے نا؟" اس نے اپنا دوسرا ناپسندیدہ کام اسے دینا چاہا۔ مگر اس نے فوراً" عذر تراش لیا۔

"میرے ناخن چھوٹے ہیں۔"

"تو تم کرو گے کیا؟" وہ بل کھا کر پلٹی۔

"میں بس تمہیں ہدایات دوں گا۔" وہ مزے سے بولا۔

"نمک مرچوں والے ڈبے کہاں ہیں۔ یہ انجو کو تو بلا کر لاؤ۔" کیبنٹ کے دروازے کھولتے ہوئے وہ بے زاری سے بولی۔ کچن میں آتے ہی اس پر کوفت سوار ہونے لگتی تھی۔

"اس پر بھی بین لگ چکا ہے۔" زریاب نے یاد دلایا۔

"یہ پھوپھو بھی نا۔" اس نے دو تین برتن پٹخے۔

"فضول جلنے کڑھنے سے کیا فائدہ؟ آج ہم کوکنگ شو کریں گے۔" شرٹ کے کف موڑتا وہ اس کے ساتھ آن کھڑا ہوا۔

ورنایاب نے جب کچن میں جھانکا تو آدھے سے زیادہ برتن ان کے کوکنگ شو کی نذر ہو چکے تھے۔ مسالا جات کو مختلف کٹوریوں میں سجایا گیا تھا۔ کیبنٹ کھلے اور فرش پر آئل گرنے سے چکنے ماربل کا ناس ہو چکا تھا۔

"یہ سب کون سمیٹے گا؟" اس نے دونوں کو گھورا۔

"کم از کم ہم تو نہیں۔" مہک نے صاف انکار کر دیا۔

"ہمارا کام محض اتنا ہی تھا۔" زریاب نے فوراً" اس کی تائید کرتے ہوئے امن کا جھنڈا لہرایا۔ وہ دونوں آگے پیچھے کچن سے باہر نکل گئے۔ جس پر وہ بھنا کر رہ گئی۔ رہی سہی کسر مٹن قورمہ نے پوری کر دی تھی۔

"انجو۔" وہ کچن کے دروازے میں کھڑی چلا رہی تھی۔ وہ لاؤنج سے باہر نکلتے ہی خوب قہقہہ لگا کر ہنسے تھے۔

اگلے روز سنڈے تھا۔ اس نے نہا کر کپڑے پہنے اور سر پہ اسکارف اوڑھ کر چرچ چلی آئی۔

کیتھڈرل کے باہر خوب رش لگا ہوا تھا۔

ایسٹر کے حوالے سے آج کیتھڈرل میں خصوصی بیان تھا۔ جس کے لیے امریکا سے بشپ آیا ہوا تھا۔ کچھ لوگ چرچ کے اندر موجود تھے۔ اس نے جا کر ایک شمع جلائی۔ سینے پر صلیب بناتے ہوئے اس کے ہاتھ رک گئے۔ وہ خاموشی سے جا کر ایک بینچ پر بیٹھ گئی۔

پوری ہو رہی ہیں سوچیں سبھی
ٹھنڈی پڑ رہی ہیں محبتیں سبھی
کیے وعدے توڑ نبھایا یسوع آنے والا ہے

لوگ ہاتھوں میں مشعل لیے ہوئے گیت گا رہے تھے۔ وہ اس گیت پر الجھ رہی تھی۔ پھر سر جھٹکتے ہوئے بشپ کا ویٹ کرنے لگی۔ آخر اکیس منٹ کے جان لیوا انتظار کے بعد ان کی آمد ہوئی۔

اور پہلے دس بار کا سنا ہوا بیان دہرا دیا گیا۔

وہ انجیل کا وہ باب سنا رہا تھا۔ جب یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کے خلاف سازش کی اور ان کو صلیب پر چڑھا دیا گیا۔ آگے تین روز بعد ان کے دوبارہ جی اٹھنے کا ذکر تھا وہ اٹھ کر باہر نکل آئی۔ شدید سردی کے باعث اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے اور ناک سرخ ہو چکی تھی۔ آسمان کو سرمئی بادلوں نے نگل لیا تھا اور قطرہ قطرہ بوندیں برسنے کو بے تاب تھیں۔

یہاں کا موسم ہی ایسا تھا۔ دو روز میں ایک پہر بارش ضرور ہوتی تھی۔ وہ سڑک کے کنارے کھڑی کیب کا انتظار کر رہی تھی۔ جب سامنے اوپن ریسٹورنٹ میں وہ بیٹھا بلیک کافی سے لطف اندوز ہوتا دکھائی دیا۔

ٹپ..... ٹپ..... ٹپ۔

موٹی موٹی بوندیں ٹپکیں اور وہ بھاگ کر چھجے کے نیچے آن کھڑی ہوئی۔

وہ مبہوت سا بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی کافی میں بوندیں گر رہی تھیں۔

وہ بھیگ رہا تھا۔

بیلا نے نظروں کا زاویہ بدل لیا۔

اس کی کافی چھلک رہی تھی۔ بال پیشانی سے چپک گئے تھے۔ مگر وہ جیسے ہر احساس سے عاری ہو چکا تھا۔ سارے جذبے سمٹ کر آنکھوں میں چھلک آئے تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے ساری دنیا میں بس اس کی آنکھیں ہیں۔ جو زندہ ہیں..... یا پھر وہ اک چہرہ تھا۔

وہ اک چہرہ جو اس کے لیے ساری کائنات تھا۔

وہ گھر آئی تو وہ بھول چکی تھی کہ اس نے کتاب میں کیا پڑھا۔ بشپ نے کیا کہا۔ وہ بھول گئی، اسے کیا کرنا تھا۔ کیا سوچنا تھا۔

بس اگر کچھ یاد تھا۔

تو وہ دو آنکھیں

جو اتنی گہری تھیں

اسے لگ رہا تھا اس کا وجود ڈوب رہا ہے۔ وہ خود کو بچانا چاہتی تھی۔ لیکن وہ ڈوب رہی تھی۔

"کھانا لاؤ۔" جم سے آتے ہی وہ اس کے قریب صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ ساتھ آرڈر بھی جاری کر دیا گیا اور اس کی گود میں رکھا کشن اچک کر سر کے نیچے رکھ

لیا۔

"ابھی صبر کرو۔" وہ ٹی وی سے نظریں ہٹائے بغیر بولی۔ اس کے فیورٹ ڈرامے کا آخری سین چل رہا تھا۔

"بندہ چاہے بھوک سے مر جائے۔ تم ڈراما دیکھتی رہنا۔" اس کے دوپٹے سے پسینہ پونچھتے ہوئے وہ بھنایا۔ مہک نے ایک پل کے لیے گردن ترچھی کر کے اسے گھورا تھا۔

"ذرا جو میرا خیال ہو۔" اس کی بڑبڑاہٹیں عروج پر تھیں۔

"ہاں! تمہارا خیال کیوں ہوگا۔ ابھی جب میں چکن بنا رہی تھی تو بھونی ہوئی بوٹیاں کس نے دی تھیں؟ اور دوپہر جو پکوڑے میں نے اپنے لیے بنائے تھے تو تمہارے لیے کس نے رکھے تھے؟ ایک پراٹھا تھا بس۔ وہ بھی میں نے تمہیں دے دیا۔" وہ ریموٹ پٹخ کر شروع ہو چکی تھی۔

"وہ تو میری نظر پڑ گئی تھی پراٹھے پہ۔ ورنہ تم تو صاف انکار کر دیتیں اور آدھی بوٹیاں کھا کر جب دل بھر گیا تو مجھے لا کر دے دیں...... باقی تین پکوڑوں کا احسان نہ جتاؤ مجھ پر۔" اسے بھی ساری خبر تھی۔

"اف! کس قدر ندیدے ہو تم دونوں۔ جیسے کبھی کچھ کھلایا ہی نہ ہو۔" ورنایاب نے ملامتی نظروں سے دونوں کو گھورا۔ مگر مجال ہے جو کوئی ذرا بھی شرمندہ ہوا ہو۔ وہ دوبارہ سے ٹی وی کی سمت متوجہ ہو چکی تھی۔

زریاب نے بے ساختہ پہلو بدلا۔

"ریموٹ ادھر لاؤ۔ مجھے کارٹونز دیکھنے ہیں۔" وہ محض پانچ منٹ ہی ضبط کر سکا تھا۔

"ہاں! اسی لیے تو مجھے کچن میں بھیج رہے تھے۔" وہ بھی اس کی رگ رگ سے واقف تھی۔

"تم ڈراما ریپیٹ میں دیکھ لینا۔" وہ عاجزی سے بولا تو مہک اس کی جانب رخ موڑ کر گویا ہوئی۔

"شکریہ! آپ نے مجھے اپنے قیمتی مشورے سے نوازا۔ مگر عمل کرنے کا میرا کوئی موڈ نہیں ہے۔"

"پھوپھو! دیکھیں اسے۔" وہ تلملا کر ورنایاب کی سمت مڑا تو اس نے جو اپائنمنٹ لکھتے ہوئے ان کو چونچیں لڑاتے دیکھ رہی تھی' اٹھ کر ٹی وی کی لیڈ نکال دی۔

"ارے یہ کیا۔" وہ چلاتے رہے۔ مگر اس نے کان نہ دھرا۔

✲ ✲ ✲

"کیا یار! تم بھی نا' رومیو بنے بیٹھے ہو۔ اس کا ہاتھ پکڑو اور کہہ دو' آئی لو یو۔" کلارک نے اسے گم صم اداس بیٹھے دیکھا تو ڈپٹ کر بولا۔

"اور نہیں تو کیا۔ اس ایک لڑکی کی خاطر ہمیں کس بات کی سزا مل رہی ہے؟ نہ پارٹیز' نہ کلب اور نہ ہی کوئی نیا ایڈونچر' بور کر دیا ہے تم نے۔" رالف تو پہلے سے ہی اس سے خار کھائے بیٹھا تھا۔ موقع ملتے ہی خوب بھڑاس نکالی۔ وہ دونوں اس کے بہترین دوست تھے۔

"میں کہنے سے نہیں ڈرتا۔" وہ زچ ہو اٹھا۔

"تو پھر؟" دونوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"میں اس کے انکار سے ڈرتا ہوں۔" بالآخر اس نے اپنے خدشے کو زبان دے ڈالی۔

"پاگل ہو گیا ہے کیا؟ وہ تجھے ریجیکٹ کرے گی؟" کلارک نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ رالف کی بھی کم و بیش یہی حالت تھی۔

مانیک خاموش رہا۔ وہ انہیں نہیں سمجھا سکتا تھا کہ وہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ وہ اسے مسترد کر چکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں جھلکتا ناگواری اور ناپسندیدگی کا تاثر وہ بارہا دیکھ چکا تھا۔

اسے یاد تھا' وہ دن جب اس نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔

ساحل پہ کھڑی وہ بادنسیم جیسی لڑکی جس کے وجود میں چڑھتا ہوا سمندر ہلکورے لے رہا تھا اس کے دل میں مدوجزر کی مانند اتھل پتھل مچا چکی تھی۔

اس کے ہر ہر عضو پہ کانسی کے مجسمے کا سا گماں ہوتا تھا۔ جیسے برسوں کی ریاضت کے بعد کسی سنگ تراش

نے اپنا شاہکار تخلیق کیا ہو۔ وہ جہاں قدم رکھتی تھی' وہاں بھنور پڑتے تھے۔

وہ دم بخود سا اسے دیکھ رہا تھا۔ ملائی کی رنگت کے موی نازک ہاتھوں کی انگلیاں کس قدر آرٹسٹک بناوٹ کی تھیں۔

غرور سے اٹھی ہوئی صراحی دار گردن
سیدھے آبشاروں جیسے بال اور بڑی بڑی سرمئی بادلوں جیسی آنکھیں
شفاف اتنی جیسے نور کے ہالے میں لپٹی ہوئی چاندنی
سادگی جس کا سنگھار تھی اور حیا اس کا وقار

"میرے یار! وہ اپنی قسمت پہ رشک کرے گی جسے تم مل جاؤ' اسے بھلا اور کیا چاہیے؟" رالف نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی سے نوازا۔

بلاشبہ وہ بہت خوب صورت تھا اعلا تعلیم یافتہ دولت مند خاندان سے تھا دونوں نے مل کر اس پر اتنا زور دیا کہ اگلے روز یونیورسٹی میں صبح کے وقت جب ابھی کلاسز اسٹارٹ نہیں ہوئی تھیں اور اسٹوڈنٹس سیڑھیوں پہ' ٹیرس پہ' لان میں کھڑے خوش گپیاں لگا رہے تھے۔ مانیک نے قریب سے گزرتی بیلا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

وہ بل کھا کر پلٹی۔ اس کے ابرو تن گئے اور پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ رخسار سرخ اور لب بھینچے ہوئے' لیکن آنکھوں میں ہنوز بے یقینی تھی۔ وہ اس کی جرات پر حیران تھی۔

وہ اس کا ہاتھ تھامے گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ اگرچہ یہ کافی عجیب حرکت تھی۔ لیکن وہ ساری دنیا کے سامنے اسے پرپوز کرنا چاہتا تھا۔ پاس سے گزرتے' دور' قریب کھڑے تقریباً سب اسٹوڈنٹس ان کی جانب متوجہ ہو چکے تھے۔ کچھ من چلوں نے تو ہوٹنگ تک شروع کر دی تھی۔

اس کا ہاتھ ابھی تک مانیک کے ہاتھ میں تھا۔

"ول یو میری می؟"

تالیوں کا شور' سیٹیوں کی گونجتی فضا اور مانیک کی اس کی جانب اٹھی منتظر نگاہیں۔

"واؤ۔" لڑکیاں بیلا کی قسمت پر رشک کر رہی تھیں۔

"نو۔" وہ ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر سیڑھیوں کی سمت بڑھ گئی اس کے جاتے ہی ہر سو جیسے سناٹا چھا گیا۔

مانیک اپنی جگہ ساکت سا بیٹھا تھا۔
رالف اور کلارک حیرت زدہ بے یقینی کا شکار
بھلا کوئی لڑکی مانیک کو بھی انکار کر سکتی تھی۔
یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔

✲ ✲ ✲

"بیلا! آئی ڈونٹ بلیو کہ تم نے اتنے اچھے لڑکے کا پرپوزل ریجیکٹ کر دیا۔ آئی تھنک ہی از اے پرفیکٹ چوائس فار یو۔" کھانے کی میز پر رابرٹ نے اس کے فیصلے پر اعتراض کرنے کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار بھی کیا تھا۔

"ایم سوری انکل! بٹ آئی ڈونٹ وانٹ ٹو میری۔" اس نے نیپکن سے ہاتھ صاف کیے۔

"یس ڈیڈ! کیونکہ اسے نن بننا ہے۔ تم چرچ کیوں نہیں جوائن کر لیتیں؟" کیتھرین کا انداز استہزائیہ تھا۔

مانیک اسے بہت پسند تھا اور وہ یہ جان کر بے حد پرجوش تھی کہ وہ بیلا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

"کیتھرین! بی ہیو یور سیلف۔" رابرٹ نے اسے گھورا۔ جس پر وہ سر جھٹکتے ہوئے فرنچ فرائز کو کیچپ میں ڈبو کر کھانے لگی۔ اس نے رابرٹ اور جینفو سے کسی بھی معاملے میں بحث کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ایک سال بعد وہ اٹھارہ کی ہو جائے گی تو اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزارے گی۔ اس خیال کے تحت وہ سب چپ چاپ سن لیتی تھی۔

"میرا مطلب تھا' مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔ میں پہلے خود کو اسٹیبل کرنا چاہتی ہوں۔" وہ ٹیبل سے اٹھ کر اوپر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ مانیک کا سر پھاڑ دے۔ اس نے سمجھ کیا رکھا

تھا۔ کیا وہ اتنی بے وقوف تھی کہ اس کے شادی کے جھانسے میں آجاتی اور وہ اپنی نفسانی تسکین کی خاطر اسے استعمال کرتا۔

☼ ☼ ☼

ان کے تھیوری کے ایگزامز اور پریکٹیکل ہو چکے تھے۔ بس کیمسٹری کا دائیوا رہ گیا تھا۔ لیکن ابھی اس میں ایک ہفتہ باقی تھا۔ مگر کیتھرین نے آؤٹنگ کے پروگرامز بنانا شروع کردیے تھے۔

وہ اسے شاپنگ پر چلنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ بیلا نے چائے کا مگ حلق میں انڈیل کر سرتاپا کمبل تان لیا تھا۔

"باہر اتنے گھنے بادل چھائے ہیں۔ کسی بھی وقت بارش ہو سکتی ہے۔ ٹھنڈ بہت زیادہ ہے۔ پھر میں چائے بھی پی چکی ہوں اور اب نرم گرم کمبل میں دبک کر سونے کی خواہش ہو رہی ہے۔ سوری کیتھی! میرا موڈ نہیں ہے جانے کا۔" اتنی طویل معذرت پر وہ جھلا اٹھی۔

"پہلے ہی پھوٹ دیتیں کہ نہیں جانا۔ دس منٹ برباد کردیے۔"

"پھر تم وضاحتیں طلب کرتیں۔" وہ کمبل سے منہ نکال کر بولی۔

"سوتی رہو پورا ہفتہ۔" اس نے زور سے دروازہ بند کیا اور سیڑھیاں اتر گئی۔ خریدنا تو اسے بھی کچھ نہیں تھا۔ یوں ہی ونڈو شاپنگ کرتے ہوئے اس کی نگاہ مانیک سے ٹکرا گئی۔ وہ بھی اسے دیکھ چکا تھا۔

کیتھرین نے اسے اس روز کے بعد آج دیکھا تھا۔ وہ اسے کچھ پژمردہ سا لگا حالانکہ اس بات کو دو ماہ ہو چکے تھے۔

"ہیلو کیتھی!" وہ اپنی جگہ رکی ہوئی تھی۔ مانیک ہی پاس آیا تھا۔

"ہائے۔" وہ بدقت تمام مسکرائی۔

بیلا نے جو اس کے ساتھ کیا تھا۔ اس پر اسے خوامخواہ شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔

"کیسی ہو؟"

"ہمیشہ کی طرح حسین۔" اس نے بشاشت سے کہا اور پھر اس کا احوال دریافت کرنے لگی۔ "اور تم؟"

"میں ٹھیک ہوں۔" وہ ہلکے سے مسکرایا۔

"لگ تو نہیں رہے۔" اس کا انداز مشکوک تھا۔

"بیلا کیسی ہے؟" اس نے بات بدل دی۔

"اچھی ہے۔" وہ سنجیدہ ہوئی۔

"وہ تمہارے ساتھ نہیں آئی؟" مانیک نے غیر محسوس انداز میں اس کے عقب میں جھانکا۔

"اس کا موڈ نہیں تھا۔" وہ بہت سپاٹ انداز میں جواب دے رہی تھی۔

"پلیز کیتھرین! اسے سمجھاؤ۔ میں اس کے بغیر مر جاؤں گا۔" وہ بے بس سا ہوا۔

"تم کیوں اس کے پیچھے پڑے ہو مانیک! یونیورسٹی میں ہزاروں لڑکیاں ہیں۔ جس کو بھی اشارہ کرو گے، تمہارے ساتھ چل پڑے گی۔"

"ہاں! مگر میری یہ مجبوری ہے کہ میں اسے چاہتا ہوں۔" اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"تمہیں کیا واقعی اس سے محبت ہے؟" وہ متاثر ہو گئی۔ اسے بیلا کی قسمت پر رشک آرہا تھا۔

"نہیں۔" اس نے خفگی سے بھرپور نگاہ اس پر ڈالی۔ "میں شوق میں رومیو بنا گھوم رہا ہوں۔"

"او کے۔" وہ مسکراتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔ دونوں ساتھ چلتے ہوئے کافی شاپ پر چلے آئے۔

"پہلے تو یہ حلیہ بدلو۔" کیتھرین کا اشارہ اس کے لمبے بالوں، کانوں میں جھولتی بالی، آنکھوں میں پہنے اسٹونز اور گلے میں جھولتی ڈوری کی سمت تھا۔

"بدل لیا..... آگے۔" وہ بے چینی سے بولا۔ اسے اصل ہدف تک پہنچنے کی جلدی تھی۔

"وہ سگریٹ سے الرجک ہے۔"

"چھوڑ دی۔"

"ہاں! یہ سب تو تم چھوڑ سکتے ہو۔ روزمرہ روٹین سے ہٹنا اور برسوں کی عادتوں کو چھوڑنا اتنا مشکل نہیں ہوتا، لیکن تم اس کی خاطر اپنا عقیدہ تو کبھی نہیں بدل پاؤ

گے۔" وہ پست آواز میں بڑبڑائی۔

"ٹھیک ہے! میرا تعلق پروٹسٹنٹ فرقے سے ہے۔ بٹ نو پرابلم، میں اس کی خاطر کیتھولک ہو جاؤں گا۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"وہ یسوع کو گاڈ (God) کا بیٹا نہیں مانتی۔" کیتھرین نے اس کے سر پر جیسے دھماکا کیا تھا۔ کتنی ہی دیر تو وہ جیسے کچھ بولنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔

"واٹ؟" اسے لگا اسے سننے میں مغالطہ ہوا ہے۔

"ہاں!" کیتھرین اٹھ کھڑی ہوئی۔

"سنو! اس نے پیچھے سے پکارا اور پھر خود بھی اٹھ کر اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"تم اسے سمجھاؤ۔"

"میں بات کروں گی۔" وہ اسے تسلی سے نوازتے ہوئے گھر لوٹ آئی۔ بیلا پر اسے نئے سرے سے غصہ آرہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلا پورا ہفتہ وہ شو کی تیاری میں گزر گیا۔ آج شام میں ڈنر کے بعد وہ دونوں فارغ تھیں۔ کیتھرین نے اسے واک پر چلنے کو کہا تھا۔ باہر کا موسم خاصا خوش گوار تھا۔ اس نے ساتھ چلنے کی ہامی بھرلی۔

لفٹ سے اٹھ کر دونوں سڑک پر آچکی تھی۔ سڑک پر برقی لائیٹس، جگنو کی مانند جگمگا رہی تھیں۔ جھیل میں چاند نہا رہا تھا اور اس کے کنارے آبی نرگس کے سنہری پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔

بلاشبہ یہ ایک خوشنما منظر تھا۔

وہ جھیل کے کنارے ہی رک گئی اور محویت سے چاند کو دیکھنے لگی۔ یوں لگتا تھا، جیسے پانی کی کٹوری میں کسی نے چاند لا کر رکھ دیا ہو۔ اتنا دلکش اور طلسماتی منظر اس کی آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ نرگس کے پھول اس کے فیورٹ تھے۔ وہ ایک سنہری کلی توڑنے کے لیے جھکی۔ اچانک بارش کا پہلا قطرہ ٹپکا۔

اس کی نظروں میں پھر سے وہ کافی شاپ کا منظر گھوم گیا۔

برستی بارش، چھلکتی کافی، پیشانی سے چپکے بال۔

اور وہ گہری سمندر جیسی آنکھیں

ان آنکھوں میں بلا کی طلسماتی کشش تھی، جو انسان کو ہوش و خرد سے بیگانہ کردے۔

"کیا کسی مرد کی آنکھیں بھی اتنی خوب صورت ہو سکتی ہیں؟" وہ اکثر خود سے سوال کرتی۔

"ارے! میں تو بتانا ہی بھول گئی۔" کیتھرین سر پہ ہاتھ مارتے ہوئے اس کے قریب آن بیٹھی۔ یہ بھی اسے متوجہ کرنے کا ایک انداز تھا۔

بیلا نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک سنہری کلی تھی۔ جسے ابھی اس نے توڑا نہیں تھا۔

"انجلین کی انگیجمنٹ ہو چکی ہے، ٹومی کے ساتھ۔ بہت امیر لڑکا ہے۔" اس کا جوش دیکھنے لائق تھا۔

بیلا نے محض مسکرانے پر اکتفا کیا۔

اسے انجلین یا پھر اس کی منگنی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے تو کیتھی کی کوئی دوست اچھی نہیں لگتی تھی۔ کیتھی ہی اسے زبردستی ان کے بیچ لے جایا کرتی تھی۔

"کاش! مجھے بھی کوئی ایسا مل جائے۔" وہ حسرت سے بولی۔

"کیسا؟" بیلا نے تین کلیاں توڑ لی تھیں اور اب بالوں سے ربن اتار کر انہیں باندھ رہی تھی۔

"ٹومی یا پھر مانیک جیسا۔"

"اس کا یہاں کیا ذکر؟" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تمہاری جگہ اگر اس نے مجھے پرپوز کیا ہوتا تو میں خود کو سب سے اسپیشل تصور کرتی۔"

"حرکتیں دیکھی ہیں اس کی؟ وہ تمہیں ہی سوٹ کرتا ہے۔"

"کاش! وہ بھی ایک بار ایسا سوچ لیتا۔" وہ شرارت سے بولی۔

"تو اس کی جگہ تم سوچ لو ایسا۔" بیلا نے بھی اسے چھیڑا۔

"او گاڈ۔" کیتھرین نے سر تھام لیا۔
"بٹ ہی لوز یو۔"
"یہ پیار ویار کا تو بس ڈھونگ ہے۔ مرد کی محبت محض عورت کے وجود تک وابستہ ہوتی ہے۔ مطلب نکلا اور بھول گئے۔"
"تم بھول رہی ہو اس نے تمہیں پروپوز کیا تھا۔" کیتھرین نے یاد دلایا۔
"شادی تو ڈیڈ نے بھی کی تھی می سے۔" اس کی آنکھوں میں یاسیت اتر آئی۔ بہت سے لمحے نظروں کے سامنے گھوم گئے۔ سترہ برس تک اس کی ماں کی نظریں چوکھٹ سے لپٹی رہی تھیں۔ اس خیال سے کہ کہیں بھولا بھٹکا مسافر لوٹ نہ آئے، اس نے اپنا اپارٹمنٹ نہیں بدلا تھا۔
"تم ہر شخص کو اپنے ڈیڈ کے ساتھ کمپیئر نہیں کر سکتیں۔"
"تم میرے سامنے اس کی حمایت مت کرو۔ مجھے کچھ نہیں سننا۔" وہ سنہری کلیاں جھیل میں پھینک کر وہاں سے بھاگ آئی۔
"بیلا! سنو تو۔" کیتھرین نے پکارا بھی۔ مگر اس کا موڈ بہت خراب ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلا پورا ہفتہ وہ اسے سمجھاتی رہی تھی۔ لیکن بیلا ہر بار یا تو اس پر بگڑ جاتی یا پھر بات کا رخ موڑ دیتی اور کبھی تو یوں ظاہر کرتی۔ جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔
تنگ آکر اس نے مانیک سے معذرت کرلی۔ تب اس نے آخری بار ملوانے کا کہا تھا اور اب وہ اسے بہانے سے کلب لے آئی تھی۔
فلیش لائیٹ میں دمکتے چہرے، بے ہنگم میوزک اور ایک دوسرے کے پہلو میں لڑھکتے نیم برہنہ وجود۔ ہر کوئی مدہوش سا اپنے حال میں مست نظر آرہا تھا۔
اس نے اک ناگوار سی نگاہ پورے ڈسکو ہال پر ڈالی اور دوسری کیتھرین پر، جو اس کی موجودگی سے بے نیاز اپنے نئے بوائے فرینڈ پیٹر کے ساتھ ڈانس کر رہی تھی اسے تو یوں آگے پیچھے ڈولنے میں کوئی چارم نظر نہیں آتا تھا۔
"گڈ ایوننگ بیلا۔" کوئی اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ لبوں پہ مسکراہٹ لیے بالکل بدلے ہوئے گیٹ اپ کے ساتھ وہ معمول سے ہٹ کر خوبرو اور اسمارٹ لگ رہا تھا۔
بیلا کو اپنی دھڑکنوں میں گڑبڑ سی محسوس ہوئی۔ اس نے سٹپٹا کر نظروں کا زاویہ بدل لیا اور کیتھرین کو آوازیں دینے لگی۔ مگر وہ سن کر بھی انجان بن رہی تھی۔
"میں جا رہی ہوں۔" اس نے دور سے اشارہ کیا۔
"ایکسکیوز می۔" پھر مانیک کے پہلو سے نکل کر وہ باہر کی طرف لپکی۔
وہ بھی اس کے پیچھے ہی آیا تھا۔
باہر کی فضا میں خنکی کا احساس شدید تھا اور بادل خوب گرج گرج کر برس رہے تھے۔ بیلا نے دروازے سے ہاتھ باہر کیا۔ بارش کی دو بوندوں کو اس نے اپنی ہتھیلی میں اٹھایا اور پھر فوراً ہاتھ اٹھا کر جھٹک دیا۔ پانی بے حد ٹھنڈا تھا۔ اس نے کپکپاتے ہوئے دونوں ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑ کر سردی کا احساس زائل کرنے کی کوشش کی۔
وہ باہر نکلا اور اس کا راستہ روک کر عین اس کے مقابل آن کھڑا ہوا۔ بارش کا پانی اسے بھگو رہا تھا۔ مگر اسے جیسے کوئی پروا نہ تھی۔
بیلا کے ابرو تن گئے۔
اس کی پرشوق نگاہیں اس کے گلابی ہونٹوں پر جمی ہوئی تھیں۔ لب خاموش تھے۔ مگر آنکھیں خاموش نہیں تھیں۔
ان سے لپکتے جذبوں کی حدت دیکھ کے بیلا کو دل کے کنارے پگھلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اپنی جنوں خیز نظریں کو اس پر ٹکائے وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ پگھل رہی تھی، موم ہو رہی تھی اور پھر بالآخر وہ بول اٹھی۔
"یوں بارش میں بھیگ کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہو تم"

"جو تمہیں میری شدتوں میں نظر نہیں آتا۔" وہ بے تاب لہجے میں بولا۔
"وہ تو تم مر کر بھی ثابت نہیں کر پاؤ گے۔ کیونکہ مجھے تمہارا اعتبار نہیں ہے۔" اس نے بے نیازی سے سر جھٹک دیا۔
"اور میں آج تمہیں وہ اعتبار دے کر رہوں گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے موت کی حد سے ہی کیوں نہ گزرنا پڑے۔" وہ اطمینان سے بولا۔ بارش کی گرج چمک بڑھ چکی تھی اور مانیک کا ارادہ بھی اٹل تھا۔ بیلا نے ایک بار برستے آسمان کو دیکھا اور دوسری بار اسے۔
تب ہی اس نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر اس کی سمت اچھال دیا۔ جو پانی کی سطح پر تیرتا اس کے قدموں میں آن رکا۔
"جاؤ! تم اپنے گھر چلی جاؤ اور صبح جب میں مر جاؤں تو میری موت کی اطلاع اس نمبر پر دے دینا۔ وہ آکر میری ڈیڈ باڈی لے جائیں گے۔" وہ ایک طرف ہو کر اسے راستہ دیتے ہوئے بولا۔
"تم ایسا نہیں کر سکتے۔" وہ ہنوز بے یقین تھی۔
"میں ایسا ہی کروں گا۔" وہ ضدی لہجے میں بولا۔ وہ اس کی سمت دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔ اس کا سارا وجود کپکپا رہا تھا اور ہونٹ نیلے پڑ چکے تھے۔ اپنی بات کہہ کر وہ ان سب سے بے نیاز اسے یوں دیکھ رہا تھا۔ جیسے کوئی مرنے والا زندگی کو دیکھتا ہے۔
اتنی حسرت، اتنی بے چارگی اور اتنی محبت وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ سکتی تھی۔
"تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو نا تو میں تم سے شادی کرنے کو تیار ہوں..... ابھی اور اسی وقت۔" وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ دوسرے لڑکوں کی طرح وہ بھی اس سے محض فلرٹ کر رہا ہے۔ اپنی جانب سے اس نے یہ سب کہہ کر اسے بڑی آزمائش میں مبتلا کیا تھا۔ اس کا خیال تھا، وہ اب کوئی بہانہ بنائے گا۔
مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی، جب وہ دوبارہ اس کے مقابل آن کھڑا ہوا۔
"چلو۔" وہ مکمل طور پر سنجیدہ تھا۔
"بیلا! تم پاگل ہو چکی ہو۔" کیتھرین اسی وقت ان کے پاس چلی آئی۔ وہ ان کی گفتگو کا آخری جملہ سن چکی تھی۔
"ایسے شادی کرو گی؟" اس نے روکنے کی سعی کی۔ مانیک جھٹ اپنی ریڈ فراری کا فرنٹ ڈور کھولے کھڑا تھا۔ بیلا نے کیتھرین کی بات کا جواب دینا بھی ضروری نہ سمجھا اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"نایاب! کہاں ہو تم؟ صبح سے کال کر رہا ہوں۔ آج یونیورسٹی بھی نہیں آئیں۔ مجھے آج تمہیں سرپرائز دینا تھا..... مما سے ملوانے لے کر جانا تھا۔ وہ ویٹ کر رہی ہوں گی اور تم ہو کہ....." لان میں جھولے پر بیٹھی وہ مسلسل اس فون کال کو سوچے جا رہی تھی۔ در نایاب نہا رہی تھی۔ اس کا فون مسلسل بج رہا تھا تو مہک نے ریسیو کر لیا۔ دوسری طرف کوئی لڑکا تھا۔
"کون ہو سکتا ہے۔" لہجے کی بے قراری اور مخاطب کرنے کا انداز بتاتا تھا کہ شناسائی کے رنگ نئے نہیں ہیں۔
"کوئی یونیورسٹی فیلو۔" اس کا شک گھوم کر ادھر ہی جا رہا تھا۔
"مگر پھوپھو کسی سے محبت کیسے کر سکتی ہیں۔" اس کا دماغ سن ہو چکا تھا۔ "اگر ایسا ہوا تو یہ لاحاصل خواہش کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔
پھوپھو اپنے قبیلے کی روایات، اپنا خاندانی وقار اور برسوں پرانی طے شدہ بات سب کیسے فراموش کر سکتی ہیں۔
کیوں انہوں نے ایسی خارزار راہ پر قدم رکھا ہے۔"
دونوں ہاتھ گود میں رکھے وہ اپنی سوچوں میں اس قدر الجھی ہوئی تھی کہ اسے زریاب کی آمد کا علم تک نہ ہو سکا۔ اس نے ڈرانے کے لیے جھولا پکڑ کر زور سے ہلایا۔ وہ گھٹنوں کے بل سوکھی خشک گھاس پر جا گری تھی۔ اس کے پاؤں میں شدید موچ آگئی۔ درد سے

آنکھوں کے کٹورے لبالب بھر گئے۔

"سوری مہک۔" وہ شرمندہ ہوا۔

میرا مقصد تمہیں گرانا نہیں تھا۔" وہ وضاحتیں دے رہا تھا۔ مگر وہ پاؤں پکڑے خاموش بیٹھی آنسو بہائے جا رہی تھی۔

"لگتا ہے' موچ آگئی ہے۔ دکھاؤ! میں ابھی ٹھیک کر دوں گا۔" اس نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا جب وہ چلا اٹھی۔

"خبردار! جو مجھے ہاتھ لگایا تو۔" اس کا انداز انتہائی جارحانہ تھا۔

"اچھا! چلو اٹھو اور اندر چلو۔ پھوپھو یہیں آ رہی ہیں۔" وہ صلح جوئی سے بولا۔

"اچھا ہے! پھوپھو کو بھی تمہاری بے ہودہ حرکتوں کا پتا چلے۔ دیکھنا! تمہاری شکایت تو میں اس بار خود ابا سے کروں گی۔ اس روز بھی تم نے مردہ چھپکلی میری گود میں رکھ دی تھی۔" سنہری آنکھوں میں بادل امڈ آئے۔ اس سے قبل کہ ٹپ ٹپ برسات ہوتی' زریاب نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"اچھا! ایک بار معاف کر دو۔ اب تمہیں چھپکلی سے کبھی نہیں ڈراؤں گا.... اور ابھی جو لال بیگ میں تمہاری نوٹ بک میں رکھ کر آیا ہوں۔ وہ بھی نکال دوں گا۔" کیا معصومیت بھرا اعتراف تھا۔ مہک کی چیخ نکل گئی۔

"میری نوٹ بک میں لال بیگ؟ زریاب! آئی ول کل یو۔" اس نے زمین پر ہاتھ مارا تو زریاب نے اس کے دونوں جوتے حفظ ماتقدم کے طور پر اٹھا لیے۔

"چلو! ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔"

"ڈاکٹر کو گھر لے کر آؤ۔" قریب رکھی نوٹ بک اٹھا کر اس نے زریاب کا نشانہ لیا۔ مگر وہ مہارت سے کیچ کر تا پلٹ گیا۔

"اب کہاں جا رہے ہو؟" وہ پیچھے سے چلائی۔

"ڈاکٹر کو بلانے۔" وہ تحمل سے گویا ہوا۔

"میں ڈاکٹر کے آنے تک یہیں بیٹھی رہوں گی کیا؟" وہ زچ ہو اٹھی۔

"چل سکتی ہو؟" وہ گھوم کر واپس آیا تو وہ نفی میں سر ہلا گئی۔

"مجھے فلمی ہیرو بننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ پھوپھو کے آنے تک ادھر ہی چڑیوں کے ساتھ بیٹھو۔" بے مروتی سے کہتا وہ چلا گیا۔ مہک پیچھے پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

چرچ میں دونوں کی شادی ہوئی۔ اس کے بعد مانیک اسے اپنے اپارٹمنٹ لے آیا۔ آج پہلی بار خوشی کے بھرپور احساس کو اس نے تمام تر شدتوں کے ساتھ محسوس کیا تھا۔

بیلا اس کی ہو چکی تھی۔ مگر وہ اب بھی بے یقین سا تھا۔ اسے یہ سب ایک حسین خواب جیسا لگ رہا تھا۔ بار بار پلکیں جھپکتے ہوئے اس نے خود کو باور کروایا کہ یہ حقیقت ہے۔ حسین' خوشنما' دلفریب حقیقت' جو خوابوں سے کہیں زیادہ خوب صورت ہے۔

وہ اس کے اپارٹمنٹ میں اس کے ساتھ موجود تھی وہ اسے کچھ کنفیوز اور نروس بھی لگ رہی تھی۔

"کیا لو گی؟" اچانک اسے آداب میزبانی یاد آئے۔

"کافی۔" اس نے بغیر کسی جھجک کے کہہ دیا۔

وہ اٹھ کر کچن میں چلا آیا کافی پھینٹنے کے ساتھ ساتھ وہ ویلیم جون کی خوب صورت نظم گنگنا رہا تھا۔

بیلا ٹیرس کی ریلنگ پر جھکی اس کی آواز سن رہی تھی۔ اسے لگا' اس گیت کو مانیک سے اچھا کوئی نہیں گنگنا سکتا۔

اس کی آواز میں ساز تھا' سوز تھا اور محبت تھی۔ محبت جو ہر چیز کو حسین بنا دیتی ہے۔

"کافی۔" اس نے مگ ریلنگ پر رکھ دیا۔

"کافی اچھی بناتے ہو۔" وہ ایک گھونٹ بھر کر بولی۔

"یہ تعریف ہے؟" وہ شرارت سے مسکرایا۔

"سمجھ سکتے ہو۔" اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔

"کیا تم اپنے فیصلے پر پچھتا رہی ہو؟" مانیک نے

ریلنگ سے ٹیک لگالی۔

ٹھنڈی سرسراتی ہوائیں شور مچا رہی تھیں۔

"میں خود اپنی کیفیت نہیں سمجھ پا رہی۔ خوش بھی نہیں اور کوئی پچھتاوا بھی نہیں۔ بہرحال اتنا ضرور ہے کہ تم جیسا شخص میرا آئیڈیل نہیں تھا۔" اس نے صاف گوئی سے کہہ دیا۔

"لیکن تم جیسی لڑکی ہی میرا آئیڈیل تھی..... جو کبھی مجھ سے بے وفائی نہ کرے۔ مجھے بروکن فیملی سے بہت ڈر لگتا ہے بیلا..... مجھے اور میرے اس گھر کو کبھی ٹوٹنے مت دینا۔" مانیک نے اسے شانوں سے تھام لیا۔

وہ اس کے لفظوں کی شدت پر ساکت رہ گئی۔ اس ایک لمحے میں وہ اسے دنیا کا سب سے سچا انسان لگا تھا۔ اس نے بے اختیار اپنے شانوں پر رکھے اس کے ہاتھوں کو چھوا' جو سنگریزوں کی مانند دہک رہے تھے۔

"تمہیں بخار ہے؟ تم بارش میں بھیگے تھے نا..... اومائی گاڈ! تمہیں نمونیہ نہ ہو جائے۔" وہ ایک پل میں کس قدر فکر مند ہو گئی تھی۔ مانیک کو اس کا اپنے لیے فکر میں مبتلا ہونا' اپنی پروا کرنا اچھا لگا تھا۔ اس کا دل چاہا' وہ خوشی سے چھلانگیں لگائے۔

☼ ☼ ☼

وہ فیصلہ جسے کرنے میں وہ تامل کا شکار تھی اور کل تک اسے اپنے احساسات کا خود بھی اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ خوش تھی' اداس تھی یا پچھتا رہی تھی۔

لیکن آج اس نے صحیح معنوں میں خوشی کو اپنے من کے اندر کسی نوخیز کلی کی مانند چٹکتے محسوس کیا تھا۔ اس کے سب اندازے' جو وہ مانیک کے متعلق لگایا کرتی تھی جھوٹ نکلے تھے۔

وہ اپنے سابقہ حلیے کے برعکس بہت محبت کرنے والا اور مہذب نوجوان تھا۔ کل اس نے کہا تھا' تم جیسا لڑکا میرا آئیڈیل نہیں تھا۔"

مگر اب ایک ہی دن میں اس کے خیالات بدل چکے تھے۔ وہ اپنے دل میں اس کے لیے بے حد محبت محسوس کر رہی تھی۔ اس کی جانب نگاہ اٹھتی تو یوں لگتا' جیسے اس ساری کائنات میں بس ایک وہ ہی ہے' جو اس کا اپنا ہے۔ وہ اس پر حق جتا سکتی تھی۔ اس پر غصہ ہو سکتی تھی۔ اس سے لڑ سکتی تھی۔ خفا ہو سکتی تھی۔

آج مدتوں بعد جیسے کوئی رشتہ میسر آیا تھا۔

رابرٹ ماموں بھی اس کے اپنے تھے۔ آنٹی جینفر اس کا کتنا خیال رکھتی تھیں۔ کیتھرین تو بہنوں جیسی تھی۔ مگر پھر بھی اس گھر میں اسے اجنبیت کا احساس ہوتا تھا۔ وہ اس گھر پر اور اس گھر میں موجود افراد پر کبھی بھی ایسا استحقاق نہیں جتا سکتی تھی۔ جیسا مانیک کے اپارٹمنٹ میں آ کر محسوس ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا' جیسے وہ صدیوں سے اسی گھر میں رہ رہی ہو۔

ابھی بھی وہ کچن کے کیبنٹ سے ٹیک لگا کر کھڑی اسے کام کرتے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس وقت بلیو پینٹ اور وائٹ ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔ سلکی بال ماتھے پہ بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ وہ اس کی محویت پر چونکا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"یہی کہ تم ویسے نہیں ہو' جیسا میں سمجھتی تھی۔"

"تو پھر کیسا ہوں؟" وہ کچن کی سلیب صاف کرتے ہوئے مسکرایا۔

"اپنی تعریف سننا چاہتے ہو؟" وہ ہنسی۔

"کیا میں اتنا لکی ہوں؟" سلیب صاف کرتے اس کے ہاتھ رک گئے۔ وہ اب سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"بیلا تمہاری ہے۔ کیا یہ خوش بختی کی علامت نہیں؟" اس نے اپنے گلے میں جھولتی چین گھماتے ہوئے شوخی سے کہا تو وہ برجستہ بولا۔

"اور بیلا کا دل؟"

"وہ تو کب کا مجھ سے بے وفائی کر چکا ہے۔" اس نے مایوسی سے شانے اچکائے۔ مانیک کے لبوں پہ بڑی دلفریب مسکراہٹ امڈ آئی۔

"تم نے بتایا نہیں کہ میں کیسا ہوں؟" وہ اب ہاتھ

دھو رہا تھا۔
"بہت اچھے اور سب سے پیارے۔" اس نے آنکھیں میچتے ہوئے دونوں ہاتھ پھیلا کر کہا تو وہ دل پہ ہاتھ رکھے جیسے گرنے کے قریب ہوگیا۔ وہ اسے اس طرح گرتا دیکھ کر مسلسل ہنسے جارہی تھی۔ جب ہی ڈور بجی۔
"کون ہے، جس نے اتنے حسین پل کو خراب کیا۔" وہ منہ بسورتے ہوئے دروازے کی سمت بڑھا۔ بیلا بھی کچن کی دہلیز پر آن کھڑی ہوئی تھی۔
"کس قدر خود غرض مطلبی اور طوطا چشم دوست ہو تم۔" دروازہ کھلتے ہی رالف کا چہرہ نمودار ہوا۔ مانیک کو دیکھتے ہی وہ نان اسٹاپ جلی کٹی سنانے پر اتر آیا۔
"اکیلے اکیلے شادی کرلی۔ ایسی بھی کیا آفت آن پڑی تھی تم پر۔ کم از کم ایک کال ہی کرلیتے۔" پیچھے کلارک تھا۔ اس کا منہ بھی پھولا ہوا تھا۔
"انہوں نے تو مجھے بھی سڑک پر چھوڑ دیا تھا۔ تم دونوں کو بلانے کی زحمت کیا کرتے؟" کیتھرین کا موڈ بھی بگڑا ہوا تھا۔ ساتھ سوزین بھی تھی۔ جس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔
بیلا اندازہ نہیں لگاپائی کہ وہ کن کیفیات کا شکار ہے
"یار! سب اتنی جلدی میں ہوا کہ بس مت پوچھو۔" وہ وضاحتیں دینے لگا۔ وہ دونوں اسے بہت عزیز تھے ۔ وہ کسی بھی صورت انہیں خفا نہیں کرسکتا تھا۔ بیلا کو پالینے کے بعد باقی رشتوں کی اہمیت اس کی نظر میں کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہر رشتے کو بہت خوب صورتی کے ساتھ نبھانا جانتا تھا۔
"یار! ہم تو تیری خوشی سے ہی خوش ہیں۔" آخر کلارک کو مصنوعی خفگی کا چولا اتارنا ہی پڑا۔ اگلے ہی پل دونوں اس سے لپٹ گئے۔
کیتھرین اس کے لیے ویڈنگ ڈریس لائی تھی۔ وائٹ نیٹ کے فراک میں وہ روایتی دولہن بنی اتنی پیاری لگ رہی تھی۔ مانیک سمیت کیتھرین، رالف کلارک اور سوزین کے لیے بھی اس پر سے نظریں ہٹانا مشکل ہوگیا۔
"یار! ہالینڈ کی شہزادی تو تم نے چرالی۔" کلارک مانیک کے کانوں میں گھسا۔ سوزین کی نظریں مانیک کی سمت اٹھ گئیں جو محبت پاش نظروں سے بیلا کو دیکھ کس قدر خوش اور مسرور دکھائی دے رہا تھا۔ اسے لگا وہ اس کی دسترس سے بہت دور جاچکا ہے۔ وہ بیلا کو پسند کرتا تھا، وہ جانتی تھی۔ بلکہ سب سے پہلے اس نے یہ بات اسے ہی بتائی تھی۔ مگر اس نے سمجھا تھا، یہ وقتی جذبہ ہے۔ کچھ وقت گزرے گا اور بیلا اپنی کشش کھو دے گی۔ لیکن اس کے تو سان و گماں میں بھی نہیں تھا کہ مانیک اس کے ساتھ شادی بھی کرسکتا ہے۔
اب رالف ان دونوں کی تصویریں بنا رہا تھا۔ وہ چپکے سے اٹھ کر اپارٹمنٹ سے باہر نکل آئی۔ اس کا یوں اٹھ کر جانا مانیک کے سوا کسی نے بھی محسوس نہیں کیا تھا۔
"ہماری پارٹی ڈیو ہے۔" رالف نے جانے سے قبل یاد دلایا۔
"اتنا سب ٹھونسنے کے بعد بھی؟" مانیک نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔
"کیتھی! انکل رابرٹ اور آنٹی کیسے ہیں؟" تنہائی ملتے ہی بیلا نے سب سے پہلے ان دونوں کا پوچھا تھا۔ اسے فکر ہورہی تھی کہ اس کے اس اقدام کے بعد ان کا کیا ردعمل سامنے آیا ہے۔
"ڈیڈ تم سے بہت ناراض ہیں۔ انہیں ہرگز امید نہیں تھی کہ تم ان کی موجودگی اور اجازت کے بغیر یوں شادی کرلوگی۔ حالانکہ وہ تمہیں اس شادی پر خود فورس کررہے تھے۔ لیکن اس حرکت پر انہیں نہ صرف خاصا شاک لگا ہے۔ بلکہ گہرا دکھ بھی ہوا ہے۔" کیتھرین صاف گوئی سے بولی۔
بیلا کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے ایسا تو کبھی نہیں چاہا تھا۔
"میں انہیں منالوں گی۔" اس خیال نے اسے مطمئن کردیا تھا۔

✵ ✵ ✵

ایونیو روڈ پر واک کرتے ہوئے دونوں اس جھیل کے کنارے چلے آئے تھے۔ جہاں آبی نرگس کی سنہری کلیاں تھیں اور جس میں چاند کا پورا عکس دکھائی دیتا تھا۔
وہ ہوا کے رخ پہ کھڑی تھی اور مانیک اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ ہوا نے اس کے بال بکھیر کر ماتھے پر گرا دیے تھے۔ سنہری آنکھوں کا رنگ آبی نرگس کے پھولوں جیسا تھا۔ نیوی بلو پینٹ اور سرمئی شرٹ میں وہ ہمیشہ کی طرح بلا کا ہینڈسم اور دلکش دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اسے دیکھنے میں اتنا کھو چکی تھی کہ اب اسے مانیک کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔
"بیلا۔" اس نے ذرا سا آگے جھکتے ہوئے اس کے رخسار پر چٹکی بھری اور نرگس کے دو سنہری پھول توڑ کر اس کے بالوں میں سجادیے۔ وہ اس وقت اسی وائٹ برائیڈل فراک میں ملبوس تھی اور ان دو نرگس کے سنہری پھولوں نے جیسے اسے سجا دیا تھا۔ فضا بھی نرگس کے پھولوں سے مہک رہی تھی۔
"ہم ہنی مون کے لیے کہاں جائیں؟" مانیک نے اپنے جوتے اتار دیے تھے اور اب اس کا ہاتھ تھام کر نم آلود گھاس پر چل رہا تھا۔
سردی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کررہی تھی۔ مگر پروا کسے تھی۔ وہ بیلا کے ساتھ تھا۔ پورے چاند کی رات تھی۔ جھیل کا کنارا تھا۔ نرگس کے پھولوں کی مہک تھی۔ ٹھنڈی گھاس اور یخ بستہ ہوائیں۔ اسے سب بہت رومانٹک لگ رہا تھا۔
"نیویارک۔" وہ اپنے شہر کو بہت مس کرتی تھی۔
"کیوں؟" مانیک نے تعجب سے سوال اٹھایا۔ وہ جانتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے سترہ سال نیویارک میں گزارے تھے۔ پھر وہاں جانے کی کیا وجہ تھی۔
"مجھے تمہیں اپنی مما سے ملوانا ہے۔"
"لیکن ان کا تو انتقال ہوچکا ہے۔"
"تو کیا ہوا؟ ہم ان کی قبر پر جائیں گے۔ وہ ہم سے بات نہیں کرسکتیں۔ مگر ہمیں دیکھ تو سکتی ہیں اور مجھے تمہارے ساتھ خوش دیکھ کر ان کی روح کو کتنا سکون ملے گا۔"
تھی، فاطمہ۔ جب اس کی والدہ کی وفات ہوئی تھی تو وہ ہر جمعے کو ان سے ملنے جایا کرتی تھی۔ اس نے کہا تھا، جسم مرجاتے ہیں، لیکن روحیں زندہ رہتی ہیں۔ جو ہمیں دیکھتی بھی ہیں اور سنتی بھی ہیں۔
مانیک کو اگرچہ ان باتوں میں کوئی سچائی نظر نہیں آرہی تھی۔ مگر پھر بھی وہ انکار نہیں کرسکا تھا۔ وہ اس کا دل نہیں توڑ سکا تھا۔ اس نے ساتھ چلنے کی ہامی بھرلی تھی۔
"اس کے بعد ہم برمنگھم جائیں گے۔ ڈیڈ سے ملنے اور پھر اسپین سے ہوکر سوئٹزرلینڈ۔"
"اچھا! اور اس کے بعد؟" وہ دلچسپی سے بولی۔
"اس کے بعد جیب خالی ہوجائے گی تو گھر لوٹ آئیں گے۔" اس نے مصنوعی بے چارگی سے ہاتھ جھاڑے تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
"تمہیں پتا ہے، تم آج بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔" اس نے آبی نرگس کے سنہری پھولوں کی ایک اور کلی اس کے بالوں میں سجادی۔

✵ ✵ ✵

"میرے بیڈروم کا ڈور کس نے لاک کیا ہے؟" وہ کھڑکی میں کھڑا چلا رہا تھا۔
"یہ کارنامہ میرے سوا کون سرانجام دے سکتا ہے۔" وہ سامنے ہی صوفے پر براجمان تھی۔ لبوں پہ دل جلادینے والی مسکراہٹ سجائے۔
"مہک کی بچی! دروازہ کھولو۔ میں کالج سے لیٹ ہو رہا ہوں۔ میرا ضروری ٹیسٹ ہے۔" اس نے دانت پیسے۔
"جی ہاں! اور اتفاق سے وہ ٹیسٹ میرا بھی تھا۔ مگر تم نے مجھے جان بوجھ کر جھولے سے گرایا۔ اب پاؤں میں آئی موچ کی وجہ سے میں کالج نہیں جاسکتی۔ پھر تم نے میرے نوٹس چرا کر رات بھر ٹیسٹ کی تیاری کی ہے۔ تمہارے لیے تو آج میدان صاف ہے۔ مجھے غیر حاضر کرواکر نمبرون پر آنا چاہتے ہو تو بات یہ ہے مسٹر زریاب شاہ! کہ میں نہیں جاؤں گی تو تم بھی نہیں جاؤ

گے۔" وہ اپنی اور اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مزے سے بولی۔

"توبہ! کس قدر کینہ پرور شاطر دماغ اور مکار لومڑی ہو تم۔" وہ تلملا کر رہ گیا۔

"حد ادب لڑکے! مت بھولو کہ تم اس وقت میری حراست میں ہو۔" اس میں سچ مچ جلال الدین کی روح سرایت کر گئی تھی۔ مگر کھڑا ہونے کے چکر میں کراہ کر واپس بیٹھ گئی۔

"ملکہ عالیہ! قیدی لڑکے پر تھوڑا ترس کھائیں۔ مجھے بھوک لگی ہے..... دروازہ تو کھول دیں۔" آواز میں مصنوعی عاجزی اور انکسار سمٹ آیا۔

"فی الحال تو میں رحم کے موڈ میں نہیں ہوں۔ کالج ٹائم گزر جائے تو سوچوں گی۔"

"یار! نہیں جانا میں کالج..... دروازہ تو کھولو..... مجھے ناشتا کرنا ہے۔" اسے واقعی بھوک لگی تھی۔ یہ بات تو مہک بھی جانتی تھی کہ وہ بھوک کا کتنا کچا ہے۔ صبح آٹھ بجے ناشتے میں دو پراٹھے لیتا تھا اور اب نو بج رہے تھے۔

"پہلے حلف اٹھاؤ کہ تم آج کالج نہیں جاؤ گے۔" اس نے شرط عائد کی۔

"بیوقوف لڑکی! جانتی نہیں کہ میں کتنی محبت کرتا ہوں تم سے؟ تمہارا کہہ دینا ہی میرے لیے کافی ہے۔" وہ ڈائیلاگ پر اتر آیا تھا۔ مگر وہ اس کی چالاکی سمجھ گئی۔

"ڈائیلاگ نہیں چلیں گے..... شرافت سے حلف اٹھاؤ اور آجاؤ۔ دیکھو! ناشتا ٹیبل پر سج چکا ہے۔ تمہاری پسند کے گوبھی والے پراٹھے ہیں۔" ایک لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے اس نے باقی کا پراٹھا زریاب کی نظروں کے سامنے لہرایا، جس پر اس کی بھوک مزید چمک اٹھی۔

اب کالج نہ جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

"خوامخواہ چھٹی کروا دی میری۔ اب میں سارا دن گھر میں کیا کروں گا۔" وہ باہر نکلتے ہی اس پر چڑھ دوڑا۔

"میری سیوا۔" وہ ہنستے ہوئے گویا ہوئی۔

آج رات گیارہ بجے ان کی نیویارک کے لیے فلائٹ تھی۔ مانیک اپنی پیکنگ مکمل کر چکا تھا۔ اپنا بیگ تیار کرنے کے بعد وہ اس کی سمت متوجہ ہوا۔

"تم نے اپنا بیگ تیار کر لیا؟"

"بیگ کپڑوں سے تیار کیا جاتا ہے اور میں ایک جوڑے میں تمہارے پاس آئی تھی۔" اس نے خفگی سے مانیک کو دیکھا تو وہ سر پہ ہاتھ مار کر بولا۔

"اوہ! تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟"

"تین روز سے مجھے ایک ہی لباس میں دیکھ کر بھی خیال نہیں آیا؟"

"جب تم سامنے ہوتی ہو تو باقی سب پس منظر میں چلا جاتا ہے یا پھر تم اتنی پیاری ہو کہ تمہیں سنگھار کی بھی ضرورت نہیں۔" وہ مکالمے بازی پر اتر آیا۔ وہ متاثر ہوئے بغیر خفگی سے اسے دیکھتی رہی۔

"چلو! تمہیں شاپنگ کروا کر لاتے ہیں۔ واپسی پر تمہارے انکل رابرٹ اور آنٹی سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔" اس نے جلدی جلدی پروگرام ترتیب دیا۔ مگر انکل رابرٹ کے نام پر اس کا چہرہ اتر گیا۔ وہ یہ سوچ کر پریشان تھی کہ وہ انہیں کیسے منائے گی۔ اسے کبھی بھی کسی کو منانا نہیں آیا تھا۔

"وہ نہیں ملیں گے۔" اس نے خود ہی اخذ کر لیا۔

"یہ میرا ہیڈک ہے۔ میں منا لوں گا۔" اس نے وثوق سے کہا۔

اور پھر واقعی اس نے انکل رابرٹ اور آنٹی کو منا کر ہی دم لیا تھا۔ دل میں تو ان کے ابھی بھی کچھ غصہ باقی تھا مگر بظاہر وہ اس سے اب کافی ہنس بول رہے تھے۔

اپنے ملک کی سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے اس کے احساسات عجیب سے ہو گئے۔ دل کسی ضدی بچے کی مانند ہمکنے لگا۔ رات کا آخری پہر بڑی مشکل سے گزرا۔

نیویارک میں صبح طلوع ہوئی اور اس نے بستر چھوڑ دیا۔ روم سروس والا آکر ناشتا دے گیا۔

مانیک کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ مگر بیلا کی خاطر وہ جلدی اٹھ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ اپنی مما سے ملنے کے لیے بے چین ہے۔

شاور لینے کے بعد اس نے بلیک پینٹ پر سفید ہائی نیک جرسی اور بلیک سلیو لیس جیکٹ پہنی تھی۔ جس میں وہ اچھا خاصا خوبرو اور اسمارٹ لگ رہا تھا مگر بیلا اس کی تیاری سے مطمئن نہیں ہوئی تھی اس نے بیگ سے اس کے لیے بلیک ٹو پیس نکال دیا تھا۔

"مانیک! اگر تم یہ پہنو تو۔" وہ اس کے سر پر آن کھڑی ہوئی۔ بالوں میں برش کرتا اس کا ہاتھ رک گیا۔ وہ کچھ کہنے نہ کہنے کی کیفیت میں الجھا کھڑا تھا اور یہی الجھن اس کی آنکھوں سے بھی جھلک رہی تھی۔ تب ہی اس نے وضاحت کر دی۔

"میں چاہتی ہوں تم مما کو برطانیہ کے شہزادے سے زیادہ ہینڈسم نظر آؤ۔" مانیک اس کی معصومانہ خواہش پر مسکرا دیا۔ وہ ایک مری ہوئی عورت کے لیے اتنی محتاط ہو رہی تھی۔ وہ اسے ٹوکنا چاہتا تھا۔ لیکن پھر اس کی خوشی کی خاطر اس نے بلیک سوٹ پہن لیا تھا۔

ناشتے کے بعد دونوں نیویارک کے قدیم چرچ یارڈ میں چلے آئے تھے۔

بیلا نے راستے میں رک کر سفید للی کا بکے خریدا۔

"مما! دیکھیں آپ سے ملنے کون آیا ہے۔" اس کی پلکیں نم ہونے لگیں۔ "آپ کہا کرتی تھیں نا کہ میری بٹی بالکل پریوں جیسی ہے اور اس کے لیے ایک دن کوئی بہت سندر سا شہزادہ آئے گا۔ دیکھیں! وہ پریوں کی کہانی سچ ہو گئی۔ آپ میرے شہزادے سے نہیں ملیں گی؟" بیلا نے مانیک کا ہاتھ تھام کر قبر کے بالکل سامنے کھڑا کر دیا۔ مگر سامنے سفید سنگ مرمر کے سپاٹ پتھر تھے۔ جن میں زندگی کی کوئی رمق موجود نہیں تھی۔ وہ بے جان تھے۔ مگر اپنے اندر کیسے کیسے محبوب چہرے سمیٹے ہوئے تھے۔

اس پر وحشت سوار ہونے لگی۔ اس کا بس نہ چلتا تھا، وہ سارا قبرستان تہس نہس کر دے۔ وہ ان سفید پتھروں کو توڑ پھوڑ دے اور پھر جانے کب ہر منظر دھندلایا تھا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ مانیک نے بڑی مشکل سے اسے سنبھالا۔

دو دن مزید وہاں رک کر وہ سب پرانے دوستوں سے ملی۔ اپنے شہر آکر جیسے ہر زخم تازہ ہو گیا تھا۔ ہر یاد کسک دینے لگی تھی۔ ان گلی کوچوں میں اسے آج بھی اپنا بچپن اور الزبتھ کے قدموں کا لمس دکھائی دیتا تھا۔ اس نے آخری بار ان سب جگہوں کو دیکھا۔

اپنا پرانا گھر جہاں اب کوئی اور فیملی رہائش پذیر تھی۔ اپنا اسکول، اپنے گراؤنڈ جہاں وہ الزبتھ کے ساتھ ٹینس کھیلا کرتی تھی۔ وہ پارک جہاں ہر شام واک کرنے جاتی تھی۔

"آئی پرامس بیلا! میں اب کبھی تمہیں تنہا نہیں ہونے دوں گا۔ ہم اپنی زندگی کو مل کر بہت خوب صورت اور خوش گوار بنائیں گے۔" وہ جھولے پر بیٹھی الزبتھ کے لمس کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہی تھی، جب مانیک نے اس کے دونوں ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

بیلا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے سینے پر سر ٹکا دیا۔

علامہ اقبال میڈیکل کالج سے ان دونوں کو پک کرنے کے بعد ڈرائیور نے گاڑی پنجاب یونیورسٹی کے سامنے روک دی تھی۔ زریاب نے جیب سے موبائل نکالا۔ وہ درنایاب کو ایس ایم ایس کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ لوگ گیٹ پر کھڑے ہیں۔ تب ہی مہک کو اچانک اس روز والی فون کال یاد آئی تھی۔ وہ بارہا اس شخص کے متعلق سوچ چکی تھی اور اس کے خیال میں وہ ضرور کلاس فیلو ہی تھا اور درنایاب اس میں انٹرسٹڈ تھی۔ آج ویسے بھی اس کا لاسٹ ڈے تھا۔

ایگزامز سے فارغ ہو کر وہ آج اپنی دوستوں سے ملنے یونیورسٹی آئی تھی۔

اسے لگا، وہ آج آسانی کے ساتھ اپنے ہدف تک پہنچ سکتی ہے۔

"تم رہنے دو۔ میں پھوپھو کو خود بلا کر لاتی ہوں۔"

اس نے زریاب کو ٹوک دیا اور اپنی سمت کا دروازہ کھولنے لگی۔

"تم کہاں تلاش کرتی پھرو گی؟ میں ایس ایم ایس کرتا ہوں۔ وہ آجائیں گی۔" آدھا ادھورا ایس ایم ایس وہ پھر سے ٹائپ کرنے لگا تھا۔

"اپنے ڈپارٹمنٹ میں ہی ہوں گی۔ مجھے پتا ہے، سائیکالوجی ڈپارٹمنٹ ..... کہاں ہے۔" وہ کہہ کر اتر گئی اور باآسانی نیو کیمپس چلی آئی۔

سائیکالوجی ڈپارٹمنٹ سامنے ہی تھا اور وہ دونوں لان میں بینچ پر بیٹھے دکھائی دے گئے تھے۔

در نایاب ایک پھول گود میں رکھے اس کی پتیاں نوچ رہی تھی۔

"میں جلد مما کے ساتھ حویلی آؤں گا۔" اس شخص نے اپنے دونوں ہاتھ نایاب کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

"جانے کیوں مجھے ڈر سا لگتا ہے۔ حویلی کے اصول بہت سفاک ہیں اور روایات کی دیواریں اتنی بلند کہ انسان کی خواہشیں ان پتھروں سے سر پٹک پٹک کر دم توڑ دیں۔"

"تم پریشان کیوں ہوتی ہو؟ زمانہ بدل چکا ہے۔ اب کوئی ذات برادریوں کے چکر کو انا کا مسئلہ نہیں بناتا۔ لوگ آج کل لڑکا، گھر اور کاروبار دیکھتے ہیں اور اس لحاظ سے مجھ میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔" اس کے ہاتھ پر اپنا دباؤ بڑھاتے ہوئے اس نے دس بار کی کہی ہوئی باتوں کو دوہرایا۔

"تم قبائلی اصولوں اور ضابطوں سے ناواقف ہو۔ زمانے کی گردشیں ہمارے اونچے شملوں کو جھکنے پر مجبور نہیں کر سکتیں۔ ہمارے ہاں رشتے نہیں، سودے ہوا کرتے ہیں۔ ہم پڑھے لکھے جاہل ہیں۔ ہمیں اسلامی اور ریاستی قوانین معلوم ہیں۔ قرآن کی صورت ایک کھلا ضابطہ حیات ہمارے سامنے ہے۔ پھر بھی ہم نے برسوں پرانے رواجوں اور اصولوں کو گلے کا ہار بنا رکھا ہے۔" وہ سسک اٹھی۔

"نیا! پلیز یار ....." وہ اس کے آنسوؤں پر تڑپ اٹھا۔

"میں کل صبح واپس جا رہی ہوں۔ اگر مجھے پانا چاہتے ہو تو مجھے روک لو۔ ورنہ پھر شاید تم مجھے کبھی نہ دیکھ سکو۔ اس سے قبل کہ ہماری محبت ایک خواب بن کر رہ جائے ہمیں کوئی اسٹینڈ لے لینا چاہیے۔ تم مجھ سے نکاح کر لو ابھی اور اسی وقت۔"

درخت کے اس پار کھڑی مہک کے پیروں تلے زمین سرک گئی اس کا دل نایاب کی عقل پر ماتم کرنے کو چاہ رہا تھا۔ کیا وہ اپنے لالہ احمد کمال شاہ کے رسوخ اور سرداری جاہ و جلال سے ناواقف تھی؟ کیا وہ بھول گئی تھی کہ ایسی صورت میں اسے پاتال سے بھی ڈھونڈ کر تختہ دار پر لٹکا دیا جائے گا۔

"نیا! میں تمہیں پوری عزت اور مکمل وقار کے ساتھ اپنانا چاہتا ہوں۔ نکاح کوئی گناہ نہیں ہے۔ جے یوں چھپ کر کیا جائے۔ مجھ میں تمہارے لالہ کے سامنے کھڑے ہونے کی ہمت ہے۔ تم بس اپنا اعتبار سلامت رکھنا۔ حوصلہ مت ہار جانا۔ مجھے یقین ہے۔ ہم ضرور ملیں گے۔"

"میں اپنے لالہ سے نہیں لڑ پاؤں گی۔ مجھے ان سے بڑی محبت ہے۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"مجھے یقین ہے، اس کی نوبت نہیں آئے گی وہ اوپر آسمانوں پر جو قادر مطلق بیٹھا ہے نا! وہ ہمارے لیے ہر راستہ ہموار کر دے گا۔" اس کا یقین کامل تھا۔

در نایاب کے سیل پر زریاب کی کال آنے لگی۔ دونوں اٹھے تو مہک سامنے چلی آئی۔

در نایاب اسے اچانک سامنے دیکھ کر چونک اٹھی۔

"تم؟" اس کی آنکھوں میں استعجاب اتر آیا۔

"مم..... میں بس یوں ہی یونیورسٹی دیکھنے چلی آئی تھی۔" وہ ہکلا گئی۔

"آؤ چلیں! زریاب باہر ویٹ کر رہا ہو گا۔"

"یہ کون ہیں؟" وہ ڈھٹائی سے وہیں کھڑی رہی۔

"یہ میرا کلاس فیلو ہے جہاں زیب۔" ناچار در نایاب کو تعارف کروانا پڑا۔ کیونکہ وہ تو ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھی۔

زریاب کی کال پھر آنے لگی تھی۔

"اب چلو بھی۔" وہ جہاں زیب کے ساتھ علیک سلیک میں مصروف تھی۔ جب در نایاب نے عجلت میں کہا اور دونوں یونیورسٹی کے گیٹ کی سمت بڑھ گئیں۔

اگلے روز ان کی جیپ حویلی کی سمت گامزن تھی۔

✡ ✡ ✡

"میں نروس ہو رہی ہوں مانیک! تمہارے فادر مزاجاً کیسے ہیں؟" وہ آج ہی برمنگھم آئے تھے اور جیسے جیسے ان کا گھر قریب آ رہا تھا، وہ گھبراہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ اسے نئے لوگوں سے ملنا ہمیشہ سے ہی بہت عجیب سا لگتا تھا۔

"ڈیڈ از ویری نائس بٹ ان کی میز کچھ پراوڈسی ہیں۔ انہیں تم زیادہ لفٹ نہ کروانا۔" تسلی دینے کا بھی کیا خوب انداز تھا۔

بیلا کو ہنسی آگئی۔

اگلے چند لمحوں میں گاڑی ایک وسیع و عریض بنگلے کے سامنے رک چکی تھی۔ مانیک نے باہر نکل کر فرنٹ ڈور کھولا۔

"آیئے لیڈی مانیک!" وہ اس وقت مکمل شوفر بنا کھڑا تھا۔ بیلا نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

"دیکھو! میرے ساتھ ساتھ رہنا۔ یہ نہ ہو کہ مجھے اپنی فیملی میں بٹھا کر خود غائب ہو جاؤ۔ میں نئی جگہ اور نئے لوگوں میں بہت ان ایزی فیل کرتی ہوں۔" وہ اندر داخل ہونے سے قبل اپنی بات دوہرانا نہیں بھولی تھی۔

"واش روم اگر جانا ہو تو تمہیں باہر چھوڑا جا سکتا ہے؟" وہ مکمل سنجیدہ تھا۔

"بکو نہیں۔" وہ برہمی سے گویا ہوئی جس پر اس کا قہقہہ نکل گیا۔ وہ مزید خفا ہو گئی۔

"کم آن یار! ٹیک اٹ ایزی۔" وہ اس کا ہاتھ تھامے اندر داخل ہوا۔ ٹومی سیڑھیوں سے اچھلتا ہوا نیچے آیا تھا۔

"یا ہو بگ بی۔" وہ چھلانگ لگا کر اس سے لپٹ گیا تھا۔ پھر اس کی نگاہ، بیلا پر پڑی تھی۔

"نیو گرل فرینڈ؟" وہ شوخی سے بولا۔

"وائف۔" مانیک نے اس کا کان کھینچتے ہوئے تصحیح کی تو ٹومی نے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے بے یقینی سے اس قدیم یونانی شہزادی کو دیکھا۔

وہ اس وقت نیلے ٹراؤزر پر گلابی ٹاپ جس پر گلابی اور نیلے رنگ کے بڑے بڑے پھول بنے ہوئے تھے میں ملبوس تھی۔ سیدھے کمر تک آتے بال سمیٹ کر اس نے دائیں کندھے پر پھیلا رکھے تھے۔ کانوں میں گلابی پنک بڑی بڑی بالیاں تھیں اور گلے میں موتیوں والی مالا تھی۔ نفاست سے کیے میک اپ کے ساتھ وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔

ٹومی کو یقین تھا کہ اس نے آج سے قبل کسی لڑکی کو اتنا حسین، اسٹائلش اور باوقار نہیں دیکھا تھا۔

بیلا اس کی آنکھوں میں امڈتے پسندیدگی کے رنگ دیکھ چکی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر مدھم سا مسکرائی۔

مگر ٹومی ابھی تک ہنوز آنکھیں پھاڑے کھڑا تھا۔

"ڈیڈ کہاں ہیں؟" مانیک نے انگشت سے اس کے ماتھے کو چھوا۔

"بھائی! آپ نے واقعی شادی کر لی ہے؟" وہ ابھی تک بے یقین سا کھڑا تھا۔

"ہاں! مگر تم اتنے شاکڈ کیوں ہو؟" اب کی بار بیلا نے جواب دیا تو وہ خاصے پراسرار انداز میں چلتے ہوئے اس کے پاس آن کھڑا ہوا۔

"آپ نہیں جانتیں مادام! کہ آپ کے شوہر نامدار کس قدر فلرٹی بندے ہیں۔"

"ٹومی۔" مانیک نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا۔

"مجھے کہنے دیں بھائی۔" اس نے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے گھوم کر بیلا کو سر تا پا دیکھا اور پھر بولا۔

"یہ کسی ایک لڑکی کے ساتھ مہینہ بھر سے زیادہ نہیں رہ سکتے۔ مگر آپ جتنی حسین ہیں، مجھے بے حد

ہمدردی محسوس ہو رہی ہے کہ مستقبل قریب میں آپ کے ساتھ بھی ایسا ہونے والا ہے۔ مگر گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ آپ سے اکتا جائیں تو میں ہوں ناں! ایک چانس مجھے ضرور دیجئے گا۔" مصنوعی کالر کھڑے کرتے ہوئے اس نے جس انداز میں کہا تھا' بیلا کی ہنسی نکل گئی۔ البتہ مانیک نے اس کی گردن دبوچ لی۔

"تمہیں لگتا ہے کہ میں ان سے اکتا سکتا ہوں؟"

"نہیں۔" وہ چلاتے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگا۔ پھر گردن ملتے ہوئے آزردگی سے بولا۔

"جو بھی لڑکی مجھے پسند آتی ہے' وہ مجھ سے بڑی ہی کیوں ہوتی ہے؟"

"کیونکہ سب پیاری لڑکیاں میرے لیے بنی ہیں لٹل بوائے۔" مانیک نے ہنستے ہوئے اپنے گیارہ سالہ بھائی کو چڑایا تو بیلا اس کے سر ہو گئی۔

"یہ سب پیاری لڑکیوں سے کیا مراد ہے تمہاری؟"

مانیک تو برا پھنسا تھا۔ ٹومی سے اپنا قہقہہ ضبط کرنا دشوار ہو گیا۔

"میرا مطلب تھا..." وہ سر کھجانے لگا۔ بیلا ہنوز اسے گھور رہی تھی۔

"تم نے آتے ہی ہمیں لڑوا دیا۔ بہت شریر ہو گئے ہو تم۔ میں نے ڈیڈ کا پوچھا تھا۔" وہ ٹومی کی خبر لینے لگا۔

"آفس۔" اس نے شانے اچکائے۔

"اور تمہاری مدر؟"

"وہ پارٹی میں گئی ہیں۔ آپ کچھ کھائیں گے؟"

"ہاں! کھانا لگوا دو۔ ہم فریش ہو کر آتے ہیں۔" وہ بیلا کے ساتھ اپنے بیڈ روم میں چلا آیا۔

گرین اور آف وائٹ رنگوں سے سجا اس کا کمرا کافی خوشنما تاثر دے رہا تھا۔ گل دانوں میں تازہ للی اور سفید گلاب کے پھول سجے تھے۔ جہازی سائز بیڈ پر سفید اور سبز پھولوں والی چادر بچھی تھی۔ کھڑکیوں کے دریچوں کے ساتھ دو جل پریوں کے مجسمے یوں ایستادہ تھے جیسے قدیم دور کی شہزادیاں اوٹ سے باہر جھانک رہی ہوں۔

دیواریں خوب صورت پینٹنگز سے آراستہ تھیں اور ان تصویروں سے جھلکتے مناظر صدیوں پرانے دور میں لے جاتے تھے۔

یہ سب اس قدر آرٹسٹک اور دلفریب تھا کہ گھنٹہ بھر وہ تصویروں میں بسے مناظر سے کہانیاں تراشتی رہی تھی۔

لنچ کے بعد مانیک نے اسے سارا گھر دکھایا تھا۔

"ہم یہاں نہیں رہ سکتے؟" اونچے ستونوں والے اس خوب صورت اور آرٹسٹک بنگلے کو دیکھتے ہوئے اس نے یوں ہی پوچھا۔

"تم یہاں رہنا چاہتی ہو؟" مانیک نے الٹا سوال پوچھا۔

"میں تو بس تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ جہاں بھی تم رہو۔" دونوں اس وقت لان کے وسط میں بنے حوض کے کنارے چل رہے تھے۔ جس میں ڈھیروں مرغابیاں تیر رہی تھیں۔ بیلا کے ہاتھ میں چھوٹے چھوٹے اسٹون تھے۔ جن کو ایک ایک کر کے وہ پانی میں اچھال رہی تھی۔ جس سے پانی میں ارتعاش پیدا ہوتا تھا اور مرغابیاں اودھم مچاتی تھیں۔

"ہالینڈ میں ڈیڈ کا بزنس ہے۔ جواب مجھے ہی دیکھنا ہے۔"

"اور اگر میں یہاں رہنے پر اصرار کرتی تو؟" اس نے مٹھی میں بند سارے اسٹونز پانی میں پھینک دیے۔ مرغابیاں شور مچاتی باہر نکل گئی تھیں۔

مانیک نے رک کر سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

"تو میں تمہاری خاطر سب چھوڑ دیتا۔"

"اگر زندگی میں کبھی کچھ چھوڑنے کو کہوں تو چھوڑ دو گے؟" اسے نہیں پتا تھا کہ اس نے ایسا کیوں پوچھا تھا وہ تو بس یوں ہی بات کو طول دے رہی تھی۔

اور مانیک نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ جب بھی کبھی اسے کچھ ایسا چھوڑنے کو کہے گی' جو وہ نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ تب بھی چھوڑ دے گا۔

رات ڈنر پر اس کی ملاقات مسٹر اینڈ مسز انتھونی سے ہوئی تھی۔ بیلا کے تمام تر خدشوں کے برعکس مسٹر انتھونی نے خاصی خوش اخلاقی اور گرم جوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔ مرین کا رویہ اگر بہت پرجوش نہیں تھا تو روکھا اور نخوت بھرا بھی نہیں تھا۔ بلکہ بیلا کو وہ اچھی ہی لگی تھیں۔

"واپسی کا کیا پروگرام ہے؟" وہ مانیک سے مخاطب تھے۔

اس دوران بیلا چپکے چپکے ان کا جائزہ لے چکی تھی۔ وہ کافی گریس فل اور ہینڈسم تھے۔ مانیک ہو بہو ان کی کاپی تھا۔

"آپ سے ملنا تھا' مل لیا۔ اب کل ہی واپسی کا ارادہ ہے۔" وہ بولا تو بیلا کو اس کا لہجہ کچھ سپاٹ سا لگا۔ وہ نوٹ کر رہی تھی کہ ٹونی کے علاوہ وہ اپنے فادر اور مرین کے ساتھ کافی لیے دیے سا رہتا تھا۔

شاید اس کی وجہ اس کی ممی کی طلاق تھی۔ ستر فیصد ویسٹرن فیملیز کی طرح شادی کے چھ سال بعد جب وہ پانچ سال کا تھا تو دونوں نے اپنے راستے جدا کر لیے تھے۔ اس کی ممی کو انتھونی سے ہمیشہ یہی شکایت رہی تھی کہ وہ انہیں زیادہ وقت نہیں دیتے۔ ہر وقت بزنس اور اس کی مصروفیات۔ ایسے حالات میں جب انہیں جانسن ملے تو انہوں نے انتھونی سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ وہاں انتھونی کی زندگی میں بھی مرین آ چکی تھی دونوں نے دوبارہ شادی بھی کر لی۔ مگر اس کے لیے کسی کے پاس وقت نہیں تھا۔ تب ہی اسے بورڈنگ بھجوا دیا گیا تھا۔

اس کی ماں سال میں ایک فون کال کرتی تھیں اور باپ سال میں دو بار ملنے آتا تھا۔ یوں دونوں اپنے اپنے فرض سے جیسے سبکدوش ہو جاتے تھے۔ وہ کیا چاہتا ہے کبھی کسی نے یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔

"رک جاؤ' ایک ہفتہ۔" ان کا انداز سرسری ضرور تھا لیکن لہجے میں چھپی حسرت وہ محسوس کر سکتی تھی۔ اب جب وہ اسے پاس رکھنا چاہتے تھے تو وہ دور بھاگتا تھا۔

"بھائی پلیز! کچھ دن رک جائیں نا۔" اس کے نیم وا لبوں کو دیکھتے ہوئے ٹومی نے فوراً" کہا تھا اور اب اس کا ہاتھ تھامے برابر اصرار کیے جا رہا تھا "میں نہیں جانے دوں گا۔"

اور ٹومی کا دل وہ نہیں توڑ سکتا تھا۔ سو اس نے ایک ہفتہ رکنے کی ہامی بھر لی تھی۔

سوئٹزرلینڈ کے فلک بوس پہاڑ' بہتے جھرنے' پھولوں سے لدی وادیاں اور حسین شب و روز۔ ایک دوسرے کی ہمراہی میں گزارتے ہوئے زندگی جنت لگنے لگی تھی۔

"کتنی پرسکون جگہ ہے۔ جی چاہتا ہے ہم ساری زندگی انہی پہاڑوں پر گزار دیں۔"

سڑک پہ دو رویہ درختوں کی قطاریں تھیں درختوں کے پتے سرخ رنگ کے تھے جو سڑک کے اطراف میں بکھرے ہوئے تھے۔ دور تلک پھیلا یہ منظر بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔

مانیک نے اپنے بیگ سے کیمرہ نکال لیا اور کھٹا کھٹ اس کے ایک ساتھ کئی پوز اتار لیے۔

"اب میں اکیلے کوئی تصویر نہیں بنواؤں گی۔ اس سے تو اچھا تھا کیتھی یا ٹومی کو ساتھ لے آتے۔ ہماری تصویریں ہی بن جاتیں۔" اس کا موڈ بگڑ گیا۔

"تو اب کیا کیا جا سکتا ہے؟" اس نے ہنستے ہوئے ایک اور تصویر اتار لی وہ خفا ہو کر درختوں کے مخالف سمت میں چلنے لگی۔

"یار سنو تو۔" وہ پیچھے بھاگا۔

"ایکسکیوز می۔" اس نے قریب سے گزرتے ایک ایشین لڑکے کو روکا۔

"یہ کیمرہ پکڑو اور ہماری تصویریں بناؤ۔"

لڑکے کا جواب سنے بغیر اس نے زبردستی کیمرہ اس کے ہاتھ میں تھمایا اور پلٹ کر مانیک کے ساتھ آن کھڑی ہوئی۔

"بیلا! یہ کیا حرکت ہے؟" اس نے ہلکا سا ڈپٹا۔

"سامنے دیکھو! ورنہ تصویر اچھی نہیں آئے گی۔" وہ کیمرے کی جانب دیکھتے ہوئے لاپروائی سے بولی۔ مانیک سر جھٹک کر کیمرے کی سمت متوجہ ہو چکا تھا۔

"آپ کا کیمرہ۔" شایان نے چند تصویریں بنانے کے بعد کیمرہ بیلا کی طرف بڑھایا۔

"تھینکس برادر۔" کیمرہ لینے سے قبل اس نے مسکراتے ہوئے شکریہ ادا کیا۔

شایان کی آنکھوں میں حیرت امڈ آئی۔ اس تعجب کی وجہ یہ تھی کہ ایک ویسٹرن لڑکی نے اسے بھائی کہا تھا۔

تب ہی اچانک ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی۔ میرا فراک بھیگا تو خراب ہو جائے گا۔

"وہ درخت کچھ گھنا ہے۔ بارش رکنے تک ہم وہاں ٹھہر سکتے ہیں۔" مانیک نے ہاتھ سے کچھ قدم کے فاصلے پر خوب پھیلے ہوئے درخت کی سمت اشارہ کیا اور دونوں بھاگ کر وہاں جا کھڑے ہوئے۔

"کیا تھا اس لڑکی میں مانوس سا۔" شایان بدستور کھڑا سوچ رہا تھا۔ جبکہ وہ دونوں اس کی موجودگی فراموش کیے اب اپنی باتوں میں مگن ہو چکے تھے۔

☼ ☼ ☼

"شکر ہے! تم لوگوں کی چھٹیاں ہوئیں۔ حویلی میں دیکھو تو کیسی رونق اتر آئی ہے۔" مرجان بیگم بچوں کو دیکھتی خوش ہو رہی تھیں۔

مہک ان کی گود میں سر رکھے لیٹی تھی۔ درنایاب سامنے کاؤچ پر گم صم اداس سی بیٹھی تھی۔ کھانا بھی اس نے برائے نام کھایا تھا اور پہلے کی طرح کسی بات میں بڑھ چڑھ کر حصہ بھی نہیں لے رہی تھی۔

زریاب نیچے فرش پر ٹھنڈے میٹھے رسیلے آموں کی ٹوکری لیے بیٹھا تھا۔

"مقابلہ کرنا ہے میرے ساتھ؟" وہ مہک کو اکسا رہا تھا۔

"میرا موڈ نہیں ہے۔" اس نے کہہ کر ایک بار پھر سے درنایاب کو دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اب اٹھ کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اپنے کمرے میں جا رہی تھی۔

اسے درنایاب کا دکھ رلا رہا تھا۔ وہ جانتے بوجھتے کیوں خود کو روگ لگا بیٹھی تھی۔

"آجاؤ! بس تھوڑے دنوں کی موجیں ہیں۔ اس کے بعد تم کہاں ہم کہاں۔" وہ اس کے لیے پلیٹ میں آم کاٹ کر لایا۔

درنایاب کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ ابا نے کل رات کہہ دیا تھا کہ اب وہ دونوں ہاسٹل میں رہیں گے وہ ملول سی بیٹھی زریاب کو دیکھ کر سوچنے لگی۔

"کیا اس سے شیئر کروں۔"

"نہیں! یہ بھی تو اسی حویلی کا مرد ہے۔ فرسودہ رسم و رواج کے نام پر اپنی ہی بہن بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے والا ایک جابر سردار کا چشم و چراغ۔" اگلے ہی پل اس نے اپنا خیال جھٹک دیا۔

☼ ☼ ☼

سترہ روز سوئٹزرلینڈ میں گزار کر وہ واپس ہالینڈ آچکے تھے۔

رالف اور مارک نے دونوں کو ڈنر پہ مدعو کیا تھا۔ ویلوٹ کی پنک میکسی جس پر سلور کام ہوا تھا۔ اس نے زیب تن کر رکھی تھی۔ ہاف سلیو میں اس کے سڈول بازو مانند دمک رہے تھے۔ دونوں کلائیوں میں پنک اور سلور چوڑیاں تھیں۔ پنسل ہیل پر اس کی دراز قامت مزید نمایاں ہو رہی تھی۔ سیدھے سلکی بالوں کو اس نے ہلکا سا پرم کیا ہوا تھا۔ کانوں میں جھمکیاں، صراحی دار گردن پہ سجا ڈائمنڈ نیکلس اور نفاست سے کیے گئے میک اپ کے ساتھ اس کی تیاری مکمل تھی۔

"تم ہر رنگ میں پہلے سے زیادہ خوب صورت لگتی ہو۔" مانیک نے اسے سراہا۔ وہ مسکرا دی۔

"اور تم ہر سوٹ میں چارمنگ۔"

"جوابی تعریف میں کبھی قبول نہیں کرتا۔" اس نے منہ بسورا۔

"یہ جوابی تعریف نہیں۔ میرے دل میں بھی بے حد پیار ہے۔" وہ مسرت سے بولی۔

"مگر مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"کیسا ڈر۔" وہ ساکت ہو گئی۔

"مجھے عجیب سا خواب آتا ہے بیلا۔" اس نے سر جھٹکا۔

"خواب؟" اس کی استفہامیہ نگاہیں مانیک کے دبیھے چہرے پر جمی تھیں۔

"بس! تم مجھ سے بھاگ رہی ہو۔ میں تمہیں پکارتا ہوں، روکتا ہوں۔ مگر تم نہیں رکتیں۔ کہیں کھو جاتی ہو۔ پھر میں تمہیں تلاشتا ہوں اور تم نہیں ملتیں۔" اس نے بے بسی سے کہتے ہوئے بیلا کے دونوں ہاتھ یوں وارفتگی سے تھام لیے۔ جیسے اسے روک لینا چاہتا ہوں۔

وہ اس کی بات سن کر حیرت کی زیادتی سے گنگ رہ گئی۔ اسے بھی تو ایسا ہی خواب آیا تھا۔

کیا یہ ممکن تھا کہ دو لوگوں کو ایک وقت میں ایک ہی جیسا خواب آجائے۔

کیا قسمت اسے کوئی اشارہ دے رہی تھی۔ کیا وہ مانیک کو کھو دینے والی تھی۔ یہ تصور ہی اس قدر روح فرسا تھا کہ دل و دماغ میں جھکڑ سے چلنے لگے۔

"مانیک! تم سے بچھڑ کر تو شاید میں مر ہی جاؤں۔" وہ روتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔ کیسا خوف تھا، جو لا شعور سے اٹھتا تھا اور دماغ کو اپنے شکنجے میں جکڑ کر سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج کیے دیتا تھا۔

"او اکیسویں صدی کے رومیو! یہ رومانس پھر کبھی جھاڑ لینا ابھی تو۔ جلدی چلو۔ بڑے زور کی بھوک لگی ہے۔" رالف انہیں لینے آیا تھا۔

بیلا نے الگ ہوتے ہوئے اپنے آنسو صاف کیے۔

ڈنر خاصے خوش گوار ماحول میں ہوا۔ اس کے بعد چاروں اٹھ کر ہوٹل کے بال روم میں چلے آئے۔ فلیش لائٹ، چمکتے چہرے، بیک گراؤنڈ میں بجتا مدھم میوزک اور ڈانس کرتی چند لڑکیاں جن میں سوزین بھی تھی۔

لوگ ان کے گرد دائرے کی شکل میں کھڑے تالیاں بجاتے محظوظ ہو رہے تھے۔

بیلا بھی مانیک کے ساتھ اسی دائرے میں جگہ بناتے ہوئے آن کھڑی ہوئی۔

سوزین نے دیکھا تو ڈانس چھوڑ کر چلی آئی۔

"ہیلو مانیک!" وہ بیلا کو سرے سے نظر انداز کر گئی تھی۔ وہ گلابی منی اسکرٹ میں ملبوس تھی۔ بالوں اور کلائیوں میں اس نے گلابی اور جامنی ربن باندھ رکھے تھے۔ تیز بھڑکیلا میک اپ تھوپا ہوا تھا۔

مانیک کو اس کا بیلا کو نظر انداز کرنا خاصا ناگوار گزرا۔

بیلا نے ایک نظر سرتاپا اسے دیکھا اور پھر مانیک سے مخاطب ہوئی۔

"چلیں مانیک۔" مانیک بیلا کا ہاتھ تھام کر بال روم کی سیڑھیاں چڑھ آیا۔ سوزین کے تاثرات دیکھنے لائق تھے۔

☼ ☼ ☼

رالف اور کلارک انہیں اپنی گاڑی میں ڈراپ کرنے آئے تھے۔ جب اپارٹمنٹ سے کچھ فاصلے پر بیلا نے گاڑی روکنے کا کہا تھا اور رالف نے گاڑی سائیڈ پر لگا دی تھی۔

وہ سرعت سے اتر کر فٹ پاتھ پہ چلنے لگی۔ مانیک، رالف اور کلارک کو "گڈ بائے" کہتا اس کے پیچھے بھاگا۔

وہ ایک درخت سے ٹیک لگائے بینچ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پہ نقاہت طاری تھی۔

"کیا ہوا۔" وہ فکر مندی سے اسے دیکھتا گھٹنوں کے بل اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

"عجیب متلی سی ہو رہی تھی۔ اب ٹھیک ہوں۔" اس نے تسلی آمیز لہجے میں کہہ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر بینچ پر بٹھا دیا۔

"کافی پیو گی؟"

"نہیں۔"

"چلو! میں تمہیں ڈاکٹر کو دکھا دوں۔" وہ اب اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا رہا تھا۔ بیلا مطمئن سی ہو کر اس کے ساتھ چل پڑی تھی۔

ابتدائی ٹیسٹ کے بعد۔ ڈاکٹر نے جو نوید انہیں

سنائی تھی۔ اس نے بیلا کے نقاہت زدہ چہرے پہ گلال بکھیر دیا تھا ۔مانیک بھی بے حد خوش تھا۔

✲ ✲ ✲

حویلی کا مین گیٹ کھلا ہوا تھا۔ جہاں زیب کی گاڑی پورچ میں چلی آئی۔ انجو اپنی ہمراہی میں انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا آئی۔

درنایاب کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا وہ دریچے سے ہٹ کر بیڈ پر آ بیٹھی۔ وہ لوگ اس کی دوست ندا کو ساتھ لے کر آئے تھے۔

کچھ پل گزرے تو اس کا بھی بلاوا آگیا۔

دھڑکتے دل کو سنبھالتے ہوئے وہ بمشکل ڈرائنگ روم تک آئی۔ وہاں لالہ اور مرجان بھابی بھی موجود تھے ۔

وہ ندا اور آنٹی سے مل کر کاؤچ پر بیٹھ گئی۔ اس نے جہاں زیب پر محض ایک ہی نگاہ ڈالی تھی۔ اسے وہ کافی شکست خوردہ سا لگا تھا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

احمد کمال کا سرخ چہرہ اس بات کا غماز تھا کہ خاتون اپنا مدعا بیان کر چکی ہیں۔

"بٹیا! تم نے اپنی دوست کو بتایا نہیں تھا کہ تمہاری نسبت بچپن سے ہی شاہ میر سے طے ہو چکی ہے؟" لالہ کا لہجہ بالکل بے تاثر اور سپاٹ تھا۔ پھر بھی وہ اس میں چھپی برہمی محسوس کر سکتی تھی۔ اس نے زخمی نظروں سے انہیں دیکھا تو وہ رخ موڑ گئے۔

ندا اور جہاں زیب اپنی جگہ ساکت سے بیٹھے تھے۔

شاہ میر اس کا چچا زاد بھائی تھا۔ وہ بچپن سے ہی اس کے ساتھ منسوب تھی۔ اس کے باوجود کہ شاہ میر اپنی جانب سے اسے آزاد کر چکا تھا۔ اس نے نیویارک میں اپنی کلاس فیلو لیزا کے ساتھ شادی کر لی تھی اور اب اس کے دو بچے بھی تھے۔ مگر اسے تمام عمر ایسے شخص کے ساتھ منسوب رہنا تھا' جو نہ کبھی اس کا تھا' نہ ہو سکتا تھا۔

خاندان والوں نے شاہ میر کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ سب کو یقین تھا کہ رشتوں کی محبت پر بے چین ہو کر وہ ضرور لوٹ آئے گا۔

چاہے تب تک درنایاب کے بالوں میں چاندنی از آئے۔ چاہے تب تک امنگوں سے بھرا دل خالی ہو جائے۔ چاہے تب تک آنکھوں سے سب خواب مر جائیں۔ مگر اسے ایک نامحرم شخص کے نام پر تمام عمر بیٹھے رہنا تھا۔ یہ اس کی سزا تھی کہ اس نے حویلیوں میں جنم لیا تھا۔ یہ اس کا قصور تھا کہ وہ ایک سردار کی بہن تھی۔

جانے سے قبل وہ ایک لمحے کے لیے اس کے پاس رکا۔ وہ ستون سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ آنکھوں کا کاجل پھیل چکا تھا اور سب کچھ کھو دینے کا ملال دل کاٹ رہا تھا۔ وہ درد سے دوہری ہوئی جا رہی تھی۔

وہ شاید آج اسے آخری بار دیکھ رہی تھی۔

اس نے ایک نظر پرشکوہ عمارت کی اونچی دیواروں کو دیکھا اور پھر اس سے بولی۔

"میں نے کہا تھا نا..." باقی کے لفظ آنسوؤں میں گم ہو گئے۔

"میں تو اتنا مانتا ہوں کہ کاتب تقدیر نے اگر تمہیں میرے نصیب میں لکھ دیا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس فیصلے کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ بس! فیصلے کی اس گھڑی کا انتظار کرنا۔" وہ جانے کس کو تسلی دے رہا تھا۔ اس کو' خود کو یا نصیب کو۔

"اور اگر کاتب تقدیر نہ چاہے تو؟" اس کی آنکھیں جھلملا گئیں۔

"تو پھر ہم اس کے فیصلوں سے بغاوت نہیں کر سکتے۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ جیسے تم میرے لیے بنائی گئی ہو۔ یہ میرے دل کی گواہی ہے اور تم جانتی ہو میرا دل جھوٹ نہیں کہتا۔" اس کی آنکھوں میں امید تھی۔ دل میں یقین تھا اور رب پر اس کا ایمان اٹل تھا۔ مگر درنایاب کو یہ محض رسمی جملے معلوم ہوئے تھے۔ وہ جاتے جاتے اسے کیا دے گیا تھا۔

دونوں مٹھیاں اس نے زور سے بھینچ کر کھولیں۔ ہاتھ خالی تھے۔

✲ ✲ ✲

"تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟" وہ بیلا کو یونیورسٹی لے جانے کے لیے آئی تھی اور وہ مزے سے لیٹی ہوئی تھی۔

"میں نے ہی منع کیا ہے۔ اب اسے یونیورسٹی جا کر کیا کرنا ہے ڈاکٹر نے بیڈ ریسٹ کی ہدایت کی ہے۔" کیتھرین نے بیلا کو دیکھا۔ اس نے بے نیازی سے شانے اچکا دیے۔

"اوکے! ٹیک کیئر۔" جانے سے قبل اس نے بیلا کو ماتھے پہ پیار کیا۔

کیتھرین کے جانے کے ایک گھنٹے بعد وہ بھی آفس کے لیے نکل گیا۔

"کھانا وقت پر کھانا اور کوئی کام مت کرنا۔" اس کی ساری گفتگو آج کل محض اس کی ڈائیٹ کے گرد گھوم رہی تھی۔

بیلا کو اس کا اپنے لیے اتنا فکر مند ہونا اور پروا کرنا اچھا لگ رہا تھا۔ اس کی مما بھی ایسے ہی اس کا خیال رکھا کرتی تھیں۔

لنچ کے بعد وہ سو کر اٹھی تو اپارٹمنٹ سے باہر نکل کر جھانکا۔ آج پھر بارش ہوئی تھی اور ننھی منی بوندوں نے آسمان سے زمین تک ہر منظر کو نکھار دیا تھا۔ ہر طرف ہریالی اور کھلتے پھولوں کی مہک حواسوں پر اچھا تاثر قائم کرتی تھی۔

وہ یوں ہی واک کرتے ہوئے پارک تک چلی آئی۔ سنہری بالوں والے بہت سے بچے جھولوں پر بیٹھے خوش ہو رہے تھے۔ وہ انہیں دیکھنے میں اتنی مگن ہو چکی تھی کہ پاس کھڑے شخص کی موجودگی کو محسوس ہی نہ کر سکی۔

"ہیلو بیلا۔" وہ آواز پر پلٹی۔ سامنے شایان کھڑا تھا۔ یہ وہی لڑکا تھا' جو اسے سوئٹزرلینڈ میں ملا تھا۔ جس سے دونوں نے اپنی تصویریں بنوائی تھی۔

"تم یہاں کیسے؟" وہ اچانک اسے ہالینڈ میں دیکھ کر اپنی حیرت چھپا نہیں پائی۔ وہ تو اسے سوئٹزرلینڈ کا ہی رہائشی تصور کر رہی تھی۔ کیونکہ بعد میں اس نے ان دونوں کو بہت خوب صورت جگہ کی سیر بھی کروائی تھی۔

"میں یہاں یونیورسٹی میں ایم ایس کر رہا ہوں ۔وہاں تو محض سیر و تفریح کی غرض سے گیا تھا۔"

"ویل! یہاں قریب ہی میرا اپارٹمنٹ ہے۔ آؤ! تمہیں اچھی سی کافی پلواتی ہوں۔"

"نو تھینکس! پھر کبھی۔" وہ ہاتھ ہلا کر چلا گیا۔ حالانکہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ جا کر کافی پیے۔ لیکن آج اسے اپنا بہت ضروری اسائنمنٹ تیار کرنا تھا۔ سو اسے جلدی تھی۔

✲ ✲ ✲

مانیک شام میں گھر آیا تو اس کے ہاتھ میں ڈھیر ساری کتابیں تھیں۔ بیلا نے ایک بار اسے اور دوسری بار کتابوں کو دیکھا۔ اس کی حیرت بجا تھی۔

وہ کتابوں سے اتنا الرجک تھا۔ بیلا نے کبھی اسے کسی غیر نصابی کتب کا مطالعہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

اور آج وہ نہ صرف کتابیں لے کر آیا تھا۔ بلکہ آتے ہی اس نے ان کتابوں میں سے ایک کتاب اٹھائی تھی اور صوفے پر کشن کے سہارے نیم دراز ہو کر بیٹھ گیا۔

"کیا پڑھ رہے ہو؟" بیلا نے اس کے ہاتھ سے کتاب اچک کر سرورق کو دیکھا تو بے ساختہ اک خوش گوار سی مسکان اس کے لبوں کو چھو گئی۔

وہ ساری کتابیں "ہاؤ ٹو سپنڈ پریگنینسی پیریڈ" پر مشتمل تھیں۔

"تم اپنا خیال نہیں رکھتیں۔ اب میں تمہارا خیال رکھا کروں گا۔" مانیک کی بات پر بیلا کا ڈھیروں خون بڑھ گیا۔

✲ ✲ ✲

وہ اور کیتھرین بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ جب ڈور بیل بج اٹھی۔ کیتھرین آج کل ان کے اپارٹمنٹ میں رہ رہی تھی۔ کیونکہ ڈاکٹرز اسے ایک ہفتہ بعد کی تاریخ دے چکے تھے اور کیتھرین اس کی تنہائی کے خیال

سے اس کے پاس آگئی تھی۔

"کون ہو گا؟" بیلا نے اس سے دریافت کیا۔

"تم بیٹھی رہو۔ میں دیکھ کر آتی ہوں۔" وہ اٹھ کر چلی گئی اور جب دروازہ کھولا تو اجنبی چہرہ سامنے تھا۔

"بیلا سے ملنا تھا۔" اس کا اعتماد بتا رہا تھا کہ وہ جو بھی ہے 'بیلا کا کافی قریبی جاننے والا ہے۔ کوئی دوست یا پھر ......

"کم ان۔" وہ دروازے سے ہٹ گئی۔

شایان اس کی معیت میں چلتے ہوئے راہداری سے ہو کر لاؤنج میں چلا آیا۔

"ویلکم ہوم۔" بیلا نے مسکراتے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا اور سفید للی کے پھول لے کر گلدان میں سجا دیے۔

"تم بہت دنوں سے نظر نہیں آئیں تو میں خود چلا آیا۔"

"اتنا فارمل ہونے کی ضرورت نہیں۔ بے تکلفی سے بتاؤ کیا کھاؤ گے؟"

"کھاؤں گا نہیں' پیوں گا۔" جواباً وہ بھی مسکرایا۔

"کافی۔"

"کیتھرین اس کی فرمائش پر اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ بیلا اس سے باتیں کرنے لگی۔

"اور سناؤ! اسٹڈی کیسی جا رہی ہے؟"

"ایم ایس کمپلیٹ ہو چکا ہے۔ اب چند دنوں میں پاکستان......" باقی کے لفظ اس کے لبوں پر ہی دم توڑ گئے۔ اس کی نظریں سامنے فریم میں لگی انلارج فوٹو پر جم سی گئی تھیں۔

بیلا نے واضح طور پر اس کی رنگت کو متغیر ہوتے دیکھا تھا۔

اگلے ہی پل وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا! میں چلتا ہوں۔ پھر آؤں گا۔" وہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ بیلا لب کھولے اس کی پشت کو گھور کر رہ گئی۔

"تمہارا مہمان کہاں گیا؟" کیتھرین کافی لیے کھڑی تھی۔

"اسے اچانک کوئی کام یاد آگیا تھا۔" وہ کہہ کر خود سے الجھتے ہوئے اپنے بیڈ روم میں چلی آئی۔

پاکستان کے نام پر اس کی دھڑکنیں بھی منتشر ہوئی تھیں۔

ایک بار کیتھرین نے اس سے پوچھا تھا۔

"کیا تمہیں اپنے ڈیڈ سے کبھی نفرت محسوس نہیں ہوئی؟"

تب اس نے کہا تھا۔ "جس شخص کو میری ماں نے دیوانوں کی طرح چاہا ہو۔ اس سے میں نفرت کر ہی نہیں سکتی۔ مجھے ان پر غصہ ہے کہ انہوں نے کیوں مما کو چھوڑ دیا۔ مگر میں دل سے چاہتی ہوں کہ وہ ایک بار مجھے مل جائیں۔ میں ایک بار انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں۔ ان کو بتا سکوں کہ میں ان کی بیٹی ہوں۔"

☆ ☆ ☆

مہک کمرے میں آکر دیر تک روتی رہی۔ اس کا دل عورت کی مظلومیت پر کڑھ رہا تھا۔

آج اسے منال یاد آرہی تھی۔ اس کی گول مٹول سنہری کانچ سی آنکھوں والی بہن۔

وہ اس سے چھ سال بڑی تھی۔ درنایاب سے اس کی گہری دوستی تھی۔ دونوں ہر وقت اودھم مچائے رکھتیں۔ ان کے نقرئی قہقہے سارا دن حویلی میں گونجا کرتے تھے۔

وہ سیدھے بالوں کی مانگ نکال کر لمبی سی چٹیا بنایا کرتی تھی۔ اسے فراک اور پاجامے پہننے کا بڑا شوق تھا۔ کانوں میں جھمکے' کلائیوں میں چوڑیاں پہنے وہ ہر وقت نک سک سے تیار تتلی کی مانند اڑتی پھرتی تھی۔ لائبریری میں رکھی بھاری بھر کم کتابیں اس نے بچپن ہی میں چاٹ لی تھیں۔ اسے اسکالر بننے کا بہت شوق تھا۔ اماں بی کی عینک لگا کر وہ سب بچوں کو قطار میں بٹھا کر کہانیاں سنایا کرتی۔

کبھی گڑیا کی شادی کرتی تو کبھی درختوں پر جھولا ڈالتی اور کبھی انجو کے ساتھ کچن کا حشر بگاڑ رہی ہوتی۔ مہک زریاب اور شایان کو کرکٹ کھیلنا' سائیکل چلانا اور ہتھیلیوں کے بل پر جمپ لگانا اسی نے سکھایا تھا۔ وہ گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ بچوں سے لے کر بڑوں تک کے لبوں پر ہر وقت اس کے نام کی پکار ہوا کرتی تھی۔

اور جس روز وہ حویلی سے دولہن بن کر گئی' اس دن حویلی میں شادیانوں کی بجائے ماتم ہوا تھا۔

نہر والی زمین پر تنازعے کے دوران مجتبیٰ کمال سے مخالف قبیلے کے سردار حشمت علی کے بیٹے کا قتل ہو گیا تھا۔ انہوں نے خون بہا میں لڑکی مانگی تھی اور جرگے کے فیصلے کے مطابق منال کو ونی کر دیا گیا تھا۔

لیکن ان کا انتقام ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔

ڈیڑھ سال بعد انہوں نے مجتبیٰ کمال اور ان کی بیگم نیرہ کو جو اپنی جیپ میں شہر سے واپس آرہے تھے' راستے میں روک کر گولیوں کا نشانہ بنایا۔ بروقت طبی امداد ملنے کے باوجود بھی دونوں جانبر نہ ہو سکے تھے۔

زریاب ان دنوں ہاسٹل میں تھا

رحمت کمال نے جرگے میں منال کو واپس مانگنے کے سوا کوئی ڈیمانڈ نہیں کی تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وراثت میں ان کے بچوں کو دشمنیاں ملیں۔

یوں منال واپس تو آگئی تھی۔ لیکن اس کی حالت دیکھ کر کوئی فرد بھی اپنی سسکیاں نہیں روک پایا تھا۔ کمزوری' نقاہت اور ٹی بی کا مرض۔ بہت علاج کروایا۔ لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔ اس کی جواں مرگ نے ہر کسی کو سوگوار کر دیا تھا۔ تب شایان نے اس سے کہا تھا۔

"مجھے نفرت ہے اس سسٹم سے جس نے میری بہن کو نگل لیا۔" اور اسے جانے کیوں یقین ہو چلا تھا کہ وہ آئے گا تو ابا کو منا لے گا۔ وہ ان روایات کو اس سسٹم کو بدل دے گا۔

☆ ☆ ☆

"کیتھرین پلیز یار! اسے سمجھاؤ الٹی سیدھی کتابوں اور ویب سائیٹ سے ریسرچ کے بعد اس نے میرا جینا محال کر رکھا ہے۔ ایسا کرو۔ ویسا نہ کرو۔ یہ کھاؤ۔ وہ نہ کھاؤ۔ جانے کیا الم غلم اٹھا کر لے آتا ہے اور پھر زبردستی مجھے کھلا کر ہی دم لیتا ہے۔ اب میں نہیں جانے والی واک پر۔ باہر اتنی ٹھنڈ ہے اور مجھے نیند آ رہی ہے۔" اپنی اور مانیک کی تکرار سے تنگ آکر اس نے کیتھرین کو اندر گھسیٹا تو اسے لب کھولتے دیکھ کر ہی مانیک نے ٹوک دیا۔

"تم نہیں جانتیں کیتھی! اس کے لیے واک کتنی ضروری ہے۔" وہ بات کیتھرین سے کر رہا تھا لیکن دیکھ بیلا کو رہا تھا۔ تب ہی اس کے چہرے کی بدلتی رنگت دیکھ کر ٹھٹکا۔

"بیلا! تم ٹھیک ہو۔" وہ لپک کر اس کے قریب آیا۔

"مانیک! گاڑی نکالو۔ اسے اسپتال لے جانا ہو گا۔"

کیتھرین نے سہارا دے کر اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ مانیک تب تک گاڑی نکال چکا تھا۔

اگلے پندرہ منٹ بعد وہ دونوں لیبر روم کے باہر بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔

دو گھنٹے بعد ڈاکٹر نے خوشخبری سنائی۔

"مبارک ہو مانیک! بیٹا ہوا ہے۔"

"یس۔" وہ خوشی سے اچھل پڑا۔

اگلے آدھ گھنٹے میں اسے پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا۔ وہ تینوں اس ننھے سے وجود کے اوپر جھکے ہوئے تھے' جو اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولے انہیں دیکھ رہا تھا۔ کیتھرین نے اس کے گال کو نرمی سے چھوا۔

"کتنا کیوٹ ہے۔ اب تو میں تمہارے اپارٹمنٹ سے جانے والی نہیں۔ بس ہر وقت اس ننھے سے کھلونے کے ساتھ کھیلوں گی اور تم دیکھ لینا! یہ تمہیں ممی کہنے سے قبل مجھے آنٹی کہے گا۔" کیتھرین کو اس پہ بہت پیار آرہا تھا۔

"جی نہیں! پہلے یہ مجھے ڈیڈ کہے گا۔" مانیک نے اس کا منا سا ہاتھ پکڑ کر ہلایا۔

بیلا ان دونوں کی نوک جھونک پر مسکراتے ہوئے اس روئی کے گڈے کو ہی دیکھے جا رہی تھی۔ جب اچانک اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔

"مانیک! اس نے آنکھیں بند کرلی ہیں۔" وہ بچے کو زور زور سے ہلانے لگی۔ کیتھرین نے اس کے ہاتھ پکڑ

لیے۔

"ارے! سو رہا ہے۔"

"نہیں..... " کسی انہونی کے احساس نے اس کی پلکوں کو نم کردیا تھا "مانیک! ڈاکٹر کو بلاؤ۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

مانیک جاکر ڈاکٹر کو لے آیا تھا اور ڈاکٹر نے آکر اس کے بدترین خدشے کی تصدیق کردی تھی۔

"سوری! ہی از نو مور۔" اس کا چہرہ سفید چادر سے ڈھانپ دیا گیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ شدید صدماتی کیفیت کے زیر اثر بچے کو زور زور سے ہلانے لگی۔ مانیک نے آگے بڑھ کر روکنے کی کوشش کی تو وہ اس کے بازوؤں میں مچل اٹھی۔

"تم سب جھوٹ بولتے ہو۔ اس نے ابھی تو پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں کا رنگ ہیزل گرین تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر مسکرایا بھی تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر میرے بازو کو چھوا تھا۔ وہ کیسے مر سکتا ہے۔ وہ زندہ ہے۔" وہ زور زور سے چلا رہی تھی۔

ڈاکٹر نے اسے سکون آور انجکشن دیا تھا۔ ایک ہفتہ مسکن دواؤں کے زیر اثر رکھنے کے بعد اسے ڈسچارج کردیا گیا۔

اس بات کو دو ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ مگر وہ ابھی تک سنبھل نہیں پائی تھی۔ سٹف بھالو، مکی ماؤس، باربی ڈولز اور دیواروں پہ لگے پوسٹرز، ریک میں رکھے کھلونے ہر چیز اس نے تہس نہس کردی تھی۔ مانیک کے ساتھ بھی آج کل اس کا رویہ بہت خراب ہو چکا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا، وہ یہاں سے کہیں دور چلی جائے۔ ہر چیز میں اس کی دلچسپی صفر ہو چکی تھی۔ بس روز پارک میں بیٹھ کر بچوں کو دیکھتے ہوئے کئی کئی گھنٹے گزار دیتی۔

اس وقت بھی اس کی نظریں دو ماہ کے بچے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ پرام میں لیٹا ہوا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ منہ میں ڈال رکھے تھے اور اپنی نیلی آنکھوں سے اوپر اڑتی چڑیا کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

"بیلا۔" آہٹ پر اس نے مڑ کر دیکھا۔ شایان تھا۔

"کیسی ہو؟" وہ اس روز کے بعد آج نظر آیا تھا۔

"اچھی ہوں۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ جبکہ شایان اس کے عقب میں نظریں دوڑا رہا تھا۔

"بے بی کو ساتھ نہیں لائیں؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا تو بیلا کی آنکھوں میں جمی برف پگھلنے لگی۔

ٹپ..... ٹپ..... ٹپ۔

"بیلا! کیا ہوا؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟" وہ اس کے آنسوؤں سے پریشان ہو گیا تھا۔

"مائی بے بی از نو مور۔" وہ بمشکل آنسوؤں کے درمیان بولی۔ شایان کے دل پر جیسے گھونسا سا پڑا۔ وہ لب بھینچے کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر ہمت کرکے بولا

"بہت دکھ ہوا بیلا! میرے چند لفظ تمہارے غم کا مداوا نہیں کر سکتے ..... مگر پلیز! اس طرح اپنی حالت خراب مت کرو۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے۔ جو ہوا اس پر صبر کرلو اور زندگی کی سمت واپس لوٹ آؤ۔ مجھے ہنستی ہوئی بیلا اچھی لگتی ہے۔" شایان نے اس کے شانوں کے گرد بازو پھیلا کر اس کا سر اپنے سینے سے لگالیا۔

وہ کچھ دیر رونے کے بعد اب نارمل ہو چکی تھی۔ اس کا سر ابھی تک شایان کے سینے پر رکھا ہوا تھا۔ وہ اس کے بازوؤں کے حصار میں تھی۔ لیکن اس حصار میں اتنا تقدس اور احترام تھا۔ جیسے کوئی بہت ہی معتبر رشتہ گلے مل رہا ہو۔

"آج مجھے کافی نہیں پلاؤ گی؟" اس نے ماحول کی سوگواری کو کچھ کم کرنے کے لیے اس سے پوچھا تو وہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔

"تم اس روز کی طرح بھاگو گے تو نہیں؟" جواب میں اس نے سر تسلیم خم کردیا۔

دونوں ساتھ چلتے ہوئے اپارٹمنٹ تک چلے آئے۔ بیلا اسے لاؤنج میں بٹھا کر خود کافی بنانے چلی گئی اور جب واپس آئی تو وہ اس کی مما اور ڈیڈ کی تصویر کے

سامنے کھڑا تھا۔

"بیلا یہ تصویر؟" اس کا انداز سرسری ضرور تھا۔ مگر لہجے میں عجیب سی کھوج تھی۔

"مائی مام اینڈ ڈیڈ۔" وہ کہہ کر کشن درست کرنے لگی۔ شایان اس کے سامنے آن بیٹھا۔

"جانتی ہو، میں کون ہوں؟" اس کے انداز میں دبا دبا سا جوش تھا۔

"میں شایان احمد کمال شاہ ہوں۔"

"تو.....؟" اس نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے اپنا لمبا چوڑا نام کیوں بتا رہا ہے اور اتنا خوش کیوں ہو رہا ہے۔

"احمق لڑکی! ہی از مائی فادر۔" اس نے تصویر کی سمت اشارہ کیا اور بیلا کے تاثرات ناقابل بیان حد تک سپاٹ ہو گئے تھے۔ یہ لڑکا اس کا بھائی تھا۔ وہ عجیب سی اس لڑکے کا اپنے بھائی ہونے پر نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ اس بات پر ہوئی تھی کہ اس کا بھائی عمر میں اس سے بڑا تھا۔

تو کیا اس کے ڈیڈ پہلے سے میرڈ تھے اور ستّر فیصد ایشین مردوں کی طرح انہوں نے ممی کو جسٹ اپنے کسی مفاد کی خاطر سیڑھی بنایا تھا اور ایک وہ عورت تھی جو عمر بھر ایک دھوکے باز اور بے وفا شخص کی خاطر خود کو روگ لگائے بیٹھی رہی۔

"تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟" وہ مایوس ہوا۔

"نائس ٹو میٹ یو۔" وہ طنزیہ لہجے میں کہتی اٹھ کر بالکونی میں چلی آئی۔

باہر کا موسم بھی اس کے تاثرات کی مانند تھا۔ سرد اور سپاٹ۔ ابھی چند روز قبل وہ سوچ رہی تھی کہ کاش! ایک بار وہ شخص اسے مل جائے۔ ایک بار وہ اسے دیکھ سکے۔ چھو سکے۔ محسوس کر سکے اور اب جب ملنے کا یقین ہو چلا تھا تو دل چاہتا تھا کہ وہ ان سے کبھی نہ ملے۔

"بیلا۔" وہ اٹھ کر اس کے پیچھے ہی چلا آیا تھا۔

"ہم پاکستان جا رہے ہیں۔" وہ اسے دیکھ کر بولی اور پھر خود بھی حیران رہ گئی۔ یہ فیصلہ کس کا تھا۔ حالانکہ وہ ہرگز ایسا نہیں چاہ رہی تھی۔ پھر کیوں اس نے ایسا کہا

تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اسے وہاں سے کچھ اور بھی ملنے والا تھا۔ کچھ ایسا جس کی تلاش میں وہ کب سے بھٹک رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

مانیک کو منانا تھوڑا مشکل تھا۔ لیکن اس کی خوشی کی خاطر وہ مان گیا۔ ویسے بھی وہ چاہ رہا تھا کہ بیلا کچھ دنوں کے لیے یہاں سے دور چلی جائے۔ شاید آب و ہوا کی تبدیلی اس کے مزاج پر اچھے اثرات مرتب کر دے۔

لیکن اس سب کے باوجود وہ اندر سے بہت اداس تھا اور اس کے اندر کے وہم اور خدشات ایک بار پھر اٹھ کر سامنے آن کھڑے ہوئے تھے۔ وہی خوف پھر دل کو جھنجھوڑ رہا تھا کہ جیسے وہ ہمیشہ کے لیے دور جا رہی ہو۔ لیکن وہ یہ سب اسے بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے ہلکی پھلکی باتوں کے دوران اس کی پیکنگ کروا رہا تھا۔

"بیلا! تم خوش ہو؟"

"خوش تو ہوں گی ہی۔ میری دیرینہ خواہش جو پوری ہو رہی ہے۔" وہ کپڑے تہہ کرتے ہوئے ہلکا سا مسکرائی۔ اپنے اندر کی بدلتی کیفیات کا اس نے مانیک سے ذکر نہیں کیا تھا۔ ویسے بھی اس خوشی کے معاملے میں ابھی تک وہ خود بھی بے یقین تھی۔

"بیلا کیا تم کبھی کسی کے کہنے پر مجھے چھوڑ سکتی ہو؟" وہ ٹھوڑی پر ہاتھ جما کر بولا۔

"کیا ہے مانیک! اب تنگ تو نہ کرو۔" وہ جھنجھلا گئی۔

"بتاؤ نا! میری تسلّی کے لیے۔"

"نہیں! میں کبھی بھی، کسی کے بھی کہنے پر تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے دانت پیس کر بولی۔ وہ اس کے انداز پر ہنس پڑا۔

تب ہی شایان چلا آیا تھا۔

"ہو گئی تیاری۔"

"سب کچھ تو پیک کرلیا ہے پھر بھی لگتا ہے، کچھ

مسنگ ہے۔" وہ سر پہ ہاتھ رکھے سوچ رہی تھی۔
تب ہی اس کے تصور میں وہ سیاہ جلد والی کتاب چلی آئی۔ جسے شادی کے بعد وہ مکمل طور پر فراموش کر چکی تھی۔ اس کے ڈیڈ کی ایک ہی تو نشانی تھی اس کے پاس۔ پھر ابھی اس میں سے بہت کچھ جاننا باقی تھا۔ ترجمہ کیے ہوئے چند ورق بھی اس نے نہیں پڑھے تھے۔
مانیک جب سے زندگی میں آیا تھا اس نے مانیک سے محبت کے سوا اور کوئی کام نہ کیا تھا۔ اس کے اندر اٹھتے سوال جیسے اپنی موت آپ مر گئے تھے۔ تحقیق کا عمل رک گیا تھا۔ اس کی بے چین روح مانیک کی سنگت میں سرشار ہو چکی تھی۔ مگر اب یوں لگتا تھا جیسے پورے مدار کا چکر کاٹ کر وہ پھر سے مرکز پر لوٹ آئی ہے۔
کتاب اسے بک شیلف میں مل گئی۔
"بیلا! تم واپس آؤ گی نا؟" ایئرپورٹ پر مانیک نے اداسی سے پوچھا۔
"ہاں! بس ایک ہفتے کی بات ہے۔ نیکسٹ فرائیڈے ہم ساتھ ہوں گے۔ میرے لیے بہت سارے فریج فرائز بنا کر رکھنا۔" وہ کہہ کر ڈیپارچر لاؤنج کی سمت بڑھ گئی۔
مانیک اس کے جہاز کے پرواز کرنے تک ادھر ہی کھڑا رہا۔

☼ ☼ ☼

"تم نے ڈیڈ کو بتایا ہے؟" وہ اپنے متعلق استفسار کر رہی تھی۔
"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔
"کیوں؟" وہ سیٹ بیلٹ کھولتے ہوئے بولی۔
"سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔" بظاہر اس نے لاپروائی سے کہا تھا۔ مگر اباجی کا متوقع رد عمل اسے ہولا رہا تھا۔
"تم کتنے بہن بھائی ہو؟" جہاز اب آسمان کی بلندیوں پر پرواز کر رہا تھا۔ بادل کھڑکیوں سے اندر جھانک رہے تھے۔
"پہلے دو تھے۔ اب تین ہو چکے ہیں۔" وہ اس کی جانب دیکھ کر مسکرایا۔
"تفصیل سے بتاؤ۔"
"مجھ سے چھوٹی ہے، مہک اور زریاب میرا کزن ہے۔ دونوں ڈاکٹر ہیں۔ ان کے علاوہ گھر میں ایک پھوپھو ہیں۔ اماں بی اور اباجان۔"
پھر وہ راستے بھر اسے ان سب کی باتیں سناتا رہا تھا۔ حویلی پہنچنے تک وہ غائبانہ طور پر سب سے متعارف ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم ایوری باڈی۔" لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اس نے سب کو مشترکہ سلام کیا۔
صوفوں پر بیٹھے تمام اہل خانہ اپنی جگہ حیرت زدہ سے رہ گئے تھے۔
وہ بغیر اطلاع کے جو آیا تھا۔
"شانی! میری جان۔" سب سے پہلے اماں بی اٹھ کر آئیں۔ باقی سب کی نظریں اس کے پیچھے کھڑی حسن کی دیوی پر جمی تھیں۔
"کہیں یہ شادی تو نہیں کر آیا؟" مہک، زریاب کے کان میں گھسی۔ ورنایاب نے سنا تو دونوں کو گھورتے ہوئے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اباجان کی موجودگی میں کسی کی جرات نہیں ہو رہی تھی کہ وہ اس لڑکی کے متعلق استفسار کرتا۔
"شانی! تم میرے کمرے میں آؤ۔" وہ اسے حکم صادر کرتے اپنے کمرے کی سمت مڑ گئے۔
شانی پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ پانی کا گلاس ایک ہی گھونٹ میں خالی کرتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
"شایان۔" وہ اسے اٹھتے دیکھ کر گھبرا گئی۔ سب اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔
"ڈونٹ وری! میں بس ابھی آتا ہوں۔ مہک! تم بیلا کو کمرے میں لے جاؤ اور خبردار! میرے واپس لوٹنے تک کوئی اس کا انٹرویو نہیں لے گا۔"
تنبیہہ سخت تھی۔ دونوں منہ پھلا کر بیٹھ گئے۔
ورنایاب نے اسکوائش سے بھرا جگ اور گلاس اس کے سامنے رکھا۔ اماں بی اٹھ کر اندر کمرے میں جا چکی تھیں۔ بیلا آرام سے بیٹھ گئی۔
"یہ لڑکی کون ہے؟" اباجان کے انداز سے ہی برہمی جھلک رہی تھی۔
"یہ الزبتھ کی بیٹی ہے۔ وہی الزبتھ جو آج سے اکیس سال قبل آپ کو نیویارک میں ملی۔ پھر آپ نے اس سے شادی کی اور پھر چھوڑ دیا تھا۔" اس میں جانے اتنی ہمت کہاں سے آ گئی تھی کہ وہ بغیر جھجکے بولتا چلا گیا۔
الزبتھ کے نام پر ان کی آنکھوں میں جیسے کوئی سایہ سا لہرایا تھا۔ وہ ایک پل کو چونکے اور پھر ہار کر جیسے کرسی پر ڈھے گئے۔ انہوں نے شایان کو جانے کا اشارہ کر دیا۔
وہ چپ چاپ واپس پلٹ آیا۔ باپ کے مقابل کھڑے ہونے کی تربیت نہیں تھی اس کی۔ ویسے بھی وہ اس کے باپ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سردار بھی تھے۔
اب سردار سے سوال و جواب کون کرتا۔
اماں بی کو برسوں پہلے کی گئی اس بے وفائی پر دکھ تو ہوا تھا۔ مگر حویلی کی عورتوں کے نصیب اس دکھ کے بغیر ادھورے سے رہتے تھے۔ وہ بھی شکوہ کرنے کے بجائے صبر کر گئی تھیں۔
البتہ مہک کا شوق دیدنی تھا۔ بیلا کی بہت جلد اس سے دوستی ہو گئی۔ زریاب اسے چڑانے کی خاطر آج کل بیلا میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لینے لگا تھا۔ دونوں نے اسپتال سے چھٹیاں لے رکھی تھیں اور بیلا کو پہاڑوں کی خوب سیر کروا رہے تھے۔
مگر جس شخص کی خاطر وہ اتنی دور یہاں آئی تھی۔ وہ پچھلے تین روز سے حویلی نہیں آیا تھا۔ وہ کہاں تھا، وہ کسی سے بھی اس کے متعلق دریافت نہیں کر پا رہی تھی۔ مہک نے اتنا کہا تھا کہ آج کل وہ زمینوں پر ہوتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

"الزبتھ کی بیٹی۔" آواز جیسے کسی ہتھوڑے کی مانند ان کے اعصاب پر برس رہی تھی اور وہ اپنی جگہ تڑپ کر رہ گئے تھے۔
جس وجہ سے انہوں نے اکیس برس قبل الزبتھ کو چھوڑا تھا، آج وہ وجہ حقیقت کا بھیانک روپ دھارے ان پر ہنس رہی تھی اور وہ اس سے نظریں چرائے، منہ چھپائے پھر رہے تھے۔
رحمت کمال شاہ کی بیٹی اور ایک غیر مسلم۔
یہ خیال ہی ان کی نیندیں حرام کیے ہوئے تھا۔
رات اپنے آخری پہر میں ڈھل رہی تھی چاند بھی کہیں دھندلکے میں کھویا ہوا تھا۔ جھینگروں اور الوؤں کی آوازیں مل کر ماحول کو وحشت ناک بنا رہی تھیں۔
وہ بے چینی سے لان میں ٹہل رہے تھے۔
جب کسی کی نظروں کے ارتکاز نے انہیں سر اٹھانے پر مجبور کیا تھا۔ وہ اپنے بیڈ روم کی کھڑکی میں کھڑی انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔
نظروں کا تصادم ہوا۔ اور وہ سر جھٹک کر اسٹڈی میں چلے آئے۔
وہ الزبتھ کی اور ان کی حسین مشابہت تھی۔
یہ ان دنوں کی بات تھی، جب وہ خود اکیس سال کے تھے۔ حال ہی میں انہوں نے گریجویشن کیا تھا۔ وہ اعلا تعلیم کے لیے امریکا جانا چاہتے تھے۔ جب ان کے چچا محسن شاہ اچانک بیمار ہو گئے۔ ان کی اکلوتی بیٹی مرجان ان کی بچپن کی منگ تھی۔ جو ایک تو پڑھی لکھی نہیں تھی۔ دوسرا ان سے آٹھ سال بڑی تھی۔ وہ اسے کچھ خاص پسند نہیں کرتے تھے۔ مگر خاندانی روایات کے مطابق شادی کرنا پڑی۔
اور اس کے بعد اماں بی کی ایک نئی فرمائش شروع ہو گئی تھی کہ جب تک وہ پوتے کا منہ نہیں دیکھ لیتیں، وہ ملک سے باہر نہیں جا سکتا۔
ایک سال کے بعد جب شایان پیدا ہوا تو وہ نیویارک چلے آئے۔ یہاں انہیں الزبتھ مل گئی اور وہ اس کے حسن جہاں سوز کے آگے دل ہار بیٹھے۔ ملاقاتیں بڑھیں اور ایک روز انہوں نے اسے پرپوز کر دیا۔

وہ اپنے خاندانی روایت کے مطابق ایک نن بن رہی تھی۔ لیکن احمد کمال کی والہانہ محبت کے سامنے سارے خاندانی دستور دم توڑ گئے۔ وہ ان سے شادی کے بعد ان کے اپارٹمنٹ چلی آئی۔

ڈیڑھ سال پلک جھپکتے گزر گیا۔ وہ ایک دوسرے کی رفاقت میں بے پناہ خوش تھے۔ ان کے مابین پہلا جھگڑا اس روز ہوا تھا' جب الزبتھ نے انہیں اپنی پریگننسی رپورٹ دکھائی تھی۔ وہ اپنی جگہ ساکت سے رہ گئے تھے۔

ان کا پاکستان میں ایک بیٹا تھا۔ بیوی تھی۔ گویا ان کی فیملی مکمل تھی تو پھر الزبتھ کون تھی اور یہ بچہ؟

انہوں نے ہر پہلو پر سوچا تو جیسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس جانے والے تھے۔ انہیں یہاں کوئی فیملی نہیں بنانا تھی۔

"تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟" الزبتھ کو ان کی خاموشی پر گھبراہٹ ہونے لگی تھی اور جب وہ بولے تو ان کی سماعتیں لرز اٹھیں۔

"تم ابارشن کروالو۔ مجھے یہ بچہ نہیں چاہیے۔"

"احمد! تم پاگل تو نہیں ہو گئے؟" اس کی آواز صدمے سے ٹوٹ گئی۔

"میں جا رہا ہوں۔ جب میری بات مان جاؤ تو بتا دینا۔ میں آ جاؤں گا واپس۔" انہوں نے اپنا سامان سمیٹا اور دھاڑ سے دروازہ بند کر کے چلے گئے۔ انہیں یقین تھا کہ الزبتھ ان کے بغیر نہیں رہ پائے گی اور انہیں پانے کی خاطر وہ ضرور ابارشن کروالے گی۔

مگر وہ اپنی ممتا کے ہاتھوں ہار گئی اور پیار کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا۔

رحمت کمال وطن واپس لوٹ آئے اور پھر مڑ کر کبھی ماضی میں نہیں جھانکا اور آج ماضی حال میں بدل کر پھر سے لوٹ آیا تھا۔

وہ مہک اور زریاب کے ساتھ لان میں اسکوائش کھیل رہی تھی۔ جب حسب معمول دونوں جھگڑنے لگے۔ ان کی زبان اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ مگر ان دونوں کی نوک جھونک سے محظوظ ہوتی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ ادھ کھلے دریچے سے رحمت کمال باہر جھانک رہے تھے۔

وہ فیروزی اور گلابی شلوار سوٹ زیب تن کیے بالوں کی لمبی چٹیا بنائے دوپٹا گلے میں ڈالے بیٹھی تھی۔ احمد کمال کو اس میں منال کا عکس جھلکتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اتنی پیاری تھی کہ دل خود بخود اس کی جانب کھنچنے لگتا تھا۔

مہک اور زریاب کا جھگڑا ہاتھا پائی کی صورت اختیار کرنے والا تھا' جب اس نے اٹھ کر بیچ بچاؤ کروایا۔

"آپی! آپ کو پتا ہے یہ کتنا بڑا چیٹر ہے۔" مہک کے گلابی رخساروں سے خون چھلکنے لگا۔ آج وہ پھر بری طرح سے ہاری تھی۔

"ہارنے کے بعد ہی تمہیں میری چیٹنگ نظر آتی ہے مکار لومڑی۔" وہ تلملایا۔

"اور تم خود کیا ہو بندر' الو' گھامڑ۔" وہ دوبدو بولی۔

"ڈاکٹر کی شان میں گستاخی۔" اس نے مصنوعی رعب جمانے کی کوشش میں آنکھیں نکالیں۔

"ڈاکٹر لگتے ہو کہیں سے تم دونوں؟" درنایاب نے کچن کی کھڑکی سے جھانکا۔

"اسپتال سے جا کر پوچھ لیں۔" وہ ڈھٹائی سے ہنسا۔

"صحیح کہا ہے کسی نے' فطرت کبھی نہیں بدلتی تم دونوں کو بھی جھگڑا کیے بغیر کھانا ہضم نہیں ہوتا۔" وہ ان کے لیے پکوڑے بنا کر لائی تھی۔

"موسم اچھا ہے باہر چلیں۔" پکوڑوں سے انصاف کرتے ہوئے زریاب نے بیلا کو پیش کش کی۔ وہ مہک کو چڑانے کے لیے آج کل بیلا میں خاصی دلچسپی لے رہا تھا۔

"مہک بھی ساتھ چلے گی۔" اس نے محبت سے اپنی چھوٹی بہن کو دیکھا۔ چند ہی دنوں میں اس کی مہک سے بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ صرف ایک وہ ہی گریزاں تھے جن کی خاطر وہ اتنی دور چلی آئی تھی۔

"دیکھ لیں! پارٹی بدل رہی ہیں آپ۔" وہ خفگی سے بولا۔

"تم اپنے جھگڑوں میں مجھے سینڈوچ مت بناؤ۔ میں خاصی امن پسند لڑکی ہوں اور دونوں کے ساتھ ہوں۔" اس نے سبز جھنڈی دکھائی۔

"درنایاب! آپ بھی چلیں نا۔" برتن اٹھاتی درنایاب کے ہاتھ رک گئے۔ جب سے جہاں زیب کا رشتہ آیا تھا تب سے ہی اس پر باہر کی دنیا کے دروازے بند کر دیے گئے تھے۔

"میرا موڈ نہیں ہے۔ تم لوگ جاؤ۔" سپاٹ سا انداز تھا۔

کسل مندی سے آنکھیں کھولتے ہوئے اس نے چہرے سے کمبل ہٹایا اور کمرے کے کارنر پر نگاہ پڑتے ہی اپنی جگہ مبہوت سی رہ گئی۔ بھلا کوئی اتنی عقیدت اور یکسوئی کے ساتھ بھی عبادت کر سکتا تھا۔

وہ کبھی کبھی پیشانی زمین پر رکھتی تھی اور پھر اٹھاتی تھی۔ کیسا منفرد سا انداز تھا اور کتنا پرسکون' سادگی اور معصومیت بھرا چہرہ تھا۔ سلام پھیرنے کے بعد اس نے دونوں ہاتھ اٹھا لیے۔ اس کے لب بہت آہستگی سے ہل رہے تھے۔ وہ دعا مانگ رہی تھی۔ اس کے انداز میں کچھ ایسی شدت اور گہرائی تھی کہ اس کا بے ساختہ دل چاہا تھا کہ وہ بھی اپنے معبود حقیقی کو اتنی ہی شدت سے پکارے۔

"بہت بھٹک چکی ہوں میں۔ اب مجھے ڈیڈ کے مذہب کو قبول کر لینا چاہیے۔ ویسے بھی ان کی خواہش ہے کہ میں مسلمان ہو جاؤں اور پھر ایک گواہی وہ ہوتی ہے' جو دل دیتا ہے۔ میرا دل' میرا ضمیر' میری روح اس فیصلے پر سرشار ہے۔"

کل اس کا سامنا احمد کمال سے ہوا تھا۔ وہ مہک کو آوازیں دے رہے تھے کہ وہ ان کی اجرک لے کر آئے اس نے سنا تو اجرک لے کر ان کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ ڈریسنگ کے سامنے کھڑے خود پر پرفیوم اسپرے کر رہے تھے۔

"آپ کی اجرک۔" اس نے نرمی سے کہا۔ وہ اسے آئینے میں دیکھ چکے تھے۔ اب خود پر مزید ضبط کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ آخر کو وہ ان کی بیٹی تھی۔ ان کی جائز اولاد' پھر خون کیسے جوش نہ مارتا۔ اجرک اس کے ہاتھ سے لے کر انہوں نے کاندھے پر رکھ لی تھی۔ مگر خود سے پہل کرنے میں متامل تھے۔

بیلا کی آنکھوں میں ڈھیروں پانی امڈ آیا۔

"میں نے آپ کو بہت مس کیا۔" وہ روتے ہوئے ان کے سینے سے لگ گئی۔

"مجھے معاف کر دو بیٹا! میں اتنے سال تمہارے وجود سے غافل رہا۔" وہ ہار گئے تھے خود سے لڑتے لڑتے غلطی تو بہرحال کی ہی تھی تو اب اس سے نظریں چرانا کیا معنی رکھتا تھا۔

"آپ نے مجھے تسلیم کر لیا۔ میرے لیے اتنا کافی ہے۔" وہ اعلا ظرف تھی۔ باپ کو کٹہرے میں کھڑا کرنے کے بجائے اس نے درگزر سے کام لیا تھا۔ ویسے بھی جس سوسائٹی کا وہ حصہ رہی تھی' وہاں ہر دوسرا بچہ بروکن فیملی کا شکار تھا۔ وہ تو خوش قسمت تھی کہ اسے الزبتھ جیسی پرخلوص مہربان ماں کا ساتھ ملا تھا اور اس نے اسے باپ سے متعلق کبھی بدگمان نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ ہمیشہ ہی اس شخص کا ذکر بڑی محبت سے کیا کرتی تھیں اور اس کے دل میں باپ سے متعلق جو ناراضی اور غصہ تھا' وہ اب باقی نہیں رہا تھا۔

"بیلا! میری ایک خواہش ہے۔ اگر تم پوری کر دو تو مجھے بہت خوشی ہو گی۔ میں سکون سے مر سکوں گا۔" انہوں نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اس کے ماتھے کا بوسہ لیا۔

بیلا کو اپنا وجود کسی قدر معتبر لگنے لگا۔ مگر وہ ان کے ملتجی لہجے پر بے چین ہو اٹھی۔

"آپ حکم کریں۔ میں ضرور مانوں گی۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تم مسلمان ہو جاؤ۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ آپ مسلم ہیں اور میں عیسائی؟" اسے مسلم ہونے پر کوئی اعتراض نہیں

تھا۔ مگر وہ باپ کی خواہش کا جواز چاہتی تھی۔

"اس فرق کی وجہ سے تو میں نے الزبتھ کو چھوڑا تھا۔" وہ کہہ کر چلے گئے۔ سرد کمرے کی منجمد فضا میں بیلا کی خاموش سماعتیں اور ان کے اعتراف کی بازگشت رہ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

درنایاب نے دعا مانگ کر منہ پر ہاتھ پھیرا اور جائے نماز اٹھا کر الماری میں رکھنے لگی۔ اس کا کمرہ بے حد سادہ تھا۔ بس ایک بیڈ اور الماری جس میں کچھ کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک ڈریسنگ ٹیبل اور کپڑوں کی الماری بھی تھی۔

"درنایاب! آپ سے کچھ پوچھنا تھا۔" اس نے باہر جاتی درنایاب کو پکارا تو وہ الٹے قدموں واپس چلی آئی۔

اتنا تو وہ جانتی تھی کہ تمام انبیاء علیہ اسلام مسلم تھے اور انہوں نے اپنی قوم کو اچھائی کا ہی پیغام دیا تھا۔ لیکن اسلام آخری اور مکمل دین تھا۔ جو تمام شعبہ زندگی کے متعلق نہ صرف مکمل رہنمائی کرتا تھا۔ بلکہ عملی طور پر ایک راستہ بھی دکھاتا تھا۔

ترجمہ کے صفحات بھی وہ پڑھ چکی تھی۔

اس میں لکھا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب دوبارہ اس دنیا میں آئیں گے تو دین محمدی میں ہی رہیں گے۔ کوئی نئی شریعت لے کر نہیں آئیں گے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو خوش خبری سنائی تھی کہ ایک رسول صلی اللہ علیہ وسلم آئے گا اس کا نام احمد ہو گا۔ انہوں نے اپنے حواریوں سے یہ بھی کہا تھا۔

کہ تم لوگ اپنے دین اور نبی آخر الزماں احمد مصطفیٰ کے دین پر ایمان لاؤ اور اسی پر ثابت قدم رہو تب تم نجات پاؤ گے۔

مگر ایک بات اس کے دماغ کو الجھا رہی تھی۔

"درنایاب! میں بھی تو مانتی ہوں کہ اللہ ایک ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں تو پھر میں مسلم کیوں نہیں ہوں؟" اس نے الجھن آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔

"تب دین نامکمل تھا بیلا! اور اس کی گواہی کافی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی پر دین مکمل کر دیا۔ نبوت ان پر ختم ہو گئی تو کلمہ بھی مکمل ہو گیا۔ اب اس گواہی کے ساتھ یہ گواہی بھی ضروری ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں۔"

"تو پھر مجھے مکمل کلمہ پڑھا دیں۔ میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں۔" جب یسوع کا بھی یہ ہی پیغام تھا تو وہ کیوں نہ مانتی۔ اسے ماننا ہی تھا۔ اس نے اللہ سے روشنی مانگی تھی، ہدایت مانگی تھی، سیدھا راستہ مانگا تھا۔ اسے اندھیروں میں بھٹکتے ہوئے زندگی نہیں گزارنا تھی۔ اس کے لیے اجالوں کا سفر منتخب ہو چکا تھا۔

درنایاب نے فرط محبت سے اس کے ہاتھ چوم لیے اور اسے لاؤنج میں چلنے کا اشارہ کیا۔

☆ ☆ ☆

"لالہ جانی، بھابھی، مہک، زریاب، شانی، انجو، رشیدہ، رزاق سب جلدی آؤ۔" اپنے جوش اور خوشی میں اس نے فیملی ممبرز کے ساتھ ساتھ ملازموں کو بھی آواز دے ڈالی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے سب کمروں سے نکل آئے۔

"بیلا اسلام قبول کرنا چاہتی ہے۔" خبر تھی یا دھماکا۔ سب مسرت آمیز چہروں کے ساتھ بیلا کے گرد جمع ہو گئے۔

"بیٹا! کیا تم نے اپنی مرضی سے یہ فیصلہ کیا ہے؟" احمد کمال اب بھی بے یقین تھے۔ ان کی دعائیں اتنی جلدی مستجاب ہو سکتی ہیں۔ ایسا سوچا نہیں تھا۔

"جی بابا جان!" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تو انہوں نے سب کی موجودگی میں اسے کلمہ پڑھا دیا۔ سب کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

"مبارک ہو بیٹا! اب تم مسلمان ہو۔" ان کے بعد باقی سب نے بھی گلے لگا کر مبارکباد دی۔ درنایاب سب کے لیے چائے اور مٹھائی لے آئی تھی۔

"ہم آپ کا نام فاطمہ رکھیں گے۔" سب سے پہلے مہک کو ہی نام بدلنے کا خیال آیا تھا۔

"بہت پیارا نام ہے۔" درنایاب نے اس کے ماتھے کا بوسہ لیتے ہوئے اپنے ساتھ لگا لیا۔

اگلے روز خاندان بھر کی دعوت ہوئی۔ جس میں اسے سب سے متعارف کروایا گیا تھا۔ کل تک احمد کمال جسے عزت کے زوال کا باعث سمجھ رہے تھے۔ آج وہ ان کا فخر بن چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ آج کل درنایاب سے نماز سیکھ رہی تھی۔ اسی دوران اس کی نگاہ اتفاق سے بیڈ پر رکھی اوندھی کتاب کے اندر پڑی تصویر سے ٹکرا گئی۔ ایک ہینڈسم سا نوجوان تھا۔

"کون ہو سکتا ہے۔" اس نے دل میں سوچا۔

"شاید پھوپھو کسی کو پسند کرتی ہیں۔" اس نے قیاس آرائی کی۔ اس کا فون بجنے لگا۔ دوسری جانب مائیک تھا۔

"ہاں! میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔

"آنا تو تھا۔ لیکن بس کچھ پرابلمز ہو گئی تھیں۔" وہ فی الحال اس سے اپنے مذہب کی تبدیلی کا ذکر نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ دوسری جانب وہ خفا ہو گیا۔

"میں کچھ نہیں جانتا۔ بس تم واپس آؤ۔"

"دیکھو پلیز! تم غصہ نہ کرو۔ جتنا تم اداس ہو۔ اس سے کہیں زیادہ..." دوسری جانب لائن منقطع ہو چکی تھی۔ وہ مایوسی سے سیل فون کو دیکھنے لگی۔

"فاطمہ!" پیچھے بابا جان کھڑے تھے۔

"جی!" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کس سے بات کر رہی تھیں؟"

"مائیک سے۔" اس نے ایک بار پھر سیل فون کو دیکھا۔

"کون مائیک؟" وہ انجان پن سے بولے۔

"مائیک... میرا شوہر۔" اس نے بتایا۔

"بٹیا! وہ تمہارا شوہر تھا۔" وہ "تھا" پر زور دے کر بولے۔

"کیا مطلب؟" وہ سمجھی نہیں۔

"مطلب یہ کہ اب تم مسلمان ہو چکی ہو۔ مائیک سے تمہارا جو رشتہ تھا، وہ ختم ہو چکا۔ اب تم کسی مسلمان سے تو نکاح کر سکتی ہو۔ مگر عیسائی سے نہیں۔" وہ رسانیت سے بولے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ نے بھی تو مما سے شادی کی تھی۔" وہ شاکڈ رہ گئی۔ اس کی ماں کا شوہر ایک مسلم تھا تو وہ کیسے مان لیتی کہ اس کا شوہر عیسائی نہیں ہو سکتا۔

"ہاں! مگر مردوں کو اہل کتاب لڑکیوں سے نکاح کی اجازت ہے... عورتوں کو نہیں۔ تمہارا اب جلد ہی دوبارہ نکاح ہو جائے گا۔" وہ آگاہ کرنے کے بعد فیصلہ سنا کر چلے گئے اور فاطمہ اپنی جگہ جیسے پتھر کی ہو کر رہ گئی تھی۔

مائیک کو چھوڑنے کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی

☆ ☆ ☆

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں فاطمہ کا نکاح زریاب سے کر دوں۔" چائے کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے انہوں نے رائے طلب نظروں سے مرجان بیگم کو دیکھا تو ان کی آنکھوں میں احتجاج امڈ آیا۔

"زریاب کے لیے تو ہم نے مہک کا سوچ رکھا تھا۔"

"جانتا ہوں۔ لیکن..."

"لیکن ویکن کچھ نہیں شاہ جی! میں اپنی بیٹی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہونے دوں گی۔" اپنے لیے تو انہوں نے کبھی آواز بلند نہیں کی تھی۔ منال کی لاش کو بھی بڑے صبر سے رخصت کیا تھا۔ درنایاب کے ساتھ ہوئے ظلم کو بھی وہ خاموشی سے سہ گئی تھیں۔ مگر اب معاملہ ان کی اکلوتی لاڈلی بیٹی کا تھا۔ وہ اسے زندہ لاش بنا کر حویلی کے کسی زندان میں درگور نہیں کر سکتی تھیں۔

"مہک کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ جلیل شاہ کا بیٹا نبیل اپنی مہک کا ہی ہم عمر ہے اور وہ ایک دوبار مجھ سے اشارے کنائے میں ذکر بھی کر چکا ہے۔" انہوں نے اطمینان سے اپنے تایا زاد کے بڑے بیٹے کا نام لیا تھا۔

"تو فاطمہ کو بیاہ دیں، نبیل کے ساتھ..... زریاب ہی کیوں؟" وہ اب بھی اپنی بات پر ڈٹی ہوئی تھیں۔ زریاب انہیں مہک کے حوالے سے ہمیشہ بہت عزیز رہا تھا۔

"ایک تو تمہاری عقل میں کوئی بات نہیں سماتی۔" وہ جھنجلا گئے۔

"وہ لوگ مہک کے طلب گار ہیں تو فاطمہ کا کیسے کر دوں اور پھر فاطمہ پہلے سے شادی شدہ تھی۔ نومسلم بھی ہے۔ خاندان والے اس کے متعلق دل میں کدورت رکھتے ہیں۔ اس لیے تو میں اسے اپنے گھر میں ہی رکھنا چاہتا ہوں۔ تاکہ اس کے ایمان اور کردار پر کوئی انگلی نہ اٹھائے۔" انہوں نے گویا بات ہی ختم کر دی تھی۔

مرجان بیگم ہمیشہ کی طرح سر جھکا کر رہ گئیں۔

دروازے کے باہر کھڑی مہک کی ٹانگوں نے اس کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ خود کو گھسیٹتی کمرے میں لائی تھی۔

"زریاب اور فاطمہ۔" اس کے لبوں پر اک زخمی سی جنبش ہوئی اور درد دل کے ہر کونے تک پھیل گیا۔ آنکھوں میں نہ جانے کیوں اتنا پانی امڈ آیا تھا۔

وہ رات فاطمہ اور مہک نے ایک دوسرے کی جانب سے کروٹ بدلے جاگ کر گزار دی تھی۔

اگلے روز وہ درنایاب کے پاس چلی آئی۔

"مانیک سے ملنے کا کیا اب کوئی راستہ نہیں ہے؟" اس کا لہجہ نم سا تھا۔

درنایاب کے دل کو کچھ ہوا وصل کا موسم بھلا ہر کسی کی قسمت میں کہاں ہوتا ہے۔ وہ تو خوش قسمت تھی جس نے پا کر کھویا تھا۔ کچھ ساعتیں، تھوڑا سا وقت ہی سہی۔ مگر وہ ملے تو تھے۔ زندگی کو انہوں نے ایک ساتھ جیا تو تھا۔ ہر پہرے، ہر قید و بند سے آزاد ہو کر، خوابوں کی راہ گزر پر ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے وہ تھوڑی دور ساتھ چلے تو تھے۔ اس کی طرح ملن سے قبل ہجر تو راہ میں حائل نہیں ہوا تھا اور اگر ہجر تھا بھی تو ابھی ملن کی امید تو باقی تھی۔

ایک وہ تھے جو پکی قبر بنا کر اب محض چراغ جلاتے تھے۔ جن میں روشنی تو تھی۔ مگر امید نہیں..... اور امید کے بغیر تو اجالا بھی اندھیرا تھا۔

فاطمہ کی آس بھری سوالیہ نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے گردن گھما کر اطراف پہ نگاہ ڈالی۔ حویلی کے چاروں جانب راہ داریاں تھیں۔ مگر اس کے لیے تو کوئی ایک راستہ بھی نہیں تھا۔

٭ ٭ ٭

مہک کتاب سامنے کھولے یوں ہی بیٹھی تھی۔ جب زریاب نے دروازے سے اندر جھانکا۔

"ہیلو ڈیئر کزن۔" مہک بے نیاز بیٹھی رہی۔

"بزی ہو؟" اسے متوجہ نہ دیکھ کر وہ پھر بولا۔ مہک نے سابقہ بے نیازی برقرار رکھتے ہوئے محض اثبات میں سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

"میں نیٹ لگا کر آیا ہوں۔ آؤ! ٹینس کھیلیں۔" زریاب نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ کھینچا۔ جسے مہک نے چھڑا کر واپس اپنی گود میں رکھ لیا۔

"پلیز! میرا موڈ نہیں ہے۔ تم جاؤ۔" وہ اٹھ کر دریچے میں آن کھڑی ہوئی۔

باہر فضا میں لیموں کی کھٹی میٹھی باس رچی ہوئی تھی۔ ایک چڑیا اور دو بلبلوں نے شور مچا رکھا تھا۔

زریاب کی جانب اس کی پشت تھی۔ مگر وہ اس کا بھیگا لہجہ محسوس کر چکا تھا۔

"تم رو رہی ہو؟" وہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"نہیں! میرے سر میں درد ہے۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیاں دبائیں۔

"اچھا! میں کوئی پین کلر لا دیتا ہوں۔"

"مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے ٹوک دیا۔

زریاب نے دروازے میں رک کر کچھ پل اسے دیکھا۔ مہک نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔ آنسو پلکوں کی باڑھ پھلانگ کر رخساروں پر لرزنے لگے۔

٭ ٭ ٭

"تمہارا ایک ہفتے کا وعدہ تھا اور اب دو ماہ ہو چکے ہیں۔ مجھے حویلی کیوں نہیں آنے دیا؟" وہ کل ہی پاکستان آیا تھا اسے واپس لے جانے کے لیے۔ مگر اس نے کہہ دیا تھا کہ تم حویلی مت آنا۔ میں کل خود تم سے ملنے آؤں گی اور اس وقت دونوں جھیل کے کنارے اونچے نیچے پتھروں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ موسم اچھا تھا۔ فضا خوش گوار مگر پھر بھی جیسے ہر سمت کچھ کمی سی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں سے اور کیسے بات شروع کرے۔

"مجھے تم سے کچھ کہنا تھا۔"

"ہاں! کہو۔" وہ ہمہ تن گوش ہوا۔ مگر اس کی سمجھ میں آ چکا تھا کہ وہ کمی کہاں تھی۔ وہ کمی بیلا کے انداز میں تھی۔ اس کے گریز میں تھی۔ وہ اپنے اور اس کے مابین فاصلہ رکھ کر بیٹھی تھی۔ وہ کمی اس ہاتھ بھر کے فاصلے میں تھی۔ وہ کمی تو اس کی آواز میں بھی تھی۔ اور شاید سب سے بڑھ کر وہ کمی اب دل میں تھی۔

"مانیک! میں مسلمان ہو چکی ہوں۔"

"اف!" اس نے بے ساختہ ایک گہرا سانس خارج کیا۔ وہ کمی اب کہیں نہیں تھی۔

"میں سمجھ رہا تھا کہ تم جانے ایسا کیا کہنے والی ہو۔ یقیناً تمہاری فیملی نے تمہیں مجبور کیا ہو گا۔ بہرحال مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"مسلمان ہونے کے بعد میرا جو تم سے تعلق تھا، وہ ختم ہو چکا ہے۔ اب جب تک تم اسلام قبول کر کے مجھ سے نکاح نہیں کر لیتے۔ ہم ساتھ نہیں رہ سکتے۔" گلے ہی پل اس نے مانیک کے حواسوں پر بم پھوڑا تھا۔

"کیا بکواس ہے یہ؟ تم یہاں آ کر کن چکروں میں پڑ گئی ہو؟ چلو! واپس چلتے ہیں۔ ہماری اپنی ایک دنیا ہے۔ جہاں تم میری ہو اور میں صرف تمہارا۔ یہی حقیقت ہے۔ باقی سب....."

"میں تمہارے ساتھ نہیں چل سکتی۔" اس کا انداز اتنا قطعی تھا۔ مانیک اسے دیکھ کر رہ گیا۔ وہ کس قدر اجنبی لگ رہی تھی۔ جیسے وہ اس سے پہلی بار مل رہا ہو۔

"بیلا۔"

"میرا نام فاطمہ ہے۔" اس نے ٹوک دیا۔

"نام بدلنے سے تم اپنی پہچان نہیں بدل سکتیں۔"

"وہ بھی بدل جائے گی۔ اگر تم نہ مانے تو مجھے اپنا حوالہ بدلنا ہی پڑے گا۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"کیوں کر رہی ہو تم ایسا؟" وہ بے بس ہوا۔

"مانیک! پلیز تم میری بات مان جاؤ۔" اس کا انداز ملتجی تھا۔

"کبھی نہیں۔" "راستہ تم نے بدلا ہے۔ واپس بھی تمہیں ہی آنا ہو گا۔" اس کے انداز میں ضد تھی۔

"میں نے راستہ نہیں بدلا۔ محض اپنی سمت درست کی ہے۔"

"میرے نزدیک یہ حماقت کے سوا کچھ نہیں۔"

"اور میرے لیے یہ میری خوش نصیبی ہے کہ اللہ نے مجھے اپنے محبوب کا امتی ہونے کا شرف بخشا۔"

"تم ایک مذہب کی خاطر مجھے چھوڑ دو گی؟" وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم بھی تو مذہب کی خاطر مجھ سے دست برداری پر رضامند ہو۔"

"تم نے کہا تھا تم کبھی بھی کسی کے بھی کہنے پر مجھے نہیں چھوڑو گی۔" اس نے یاد دلانا چاہا۔ مگر ایسا ایک عہد ان مہکتے شاداب لمحوں اور دلفریب قربتوں نے اسے بھی عنایت کیا تھا۔

"تم نے بھی کہا تھا کہ جب کبھی میں کچھ ایسا چھوڑنے کو کہوں، جو تم نہیں چھوڑ سکتے۔ پھر بھی چھوڑ دو گے۔ اپنا مذہب چھوڑ دو مانیک! میں کبھی تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔"

"میری بات کو مشروط نہ کرو۔ اپنے وعدے پہ قائم رہو۔"

"میں یہ عہد نہیں نبھا سکتی۔ اللہ کے حکم سے انحراف میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ میں نے اپنی سب سے پیاری چیز اس کی راہ میں قربان کردی ہے۔ اب کاش! وہ اجر کے طور پر میری وہ پیاری چیز مجھے واپس لوٹا دے۔ عجیب خواہش ہے۔ مگر اس سے تو کچھ بھی مانگا جا سکتا ہے نا۔" وہ ہار کر واپس لوٹ آئی۔

مانیک نے اسے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں پکارا۔

وہ کمی اب ہر جگہ تھی ہمیشہ کے لیے۔

✲ ✲ ✲

جمعہ کے روز اس کا نکاح سادگی کے ساتھ زریاب شاہ سے ہو گیا۔ احمد کمال نے جب اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر فاطمہ کا پرپوزل پیش کیا تو وہ چاہ کر بھی انکار نہ کرسکا۔ بلا ارادہ اس کا سر اثبات میں ہل گیا۔

وہ اس سے دو سال بڑی تھی۔ وہ اس کی عزت کرتا تھا۔ مگر ایسا تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

"مہک! اگر تم میرا ساتھ دو تو میں اسٹینڈ لے سکتا ہوں۔" وہ آخری کوشش کرنا چاہتا تھا۔

"مسٹر زریاب شاہ! تم اپنے متعلق کچھ زیادہ ہی خوش فہمیوں کا شکار ہو۔ تم نے یہ سوچا بھی کیسے کہ تم میں اور مجھ میں کوئی ایسا جذبہ ہو سکتا ہے؟ تم میرے اچھے کزن ہو' دوست ہو تو اس کا یہ مطلب......"

کھنکتی چوڑیوں کی چھن چھن پر وہ سامنے پھولوں کی سیج پہ بیٹھی دلہن کی جانب متوجہ ہوا۔

اسے جیسے یقین نہیں آرہا تھا کہ سرخ زرتار میں چھپا وہ چہرہ مہک کا نہیں' کسی اور کا تھا۔

دونوں کو بچپن سے ہی پتا تھا کہ ان کی شادی آپس میں ہی ہوگی اور فطری طور پر اسے اس سے بے حد لگاؤ رہا تھا۔ اسے وہ ساری شرارتیں' جھگڑے' روٹھنا اور منانا یاد آرہا تھا۔

"ہرگز نہیں کہ میں تم سے شادی کرلوں۔" مہک کا ادھورا فقرہ اس کی سماعتوں میں گونجا تو وہ بے قراری سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ جانتا تھا' وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

"اور وہ تو ازل سے ہی جھوٹی تھی۔ پھر میں نے اس کا اعتبار کیونکر کیا۔" اب اسے خود پہ غصہ آرہا تھا۔ بے بسی سے اس نے اپنے بال نوچ ڈالے۔

احمد کمال نے بھی تو اسے سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اس نے تو محض ان کی جذباتیت کا بھرم رکھا تھا۔ اب کیا معلوم تھا کہ وہ اگلے ہی روز نکاح کروا دیں گے۔

"کاش! میں نے نکاح سے انکار کر دیا ہوتا۔" پچھتاوے اسے گھیرنے لگے۔

"میں چینج کرلوں۔" فاطمہ اس کی جانب سے کوئی پیش قدمی نہ ہوتے دیکھ کر خود ہی اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی۔

زریاب نے بلا ارادہ ہی اوپر دیکھا تھا اور اپنی جگہ مبہوت سا رہ گیا خوب صورت تو وہ بہت تھی۔ مگر اس وقت اس کا حسن قیامت ڈھا رہا تھا۔

مگر وہ مہک کا نعم البدل تو کبھی نہیں ہو سکتی تھی۔

"یہ ڈریسنگ روم ہے۔" وہ دائیں جانب اشارہ کرتا خود باہر نکل آیا۔

✲ ✲ ✲

آئینے میں اپنا بھرپور سجا سراپا دیکھ کر وہ دشمن جاں آج پھر بڑی شدت سے یاد آیا تھا۔

"میرا دل چاہتا ہے تم دولہن بنو۔" وہ ادھ کھلے دریچے میں کھڑی سوئٹزرلینڈ کا نظارہ دیکھ رہی تھی جب مانیک نے اسے اپنے بازوؤں میں بھرتے ہوئے ٹھوڑی اس کے شانے پر ٹکا دی تھی۔

"کتنی بار دولہن بناؤ گے؟" وہ اس انوکھی فرمائش پر ہنس پڑی۔

"وائیٹ میکسی والی نہیں یار! میں چاہتا ہوں تم انڈین برائیڈل بنو...... وہ جیسی ہم نے ہوٹل میں دیکھی تھی۔ سرخ لہنگے میں ملبوس ڈھیر سارا زیور پہنے سولہ سنگھار کیے۔ وہ کیا ہوتا ہے ہاں! بندیا' چوڑیاں' گجرے' مہندی اور جانے کیا کیا۔" وہ سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔

پتا نہیں اس نے یہ سارے الفاظ کس سے سیکھے تھے۔

اس نے پھولوں کے گجرے نوچ کر پھینک دیے۔ ایک ایک کر کے ساری چوڑیاں توڑ دیں۔ ان کے نوکیلے کانچ گوری ملائم کلائیوں کو زخمی کر گئے۔ زخموں سے خون رسنے لگا تھا۔

وہ دیوار سے ٹیک لگا کر اپنی جگہ بیٹھتی چلی گئی۔ آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی امڈ آیا تھا۔

✲ ✲ ✲

آج کی رات کس قدر ظالم اور وحشت ناک تھی۔ سلیپنگ پلز نگلنے کے باوجود بھی اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ بستر پر کروٹیں بدل بدل کر پورا وجود دکھنے لگا وہ چت لیٹی چھت پر لٹکے فانوس کو گھور رہی تھی۔ پھر اس نے وال کلاک کی سمت دیکھا۔

رات کے تین بج رہے تھے۔

وہ دوپٹا اوڑھتی دروازے پر چلی آئی۔ آہستگی سے دروازہ کھولا۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ راہ داری ویران پڑی تھی۔ ہر کمرے کا دروازہ بند تھا۔

وہ شال اوڑھ کر باہر نکل آئی۔ بند کمرے میں اب تو دم گھٹنے لگا تھا۔

رت جگے تو اب ہمارا مقدر ہیں دوست

تم کیوں جاگتے ہو اجاڑ راتوں میں

نیم تاریکی میں وہ اسے دیکھ نہیں پائی تھی۔ سامنے آیا تو اس کی پوروں میں جلتا ہوا شعلہ تھا۔ جس کا ایک کش لے کر اس نے دھواں مہک کے منہ پر چھوڑ دیا۔ وہ بے ساختہ کھانس کر رہ گئی۔

"کیا بدتمیزی ہے یہ؟" اشتعال سے زیادہ اسے صدمہ ہوا تھا۔ اس نے سگریٹ کیوں پینی شروع کردی۔

"بدتمیزی......" وہ استہزائیہ ہنسا۔

"بدتمیزی ابھی تم نے میری دیکھی کہاں ہے۔" ایک جھٹکے سے اس کا بازو جکڑتے ہوئے وہ غرایا۔ اس کی سرخ آنکھوں سے مہک کو خوف آنے لگا۔

"بازو چھوڑو میرا۔" اس کی آواز میں نمی گھل گئی۔

آج سے قبل اس نے زریاب کو کبھی اس قدر ٹوٹی بکھری حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ شکستگی' لاچاری اور جنوں کی جس انتہا پر تھا مہک کو لگا ابھی وہ اس کا گلا دبا کر سارے حساب بے باق کر ڈالے گا۔

"کیوں کیا تم نے ایسا میرے ساتھ مہک...... کیوں؟" نیم دیوانگی میں اس نے مہک کو پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ پھر اگلے ہی پل پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

"زریاب! یہ کیا پاگل پن ہے۔" وہ بوکھلا کر رہ گئی۔

"میں نہیں جی سکتا تمہارے بغیر۔"

"اب تمہاری زندگی فاطمہ سے وابستہ ہے زریاب...... اور یہ کبھی مت بھولنا کہ فاطمہ میری بہن ہے۔"

✲ ✲ ✲

"اماں جی' بابا جان کے ساتھ بیڈ روم میں ہی ناشتا کیا کرتی تھیں۔ اس وقت ڈائننگ ٹیبل پر حسب معمول وہ چاروں موجود تھے۔

فاطمہ کو مہک کچھ دنوں سے بہت بدلی ہوئی اداس اور گم صم سی لگ رہی تھی۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی تو اسے خیال آیا کہ شاید دونوں میں کوئی جھگڑا چل رہا تھا۔ بات چیت تو تقریباً" نہ ہونے کے برابر تھی۔ دونوں کو ایک ہی اسپتال جانا ہوتا تھا۔ مگر دونوں الگ الگ گاڑیاں استعمال کرتے تھے۔

"چائے اتنی پھیکی کیوں ہے۔" زریاب نے ایک گھونٹ بھر کر کپ واپس رکھ دیا۔ مہک خاموش رہی تھی۔ کیونکہ چائے وہی بنا کر لائی تھی اور وہ ہمیشہ سے ہی پھیکی چائے پیتا تھا۔

"فاطمہ! میرے لیے چائے تم بنایا کرو۔ تم چائے بہت اچھی بناتی ہو۔" اگلے ہی پل پیار بھرے لہجے میں فاطمہ سے فرمائش کی گئی اور فاطمہ کو یاد نہ آیا کہ اس نے کب زریاب کے لیے چائے بنائی تھی۔

اپنے سب کام جو وہ پہلے مہک سے کروایا کرتا تھا۔ اب فاطمہ سے کروانے لگا تھا۔ سب کے سامنے ایسے

ظاہر کرتا تھا۔ جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کی سنگت میں بہت خوش حال زندگی گزار رہے ہوں اور تنہائی میں مکمل لاتعلق اور اجنبی بن جاتا۔

☼ ☼ ☼

سردیوں کی نرم گرم دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ پہاڑوں پر سورج سردیوں میں شاذ و نادر ہی جلوہ گر ہوتا تھا۔ فاطمہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم لے کر اوپر ٹیرس پر چلی آئی تھی، جہاں زریاب پہلے سے موجود کسی کیس ہسٹری میں مکمل طور پر محو تھا۔

"آج کل اپنا زیادہ وقت مذہبی کتابوں کے مطالعے اور عبادت کو دے رہی تھی۔ جس سے نہ صرف اس کا وقت اچھا گزر جاتا تھا۔ بلکہ ایک روحانی سکون بھی ملتا تھا۔ وہ مانیک کو بھی نہیں بھلا سکتی تھی۔ مگر اتنا ضرور چاہتی تھی کہ زندگی کو نئے رخ سے جینا سیکھ لے۔

"یار! میں سوچ رہا ہوں۔ ہمیں کہیں ہنی مون کے لیے چلنا چاہیے۔"

ٹیرس کی خاموش لاتعلق فضا میں اچانک زریاب کی پرجوش آواز ابھری۔ انداز ایسا تھا۔ جیسے گھنٹہ بھر سے وہ اس کے ساتھ یہ ہی باتیں کر رہا ہو۔ مہک ابھی ابھی ٹیرس سے کپڑے اتارنے آئی تھی۔

"ہنی مون۔" اس کے اندر چھن سے کچھ ٹوٹ گیا۔ اسے سوئٹزرلینڈ کی وہ فلک بوس پہاڑیاں اور پھولوں سے مہکتی وادیاں یاد آ گئیں۔

"بیلا! ہم سال میں ایک بار ہنی مون ضرور منایا کریں گے۔ میں تمہیں لے کر ملکوں ملکوں گھومنا چاہتا ہوں۔"

"اچھا! اس سے کیا ہو گا؟" اس کی جذبے لٹاتی والہانہ نظروں سے شرما کر اس نے بے تکا سا سوال پوچھا تھا۔

"ہمارا پیار ہمیشہ جوان رہے گا۔" مانیک نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

"پیار کبھی بوڑھا یا جوان نہیں ہوتا۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

"تم کبھی بدل تو نہیں جاؤ گی نا؟ دیکھو! وعدہ کرو کہ ہمیشہ مجھے یوں ہی چاہو گی۔"

"انسان بھی کبھی بدلا ہے؟ آج جیسی ہوں، کل بھی ویسی ہی رہوں گی۔ گھبراؤ مت۔ میرے سر پہ سینگ نہیں نکلیں گے اور نہ ہی..." اپنی بات کا حظ اٹھاتی، خود ہی ہنسے جا رہی تھی۔

"تم ہنستی ہوئی کتنی اچھی لگتی ہو۔ میں چاہتا ہوں، تمہاری ہنسی کا ترنم کبھی پھیکا نہ پڑے۔ جب بھی تمہیں دیکھوں۔ تم یوں ہی کھلکھلاتی رہو۔" وہ اب اسے گدگدا رہا تھا۔ اور وہ ہنستے ہوئے اس سے دور بھاگ رہی تھی۔

"مانیک! اسٹاپ اٹ۔"

"بتاؤ نا! کس ملک کی سیر کرنا چاہتی ہو؟" زریاب نے اسے خاموش دیکھ کر اس کا ہاتھ دبایا۔

فاطمہ کی ہتھیلی سلگنے لگی۔ اسے آج تک کبھی مانیک کے سوا کسی نے نہیں چھوا تھا اور وہ ہمیشہ اس کی ہو کر رہنا چاہتی تھی۔

اس نے غیر محسوس انداز میں اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا وہ جتنا بھی خود کو آمادہ کرتی، یہ پل صراط اس سے پار ہونے والا نہیں تھا۔

مہک چپ چاپ سیڑھیاں اتر گئی اور اس کے جاتے ہی زریاب واپس اپنے خول میں سمٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

"ہاتھ دکھاؤ اپنا۔" وہ ڈریسنگ کے سامنے بیٹھی اپنی چوڑیاں اتار رہی تھی، جب وہ تن فن کرتا اس کے سر پہ اپنا حکم نامہ لیے آن کھڑا ہوا۔

مہک نے الجھن آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کے تاثرات خاصے برہم تھے۔ خشمگیں نظریں اس پہ جمائے وہ اسے مسلسل گھور رہا تھا۔

"سنا نہیں تم نے؟ اپنا ہاتھ دکھاؤ۔" اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ آتے دیکھ کر وہ اتنی زور سے دھاڑا تھا کہ مہک بے اختیار سہم کر دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔ پھر خاموشی سے اپنا ہاتھ اس کی سمت بڑھا دیا۔

اس نے نہایت درشتی کے ساتھ اس کے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہنی انگوٹھی اتار کر کھڑکی سے باہر اچھال دی۔

مہک ششدر سی رہ گئی اسے زریاب سے ایسی حرکت کی امید نہیں تھی۔

"تم صرف میری ہو اور میں تمہیں کسی اور کا ہونے نہیں دوں گا۔ یاد رکھنا۔" اس کے بازو کو اپنی آہنی گرفت سے جکڑے ہوئے ایک جھٹکے سے پیچھے دھکیلا جس طرح آندھی کی طرح آیا تھا۔ ویسے ہی واپس لوٹ گیا۔

وہ رونے لگی تھی۔ زریاب کا یہ جارحانہ روپ اس کے لیے بالکل نیا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس معاملے میں اس قدر جنون اور پاگل پن کا مظاہرہ کرے گا۔

☼ ☼ ☼

"فاطمہ! زریاب آ چکا ہے۔ تم ایسا کرو اس کی چائے بیڈ روم میں ہی لے جاؤ۔" درنایاب کچن میں ٹرالی سیٹ کر رہی تھی۔ اپنے اور مہک کے لیے چائے نکال کر اس نے باقی لوازمات اس کی سمت بڑھا دیے۔

"بھئی بڑی خاطریں ہو رہی ہیں میاں صاحب کی۔" راستے میں شایان ایک کپ اور سموسوں کی پلیٹ لے اڑا۔

فاطمہ سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے کمرے میں چلی آئی۔

پہلے تو اسے کچھ نظر ہی نہیں آیا۔ دبیز پردوں کے باعث سورج کی شعاعیں کھڑکیوں میں کھڑی جیسے محو انتظار میں تھیں کہ کوئی ان کو اندر جھانکنے کا راستہ فراہم کرے۔ اس نے سب سے پہلے ان کی خواہش کو عملی جامہ پہناتے ہوئے پردے ہٹائے تو جیسے ہر منظر نکھر سا گیا۔

بستر پر اوندھا لیٹا زریاب ایک ٹانگ جھلا رہا تھا۔ کمرے کی فضا میں عجیب ناگوار سی بو رچی ہوئی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر ایش ٹرے ڈسٹ بن میں جھاڑی، جو سگریٹ کے ادھ جلے ٹکڑوں سے بھری ہوئی تھی۔ اسے یاد آیا کبھی وہ کہا کرتی تھی۔

"آئی ہیٹ اسموکر۔"

مانیک کو بھی اسی وجہ سے وہ کتنا عرصہ ناپسند کرتی رہی تھی مگر اس نے بیلا کی خاطر سب چھوڑ دیا تھا۔ پھر اب کیوں نہیں۔

اس کے دماغ میں سوال اٹھا اور پھر کیتھرین کی فون کال یاد آ گئی۔ پہلے تو وہ اس پر خوب ناراض ہوئی تھی۔ پھر واپسی پر اصرار کرنے لگی۔ اس نے مانیک کا پوچھا تو اس نے بتایا تھا کہ ایک گیٹ ٹوگیدر میں وہ زبردستی مانیک کو ساتھ لے کر گئی تھی۔ وہاں سوزین نے سب کے سامنے اس کا خوب مذاق اڑایا کہ تمہاری بیوی تمہیں چھوڑ کر اپنے کسی آشنا کے ساتھ پاکستان چلی گئی ہے۔ بس اسی روز کی فلائٹ سے وہ برمنگھم چلا گیا ہے۔ اسے سن کر بہت دکھ ہوا تھا۔

ڈر، خوف، وہم بعض اوقات انسان کے دل و دماغ پر اتنے حاوی ہو جاتے ہیں کہ پھر حقیقت کا روپ دھار کر ہی جان چھوڑتے ہیں اور جو رسوائی قسمت میں لکھی جا چکی ہو، وہ ہزار تدبیروں سے بھی موخر نہیں ہو سکتی۔

اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

زریاب اس کی موجودگی کو محسوس کرتا اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔

"چائے۔" فاطمہ نے کپ اس کی جانب بڑھایا۔

تب ہی زریاب کی نظر اٹھی۔ وہ سی گرین رنگ کے لباس میں ہمیشہ کی طرح فریش اور خوب صورت لگ رہی تھی۔ سیدھے بال چٹیا میں مقید تھے۔ سرمئی آنکھوں میں کتنی حیا اور پاکیزگی تھی۔

مگر کوشش کے باوجود بھی اس کا دل فاطمہ کی جانب ملتفت نہیں ہوتا تھا۔

"یہ مٹھائی کہاں سے آئی ہے؟" پلیٹ پر نظر پڑتے ہی وہ اچھا خاصا بدمزا ہوا تھا۔

"جلیل انکل کے گھر سے..." نبیل شاہ کے نام کی انگوٹھی آج ہی ذکیہ آنٹی مہک کی انگلی میں پہنا کر گئی

ہیں۔" اس نے تو اپنی جانب سے خوش خبری سنائی تھی اس کے چہرے کے زاویے جانے کیوں بگڑ گئے۔

"اٹھا کر پھینکو اس کو باہر۔" وہ کپ واپس پٹختے ہوئے ٹرالی کو ٹھوکر مارتا باہر چلا گیا اور فاطمہ کے ذہن میں، اتنے دنوں سے جو کھٹک رہا تھا۔ وہ جیسے اس پر یقین کرنے میں ابھی تک متامل تھی۔

☼ ☼ ☼

"مہک! تم سے ایک بات پوچھوں؟" شام کی ٹھنڈی خوش گوار ہوا چل رہی تھی۔ دونوں لان میں بیٹھی چلغوزے کھا رہی تھیں۔ جب فاطمہ نے کہا۔ مہک کا دل دھک سے ہوا اب جانے وہ کیا استفسار کرنے والی تھی۔

"پھوپھو کی کتاب میں ایک نوجوان کی تصویر دیکھی تھی میں نے۔ لگتا ہے وہ کسی کو پسند کرتی تھیں۔ کیا تم جانتی ہو؟" فاطمہ کی نظر بالکونی پر جمی ہوئی تھی۔ وہاں درنایاب ستون سے ٹیک لگائے آسمان کی وسعتوں میں اڑتے پرندوں کو دیکھ رہی تھی۔

مہک نے ایک گہرا سانس بھرتے ہوئے اسے جہاں زیب کے متعلق بتا دیا تھا۔

"ابا نے پھوپھو کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ اب انہیں تم سے پہلے ان کی شادی کرنی چاہیے۔" اسے واقعی دکھ ہوا تھا۔

"پھوپھو کی شادی نہیں ہو سکتی۔" مہک کی آواز اتنی پست تھی کہ فاطمہ بمشکل سن پائی۔

"کیوں؟" حیرت کے ساتھ اس کی آنکھوں میں سوال بھی تھا۔

"وہ شاہ میر کے ساتھ منسوب ہیں اور وہ لندن میں لیزا کے ساتھ شادی کر چکا ہے۔ اب پھوپھو تمام عمر اس کی منگ بن کر رہیں گی۔"

"واٹ ربش..... کیا جہالت ہے یہ؟" پل میں اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

مہک اسے اپنی روایات، رسوم و رواج کے متعلق بتانے لگی۔ جنہیں سن کر اس کے ماتھے کی شکنوں میں اضافہ ہی ہوا تھا۔

وہ تن فن کرتی شایان کے سر پر پہنچ گئی تھی۔ جو ابھی عشاء کی نماز سے فارغ ہوا تھا۔

"تمہیں نہیں لگتا کہ اللہ سے تمہارا تعلق محض ایک سجدے میں سمٹا ہوا ہے؟ ایک سجدہ کیا اور گویا حق بندگی ادا ہو گیا..... اور پھر باقی کے تمام معاملات زندگی میں تم اپنی مرضی چلا رہے ہوتے ہو۔ حالانکہ اللہ سے محبت کا تقاضا تو یہ ہے نا کہ ہر کام اس کی مرضی سے کیا جائے؟" وہ بغیر کسی لاگ لپٹ کے شروع ہو چکی تھی۔ شایان نے تحمل سے اسے سنا اور پھر بولا۔

"بات کیا ہے؟"

"پھوپھو کو کس طرح آپ نے ایک جاہلانہ رسم کی بھینٹ چڑھا رکھا ہے۔" اس کے ابرو تن گئے۔

"یہ برادری اور جرگوں کے فیصلے ہیں۔ تم نہیں سمجھو گی۔" اس نے ٹالنا چاہا۔ مگر وہ بھی مکمل تیاری کے ساتھ آئی تھی۔

"آپ سمجھانے کی کوشش کریں تو ہو سکتا ہے آپ کے نادر خیالات، انمول اصول اور نایاب روایات میرے بھی اس کم عقل ذہن میں سما جائیں۔" وہ اطمینان سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"دیکھو فاطمہ! مجھے بھی یہ سب پسند نہیں۔ لیکن صدیوں سے چلے آئے سسٹم کو یوں ایک دم سے تو نہیں بدلا جا سکتا ناں۔"

"تبدیلی کبھی بھی سمندر میں نہیں آتی۔ پہلے دریا کا رخ موڑنا پڑتا ہے۔ تم پہلا قدم تو اٹھاؤ۔" وہ اب کے ذرا جوش سے بولی۔

"یہ سب اتنا آسان نہیں ہو گا۔ سارا قبیلہ ہم سے منہ موڑ لے گا۔ خاندان بھر میں ہماری بدنامی ہو گی اور....."

"اللہ کے احکامات کی پیروی پر شرمندگی کیسی؟" اس کی بات کاٹتے ہوئے فاطمہ نے اسے دیکھا تو ایک پل کے لیے وہ بھی لاجواب ہو کر رہ گیا۔

"تمہیں پتا ہے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام شیر خوارگی میں بنی اسرائیل کو توریت پڑھ کر سنایا کرتے تھے تو سارے یہودی توریت کا کلام سنا کرتے تھے۔ لیکن جب انہوں نے اپنی قوم کو انجیل کا پیغام دیا تو بنی اسرائیل کے لوگ ان کے دشمن ہو گئے اور ان کو صلیب پر چڑھانے کی سازش تک کر ڈالی۔ ایسے ہی جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دی تو طائف والوں نے ان پر پتھر برسائے۔ اللہ نے ہمیں عقل اور شعور کے ساتھ ایک مکمل ضابطہ حیات بھی دیا ہے تو ہم کیوں غور و تفکر سے کام نہیں لیتے؟ اصل میں ہم ریجڈ ہیں وہی کریں گے جو ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو کرتے دیکھا تھا۔" اس نے تاسف سے سر ہلایا اور اپنی بات جاری رکھی۔ یہ ہمارا جاگیرانہ سسٹم بھی ایسا ہی ہے۔ بہت سے غیر انسانی رسوم و رواج اور طور طریقے ایسے بھی رائج ہیں مذہب میں جن کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ بلکہ بعض تو صریح گناہ ہیں۔ لیکن جب بھی کوئی ان میں تبدیلی لے کر آئے گا، وہ معتوب ٹھہرے گا۔ اس پر پتھر بھی برسائے جائیں گے اور صلیب پر بھی چڑھایا جائے گا۔"

"میں آپ کی فصیح و بلیغ گفتگو سے متاثر ہو چکا ہوں مادام! آج ابا زمینوں پر ہیں۔ کل بات کریں گے۔" اسے تو ابھی تک منال کا دکھ نہیں بھولا تھا۔ پھر درنایاب کو اس ظلم کی بھینٹ کیوں چڑھنے دیتا۔ بس ابا کے سامنے کھڑا ہونے کی ہمت نہیں تھی۔ ورنہ ان رسموں کے وہ بھی دل سے خلاف تھا اور آج فاطمہ کی باتوں نے اسے اکسا دیا تھا کہ وہ حق کے لیے اٹھے۔

فاطمہ بے پناہ خوش ہوئی۔ اسے اب شدت سے کل کا انتظار تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز احمد کمال زمینوں سے آ کر کھانا کھانے کے بعد اپنی اسٹڈی میں چلے گئے۔ فاطمہ ان کے فارغ ہونے کا انتظار ہی کر رہی تھی۔ وہ اٹھنے ہی والی تھی۔ جب سامنے سے زریاب چلا آیا۔

"فاطمہ! یہ تمہاری شاپنگ ہے۔ دیکھ لو۔" اس

نے دو، تین شاپنگ بیگز اس کی سمت بڑھائے۔ جنہیں فاطمہ نے لے کر سائیڈ پہ رکھ دیا۔ لاؤنج میں اب وہ اور مہک ہی تھیں۔ مہک اٹھنے کے لیے پر تولنے لگی۔ وہ خود ہی بیگز کھولنے لگا۔

"یہ دیکھو! یہ سیٹ تو میں نے خاص تمہارے لیے خریدا تھا۔" جیولری باکس کھول کر وہ اس کے بالکل برابر میں آبیٹھا۔

فاطمہ نے اک سرسری سی نگاہ ڈالی۔

سفید یاقوت اور زمرد سے مزین وہ بہت خوب صورت نیکلس تھا۔ زریاب نے ایک جھمکا نکال کر اس کے کان میں لٹکا دیا۔

"واؤ بیوٹی فل، تم جس چیز کو زیب تن کر لو وہ خوب صورت ہو جاتی ہے۔" وہ کچھ زیادہ ہی شوخ ہو رہا تھا۔

مہک چپکے سے اٹھ کر چلی گئی اور اس کے جانے کے بعد باقی کے شاپنگ بیگز بند ہی پڑے رہے۔

"کاش مہک! تم میری بہن نہ ہوتیں تو میں خود تمہیں زریاب کی دولہن بناتی۔" وہ دل گرفتی سے سوچنے لگی۔ اس نئے رشتے کو نبھانے کے لیے ابھی کچھ وقت درکار تھا اور شاید یہی مجبوری زریاب کی بھی تھی۔

وہ دونوں ہی جدا جدا منزلوں کے راہی تھے۔ مگر رہ گزر شاید ایک ہی تھی سو وہ چل رہے تھے۔

"چائے پیو گی؟" ورنایاب کی آواز سے اس کے خیالوں کا تسلسل ٹوٹا۔ وہ ٹرے تھامے اس کے قریب کھڑی تھی۔ فاطمہ نے اٹھتے ہوئے دو کپ اٹھا لیے۔

"ابا جان کے پاس بہت ضروری کام سے جا رہی ہوں۔ دعا کیجیے گا، میرا کام ہو جائے۔"

"لالہ اب اتنے بھی کٹر نہیں ہیں اور تم سے تو بہت محبت کرتے ہیں۔ جس طرح تم نے ان کا مان رکھتے ہوئے زریاب سے نکاح کیا ہے وہ بہت خوش ہیں تم سے۔ امید ہے کہ تمہارا کام ہو جائے گا۔" دعا کرنے کے بجائے وہ اپنے خیالات کا اظہار کرنے بیٹھ گئی تو فاطمہ نے مصنوعی خفگی سے اسے گھورا۔

"آپ بس دعا کریں۔" وہ اپنی بات پر مصر تھی۔

ورنایاب نے اثبات میں سر ہلا دیا اور جب وہ چائے لے کر اسٹڈی میں پہنچی تو وہ کرسی پہ بیہوش پڑے تھے۔ ان کا دایاں بازو نیچے جھول رہا تھا اور گردن لڑھک کر ایک جانب کو ڈھلک چکی تھی۔

انہیں اس حالت میں دیکھ کر فاطمہ کی چیخ نکل گئی۔ اگلے ہی پل ملازموں سمیت تمام افراد خانہ اسٹڈی میں جمع ہو چکے تھے۔

"شایان! ان کو اسپتال لے کر جاؤ۔" شایان کو دیکھ کر وہ چلائی۔ زریاب آگے بڑھ کر ان کی نبض ٹٹول رہا تھا۔

"شایان! انہیں لاؤنج میں لے چلو۔" وہ مایوسی سے کہتا ان کے بازو اور سر سیدھا کر رہا تھا۔

سب کی آنکھوں میں بے تحاشا آنسو امڈ آئے۔ فاطمہ کا دل چیخ چیخ کے رو رہا تھا۔ وہ ہنوز بے یقینی کے عالم میں کھڑی تھی۔ ورنایاب ساکت تھی اور مہک کو تو لگ رہا تھا جیسے کسی نے بھری دنیا میں تنہا کر دیا ہو۔ مرجان بیگم کی حالت الگ خراب تھی۔ شام کے قریب انہیں سپرد خاک کر دیا گیا۔

زندگی رفتہ رفتہ معمول پر آنے لگی۔ دستار شایان کے سر پر سج چکی تھی اور زندگی میں بہت کچھ تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ اسے ورنایاب کی شادی پر رضامند کر چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"فاطمہ!" شام کا وقت تھا دونوں واک پر نکلی ہوئی تھیں۔ جب ورنایاب نے کسی بات کی غرض سی اسے پکارا تو وہ پلٹ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"تمہیں اس شام لالہ سے کیا کہنا تھا؟" وہ کتنے دنوں سے یہ سوال پوچھنا چاہ رہی تھی۔ آج موقع مل گیا۔

"آپ کی شادی کی بات کرنا تھی۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔ پارک سامنے ہی تھا۔ فاطمہ اسے باتوں میں لگا کر منزل کے قریب لے آئی تھی۔

"شادی۔" وہ استہزائیہ ہنسی۔

"تم نے لاحاصل کوشش کی؟ اب تو بہت دیر ہو چکی ہے۔"

"کیوں؟ اپنی محبت پر اعتبار نہیں ہے۔"

"اعتبار کی بات نہیں ہے فاطمہ! مگر اب جانے وہ کہاں ہو گا۔ شاید اس کا اپنا ایک گھر ہو......"

"بیوی ہو اور بچے بھی ہوں اور وہ اپنی دنیا میں ہمیشہ مگن ہو۔ جانے اسے کبھی میری یاد بھی آئی ہو گی یا نہیں۔" اس کی بات اچک کر وہ بولے جا رہا تھا۔

فاطمہ ہنستے ہوئے ایک طرف چلی گئی ورنایاب کو لگ رہا تھا، جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ خوش رنگ تتلی کے پروں جیسا خواب، چھونے سے ابھی رنگ بکھر جائیں گے۔

"چھو کر دیکھ لو۔ یہ میں ہوں۔ کوئی خواب نہیں۔" اس نے دھیرے سے ورنایاب کا ہاتھ تھاما۔

"جہاں زیب۔" اس کے لب بے آواز ہلے اور آنکھوں سے ساون برسنے لگا۔ اس نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اس زندگی میں دوبارہ کبھی اسے دیکھ بھی سکتی ہے۔

☼ ☼ ☼

اگلے ہی ہفتے وہ پھر سے اپنی مما کے ساتھ سوالی بن کر آیا تھا اور اب حویلی میں کسی کو بھی اس رشتے پر اعتراض نہیں تھا۔ ورنایاب بہت خوش تھی اور اب اس کا سر کھا رہی تھی۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں اور جہاں زیب ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور تمہیں وہ کہاں ملا؟ یہ سب یوں اچانک؟" متجسس بھی تھی۔

"بھول گئیں آپ، جہاں زیب نے آپ سے کہا تھا کہ اگر کاتب تقدیر نے تمہیں میرے نصیب میں لکھا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس فیصلے کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ مگر ملن کا بھی تو ایک وقت مقرر تھا اور جہاں زیب بھائی آپ کو وقت سے پہلے مانگنے آئے تھے۔ اسی لیے خالی ہاتھ لوٹنا پڑا۔" وہ ہنوز غیر سنجیدہ تھی۔

"بتاؤ نا! وہ کہاں ملے اور یہ سب کیسے ہوا؟" وہ اپنے سوال پر مصر تھی۔

"بھئی! وہ تو آپ کے بڑے پکے عاشق نکلے۔ بس! اپنی یادوں کے ساتھ جی رہے تھے، جو آپ انہیں سونپ کر آئی تھیں۔" اس نے پھر گول مول سا جواب دیا تھا اور ورنایاب اس بار ضبط نہیں کر پائی۔ کشن اٹھا کر اس کی جانب اچھالا تو وہ بمشکل اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے بولی۔

"جناب! وہ اسی یونیورسٹی میں لیکچرار ہیں۔ ہم تو یونیورسٹی اسٹوڈنٹس ریکارڈ سے ان کا کوئی اتا پتا معلوم کرنے گئے تھے۔ مگر آپ کی قسمت یہ ہمیں خود مل گئے۔ ہمارا ارادہ تو حجلۂ عروسی میں آپ کو ان کا دیدار کروانے کا تھا۔ مگر مہک نے کہا اتنا ہی سرپرائز ٹھیک ہے۔ ورنہ پھوپھو کہیں مارے خوشی کے دنیا سے ہی نہ کوچ کر جائیں۔" حفظ ماتقدم کے طور پر اس نے دوسرا کشن اور تکیہ پہلے ہی اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔

خاندان بھر کی مخالفت کے پیش نظر ورنایاب کو سادگی سے ہی رخصت کیا گیا تھا۔ مگر شایان کے خدشے درست نکلے۔ تایا جلیل شاہ اگلے ہی روز آکر کافی برہمی کا اظہار کرتے ہوئے منگنی کا سامان لوٹا گئے تھے۔

"میری بیٹی کا اب جانے کیا ہو گا۔" مرجان بیگم کو دن رات ایک ہی فکر کھائے جا رہی تھی۔

"اماں بی! آپ فکر کیوں کرتی ہیں۔ اللہ نے ہماری مہک کے لیے بھی کچھ اچھا ہی سوچا ہو گا۔" شایان انہیں تسلیاں دیتا اور فاطمہ خود سے نظریں چرانے لگتی۔ زریاب شاہ سے بات کرنے کا ارادہ تو وہ پہلے ہی کر چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

فون کی چنگھاڑتی بیل پر کچن کی جانب بڑھتے اس کے قدم رک گئے۔

"شاید پھوپھو کا ہو۔" وہ یہی قیاس کرتی فون سیٹ کی جانب آئی تھی۔

"ہیلو فاطمہ؟" ریسیور کان سے لگاتے ہی دوسری

جانب سے استفسار کیا گیا تھا۔ یہ آواز یہ لہجہ تو وہ سینکڑوں میں بھی پہچان سکتی تھی۔

مگر اب کیوں؟

کتنے پل، پہر، موسم گُسے تو یوں لگتا تھا جیسے صدیاں بیت چکی ہوں۔ اب تو اس نے موسموں کا، دنوں کا پہروں کا حساب رکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اب تو وہ اپنے نصیب پر صابر شاکر ہو کر تقدیر سے سمجھوتا کر چکی تھی۔

"فاطمہ! میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔" اس کے ملتجی لہجے پر وہ جیسے اپنے حواسوں میں واپس لوٹی۔

"کیوں؟" لاکھ چاہنے پر بھی وہ اپنا لہجہ تلخ نہ کر سکی۔

"مجھے تمہیں کچھ بتانا ہے۔" اس کی آواز میں اب کے دبا دبا سا جوش تھا۔ جس پر وہ متجسس ہوئے بغیر رکھائی سے بولی۔

"اپنے لیے کوئی دوسرا سامع ڈھونڈ لو۔ مجھے اب اتنی فرصت کہاں۔" وہ بھلا اب اس سے ملنے کیسے جا سکتی تھی۔ اس کا حوالہ اس کا نام اس کی پہچان تک تو بدل چکی تھی۔ اب وہ بیلا مانیک کہاں رہی تھی۔ اب تو وہ فاطمہ زریاب بن چکی تھی۔

"پلیز فاطمہ! بس ایک بار..... میں تمہارا انتظار کروں گا۔" اس نے جگہ اور وقت بتا کر فون بند کر دیا۔

وہ کتنی ہی دیر شش و پنج کا شکار ریسیور ہاتھ میں تھامے کھڑی رہی اور پھر سر جھٹک کر اسے کریڈل پر پٹخ دیا۔ اس کا ارادہ کہیں جانے کا نہیں تھا۔

دوسری جانب اپنے بیڈ روم کے ایکسٹینشن سے اتفاقاً ان کی گفتگو سننے کے بعد زریاب کا خون کھول اٹھا۔

وہ اس سے کتنا ہی اجنبی اور لاتعلق سہی۔ مگر وہ تھی تو اس کی بیوی نا۔ ایسی عورتوں کو ان کے خاندان میں کاری قرار دیتے ہوئے سرعام سنگسار کیا جاتا تھا۔

تب ہی وہ کمرے میں چلی آئی۔ وہ اس پر ایک زہر خند سی نگاہ ڈالتا باہر نکل گیا۔ لان میں ٹہلتے ہوئے اس کی نگاہ اوپر اٹھی اور کتنے ہی پل خاموشی سے سرک گئے۔

"عورتوں کو سرعام سنگسار کرتے ہو اور ایسے مردوں کے لیے کیا سزا تجویز کی ہے۔" کوئی اس کے اندر سے بولا۔ اس نے جھنجلا کر مہک پر سے نظریں ہٹا لیں اور پاؤں پٹختا ہوا حویلی سے دور نکل گیا۔ اسے کل شام چار بجے کا بے چینی سے انتظار تھا۔

☼ ☼ ☼

دن بھر وہ معمول کے کام نبٹاتی رہی۔ مگر چار بجتے ہی اس کا دل معمول سے ہٹ کر دھڑکنے لگا۔

"میں انتظار کروں گا۔" اس کے لفظ بار بار سماعتوں سے ٹکرا رہے تھے۔

"مجھے تمہیں کچھ بتانا ہے۔" بالآخر اس نے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

آئینے میں اپنا آخری جائزہ لینے کے بعد وہ حویلی سے باہر نکل آئی۔ آج اس نے کوئی خاص بناؤ سنگھار نہیں کیا تھا۔ وہ اس وقت عبایا کے اوپر سیاہ حجاب لپیٹے ہوئے تھی۔ مطلوبہ جگہ پہنچ کر اسے مانیک سے اپنی آخری ملاقات یاد آگئی۔ جس میں وہ اپنی محبت کا مان ہار چکی تھی۔ مانیک نے اسے کتنا مایوس کیا تھا۔

مگر شاید اس سے کہیں زیادہ مایوس تو وہ اسے کر چکی تھی۔

"السلام علیکم۔" ایک یک سر اجنبی مرد نے اسے کسی کی تلاش میں سرگرداں دیکھا تو اٹھ کر قریب چلا آیا۔

فاطمہ اپنی جگہ حیرت کا بت بنی، منہ کھولے محض دیکھتی ہی رہ گئی۔

سفید، شلوار سوٹ میں ملبوس سر پہ کروشیے کی ٹوپی پہنے، ہلکی ہلکی داڑھی والا وہ خوبرو نوجوان کوئی اور نہیں مانیک تھا۔

"وعلیکم السلام۔" حیرت کے جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے گویا ہوئی۔ "مانیک....."

"میرا نام علی ہے۔" وہ اس کے انداز میں بولا۔

"کیا؟" اس کے دل میں چھن سے جیسے کچھ ٹوٹ گیا۔

علی نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے قریب بینچ پر بٹھا لیا۔ پھر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر شرارت سے بولا۔

"محترمہ! اب تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ دیکھو! نام بھی تمہارے برابر کا رکھا ہے۔"

"یہ سب یوں اچانک....."

"اچانک نہیں۔" وہ ایک لمحے کے توقف سے بولا

"جب تم مجھے ٹھکرا کر چلی گئی تھیں تو میں بہت دل برداشتہ ہوا تھا۔ کتنے ہی دن تمہاری بے وفائی کے روگ نے مجھے بستر سے اٹھنے نہ دیا۔ ان دنوں سوزین نے میرا بہت خیال رکھا۔ پھر وہ شادی پر اصرار کرنے لگی اور جب میں نے دو ٹوک انکار کیا تو اس نے بھری محفل میں مجھے ڈی گریڈ کرنے کی کوشش کی۔ تمہارے حوالے سے مجھے ذلیل کیا۔ میرا دل تو اس ملک سے ویسے ہی اچاٹ ہو چکا تھا۔ میں نے سامان سمیٹا اور برمنگھم چلا آیا۔ میں تمہیں بے وفا کہتا تھا۔ مگر دل تمہاری بے وفائی کو تسلیم کرنے سے انکاری تھا۔ پہلے پہل میں اسے مختلف دلائل دے کر مناتا رہا۔ مگر جب یہ نہ مانا تو میں نے ہار مان لی۔ میں نے حقیقت پسندی سے سوچا کہ تم جو مجھ سے اتنی محبت کرتی تھیں۔ جس کے لیے میرے بغیر جینے کا تصور بھی محال تھا۔ تم نے محض ایک مذہب کی خاطر کیسے مجھے چھوڑ دیا۔ ایسا کیا ہے اس مذہب میں جس کی خاطر تم نے اپنی جان سے پیاری چیز اپنی محبت تک کو قربان کر دیا ہے۔" وہ ایک لمحے کو رکا اور اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"بس یہ خیال تھا، جو مجھے روز اکساتا تھا کہ میں تمہارے مذہب کا مطالعہ کروں اور جانوں کہ اس میں ایسی کیا کشش ہے، جو مجھ سے بڑھ کر تھی۔ مگر تم تو جانتی ہو کہ میں کتابوں سے کتنا الرجک تھا۔ کتنے ہی مہینے میں خود کو ٹالتا رہا۔ مگر جب بے چینی حد سے سوا ہوئی تو میں جا کر قرآن پاک لے آیا اور تم یقین نہیں کرو گی، چھتیس گھنٹے بغیر کچھ کھائے پیے اپنے بیڈ روم میں محصور ہو کر میں نے محض اسے پڑھا۔"

وہ جیسے سحر کی سی کیفیت میں بول رہا تھا۔ فاطمہ دم بخود اسے سن رہی تھی۔

"اور تب میں نے جانا کہ تم نے مجھے کھو کر کیا پایا ہے۔ اس کے بعد میں نے اسلامک سینٹر جوائن کر لیا چھ ماہ تک وہاں سے احکام شریعت کی تعلیم حاصل کی۔ خود کو تمہارے قابل بنایا۔ میں آنا چاہتا تھا، جب اچانک ڈیڈ کی طبیعت خراب ہو گئی۔ ان پر فالج کا شدید اٹیک ہوا تھا۔ دو ماہ دن رات میں نے ان کی خدمت کی۔ مگر وہ صحت یاب نہ ہو سکے۔ ان کی وفات کے بعد جائیداد میں سے مما اور ٹومی کو ان کا حصہ دینے کے بعد پہلی فلائٹ سے پاکستان آیا ہوں اور اب....."

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" اسی لمحے زریاب نے ایک جھٹکے سے اس کا بازو پکڑتے ہوئے انتہائی درشت لہجے میں استفسار کیا۔ اس کی آنکھوں سے جیسے شرارے نکل رہے تھے۔

فاطمہ اسے یوں غیر متوقع طور پر سامنے دیکھ کر بوکھلا کر رہ گئی۔ اس پر اس کے بگڑے تیور، اسے جیسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی یہاں موجودگی کا کیا جواز پیش کرے۔

"ایکسکیوز می مسٹر۔" علی نے اٹھ کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔

"علی! یہ میرا شوہر ہے۔" علی کی گرفت وہیں ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ بے یقین نظروں سے فاطمہ کو دیکھنے لگا۔

"چلو!" زریاب نے اسے چلنے کا اشارہ کیا۔

وہ مرے مرے قدموں سے اس کے ساتھ چلنے لگی تھی۔ لیکن اس کا سارا دھیان پیچھے کھڑے علی میں اٹکا ہوا تھا۔

جیپ کے قریب پہنچنے تک وہ ایک فیصلہ کر چکی تھی۔

زریاب نے اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ مگر وہ بیٹھنے کا ارادہ موقوف کر چکی تھی۔ دور کھڑا علی ابھی تک اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"زریاب! مجھے تم سے طلاق چاہیے۔" اس کے لہجے کی مضبوطی اور اطمینان بھرے انداز نے ایک پل

کے لیے زریاب کو ساکت کر ڈالا۔ جو بات' وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا' وہ کتنی آسانی سے بول گئی تھی۔

مگر اس کا یہ مطالبہ کسی صورت قابل عمل نہیں تھا۔ ان کے خاندان میں سات پشتوں تک کبھی کسی مرد نے عورت کو طلاق نہیں دی تھی۔

''میں تمہاری اس حرکت کے لیے تمہیں معاف کر سکتا ہوں۔ مگر طلاق نہیں دے سکتا۔ یہ ایک ناممکن سی بات ہے۔'' ایک جھٹکے سے اسے گاڑی میں دھکیلتے ہوئے اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

☼ ☼ ☼

''اتنی اداس کیوں کھڑی ہو؟ لگتا ہے منگنی ٹوٹنے کا کچھ زیادہ ہی ملال ہے؟'' وہ ٹیرس پہ کھڑی خشک اور بے رنگ درختوں سے سوکھے پتوں کو گرتے دیکھ رہی تھی' جب وہ اچانک اس کے عقب میں آکر بولا۔ انداز ایسا جی جلانے والا تھا کہ وہ سر تا پا سلگ کر رہ گئی۔

''دیکھو! بہت برداشت کر چکی ہوں میں اب اگر تم نے ایک بھی فضول اور بے ہودہ بات کی تو تمہارا منہ نوچ لوں گی۔''

''جہاں تک برداشت کرنے کی بات ہے' وہ تو اب تمام عمر کرنا پڑے گا...... اور رہی فضول اور بے ہودہ بکواس تو ان کے کرنے کا تو جلد ہی باقاعدہ سرٹیفکیٹ ملنے والا ہے۔'' اطمینان سے اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ اس کی معلومات میں بھی اضافہ کیا گیا تھا۔

''فاطمہ کہاں ہے؟'' اس کی بکواس کو سرے سے نظر انداز کرتے ہوئے اس نے متلاشی نظروں سے پورا لان بالکونی اور سیڑھیاں تک کھنگال ڈالیں۔ وہ غائب تھی اور ڈرائیور بھی خالی گاڑی لیے واپس آیا تھا۔

''وہ جا چکی ہے' تمہیں سلام کہہ رہی تھی اور ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ زریاب سے میرا نکاح ضرور ہوا تھا۔ مگر ہم آپس میں کسی طرح کا کوئی تعلق نہ جوڑ سکے۔ سو یہ رشتہ کاغذ تک ہی محدود رہا اور اسی پر ختم بھی ہو گیا۔ اب تم سے درخواست ہے کہ زریاب کا بہت خیال رکھنا۔ وہ تم سے بہت پیار کرتا ہے۔'' ایک لائن کے سوا باقی سارے جملے اس کے اپنے تھے۔

گاڑی اسٹارٹ کرنے کے بعد جب اس نے فاطمہ کی آنکھوں سے آنسو گرتے دیکھے تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رک گیا۔ اس کے دل نے کہا تھا۔

''زریاب شاہ! کیوں زندگی کو سزا بنا دینا چاہتے ہو۔ تقدیر مہربان ہے اور منزل قریب۔ کشتی اگر بھنور سے نکال کر ساحل پر آ ہی چکی ہے تو پھر کیوں ڈبو دینا چاہتے ہو؟ خود کو بھی اور اپنے سے وابستہ تمام لوگوں کی خوشیوں کو بھی؟ تم وہ کیوں نہیں کرتے جو سیدھا اور آسان ہے؟ بھلے ہی وہ اعتراف نہ کرے۔ مگر محبت تو تم سے ہی کرتی ہے نا۔''

''جاؤ فاطمہ! میں نے تمہیں آزاد کیا۔'' اس کی آواز سرگوشی سے بلند نہیں تھی۔

فاطمہ نے بے یقین نظروں سے اسے دیکھا اور پھر بھیگی پلکوں سے مسکراتے ہوئے گاڑی سے اتر گئی۔

جس رہ گزر پر دونوں چل رہے تھے۔ اس کے اختتام پر دونوں کی منزل الگ تھی۔ سو راستے جدا کیونکر نہ ہوتے۔

''تم نے انہیں جانے کیوں دیا؟ گھر لے کر آتے۔ پھر ہم دھوم دھام سے ان کی شادی......''

''بس! دوسروں کی شادیوں کا شوق ہے تمہیں۔ اور جو میں بکواس کر رہا ہوں' اس پہ کان نہ دھرنا۔'' اتنے رومانٹک جملے کے بدلے ایسی فرمائش پر اسے تپ نہ چڑھتی تو کیا ہوتا۔ مگر وہاں جو ذرا پروا ہو۔

''مجھے نہیں کرنی تم سے شادی۔ کتنی بار انکار کروں؟''

''اب کیا اعتراض ہے تمہیں؟'' وہ کھول ہی تو اٹھا تھا۔

مہک مصنوعی گھبراہٹ کا مظاہرہ کرتی دو قدم پیچھے ہٹی۔

''ایسے خونخوار انداز میں پروپوز کرو گے تو میں کیا' دنیا کی کوئی بھی لڑکی تم سے شادی نہیں کرے گی۔'' خفگی سے کہتے ہوئے اس نے رخ موڑ لیا۔

''یہ لو۔'' اس نے سرخ گلابوں کا بکے اور چاکلیٹ اس کی جانب بڑھائیں۔

''اب بھی انکار کیا تو زبردستی اٹھا کر لے جاؤں گا۔''

''بہت موٹی ہو چکی ہوں۔ ایسی حرکت سے احتراز ہی کرنا۔'' وہ اس کی دھمکی پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''قسم سے مہک! مجھے تو ایسا لگتا تھا کہ جیسے اب تم مجھے کبھی نہیں مل سکو گی۔''

''اپنی وہ الٹی سیدھی تمام تر حرکتیں یاد ہیں تمہیں؟''

''وہ تو بس تمہیں جیلس کروانا چاہتا تھا۔''

''اور میں جیلس ہو بھی جاتی۔ اگر فاطمہ میری بہن نہ ہوتی۔''

''اچھا! اور اگر فاطمہ آج بھی ہمارے درمیان ہوتی تو تم ساری زندگی میرے بغیر کیسے گزارتیں؟'' زریاب کو اس کا فاطمہ کی حمایت میں بولنا اچھا نہیں لگا تھا۔ وہی تو تھی جس نے دونوں کی ہنستی مسکراتی زندگی سے سارے رنگ چرا لیے تھے۔

''تمہیں یاد ہے جہاں زیب پھوپھا نے کہا تھا کہ جو چیز ہمارے مقدر میں ہو' وہ ضرور ملتی ہے اور فاطمہ کہا کرتی تھی کہ مقدر میں لکھی چیزیں وقت سے پہلے نہیں ملتیں۔ یو نو! تمہارے مقدر میں دو شادیاں لکھی تھی اور مجھے اپنے وقت کا انتظار تھا۔''

''لیکن پیار ایک ہی بار لکھا تھا اور میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔'' وہ اس کی بڑی بڑی سنہری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

مہک کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ سچی' شرمیلی اور محبت بھری مسکراہٹ۔

☼ ☼ ☼

''مجھے افسوس ہے کہ میں نے زندگی کے دو سال تمہارے بغیر برباد کر دیے۔ کاش! کہ میں نے اس وقت تمہاری بات مان لی ہوتی۔ جب تم آخری بار مجھ سے ملنے آئی تھیں۔'' علی سے اس کا نکاح ہوئے چھ ماہ ہو چکے تھے۔ مگر اسے ان دو سالوں کا غم آج بھی تھا۔

''تمہارے وہ ماہ و سال ضائع نہیں ہوئے۔ ان دو سالوں نے تمہیں ایک اچھا مسلمان بھی تو بنایا تھا۔ اگر تم تب میری بات مان لیتے تو اتنے اچھے باعمل مسلمان کبھی نہ بنتے اور اب اٹھ جاؤ! اذان ہو چکی ہے۔ یہ ڈائیلاگ آکر جھاڑ لینا۔ ابھی تو رات باقی ہے۔'' فاطمہ نے بمشکل تمام اسے باہر دھکیلا۔

''ہاں! تم سچ کہتی ہو۔ پھر واقعی میں اتنا اچھا باعمل مسلمان کبھی نہ بنتا تو گویا اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی حکمت یا مصلحت ضرور ہوتی ہے۔ مگر ہم ہی دیر سے سمجھتے ہیں۔'' وہ سوچتے ہوئے چلتا جا رہا تھا۔ اس کا رخ مسجد کی جانب تھا۔

جہاں سے ''حی علی الفلاح'' کی صدا بلند ہو رہی تھی۔

فوزیہ احسان رانا

آمنہ پودوں کو پانی دے رہی تھی' جب اسے زارا کے اونچا اونچا بولنے کی آواز سنائی دی۔

"الٰہی خیر! آج علی الصبح ہی معرکہ آرائی شروع ہو گئی ہے۔" آمنہ نے تاسف سے سر جھٹکا۔ زارا اور حسن اس کے کرائے دار تھے۔ وہ اس کے گھر کے اوپری پورشن میں ابھی چند ماہ پہلے ہی شفٹ ہوئے تھے۔ وہ دونوں ویسے تو اچھے خاصے تھے۔ مگر ان میں ایک خراب بات یہ تھی کہ آئے دن ان میں کسی نہ کسی بات پر تکرار رہتی۔ آج بھی وہ نجانے کس بات پر لڑ رہے تھے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے چکر میں زور زور سے چیخ رہے تھے۔ حلق پھاڑ کر حسن ایک بات کہہ رہا تھا تو زارا دو بدو جواب دے رہی تھی۔ بلکہ حسن کی ایک بات کے جواب میں چار باتیں سنا رہی تھی۔ اس کا لہجہ اور انداز یقیناً" ایک مرد کے لیے تحقیر آمیز ہی نہیں' بلکہ سلگا دینے والا تھا۔

"چپ کر جاو ورنہ......" ہوا کے دوش پر لہراتی زارا کی آواز آمنہ کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

"ورنہ کیا؟" زارا کا انداز للکارنے والا تھا۔ آمنہ نے دکھ سے سوچا کہ زارا کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

"جان سے مار ڈالوں گا تمہیں۔" حسن کی مردانگی جوش میں آئی۔ سانس معتدل نہ رہی۔ فشار خون بلند ہونے لگا۔ اس نے سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ ڈالے۔

"مار کے دکھاؤ' تمہارے ہاتھ نہ توڑ ڈالوں۔" زارا دانت پیستے ہوئے غرائی۔ وہ دونوں ہی اشتعال میں تھے۔

"مجھے آنکھیں دکھاتی ہے جنگلی! نہیں چھوڑوں گا۔" حسن کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر زارا کی چوٹی پکڑ کر دو تین تھپڑ پے در پے رسید کیے۔ زارا رونے لگی۔ چند ثانیے گزرے۔ وہ لال بھبھو کا چہرہ لیے پھر اس کے سامنے تن کر کھڑی ہو کر مقابلے پر اتر آئی۔

"اب مار کے دکھا گھٹیا آدمی!" وہ روتے ہوئے دانت کچکچا کر بولی۔

اور پھر حسن نے اسے مار مار کر ادھ موا کر ڈالا۔ سارا محلہ اکٹھا ہو گیا۔ ٹیرس پر پودوں کو پانی دیتی آمنہ نے بھی سب کچھ سنا اور دیکھا۔ مگر ان کے گھر جانا مناسب نہیں سمجھا۔ ہاں آمنہ کا دل ملال سے ضرور بھر گیا۔ صبح صبح جو بد مزگی ہوئی تھی' اس نے آمنہ کے دل کو رنجیدہ کر دیا۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی سیڑھیاں اتر کر نیچے آگئی۔ بچوں کو اسکول بھیجنا تھا۔ زوار ذرا اطمینان سے ہی آفس جاتے تھے۔ ان کا اپنا گارمنٹس کا کاروبار تھا۔ ملازم شاپ کھول لیتا تھا زوار سہولت اور اطمینان سے آفس جایا کرتے تھے۔ تب تک ملازم کام سنبھال لیتے تھے۔ آمدنی اچھی ہونے کی بنا پر اس گھر کے مکین خوشحال زندگی بسر کر رہے تھے۔ آمنہ اور زوار کے دو بچے تھے' انا اور تیمور۔

آمنہ نے انا اور تیمور کو اسکول کے لیے تیار کیا۔ انہیں ناشتا کروایا۔ ان کے لنچ بکس تیار کیے۔ بچے اسکول جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ جبکہ زوار ابھی تک سو رہے تھے۔

"زوار! اٹھیے بچوں کو اسکول چھوڑ آئیں۔" آمنہ نے دھیرے سے ان کا کندھا ہلایا۔ زوار اتنی پرسکون نیند سو رہے تھے کہ آمنہ کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ ان کو اتنی گہری اور میٹھی نیند سے جگائے۔ مگر مجبوری تھی۔ بچوں کو اسکول جانا تھا۔ آمنہ نے دوبارہ جھجکتے ہوئے زوار کا کندھا ہلایا تو انہوں نے آنکھیں کھول کر قہر بھری نظروں سے اس کو دیکھا۔

"جاہل عورت! سوتے سے جگا دیا۔" یہ زوار کا معمول کا جملہ تھا۔ حالانکہ آمنہ ان کے آرام کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اب بھی آمنہ نے پلٹ کر کچھ نہیں کہا۔ چپ چاپ کچن میں چلی گئی۔

زوار کچھ دیر کسل مندی سے لیٹے جمائیاں لیتے رہے۔ پھر اٹھ کر منہ پر پانی کے چند چھپاکے مارے اور ہنستے مسکراتے بچوں کو اسکول چھوڑنے چلے گئے۔ بچوں کو دیکھ کر ان کا موڈ خود بخود ٹھیک ہوگیا۔

آمنہ کچن میں زوار کا ناشتا بنانے لگی۔ تب ہی باہر بائیک رکنے کی آواز آئی۔ آمنہ زوار کی بائیک کی آواز پہچانتی تھی۔ اس کے ہاتھ تیز چلنے لگے۔ زوار غصے کے بہت تیز تھے۔ ہر چیز انہیں "فوراً" اور من پسند چاہیے ہوتی تھی۔ آمنہ ان کی جلی کٹی بھی یوں سن لیتی تھی کہ جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ مگر جب ان کا غصہ اتر جاتا۔ تب وہ کوئی مناسب موقع اور زوار کا موڈ دیکھ کر ان کو ان کے بلاوجہ کے بدصورت رویے کا احساس ضرور دلا دیتی تھی۔ ایسے موقع پر وہ ہمیشہ مناسب اور نرم الفاظ کا چناؤ کرتی تھی۔ زوار کی بھی یہ خوبی تھی کہ وہ اپنی غلطی تسلیم کر لیتے تھے۔ مگر دوبارہ غصے پر کنٹرول کرنا پھر سے بھول جاتے تھے۔ آمنہ ان کی پسند کا کھانا بناتی۔ ہر کام زوار کی مرضی کے مطابق کرتی۔ سارا دن گھر کے کام کاج میں خود کو ہلکان کر دیتی۔ مگر زوار اس کی عزت نفس کو پل بھر میں روند کے رکھ دیتے تھے۔ اس کی انا، اس کی خودی اور نسوانیت کو اپنی مردانہ حاکمیت کی بھینٹ چڑھا دیتے، وہ سر جھکائے سنتی رہتی۔ جیسے وہ کوئی مجرم ہو، کوئی گناہ سرزد کر بیٹھی ہو۔

"لے آؤ ناشتا جلدی سے۔" زوار شاید نہا چکے تھے۔ انہوں نے کمرے ہی سے آواز لگائی۔

"جی لائی۔" وہ پھرتی سے ٹرے میں ناشتا لگانے لگی۔ دو پراٹھے، آملیٹ، پانی....

"آؤ بیٹھو آمنہ! اکٹھے ناشتا کرتے ہیں۔" زوار کا موڈ بہت خوش گوار لگ رہا تھا۔

آمنہ نے غور سے زوار کے مسکراتے چہرے کو دیکھا اور پراٹھے کے چھوٹے چھوٹے لقمے لینے لگی۔ پھر ایسے ہی اچھے موڈ میں وہ کپڑے بدل کر آفس چلے گئے۔ زوار ہر لحاظ سے بہترین تھے۔ بس غصے کی حالت میں عقل کا دامن چھوڑ دیتے تھے۔ آمنہ خود پر ضبط کرنا جانتی تھی۔ وہ سوچتی۔ سب کے طعنے تشنے سننے سے بہتر ہے کہ صرف شوہر کے ہی غصے کا نشانہ بن لیا جائے۔ شوہر کا گھر چھوڑ کر زمانے بھر کی ٹھوکریں کھانے سے زیادہ اچھا ہے کہ شوہر کی ہی کڑوی کسیلی سن لی جائیں۔

☼ ☼ ☼

زوار کے جانے کے بعد آمنہ نے پہلے برتن دھو کر کچن صاف کیا۔ پھر لنچ کے لیے دال چن کر بھگو دی۔ اس کا ارادہ دال گوشت بنانے کا تھا۔ دال بھگونے کے بعد وہ کچن کی سلیب صاف کرنے لگی۔ کام والی صفائی کر رہی تھی۔ آمنہ لہسن اور پیاز ایک ٹوکری میں لے کر باہر صحن میں رکھے تخت پر آ بیٹھی۔ تاکہ کام والی اطمینان سے اپنا کام نپٹا سکے۔

آمنہ سالن کے لیے پیاز کاٹ رہی تھی۔ جب زارا دروازہ دھکیلتی آندھی طوفان کی طرح اندر آئی تھی۔ آمنہ نے اسے دیکھا۔ زارا بھی آمنہ کو دیکھ چکی تھی۔ وہ ناک کی سیدھ میں چلتی آمنہ کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ آمنہ نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ تخت پر دونوں پاؤں رکھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی اور چہرہ ستا ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟" آمنہ کا اتنا کہنا تھا، زارا پھپھک پھپھک کر رو دی۔ آمنہ نے اسے چپ نہیں کروایا۔ رونے دیا۔

"بہت مارا مجھے اس خبیث نے.... یہ دیکھیں۔" زارا نے اپنے بازوؤں پر سے کپڑا اٹھایا۔ اس کے بازو نیلے ہو رہے تھے۔ آمنہ کے دل سے ٹیس سی اٹھی۔

"یہ بھی دیکھیں۔" اب وہ اپنے پیٹ اور ٹانگوں سے کپڑا ہٹا رہی تھی۔ اس کی ٹانگیں زخمی تھیں اور پیٹ پر بھی زخم تھے۔ کچھ زخموں سے خون بھی رس رہا تھا۔ آمنہ کے پورے بدن میں درد پھیلنے لگا۔ حسن نے بہت ظالمانہ طریقے سے انتہائی بے دردی اور سفاکی سے زارا کو مارا تھا۔

"چپ ہو جاؤ زارا! مت رو۔" آمنہ اسے اور کیا کہہ سکتی تھی۔ جبکہ وہ اپنے کانوں سے زارا کی زبان درازی سن چکی تھی۔

"کیوں نہ روؤں میں! جو کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ صرف رو ہی سکتا ہے۔" زارا اور بھی زور سے رونے لگی۔

کام والی کام کر چکی تھی۔ وہ آمنہ سے اجازت لے کر چلی گئی تو وہ زارا کو اندر ٹی وی لاؤنج میں لے آئی۔

"اللہ کرے اس کے ہاتھ ٹوٹ جائیں۔" زارا نے زور سے آنکھیں رگڑیں اور حسن کو بددعا دی۔

"ایسے نہیں کہتے زارا! شوہر کی عزت کرنا بیوی کا فرض ہے۔" آمنہ نے دھیمی آواز میں کہا۔

"ایسے ہی کہوں گی۔ میں ڈرتی تو نہیں اس سے۔" اس کا لہجہ بہت سا طیش سمیٹ لایا تھا۔

"مجازی خدا تو کچھ بھی کرے، کچھ بھی کہے، سننا پڑتا ہے۔ سارے مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔ زارا! کچھ شبنم اور کچھ شعلہ ہوتے ہیں۔ عورت کو گھر بنانے کے لیے صبر کی بھٹی میں جلنا پڑتا ہے۔" آمنہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

"ہاں جی! آپ کے میاں نے تو کبھی آپ کو اف تک نہیں کہا ناں۔ آپ تو ایسی باتیں ہی کریں گی.... ہونہہ۔" زارا نے طنزیہ کہا اور ایک کٹیلی نظر آمنہ پر ڈالی۔

"زارا! تم حسن سے بدکلامی مت کیا کرو۔ اسے ہاتھ اٹھانے پر اکسایا نہ کرو۔" آمنہ نے مدبرانہ انداز میں کہا۔

"آمنہ باجی! وہ ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا لیتا ہے۔" زارا کا لب و لہجہ ہنوز جتاتا ہوا سا تھا۔

"صبح اس نے کہا۔ مجھے رات کا سالن نہیں کھانا۔ میں نے کہا۔ اب یہ بچ گیا ہے تو کیا کروں اس کا.... بس اسی سے اتنا جھگڑا بڑھ گیا۔" زارا حتی المقدور کوشش کر رہی تھی کہ وہ آمنہ کے سامنے حسن کو غلط ثابت کر سکے۔

"زارا! تم کچھ اور بنا دیتیں۔"

"نوکر نہیں میں اس کی... کچھ اور بنا دیتیں۔" زارا نے تنک کر آمنہ کے لہجے کی نقل اتاری۔

آمنہ زیر لب مسکرائی اور زارا کے لیے چائے بنانے کچن میں چلی گئی۔ دونوں نے اکٹھے چائے پی۔ کچھ ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ تب تک زارا کا غصہ بھی کم ہو چکا تھا۔

"آپ بہت خوش قسمت ہیں آمنہ باجی! جو آپ کو زوار بھائی جیسے نرم مزاج اور ٹھنڈی طبیعت کے شوہر ملے۔ آج تک میں نے ان کو چلانا تو درکنار کبھی تیز آواز میں بولتے ہوئے بھی نہیں سنا۔" زارا زوار کی تعریف میں رطب اللسان تھی۔ آمنہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

"بس! اللہ کا شکر ہے۔" آمنہ نے کہا۔ زارا دل ہلکا کر کے چلی گئی۔ آمنہ کھانا بنانے لگی۔

"جب مرد غصے میں بولتا ہے تو عورت کو چپ ہو جانا چاہیے۔ مرد کی آواز تب گلی محلے میں گونجتی ہے پگلی! جب عورت مرد سے بھی بڑھ کر یا اس کے مقابلے پر زبان درازی کا مظاہرہ کرتی ہے۔" آمنہ نے چشم تصور سے زارا کو مخاطب کر کے کہا اور سالن میں ڈوئی ہلانے لگی۔

✲ ✲ ✲

شام کو بچوں کو ٹیوشن بھیجنے کے بعد آمنہ کے پاس ذرا فراغت تھی۔ جیسے ہی وہ فارغ ہو کر بیٹھی، زارا اور حسن کی لڑائی پورے سیاق و سباق کے ساتھ اس کے ذہن میں تازہ ہو گئی۔

آمنہ نے کچھ دیر کچھ سوچا اور پھر کمرے سے زخموں پر لگانے والی دوائی اٹھا لائی برآمدے سے باہر نکل کر بیرونی سیڑھیاں چڑھیں اور زارا کے گھر چلی آئی۔ زارا کے چھوٹے سے گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ آمنہ زارا کو آوازیں دیتی کمرے کے دروازے تک پہنچ گئی۔ کمرے کے باہر کھڑے ہو کر آمنہ نے پھر آواز دی۔ مگر اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔

"شاید زارا سو رہی ہے۔" آمنہ نے خود ہی قیاس کیا اور ہچکچاتے ہوئے دروازہ کھولا۔ کمرہ خالی تھا۔ آمنہ ... رہ گئی۔ وہ باہر صحن میں چلی آئی۔ ابھی وہ صحن کے وسط میں کھڑی کشمکش و پیچ کا شکار ہی تھی کہ اب کیا کرے۔ واپس گھر چلی جائے یا وہیں کچھ دیر ٹھہر کر زارا کا انتظار کرے۔ اچانک بیرونی سیڑھیوں پر کچھ شور سا اٹھا۔ مدھم نسوانی ہنسی اور چوڑیوں کی کھنک کی ملی جلی آوازیں بچوں کی چہکاریں، پھر مردانہ گمبھیر دلکش آواز بھی شام کے دھندلکے میں ابھری۔

آمنہ ذرا سا آگے ہوئی۔ تب ہی زارا ہاتھوں میں شاپرز پکڑے ہنستی مسکراتی گھر میں داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے بچے اور حسن بھی چہرے پر مسکراہٹ سجائے خوش اور مگن سے گھر میں آ رہے تھے۔ آمنہ کی آنکھوں کے سامنے کچھ گھنٹے پہلے روتی دھوتی، کوسنے اور بددعائیں دیتی زارا در آئی۔ مضمحل، نڈھال سی... مگر اب کھلکھلاتی، چہکتی زارا۔

"ارے! آپ ہمارے گھر۔" حسن اور زارا نے ایک ساتھ آمنہ کو دیکھا۔ وہ بہت کم زارا کے گھر آتی تھی۔ مگر زارا ایک دن میں نجانے کتنے چکر آمنہ کے گھر کے لگا لیتی تھی۔

"آپ اندر آئیں نا پلیز!" وہ دونوں میاں، بیوی بہت عزت سے آمنہ کو اندر آنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ آمنہ کو وہ دونوں خوش و خرم ایک ساتھ چلتے بہت اچھے لگ رہے تھے۔ آمنہ کے دل سے دعا نکلی کہ یہ دونوں یوں ہی مطمئن اور خوش رہیں، ایک دوسرے کی سنگت میں۔

زارا نے اپنی چادر اتار کر دور اچھال دی۔ آمنہ کو اس کی لاپروائی بری لگی۔ زارا بیڈ پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی اور شاپرز الٹ پلٹ کرنے لگی۔ حسن تب تک خود گلاس میں پانی ڈال کر آمنہ کے لیے لے آیا۔ زارا چہرے پر آسودہ سی مسکان سجائے آمنہ کو خریدی ہوئی چیزیں دکھاتی رہی۔ جبکہ حسن شرمندہ سا تھا۔

"آمنہ باجی! ہماری صلح ہو گئی ہے۔ ہم نے عہد کیا

ہے دوبارہ کبھی نہیں لڑیں گے۔" زارا نے بتایا۔ نئے سوٹ پا کر وہ بے انتہا خوش تھی اور جس عہد کا وہ برملا بتا رہی تھی۔ نجانے وہ اس پر عمل کرتی یا نہیں۔ مگر اس وقت وہ سب بھول بھال کر سوٹوں کے خوشنما رنگوں میں کھو کر رہ گئی تھی۔

"زارا! میاں، بیوی کی بھی بھلا کوئی لڑائی ہوتی ہے۔ ادھر نوک جھونک ہوئی، ادھر صلح۔" آمنہ نے بھی ماحول کو خوش گوار رکھنے کی کوشش کی۔ زارا چائے بنا لائی۔ ساتھ گرم گرم سموسے جو وہ بازار سے پیک کروا کر لائے تھے۔

کچھ دیر بیٹھ کر آمنہ گھر واپس آ گئی۔ جب وہ گئی تو دلگرفتہ تھی۔ مگر لوٹی تو لب مسکرا رہے تھے۔

"زعم میں بدکلامی کرتی عورت بھول جاتی ہے کہ شادی کے بعد عورت کا ہر راستہ شوہر سے شروع ہو کر شوہر تک ختم ہو جاتا ہے۔ پھر تماشا بننے اور بنانے سے کیا لاحاصل۔ جب کوئی اور راستہ ہی نہیں۔" آمنہ کے ذہن میں یہی بات گردش کر رہی تھی۔

✲ ✲ ✲

آج اتوار تھا اور زوار گھر پر تھے۔ گو کہ ان کا اپنا کاروبار تھا۔ مگر پھر بھی وہ اتوار کا دن گھر پر ہی گزارتے تھے۔ کچھ سو کر اور کچھ آمنہ اور بچوں سے گپ شپ لگا کر۔ ورنہ عام دنوں میں بچوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اس وقت بھی وہ ٹی وی کا ریموٹ ہاتھ میں پکڑے خبریں سن رہے تھے۔ بچے پاس ہی بیٹھے اپنے کھلونوں سے کھیل رہے تھے۔ آمنہ کچن میں گوبھی والے پراٹھے بنا رہی تھی۔ زوار گوبھی بھرے پراٹھے مکھن کے ساتھ بہت شوق سے کھاتے تھے۔

آمنہ ناشتے کے مکمل لوازمات کے ساتھ کچن سے نکلی۔ اس نے زوار کے سامنے ناشتا رکھا۔ زوار نے ایک نظر ناشتے پر ڈالی اور ان کی بھنویں تن گئیں۔ یہی وہ لمحہ تھا۔ جب زارا کسی کام سے ان کے دروازے پر آئی تھی۔

"ہر وقت مجھے گوبھی بھرے پراٹھے کھلا کھلا کر بادی کروا دو۔ ناکارہ اور نکما بنا دو۔ جوڑ دکھنے لگ جائیں گے۔" زوار کے الفاظ سے کہیں زیادہ ان کی ادائیگی میں تلخی اور ناگواری تھی۔ آمنہ سہم گئی۔ جبکہ زارا ہونٹوں پر ہاتھ رکھے وہیں جم گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہمہ وقت نرمی سے بات کرنے والے زوار بھائی ایسے پھنکار بھی سکتے ہیں۔

"میں کچھ اور..." آمنہ کی منمناہٹ... زوار کا بات کاٹنا... زارا کو ورطہ حیرت میں ڈبو گیا۔ وہ وہیں کھڑی رہی۔ پھر زور سے برتن پھینکنے کی آواز آئی۔ مگر آمنہ کی چپ برقرار تھی۔

"جاہل عورت! جو چیز پسند ہوتی ہے، وہ ہر وقت تو نہیں کھائی جا سکتی نا؟ تم بھی تو ماضی میں میری پسند تھیں۔ اب ہر وقت میرے سر پر سوار رہتی ہو... دفع ہو جاؤ میرے سامنے سے۔ ورنہ..." وہ اپنا آپ دکھا چکا تھا۔ آمنہ جامد چپ ہونٹوں پر سجائے بکھرے برتن اکٹھے کرتی رہی۔ پلٹ کر کچھ بھی نہ کہا۔ اس کی چپ زارا پر سوچ کے بہت سے در وا کرتی گئی۔

"اس وقت اگر آمنہ باجی میری طرح بدزبانی کرتیں تو زوار بھائی بھی حسن کی طرح ان کو دھنک کر رکھ دیتے۔ وہ اپنی معاملہ فہمی اور سمجھ داری سے عزت بنائے بیٹھی ہیں اور میں..."

کچھ عورتیں اپنی جذباتیت کے ہاتھوں بھرم کھو دیتی ہیں اور کچھ اپنی سمجھ داری کی بدولت اپنا بھرم بنا لیتی ہیں۔

زارا شکستہ قدموں سے واپس لوٹ گئی۔ وہ دل میں حسن سے چند روز پہلے کیا ہوا عہد نبھانے کا مصمم ارادہ کر چکی تھی۔

صائمہ اکرم چوہدری

دیمک زدہ محبت

سکینہ' جمیلہ مائی اور اللہ دتا کمہار کی اکلوتی بیٹی ہے' جو شادی کے سترہ سال بعد پیدا ہوئی اور چودہ برس کی عمر میں کبڑے پن کی بیماری میں مبتلا ہو گئی۔ پانچ سال لگاتار علاج کے بعد بیت المال والوں نے اسے سرکاری اسپتال میں پرائیویٹ کرا دلوا دیا۔ جہاں ڈاکٹر خاور اس کا مفت علاج کر رہے ہیں۔ عام سی شکل و صورت والی سکینہ' ڈاکٹر خاور کو پسند کرنے لگتی ہے۔ سکینہ کی آواز بہت خوب صورت ہے تاہم ڈاکٹر خاور اسے صرف اپنی مریضہ سمجھتے ہیں۔

ماہم منصور حسین ترین سائیکولوجسٹ ہے اور اپنا ذاتی کلینک چلاتی ہے۔ رامس علی اس کا مریض ہے۔ ماہم بلا کی حسن پرست ہے۔ اس کی دوست عائشہ قدرے کم صورت ہے۔ عائشہ کا بھائی موحد رحیم' ماہم کو پسند کرتا ہے مگر سوات آپریشن میں اس کی دونوں ٹانگیں ضائع ہو جانے کے سبب ماہم اس سے کھنچ جاتی ہے۔ ماہم کی بڑی بہن ثمن' عائشہ کے کزن انصر کی بیوی ہے اور ڈینٹسٹ ہے۔

رامس علی اپنے نفسیاتی عارضے کی وجہ سے خود کشی کی کوشش کرتا ہے لیکن بچ جاتا ہے۔ اس حادثے کے بعد رامس اور ماہم ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں۔

سکینہ کی خوب صورت آواز کی وجہ سے ڈاکٹر خاور اسے ایک نعت کمپٹیشن میں حصہ لینے کے لیے کہتے ہیں۔ ڈاکٹر خاور کی ساتھی ڈاکٹر زوبا کو ان کا سکینہ پر مہربان ہونا ناگوار گزرتا ہے۔ سکینہ اور ڈاکٹر خاور کو ان کی ناپسندیدگی کا علم ہے۔ جمیلہ مائی

ناولٹ

"وقتاً فوقتاً" سکینہ کو سمجھاتی رہتی ہیں۔ نعت کمپٹیشن میں سکینہ کی ملاقات موحد اور عائشہ سے ہوتی ہے۔ عائشہ کی پینٹنگز سے متاثر ہو کر علی اس میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔ مگر ماہم کو یہ بات اچھی نہیں لگتی۔

ثنائلہ زبیر ایک مشہور مصنفہ ہے۔ وہ اپنے فرضی کردار سکندر شاہ سے محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اسی سلسلے میں اس کی ملاقات ماہم سے ہوتی ہے۔ ثنائلہ اپنی ماں کا واحد سہارا ہے۔ اس کا اکلوتا بھائی دوسرے ملک میں اپنی فیملی کے ساتھ رہتا ہے اور انہیں "تقریباً" بھول ہی گیا ہے۔ معمولی ایکسیڈنٹ کے واقعے میں اس کی ملاقات موحد سے ہوتی ہے۔ وہ سکندر شاہ سے بے حد مماثلت رکھتا ہے۔ ثنائلہ اور موحد کی دوستی ہو جاتی ہے۔ مارننگ شو کی میزبانی کرنے سے منع کرنے پر ثمن انفر سے خلع کا دعوا دائر کر دیتی ہے۔ ایک اسپتال میں عائشہ ہملی کو ایک لڑکی کے ساتھ گائنی وارڈ میں دیکھ کر برگشتہ ہو جاتی ہے۔ ماہم، رامس کی ٹانگوں پر برص کے نشان دیکھ کر پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ اور "تقریباً" اس سے قطع تعلق کر لیتی ہے۔ رامس دلبرداشتہ ہو کر عائشہ سے رابطہ کرتا ہے۔ عائشہ اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ڈاکٹر خاور، زویا سکینہ کے معاملے میں خفا ہو جاتے ہیں اور انہیں واپس اپنے ملک جانے کا کہہ دیتے ہیں۔ عائشہ شاپنگ مال میں علی اور ماہم کو اکٹھے نہایت بے تکلفی سے باتیں کرتے دیکھ کر مزید ڈسٹرب ہو جاتی ہے۔

ساتویں قسط

"یہ ماہم کچھ عجیب سی نہیں ہو گئی۔" ماما نے اس کے تندور بنے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتے ہوئے اچانک کہا۔ وہ پچھلی رات سے سخت بخار میں جل رہی تھی۔ پتا نہیں اندر کون سا آگ کا الاؤ تھا جو سرد ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

"صبح مجھے گیٹ پر ملی تھی اور میں نے اسے تمہاری بیماری کا بھی بتایا، لیکن سارا دن ہو گیا اس نے ایک دفعہ جھانکنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔" ماما کا الجھن بھرا انداز پاس بیٹھے موحد کو سلگا گیا تب ہی وہ طنزیہ لہجے میں گویا ہوا۔

"وہ کون سا ڈاکٹر لگی ہوئی ہے جو آپ اسے صبح سے یاد کیے جا رہی ہیں۔" موحد نے گود میں رکھا اخبار ایک دفعہ پھر اٹھا لیا۔ اس کی تیوری کے گہرے بل اس کے خراب موڈ کی نشان دہی کر رہے تھے۔ عائشہ کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے وہ آج فیکٹری بھی نہیں گیا تھا۔

"پھر بھی اتنی اچھی دوست ہے وہ عائشہ کی۔"

ماما کی سادگی پر وہ بری طرح چڑا اور ہاتھ میں پکڑا اخبار عائشہ کے بیڈ پر پھینک دیا۔

"اب ایسی کون سی اہم شخصیت ہے وہ جس کی تیمارداری نہ کرنے کا دکھ آپ کو کھائے جا رہا ہے۔" اس کے تیز بولنے پر ماما چپ کر گئیں۔

"آپ دونوں نے اگر لڑنا ہے تو پلیز، میرے سرہانے بیٹھ کر یہ کام مت سرانجام دیں۔" عائشہ کی نقاہت زدہ آواز میں بے زاری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر ماما اور موحد کو دیکھا جو اب خفگی سے قدرے رخ موڑے بیٹھے تھے۔

"میں نے تو بس ایک بات کی تھی۔"

"ماما! پلیز لیو دس ٹاپک ناؤ۔" موحد نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے تو وہ شکایتی نگاہوں سے عائشہ کو تکنے لگیں۔ کمرے میں چھنے والی خاموشی نے بڑی عجلت میں اپنا ڈیرہ جما لیا۔

"میں تمہارے لیے دلیہ بنواتی ہوں۔" ماما ناراضی کے اظہار کے طور پر کچن میں چلی گئیں۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے ماہم کا۔" ماما کے باہر نکلتے ہی موحد نے عائشہ کو مخاطب کیا۔ "اس قدر فضول اور بے تکی باتیں کرنے لگی ہے کہ دماغ کھولنے لگتا ہے۔" عائشہ نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

اس کا تو اپنا دماغ بھی کل سے ماؤف تھا۔ رہ رہ کر وہ سین یاد آ رہا تھا جس میں ماہم نے ہنستے ہوئے علی کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔

"عائشہ....." موحد نے فکرمندی سے اس کا ماتھا چھوا۔ حدت پہلے کی نسبت خاصی کم ہو گئی تھی۔

"بیٹھے بٹھائے تم نے کیسے طبیعت خراب کر لی، ابھی کل صبح تک تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھیں۔" اس کا لہجہ نرم ہوا۔

"پتا نہیں۔" وہ بمشکل گویا ہوئی۔ "مجھے خود نہیں پتا۔" اس نے نقاہت سے آنکھیں بند کر لیں۔ ویسے بھی آنسو آج کل ہر وقت نکلنے کو بے تاب رہتے تھے۔

"عائشہ! کوئی اور مسئلہ تو نہیں۔" موحد اس کی کمزور اور زرد شکل دیکھ کر ٹھٹک سا گیا۔ اسے کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا تھا۔

"کچھ نہیں ہے بھائی! پلیز مجھے تنگ نہ کریں۔" اس نے اتنی لجاجت سے کہا کہ موحد کے ہونٹوں پر ایک دم چپ لگ گئی۔ "مجھے سونے دیں۔" اس نے روٹھے پن سے کہا تو وہ فوراً اپنی وہیل چیئر سمیت باہر نکل آیا۔

"ماما! عائشہ کے کمرے میں مت جائیے گا، وہ سو رہی ہے۔" اس نے سنجیدگی سے ماما سے کہا جو دلیے کا پیالہ اٹھائے اس کے کمرے کی طرف جا رہی تھیں۔

"اتنی جلدی۔" ماما کو موحد کا لہجہ غیر معمولی سنجیدہ لگا تو وہ وہیں کھڑی رہ گئیں۔

"ماما! عائشہ کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے کیا؟" ماما نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بری طرح الجھا ہوا تھا۔

"پتا نہیں بیٹا، لیکن کافی دنوں سے وہ مجھے کچھ ٹینس سی لگ رہی ہے۔" ماما کی بات پر ایک گہری سوچ کا تاثر اس کے چہرے پر ابھرا۔ اگلے ہی لمحے وہ دونوں لاؤنج میں بیٹھے اپنی ساری ناراضی بھلائے عائشہ کے متعلق گفت و شنید میں مگن ہو گئے۔

جمیلہ مائی نے پنڈ پہنچتے ہی اپنے پورے گھر کو مٹی اور گارے کا لیپ کر کے چمکا کر رکھ دیا تھا۔ عیدالفطر کا تیسرا دن تھا اور صبح سے گھر میں مہمانوں کی آمد و رفت تھی۔ آدھا پنڈ تو صرف سکینہ کو دیکھنے کے لیے ذوق و شوق سے آ رہا تھا۔ اکثر لوگ تو یہ کام روزانہ باقاعدگی سے کر رہے تھے۔

آج صبح سے کافی گرمی تھی۔ اللہ دتا نے پورے صحن میں چھڑکاؤ کر کے چارپائیاں بچھا دی تھیں۔ جمیلہ مائی نے اندر سے کھیس اور گاؤ تکیے لا کر رکھ دیے۔ بان کی چارپائی پر سکینہ انتہائی بے زاری سے نیم دراز تھی۔

"اماں! ہم اسلام آباد واپس کب جائیں گے۔" سکینہ نے مٹی کی پرات میں ہل ہل کر آٹا گوندھتی جمیلہ مائی کو مخاطب کیا۔

"دھی رانی اتنی جلدی کیوں؟" پنڈ آ کر جملہ مائی کا موڈ خاصا خوشگوار ہو گیا تھا۔ ان کی اور سکینہ کی روزانہ ہونے والی جھڑپوں میں بھی تعطل آ گیا تھا۔

"یہ اتنی جلدی ہے کیا۔" سکینہ نے اکتاہٹ سے کہا۔ "پورے دس دن ہو گئے ہیں ہمیں۔ اتنی سخت گرمی ہے یہاں۔" اس کی نازک مزاجی پر جمیلہ مائی بے ساختہ ہنس پڑیں۔

"آ لینے دے تیرے ابے کو، بتاؤں گی کہ تیری دھی شہرن ہو گئی ہے۔"

"بات شہری ہونے کی نہیں ہے اماں۔" سکینہ نے اکتاہٹ سے سبزی کی ٹوکری پر چڑھے مرغوں کی فوج کو دیکھا۔ جنہوں نے ٹھونگیں مار کر کچھ سبزی نیچے زمین پر گرا دی تھی۔

"پھر کیا مسئلہ ہے؟" جمیلہ مائی نے نلکا چلا کر پانی نکالا اور ہاتھ دھونے لگی۔

"یہ جو ہر روز جلوس مجھے دیکھنے آ جاتا ہے نا مجھے اس سے کوفت ہوتی ہے۔" سکینہ نے اصل بات اگل ہی دی۔ اماں کا نلکے کی ہتھی پر جما ہاتھ وہیں کا وہیں رہ گیا۔

"نی سکینہ سارے پنڈ کے لوگ تجھ سے پیار کرتے ہیں اور تیرا آگے سے نخرا ہی نہیں ختم ہو رہا۔" اماں اپنے ململ کے دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتی ہوئی چارپائی پر آن بیٹھیں۔

"کوئی محبت وحبت نہیں کرتے وہ۔" سکینہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ "مذاق اڑاتے ہیں میرا، ایک دوسرے کو کہنیاں مار مار کر اشارے کرتے ہیں جو تجھے نظر نہیں آتے۔" سکینہ پھٹ پڑی جب کہ جمیلہ مائی بھی کافی لمحوں تک بول ہی نہیں پائیں۔

"ایویں وہم ہے تیرا۔" جمیلہ مائی نے نظریں چرائیں اور اٹھ کر چولہا جلانے لگیں۔

"جمیلہ آپا! کیا بنا رہی ہو رات کے کھانے میں۔" صحن کی چھوٹی دیوار کے دوسری طرف ہمسائی کا چہرہ نمودار ہوا۔ سکینہ نے اپنی آنکھوں پر دوپٹا رکھ لیا۔

"کچھ نہیں شریفاں! دیسی مرغا بنایا تھا سکینہ کے لیے اس کو دیسی ککڑ کا شوربا بہت پسند ہے تو سنا؟"

"خیر ہے آپا! بڑے دیسی مرغے کھلا کر اپنی دھی کی جان بنا رہی ہو۔" شریفاں کی بات پر اماں نے مسکراتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی لکڑی چولہے میں لگائی اور پھونکیں مارنے لگیں۔

"یہ اپنی سکینہ آج شام ڈھلنے سے پہلے ہی سو گئی۔" شریفاں نے تجسس بھرے انداز سے پوچھا تو اماں نے چونک کر سکینہ کو دیکھا جو سونے کی بہت عمدہ اداکاری کر رہی تھی۔

"ہاں بس نمانی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔" جمیلہ مائی نے یونہی بہانہ کیا۔

"اے آپا۔" ہمسائی نے تھوڑا سا رازدارانہ انداز اختیار کیا۔ "کیا یہ بات درست ہے کہ تو اس دفعہ سکینہ کا شگن کرنے آئی ہے؟"

"تجھے کس نے کہا؟" اماں نے چولہے میں پھونکیں مارنے کا مشغلہ عارضی طور پر ملتوی کیا اور کن اکھیوں سے سکینہ کو دیکھا جو بالکل ساکت لیٹی تھی۔

"اے مجھے کس نے کہنا تھا۔" شریفاں نے ناک پر انگلی رکھی۔ "پورے پنڈ میں رولا پڑا ہوا ہے۔" اپنی ہمسائی کے منہ سے یہ بات سن کر جمیلہ مائی کو بہت عجیب لگا۔

"اور پتا ہے، جاجی کی بے بے تو پنڈ کے ہر گھر میں جا کر رونا رو رہی ہے۔" شریفاں کا لہجہ کچھ دھیما ہوا۔ جمیلہ مائی گھبرا کر دیوار کے پاس گئیں۔ اتنا تو اسے بھی پتا تھا کہ اس کی دیورانی کا مزاج خاصا اکھڑا سا ہے۔ سکینہ کو بھی وہ بس کھڑے کھڑے دیکھنے آئی تھی۔

"کیا کہہ رہی ہے وہ۔" جمیلہ مائی نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"یہی کہ پا اللہ دتا نے اس کے میاں پر زور ڈال کے اس کے پتر کو زبردستی قربانی کا بکرا بنا دیا ہے۔ ورنہ سکینہ کبڑی سے کون شادی کرتا۔" شریفاں بی بی کے منہ سے نکلنے والی تلخ بات پر جمیلہ مائی کے ساتھ ساتھ سکینہ کے دل کو بھی گھونسا سا لگا۔

"ہر کسی کے گھر میں کہتی ہے کہ جمیلہ نے اس کے جاجی کو تعویذ گھول کے پلا دیے ہیں تب ہی اسے سکینہ کا کب نظر نہیں آتا۔" شریفاں بی بی میں بھی شاید شرافت نام کو نہیں تھی تب ہی وہ بے تکلفی سے اتنے زہریلے جملے جوں کے توں ماں بیٹی کے سامنے کہے جا رہی تھی۔

"میری سکینہ ان شاء اللہ آپریشن کے بعد بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جائے گی۔" جمیلہ مائی ہمسائی کی ساری باتوں کے جواب میں بس اتنا ہی کہہ سکیں۔

"تو آپا! پھر سکینہ کے شگن بھی آپریشن کے بعد کر لینا، ہتھیلی پر سرسوں کیوں جما رہی ہو۔" ہمسائی نے چسکہ لینے کے انداز میں کہا تو جمیلہ مائی نے بھی دل پر جبر رکھ کر کے کہہ دیا۔ "ابھی تو خود ہمارے گھر میں کچی سی بات تھی۔ پتا نہیں پنڈ والوں نے کہاں سے پوری داستان گھڑ لی۔"

"خیر آپا! اب داستان تو نہ کہو۔" وہ منہ پر دوپٹا رکھ کر ہنسی۔ "کوئی نہ کوئی تو جاجی والی بات میں سچائی ہو گی۔ ایویں تو نہیں وہ شودا بھاگ بھاگ کر اسپتال جاتا۔"

"دیکھ شریفاں! بیٹیوں والی ماؤں کو ایسی باتیں کرنا زیب نہیں دیتا۔" جمیلہ مائی دوبارہ اپنی پیڑھی پر آ کر بیٹھ گئیں۔ ان کا متحمل انداز ان کی ہمسائی کو ایک آنکھ نہیں بھایا۔

"لو میں نے ایسا کیا کہہ دیا۔" اس نے برا سا منہ بنایا۔ "بھئی سچ پوچھو تو مجھے لگی لپٹی آتی نہیں، جو سچ تھا کہہ دیا۔ ہم سے جاجی کی بے بے کا رونا نہیں دیکھا جاتا، ہم بھی اولاد والے ہیں۔" شریفاں نے اپنی بات مکمل کر کے فوراً دیوار سے سر نیچے کر لیا۔ جمیلہ مائی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اماں! اب سکون آ گیا۔" سکینہ کے لہجے کی کڑواہٹ ان کی سماعتوں تک پہنچی تو دل اور زیادہ غمگین ہو گیا۔

"اللہ ہدایت دے، ہم سب کو۔" جمیلہ مائی نے دل ہی دل میں دعا کرتے ہوئے گیلی لکڑیوں کو اور قوت سے پھونکیں مارنا شروع کر دیں۔

☆ ☆ ☆

"ہوں... لگتا ہے کہ رائٹر صاحبہ کو اپنے گمشدہ لفظ واپس مل گئے ہیں؟" نابیہ دبے قدموں اس کے پیچھے آن کھڑی ہوئی تھی۔ کچھ دیر اس کے لکھے پیراگراف کو پڑھنے کے بعد اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ آج ثنائیہ کی طبیعت لکھنے پر آمادہ ہے۔ وہ لکھنے میں اس قدر محو تھی کہ اسے نابیہ کی موجودگی کا احساس تک نہیں ہوا۔

"اوہ۔" وہ چونکی اور بے ساختہ مڑ کر نابیہ کو دیکھا جو اپنے چہرے پر خوشگوار مسکراہٹ سجائے عین پیچھے کھڑی تھی۔

"نابیہ اللہ پاک نے بہت کرم کیا مجھ پر۔" ثنائلہ نے ایک پرسکون سانس فضا میں خارج کی۔ "یقین مانو، دماغ میں خیالات کا ہجوم ہے اور لفظ خود بخود میرے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔"

"ہوں۔" اس کی بات سنتے ہوئے نابیہ مسکرا کر سامنے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"اس کا مطلب ہے کہ تمہارے قارئین کو ایک

دفعہ پھر تمہاری بہترین تحریریں پڑھنے کو ملیں گی۔" نابیہ کی بات پر ثنائلہ کھل کر مسکرائی۔

"پتا نہیں۔ ہر لکھاری کی طرح میری بھی یہی کوشش ہوتی ہے کہ میرا قاری مجھ سے مایوس نہ ہو۔" ثنائلہ نے انکساری سے جواب دیا۔

"کیا حال ہے تمہارے ہیرو کا؟" نابیہ کی بات پر ثنائلہ کے چہرے پر کئی خوب صورت رنگ بکھرے۔

"ہیرو صاحب ماشاء اللہ بالکل ٹھیک ٹھاک اپنے بزنس میں مصروف ہیں۔" اس نے مختصراً" بتایا۔

"کب بھیجیں گے موصوف اپنے گھر والوں کو؟" نابیہ نے تجسس سے پوچھا۔

"پتا نہیں یار! ابھی اس موضوع پر بات نہیں ہوئی۔" ثنائلہ نے سادگی سے جواب دیا۔

"لو یہ کیا بات ہوئی بھلا" نابیہ نے برا منہ بنایا۔ "آخر تم لوگ گھنٹوں کیا باتیں کرتے ہو؟"

"اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔" ثنائلہ نے شوخی سے اسے ٹالا اور وہ ٹل بھی گئی۔

"تم ماہم منصور کے پاس دوبارہ نہیں گئیں؟" نابیہ کو اچانک یاد آیا۔

"نہیں یار! ٹائم ہی نہیں ملا۔ اس کی اسسٹنٹ کا بھی درمیان میں ایک دو دفعہ فون آیا تھا۔" ثنائلہ ایک دم شرمندہ ہوئی۔ "کل ان شاء اللہ جاؤں گی' امی کو اکیلے چھوڑ کر جانا بھی تو ایک مسئلہ ہے۔" ثنائلہ نے اپنے مسئلہ بتایا تو نابینہ نے چٹکی بجا کر حل بھی نکال دیا۔

"کوئی مسئلہ نہیں' میں خالہ کے پاس رہ جاؤں گی۔"

"تھینک یو یار۔" اس نے ممنون لہجے میں کہا تو نابیہ نے فوراً" انگلی اٹھا کر وارننگ دی۔

"نو سوری' نو تھینکس' ان فرینڈ شپ۔"

☼ ☼ ☼

"بی بی جی! آپ کو بیگم صاحبہ ڈرائنگ روم میں بلا رہی ہیں۔"

"کیوں۔" عائشہ نے بے زاری سے پوچھا۔

"جی کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔" ملازمہ نے اطلاع دے کر سائیڈ میز سے ناشتے کے برتن اٹھانے شروع کر دیے۔ وہ پچھلے ایک ہفتے سے اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔

اسے لوگوں سے وحشت ہونے لگی تھی۔ اپنا سیل فون تک اس نے بند کر رکھا تھا۔ منہ پر دو چار چھینٹے مار کر اس نے بالوں میں بے دلی سے برش پھیرا اور چپل گھسیٹتی ہوئی ڈرائنگ روم کی طرف چل دی۔

اندر پہلا قدم رکھتے ہی اسے شاک لگا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ بے یقینی اور حیرت کا ایک سمندر اس کے چہرے پر ٹھاٹھیں مارتا ہوا صاف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سامنے صوفے پر بڑی خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ بیٹھے رامس علی کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔ اس کے بالکل پاس موحد اپنی وہیل چیئر پر بیٹھا ہوا تھا۔

"ارے عائشہ! تم نے کبھی رامس کا گھر میں ذکر ہی نہیں کیا۔" ماما کی خوش اخلاقی آج عروج پر تھی۔

"تمہارا سیل فون بند ہونے کی وجہ سے بے چارہ پریشانی میں تمہیں ڈھونڈتا ہوا یہاں آن پہنچا۔" لگتا تھا ماما رامس علی سے خوب متاثر ہو چکی تھیں۔ اس لیے ان کے لبوں پر مسکراہٹ اور لہجے میں شیرینی بھری تھی۔

"کیسی ہیں آپ؟" رامس اس کی حیرت سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔

"میں اب ٹھیک ہوں۔" عائشہ خود کو سنبھال کر اب سنگل صوفے پر آن بیٹھی۔

"تم لوگ بیٹھو' میں رامس بیٹے کے لیے اچھی سی چائے کا بندوبست کرواتی ہوں۔" ماما نے بڑے عجلت بھرے انداز میں کہا۔

"آو نا یار! کسی دن میرے آفس' بیٹھ کر گپ شپ کریں گے۔" موحد کے بے تکلفانہ انداز پر عائشہ کو خوشگوار حیرت ہوئی۔

"ہاں ضرور۔" رامس کھل کر مسکرایا۔

"یہ تم کیا میری جاسوسی کرتے ہوئے گھر تک آ پہنچے

" عائشہ نے ہلکا پھلکا سا طنز کیا۔

"اف بہت مشکل کام تھا یہ۔" وہ ہنسا۔ "آپ تو سیل بند کر کے آرام سے بیٹھ گئی تھیں۔"

"پھر' تم نے کیا ہوائی مخلوق سے مدد لی۔" عائشہ کے طنز پر وہ قہقہہ لگا کر ہنسا جب کہ موحد کے چہرے پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"نہیں۔" اس نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا۔ "وہ تو کل مجھے جناح سپر میں موحد بھائی مل گئے تو میں نے فوراً" آپ کا پوچھا ان سے پتا چلا کہ آپ ہفتہ بیماری منا رہی ہیں۔" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں اصل بات بتائی تو عائشہ نے پرسکون سانس لیا۔

"بھئی' مجھے تو ایک میٹنگ کے لیے نکلنا ہے' اس لیے رامس! تم سے پھر ان شاء اللہ تفصیلی ملاقات ہوگی۔" موحد کے دوستانہ انداز پر رامس مسکرایا۔

"جی ضرور' میں ان شاء اللہ آپ کے آفس حاضر ہوں گا۔" رامس نے اسے یقین دہانی کروائی تو وہ الوداعی الفاظ کے ساتھ فوراً" کمرے سے نکل گیا۔

"آپ نے اس دن میرے ساتھ خوب ڈراما کیا۔" رامس کی بات پر عائشہ کے زخم پھر سے ہرے ہو گئے۔

"وہ اس دن۔" عائشہ چونکی۔ "ایک تو سیل کی بیٹری ڈاؤن ہو گئی اور دوسرے راستے میں گاڑی خراب ہو گئی تھی۔" عائشہ کو بروقت بہانہ مل گیا۔

"اف۔" رامس نے مصنوعی صدمے سے اپنا سر پکڑ لیا۔

"کیا ہوا؟" عائشہ کو اس کے چہرے کے تاثرات سے کچھ غیر معمولی سا احساس ہوا۔

"جھوٹ بولنا بھی ایک آرٹ ہے اور اس کے لیے کسی ڈگری کی ضرورت نہیں' لیکن افسوس کہ آپ جیسی اچھی لڑکیوں کو یہ ہنر سیکھنے سے بھی نہیں آسکتا۔" رامس نے شرارت بھرے لہجے میں کہا تو عائشہ کو کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا جو کہہ رہا تھا۔

"پارکنگ میں آپ کی گاڑی کے ساتھ ہی تو میں اپنی گاڑی پارک کر کے آیا تھا۔ سارے فلور آپ کی تلاش میں چھان کر پارکنگ میں پہنچا تو گاڑی غائب ہو چکی تھی۔" اس کی بات پر عائشہ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ تو غنیمت رہی کہ ماما چائے کی ٹرالی کے ساتھ آگئیں۔

"بھئی رامس! کسی دن اپنی ماما کو لے کر آو نا ہمارے ہاں۔" ماما کی بات پر عائشہ نے کوفت سے پہلو بدلا۔ ایک تو رامس کی شوخی سے بھرپور نظریں اور دوسرے ماما کی غلط فہمی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کوئی منتر پڑھ کر اس منظر سے غائب ہو جائے۔

"جی آنٹی! ضرور' ان شاء اللہ۔" رامس نے اپنی پلیٹ میں پزا کا ایک بڑا ٹکڑا ڈالتے ہوئے بے تکلفی سے کہا۔

"اور بزنس کیسا چل رہا ہے آپ کا؟" ماما نے اپنی معلومات میں اضافے کے لیے انٹرویو شروع کر دیا۔ جب کہ وہ عائشہ کی بے زاری محسوس کر کے محض اسے تنگ کرنے کے لیے ماما کے سوالات کے جواب بڑی تفصیل سے دے رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہوں۔" ماہم نے اپنے سامنے خوش باش بیٹھی مصنفہ کو دلچسپی سے دیکھا جو پچھلے ایک گھنٹے سے اسے اپنی اسٹوری تفصیل سے سنا رہی تھی۔

"یقین مانو' ثنائلہ! یہ میری زندگی کا ایک منفرد کیس ضرور ہے لیکن اتنا زیادہ حیران کن بھی نہیں۔" ماہم نے بال پوائنٹ اپنی تھوڑی پر جماتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

"لیکن میم! یہ سب کیا تھا؟" ثنائلہ ابھی تک حیرت کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی۔ "جو چیزیں میری تخیل میں تھیں وہ میرے سامنے مجسم حقیقت بن کر کیسے آگئیں؟"

"دیکھو ثنائلہ زندگی میں زندگی سے زیادہ حیران کن چیز کوئی نہیں اور انسانی ذہن کو اللہ تعالیٰ نے بہت وسعت عطا کی ہے۔ بلاشبہ تمہارا تخیل بہت مضبوط تھا لیکن جیسا تم نے سوچا' زندگی میں ویسا ہی ہوا۔ اسے ہم ایک حسین اتفاق سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔" ماہم

نے بڑی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ اسے تسلی دی۔

"ہاں ایک اور بات۔" ماہم کو اچانک یاد آیا' ثنائلہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ہم اپنے مذہبی نقطہ نگاہ سے دیکھیں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کہتا ہے کہ تم مجھ سے جیسا گمان رکھو گے' میں تمہیں ویسا ہی دوں گا۔" ماہم کی دلیل سے اب ثنائلہ متاثر ہوئی۔

"پس' تمہیں اللہ پاک پر یقین تھا اور اللہ نے تمہارے یقین کو مضبوطی بخشی' اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔" ماہم نے مزید اسے سمجھایا تو وہ اب کھل کر مسکرائی۔

"آپ کی باتوں سے لگتا ہے کہ آپ بہت اچھی سائیکولوجسٹ ہی نہیں' بہت عمدہ انسان بھی ہیں۔" ثنائلہ نے فوراً" تعریف کی اس کی اس بات پر ماہم تھوڑا سا سنجیدہ ہوئی۔

"دیکھیں ثنائلہ! لوگوں کو پرکھنے کے لیے ان کے پروفیشن کو ایک پیمانہ بنانا بالکل غلط بات ہے۔"

"کیا مطلب؟" ثنائلہ نے الجھن بھرے انداز میں دیکھا۔

"آپ نے زندگی میں کبھی مشاہدہ کیا ہوگا کہ کبھی کبھی اپنے شعبے میں بے پناہ کامیاب لوگ اپنی ذاتی زندگی میں بالکل ایک ناکام زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے چیزوں کو مکس اپ نہیں کرنا چاہیے۔ ان کو ان ہی کے رنگ میں سمجھیں تو زندگی میں آپ کی دوسروں سے وابستہ توقعات کے پل کبھی نہیں گرتے۔" ماہم نے بہت پتے کی بات اسے بتائی تھی۔

"ہوں۔" ثنائلہ نے سر ہلایا۔

"کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ مجھے بہت اچھی سائیکولوجسٹ سمجھتی ہیں' ہیں نا۔" ماہم نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا تو اس نے جھٹ میں اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہو سکتا ہے کہ میری ذاتی زندگی میں جھانک کر آپ کو بہت مایوسی ہو۔" ماہم کی بات نے اسے الجھن میں مبتلا کیا۔

"ضروری نہیں کہ ہر ڈاکٹر دکھی انسانیت کا درد سمجھتا ہو اور ہر ڈاکو ظالم ہی ہو' سمجھ میں آئی بات۔" ماہم نے مزید آسان طریقے میں سمجھایا۔

"ویسے ملوا دینا' اپنے سکندر شاہ کو ہم سے بھی۔" ماہم نے اسے چھیڑنے کی غرض سے کہا۔

"جی ضرور۔" ثنائلہ کے چہرے پر سرخی دوڑی۔

"ویسے' اسے بھی یہ اسٹوری سنائی کہ نہیں؟" ماہم نے اشتیاق بھرے انداز سے دریافت کیا۔

"جی سنائی تھی۔" ثنائلہ نے مسکرا کر جواب دیا۔ "میرے جذبے کی بھرپور طاقت نے ہی تو اس کے دل کے سارے دروازے کھولے ہیں۔"

"ہوں' بیسٹ آف لک۔" ماہم نے اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔

"تھینکس' لیکن میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔" ثنائلہ نے خلوص دل سے کہا۔

"اور میں بھی۔" ماہم نے بھی الوداعی مسکراہٹ کے ساتھ اسے یقین دلایا۔

☼ ☼ ☼

"قسم سے اماں! اپنے اسپتال والے کمرے میں آکر تو مجھے سکون آگیا ہے۔" سکینہ نے یہ فقرہ صبح سے کوئی چوتھی دفعہ بولا تھا۔ ہر دفعہ جمیلہ مائی اس کی بات پر مسکرا دیتیں۔

"یہاں کم از کم' ہر روز چسکے لے کر میری داستان سننے والے لوگ تو نہیں آتے نا۔" سکینہ کی بات پر جمیلہ مائی کا دل دکھا۔

"بس پتر! دعا کیا کر کہ اللہ پاک ایسی آزمائش میں کسی کو ڈالے ہی نا' جو دوسروں کے لیے تفریح کا سامان بنے۔" جمیلہ مائی نے تسبیح کے دانے گراتے ہوئے سکینہ کو آج کا پہلا سبق پڑھایا۔

"بس اماں! لوگ سمجھتے ہیں کہ جس آزمائش میں سے کوئی دوسرا گزر رہا ہے' وہ ان پر کبھی آ ہی نہیں سکتی۔" سکینہ نے اپنی کتابوں کو جھاڑتے ہوئے رنج بھرے لہجے میں کہا۔

"اللہ سوہنا سب پر اپنا کرم ہی رکھے۔" جمیلہ مائی نے اٹھ کر کھڑکی کھولی تو ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اندر کے ماحول کو تبدیل کر گیا۔

"شکر ہے سکینہ! تم واپس آگئیں' یقین کرو' پورا وارڈ ہی مجھے ویران لگ رہا تھا۔" سسٹر ماریہ جو ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ سکینہ کو دیکھ کر بے ساختہ خوشی کا اظہار کرنے لگی۔ اس کی بات پر سکینہ بھی مسکرا دی۔

"میں نے خود آپ سب لوگوں کو بہت یاد کیا۔" سکینہ نے بھی فوراً" بتایا۔

"ڈاکٹر خاور تو اکثر ہی تمہیں یاد کرتے تھے۔" نرس نے ڈرپ کا کینولا پاس کرتے ہوئے سرسری انداز سے بتایا تو سکینہ کا دل ایک عجیب سی لے پر دھڑک اٹھا۔

"ہاں اور عید والے دن' وہ دونوں بہن بھائی بھی تم سے ملنے آئے تھے۔" سسٹر ماریہ کی اطلاع پر جمیلہ مائی اور سکینہ دونوں چونکیں۔

"کون؟" جمیلہ مائی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"وہ ہی موحد اور عائشہ۔" سسٹر ماریہ نے روانی میں بتایا۔ دونوں بہن بھائیوں کا بہت بڑا دل ہے۔ عید والے دن یہاں موجود سب مریضوں کے لیے پھل فروٹ اور سارے نچلے عملے کو عیدی دے کر گئے تھے۔" سسٹر ماریہ ان سے خوب متاثر ہو چکی تھی۔ اس لیے کھل کر تعریفی پروگرام جاری تھا۔

"اللہ پاک ان کو اس چیز کا اجر دے۔" جمیلہ مائی نے دل سے دعا کی۔

"ہاں جی اللہ تعالیٰ نے دیا تو سب کو ہی ہے لیکن دوسروں پر خرچ کرنے کی توفیق کسی کسی کو ہی دی ہے۔" سسٹر ماریہ نے افسردگی سے کہا۔

"بس بیٹا! اللہ کا مال ہے۔ جتنا اللہ کے بندوں پر خرچ کرو وہ دوگنا کر کے واپس کرتا ہے۔ اتنی سی بات سمجھ میں آجائے تو کوئی اپنی تجوریوں کو تالے لگا کر بے سکون نہ ہو۔" جمیلہ مائی وضو کرنے کے لیے واش روم کی طرف چل پڑیں۔ ان کے اندر جاتے ہی سسٹر ماریہ سرگوشی کے انداز سے بولی۔

"سکینہ! وہ بہن بھائی تمہارے لیے بھی تحفے دے کر گئے ہیں' میری الماری میں پڑے ہیں۔"

"میرے لیے۔" سکینہ تھوڑا سا خوف زدہ ہوئی۔

"تمہیں لا دوں گی' تم اماں کو نہ بتانا۔" سسٹر ماریہ نے اسے تجویز دی۔

"نہیں سسٹر! آپ اماں کے سامنے دے دینا' اگر اسے اچھا لگا تو ٹھیک ورنہ خود رکھ لینا۔" سکینہ کو اماں سے چھپا کر چیز لینا اچھا نہیں لگا۔ اس لیے جھٹ سے کہہ دیا۔

"واہ سکینہ! تم تو اپنے پنڈ سے اس دفعہ بڑی سمجھ دار ہو کر آئی ہو۔" سسٹر ماریہ نے کھلے دل سے تعریف کی۔

"سارا سارا دن جامن کے درخت کے نیچے لیٹی ابے کے لمبے لمبے لیکچر جو سنتی تھی۔" سکینہ نے ہنس کر بتایا۔

"اچھا' کیا کہتا تھا تمہارا ابا۔" سسٹر ماریہ اس کی ڈرپ سیٹ کر کے وہیں بیٹھ گئی۔

"ابا کہتا تھا کہ سکینہ! یہ بیماری تجھے ہر حال میں جھیلنی ہی ہے۔ اللہ پاک کا شکر ادا کر کے اس سے مدد مانگے گی تو تجھے وہ آسانی دے گا' لیکن اگر رولا ڈالے گی تو یاد رکھ' رب کی ہلکی سی ناراضی کا بوجھ بھی برداشت کرنا' بندے کی بس کی بات نہیں۔" سکینہ نے سنجیدگی سے بتایا۔

"بات تو تمہارے ابے نے پورے سولہ آنے درست کہی ہے۔" سسٹر ماریہ نے فوراً" تائید کی اور پھر کچھ یاد آنے پر بولی۔

"بس سکینہ! اب تو اپنے علاج پر توجہ دے' باقاعدگی سے فزیوتھراپی کروا تاکہ جلدی جلدی تیرا آپریشن ہو سکے۔"

"میرے لیے دعا کرنا سسٹر۔" سکینہ افسردگی سے مسکرائی تو سسٹر ماریہ نے اس کا ہاتھ گرم جوشی سے دبا کر یقین دہانی کروانے میں دیر نہیں کی۔

☼ ☼ ☼

"دماغ خراب ہو گیا ہے آج کل کی ینگ جنریشن

کا۔" ماما نے ڈائننگ روم میں داخل ہوتے ہی بلند آواز میں تبصرہ کیا۔ ان کا مزاج ٹھیک ٹھاک برہم تھا۔ فرائیڈ رائس اپنی پلیٹ میں نکالتے ہوئے موحد نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"اب کیا ہوا ہے؟" عائشہ نے بے زاری سے پوچھا' وہ ویسے ہی آج کل چڑچڑے پن کا شکار تھی۔

"ثمن نے انصر کو خلع کا نوٹس بھجوا دیا۔" ماما نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ماما! پرانی خبر ہے یہ۔" موحد نے بے زاری سے ناک سے مکھی اڑائی "نئی خبر یہ ہے کہ انصر بھائی نے انہیں جواب میں طلاق بھجوا دی ہے۔" موحد نے اطمینان سے دھماکا کیا۔

"واٹ۔" عائشہ نے ہاتھ میں پکڑا پانی کا گلاس میز پر رکھتے ہوئے ماما کو بے یقینی سے دیکھا۔ جو سخت پریشان دکھائی دے رہی تھیں۔

"ثمن آپی تو بے وقوف تھیں ہی' یہ انصر بھائی کو کیا ہوا۔" عائشہ کو سخت صدمہ ہوا۔

"بے وقوف عورتیں ایسے ہی اپنے مردوں کا دماغ خراب کرتی ہیں کہ ان کے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں ماؤف ہو جاتی ہیں۔" موحد نے تلخ لہجے میں تبصرہ کیا۔ وہ تسلی سے کھانا کھانے میں مگن تھا۔ جب کہ عائشہ کی بھوک اڑ گئی تھی۔

"خالہ تو بہت پریشان ہوں گی۔" عائشہ کو خیال آیا۔ ماما سر پکڑے بیٹھی تھیں۔

"فار گاڈ سیک ماما۔ اب آپ اگلے کئی دن تک اس بات کا سوگ نہ مناتی رہیے گا۔" موحد نے صاف گوئی سے کہا۔ "حالانکہ جن کو سوگ منانا چاہیے اور عدت بھی پوری کرنی چاہیے وہ صبح سولہ سنگھار کر کے ٹی وی اسکرین پر ناظرین کا دل بہلا رہی ہوں گی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا! لیکن مجھے احیان کی ٹینشن ہے' اس کا کیا بنے گا؟" ماما نے تاسف بھرے انداز سے اپنی پریشانی بتائی۔

"کیوں' احیان کو کیا مسئلہ ہے' اپنے باپ کے پاس ہے۔ دادا' دادی' پھپھو سارے رشتے تو ہیں اس کے پاس۔" موحد نے دانستہ اپنا لہجہ نرم رکھا۔

"اگر ثمن نے اس کی ملکیت کا دعوا کر دیا تو؟" ماما نے اپنا خدشہ بتایا تو وہ استہزائیہ انداز سے ہنس پڑا۔

"اف ماما! کتنی بھولی ہیں آپ۔" اس کے لہجے میں طنز کی آمیزش تھی۔ "ثمن آپی ٹائپ کے لوگ سب سے پہلے اپنے بچوں سے ہی جان چھڑاتے ہیں۔ انہیں لگتا ہے کہ بچے ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔" موحد کی اس درجہ تلخ لیکن حقیقت پر مبنی بات پر ماما کے ساتھ ساتھ عائشہ کو بھی چپ لگ گئی۔

"بہت برا ہوا ہے یہ۔" عائشہ بمشکل بولی۔

"جب کہ میرے خیال میں انصر بھائی اور احیان کے لیے بہت اچھا ہوا ہے۔" موحد نے صاف گوئی سے کہا۔

"وہ کیسے؟" عائشہ اور ماما کی نگاہوں نے سوال کیا۔

"بھئی انصر بھائی اب اپنے لیے کچھ اور سوچیں گے اور احیان کو بھی روز روز کے جھگڑوں سے نجات مل جائے گی۔" وہ بڑے سکون سے کھانا کھانے لگا۔

"لیکن احیان کو ماں تو نہیں ملے گی نا۔" ماما کا دکھ کم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

"تو پہلے کون سا اس پر دن رات ماں کی ممتا نچھاور ہو رہی تھی۔ دن تو سارا ثمن آپی کا گھر سے باہر ہی گزرتا تھا۔" موحد تلخی سے ہنسا۔

"پھر بھی بیٹا!" ماما افسردہ ہوئیں۔

"دفع کریں ماما! خالہ سے بھی کہیں کہ خود غرض لوگوں کا زیادہ دیر تک سوگ نہیں مناتے' میں خود بات کروں گا انصر بھائی سے۔" اس نے ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کیے۔

"عائشہ! تم چکر لگا آنا ذرا ماہم کے گھر' دیکھنا وہاں کیا صورت حال ہے۔" ماما نے فکرمندی سے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے عائشہ!" موحد نے تیزی سے ان کی بات قطع کر کے کہا۔ "یہ اتنا بیمار رہی ہے ماہم نے جھانک کر بھی نہیں دیکھا' ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے۔" وہ بھی بدلحاظ ہوا۔ عائشہ بھی پھیکے سے انداز میں مسکرا دی۔

"ماما! آپ کیوں ٹینشن لے رہی ہیں۔ جو کام ماہم یا ثمن آپی اپنی چوائس سے کرتی ہیں' ان پر کبھی دکھی نہیں ہوتیں۔" عائشہ نے سادگی سے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

"چلو اپنی خالہ کے ہاں تو چکر لگا آنا نا۔" ماما نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں' ان کی طرف ہو آؤں گی۔" ماہم نے کہا تو وہ خاموش ہو گئیں۔

پورے گھر میں موتیا کے پھولوں کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ ثنائلہ صبح دس بجے ہی نابیہ کو اپنے گھر چھوڑ کر ماہم کی طرف نکل گئی تھی۔ نابیہ کچھ دیر تو اس کی والدہ کے ساتھ گپ شپ کرتی رہی۔ اس کے بعد ان کو میڈیسن دے کر خود ٹی وی پر ایک ڈراما دیکھنے لگی۔ ثنائلہ کی امی ادویات کے زیر اثر سو گئی تھیں۔ ان کے آرام میں خلل پڑنے کے ڈر سے اس نے ٹی وی بند کر دیا اور بانو قدسیہ کا ناول اٹھا کر باہر صحن میں نکل آئی۔ آسمان گہرے سیاہ بادلوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ پھولوں کی کیاری کے پاس چارپائی بچھا کر لیٹ گئی۔ موتیے کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو نے پورے ماحول کو معطر بنا رکھا تھا۔ وہ بڑے مزے سے ناول سے لطف اندوز ہو رہی تھی جب گھر کے دروازے پر بیل ہوئی۔

"ثنائلہ کیا اتنی جلدی آ گئی' ابھی تو ایک گھنٹہ ہوا ہے۔" وہ مختلف سوچوں کے زیر اثر بے دھیانی میں دروازہ کھول گئی۔

"یہ زبیر انکل کا گھر ہے۔" سامنے سیاہ پینٹ اور کاسنی شرٹ میں ملبوس نوجوان نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"جی بالکل یہ زبیر صاحب کا ہی گھر ہے۔" نابیہ نے پراعتماد انداز میں جواب دیتے ہوئے اس کا بغور جائزہ لیا۔ وہ اپنے حلیے سے ایک پڑھا لکھا' سلجھا ہوا نوجوان لگ رہا تھا۔

"ان سے ملاقات ہو سکتی ہے۔" اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"جی نہیں۔" نابیہ نے بڑے آرام سے جواب دیا۔

"کیوں؟" وہ ایک دم حیران ہوا۔

"ان سے ملاقات کے لیے آپ کو شہر خموشاں جانا پڑے گا' وہ آج کل وہیں ہوتے ہیں۔"

نابیہ کی اطلاع پر وہ کئی لمحوں تک بول ہی نہیں سکا۔

"ان کا بیٹا شہیر تو ہو گا نا۔" وہ اس اچانک اطلاع سے سنبھل کر بولا تو نابیہ کو اندازہ ہوا کہ وہ سارے ہی خاندان سے واقف ہے۔

"جی! شہیر سے ملاقات کے لیے آپ کو کویت جانا پڑے گا۔" نئی اطلاع پر اسے ایک دم پھر دھچکا لگا۔

"ان کی بیٹی؟" اب کے اس نے محتاط انداز سے سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھا۔ جس کا پراعتماد انداز ہی اس کی سب سے بڑی خوبصورتی تھا۔

"ان کی بیٹی اسلام آباد گئی ہوئی ہے۔"

"اور پھپھو؟" سب سے اہم سوال اس نے سب سے آخری میں کیا تھا۔

"اوہ تو آپ ثنائلہ کے وہ والے کزن ہیں جو گزشتہ کئی سالوں سے لاپتا تھے۔" اس نے شرارت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اب دروازہ چھوڑا تو اس شخص نے بھی ایک پرسکون سانس فضا میں خارج کی۔

"آجائیے' خالہ میڈیسن لے کر سو رہی ہیں۔ فوراً" نہیں اٹھا سکتی' ورنہ ان کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔" اس نے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

"اوہ' کیا ہوا ان کو؟" وہ تھوڑا سا فکرمند ہوا اور صحن میں رکھی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"شوگر اور ہائی بلڈ پریشر کے علاوہ انجائنا کی تکلیف بھی ہو چکی ہے۔" نابیہ سامنے کچن میں بڑھ گئی۔ پانچ منٹ کے بعد وہ شربت کا گلاس لیے باہر آئی۔

"آپ پھپھو کی کیا لگتی ہیں؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا تو نابیہ چونک گئی۔

"جی میں ان کی بیٹی ثنائلہ کی بیسٹ فرینڈ ہوں' نابیہ۔" اس نے گلاس اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا تو اس نے سرہلا دیا۔

"انکل زبیر کا انتقال کب ہوا' پھپھو کی جب ماما سے بات ہوئی تھی' انہوں نے تو نہیں بتایا۔" وہ الجھن بھرے انداز سے گویا ہوا۔

"کچھ سال پہلے۔" نابیہ برآمدے سے موڑھا اٹھالائی اور اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ہو سکتا ہے کہ وہ فون پر یہ بات نہ بتانا چاہتی ہوں۔" اس نے بھی محتاط انداز سے جواب دیا۔

"آپ کے والدین نہیں آئے؟" نابیہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی' پھر ایڈریس بھی کچھ کنفرم نہیں تھا' اس سے پہلے تو وکیل صاحب ہی آئے تھے۔" اس نے تفصیل سے جواب دیتے ہوئے اس صاف ستھرے گھر کو دیکھا۔

"آپ لوگوں کو رابطہ رکھنا چاہیے تھا' انہوں نے بہت مشکل وقت دیکھا ہے۔" نابیہ نے اس اجنبی شخص سے شکوہ کیا۔

"بس ہم لوگوں کے حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے تھے۔" اس نے بھی صفائی دیتے ہوئے اس سادہ سی لڑکی کو غور سے دیکھا۔

"میرا خیال ہے کہ میں خالہ کو اٹھا دیتی ہوں۔" اس کی نظروں کے ارتکاز سے گھبرا کر نابیہ نے عجلت بھرے انداز میں کہا۔

"میرا خیال ہے کہ رہنے دیں' میں کل ماما کے ساتھ ہی چکر لگالوں گا۔" وہ نہ جانے کیوں ایک دم کھڑا ہو گیا۔

"دیکھیں' آپ خالہ سے مل کر جائیں' ورنہ وہ مجھ سے خفا ہو جائیں گی۔" نابیہ نے گھبرا کر کہا۔

"آپ میرا یقین رکھیں' میں دوبارہ آؤں گا' اس وقت ثنائلہ بھی گھر پہ ہوں گی' تب تفصیلی بات ہو گی۔" وہ فوراً" باہر نکلا۔ نابیہ اس کے پیچھے لپکی۔

"میرا انتظار کیجیے گا۔" اس نے سن گلاسز ٹشو پیپر سے صاف کرتے ہوئے بڑے گہرے لہجے میں کہا۔ نابیہ کی دل کی دھڑکنوں میں ارتعاش سا برپا ہوا۔ وہ سامنے گلی میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ جب کہ نابیہ وہیں کھڑی کی کھڑی اسے جاتے دیکھتی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

"تم دنیا کی انتہائی بے مروت لڑکی ہو۔" ماہم کی بے تکلفانہ آواز سن کر عائشہ کو دھچکا سا لگا۔ رائل بلیو سوٹ میں اس کی شہابی رنگت دمک رہی تھی۔ وہ بے تکلفی سے اس کے کمرے کے پردے ہٹا رہی تھی۔

"کیا ہوا' ایسے کیوں گھور رہی ہو' جیسے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔" ماہم نے شوخی سے لبریز لہجے میں کہا۔ وہ اب اس کے بیڈ پر بیٹھ چکی تھی۔

"بھوت تم سے زیادہ خوفناک نہیں ہو سکتا۔" عائشہ چاہتے ہوئے بھی اس پر یہ طنز نہیں کر سکی۔

"سوری یار! تم اتنا بیمار رہیں اور میں عیادت کے لیے نہیں آسکی۔" وہ پہلے کی طرح شروع ہو چکی تھی۔

"بس ثمن آپی والے مسئلے نے سب کو اپ سیٹ کر رکھا تھا۔"

"کیوں؟" عائشہ بمشکل اتنا ہی بول سکی۔

"بس یار انصر بھائی طلاق دینا نہیں چاہتے تھے اور ثمن آپی ان کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تھیں۔" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں سنگین مسئلے پر روشنی ڈالی۔

"چلو اب تو ثمن آپی کی خواہش پوری ہو گئی۔" اس نے ٹانگیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

"تھینکس گاڈ۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنسی۔ "ویسے یہ طلاق تو ان کے حق میں بڑی فائدہ مند ثابت ہوئی۔" اس نے خوشگوار انداز میں اطلاع دی۔

"وہ کیسے؟" عائشہ جبراً" بولی' ورنہ اس کا بات کرنے کو بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔

"بھئی انہیں تو فوراً" ہی الیکٹرانک میڈیا سے بڑے بڑے پروجیکٹ ملنے لگ گئے۔ آج کل بہت خوش ہیں وہ۔" ماہم نے بڑی خوش دلی سے اسے بتایا۔

"چلو' اچھی بات ہے۔ ویسے یہ علیحدگی تو انصر بھائی

کے حق میں بھی بڑی فائدہ مند ثابت ہوئی۔" عائشہ اپنی طبیعت کے برخلاف طنز کر ہی گئی۔

"وہ کیسے؟" ماہم نے عجلت بھرے انداز میں پوچھا۔

"انصر بھائی کو یو این او سے بہت زبردست آفر آئی اور انہوں نے فوراً" قبول کر لی۔" عائشہ نے ماہم کے چہرے کا اڑتا رنگ فوراً" محسوس کیا۔

"اچھا! یہ تو بہت اچھا ہوا ہے۔" عائشہ کو پتا تھا کہ اس نے بہت دل پر جبر کر کے یہ فقرہ کہا ہے۔

"اس کے علاوہ انصر بھائی کے بہت زبردست پروپوزل بھی آنا شروع ہو گئے ہیں۔" اس اطلاع پر ماہم کے چہرے پر ابھرنے والا تاثر بڑا عجیب تھا۔

"وہ دوسری شادی کریں گے کیا؟" ماہم کا سوال کم از کم عائشہ کو بہت بچکانہ لگا لیکن بہت عرصے کے بعد اس نے اپنے اندر کچھ ٹھنڈک اترتے محسوس کی تھی۔

"آف کورس' ان کا حق ہے۔" عائشہ نے کھلے دل سے اپنے کزن کی حمایت کی۔

"چلو دفع کرو' ہمیں کیا' یہ بتاؤ کہاں گم تھیں۔" ماہم کا چہرہ بے سکون ہو چکا تھا لیکن اب ایک دم اٹھ کر جانا نامناسب تھا۔ اس لیے وہ مروتاً بیٹھی رہی۔

"کہیں نہیں' بس ایسے ہی بیماری بھگتا رہی تھی۔" عائشہ اب کھل کر مسکرا رہی تھی۔

"اور کیا حال ہے تمہارے ہیرو کا۔" ماہم نے کچھ ٹٹولنا چاہا۔ عائشہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کون سا ہیرو؟" عائشہ کے سپاٹ لہجے پر ماہم نے الجھ کر اسے دیکھا۔ جیسے یقین نہ آرہا ہو۔

"بھئی علی کی بات کر رہی ہوں۔" اس نے چبا چبا کر کہا تو وہ فوراً" بولی۔

"پتا نہیں میرا اس سے کوئی رابطہ نہیں۔" کچھ توقف کے بعد وہ مزید گویا ہوئی۔

"ویسے ہر تیسرے دن کسی نہ کسی نئی لڑکی کے ساتھ کہیں نہ کہیں نظر آجاتا ہے۔" عائشہ نے بھی اس کا سکون درہم برہم کیا۔

"اچھا۔" ماہم کو دھچکا سا لگا۔

"تم نے خود بھی تو دیکھا تھا اسے گولف کلب میں۔" عائشہ نے اسے یاد دلایا تو ماہم پھیکے سے انداز میں مسکرا دی۔ "اور سناؤ آج کل کیا ہو رہا ہے؟" عائشہ کا لاپروا انداز ماہم کے اندر بے چینی سی بھر گیا۔

"کچھ خاص نہیں' بس کلینک' گھر یا پھر جم۔" ماہم نے بے دلی سے جواب دیا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا ہوا؟" عائشہ نے اپنے چہرے پر آنے والی بے ساختہ مسکراہٹ کا بمشکل گلا گھونٹا۔

"بس چلتی ہوں اب' ثمن آپی کے ساتھ مارکیٹ کا پروگرام تھا۔" ماہم نے صاف بہانہ بنایا تھا اور عائشہ نے بھی اسے جتایا نہیں۔ وہ بس اسے اضطرابی انداز سے باہر نکلتے ہوئے دیکھنے لگی۔

☆ ☆ ☆

"ہاں بھئی سکینہ! اس دفعہ گاؤں سے واپس آنے کے بعد کچھ چپ چپ سی ہو۔" ڈاکٹر خاور نے پہلی ہی ملاقات میں بھانپ لیا تھا کہ سکینہ میں کوئی تبدیلی آئی ہے۔ انہیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں جگنو تو چمکتے تھے لیکن طبیعت میں ایک ٹھہراؤ سا آگیا تھا۔

"پتا نہیں ڈاکٹر صاحب! لیکن اس دفعہ گاؤں جا کر طبیعت بہت اداس ہوئی۔" اس نے بھی بے تکلفی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"کیوں؟" ڈاکٹر خاور نے بڑے نرم لہجے میں پوچھا اور اس کی فائل میں نئے ٹیسٹ کی رپورٹس دیکھنے لگے۔

"پہلی دفعہ احساس ہوا کہ خنجر کی دھار ہی بندے کو زخمی نہیں کرتی' زبان اور نظروں کے تیر زیادہ دل دکھاتے ہیں۔" سکینہ تھوڑا سا افسردہ ہوئی۔

"ٹھیک کہتی ہیں آپ' جسم کا زخم تو بھر جاتا ہے لفظوں کے گھاؤ تو کبھی نہیں بھرتے۔ ہر دفعہ یاد آنے پر پہلے سے زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔" وہ بھی کسی گہری سوچ کے زیر اثر بولے تھے۔

"آپ ٹھیک ہیں نا؟" سکینہ نے چونک کر پوچھا۔

اس وقت جمیلہ مائی کمرے میں نہیں تھیں' اس لیے اسے کھل کر بولنے کا موقع ملا ہوا تھا۔
"آپ کو کیسا لگ رہا ہوں۔" وہ زبردستی مسکرائے۔
"کچھ الجھے الجھے اور پریشان سے۔" سکینہ کی بات پر وہ تعجب کا شکار ہوئے۔
"آپ کو کیسے پتا چل جاتا ہے سکینہ؟" ان کے سوال پر سکینہ اللہ دتا کے لبوں پر ابھرنے والی مسکراہٹ اتنی بامعنی تھی کہ ڈاکٹر خاور کو اپنے سوال کا جواب مل گیا۔
"پتا نہیں۔" سکینہ نے بھی انہیں صاف ٹالا۔
"پتا ہے ڈاکٹر صاحب! جب میں ٹھیک ہو جاؤں گی نا تو پہلے قرآن پاک حفظ کروں گی۔" ڈاکٹر خاور اس کے منہ سے بالکل غیر متوقع بات سن کر حیران ہوئے۔
"پھر اس کے بعد ایک مدرسہ بناؤں گی' اس میں بچیوں کو قرآن پڑھاؤں گی۔" سکینہ کی آخری دو باتیں کمرے میں آتی جمیلہ مائی نے بڑی دھیان سے سنی تھیں۔
"پتر! پہلے والا کام تو تو ابھی بھی کر سکتی ہے۔" جمیلہ مائی بالکل سامنے آکر بولیں۔
"اللہ کے ساتھ "جب" اور "تب" والے رشتے نہیں بناتے۔ اس پر پکا یقین کرتے ہیں۔"
جمیلہ مائی کی سادہ سی بات سے ڈاکٹر خاور سخت متاثر ہوئے۔
"اللہ کو یہ شرطوں والے تعلق اچھے نہیں لگتے' ہر حال میں اس کا دم بھرتے ہیں پتر! پھر وہ بھی اپنے بندے کو آسانی دیتا ہے۔" جمیلہ مائی کا پرسکون لہجہ سکینہ کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر خاور کو بھی سوچ میں مبتلا کر گیا تھا۔ تینوں اب اپنی اپنی جگہ پر مختلف سوچوں کے زیر اثر کھڑے تھے۔

☆ ☆ ☆

"بھائی! اگر آپ کا کوئی دوست آپ کے ساتھ مخلص نہ ہو تو کیا کرنا چاہیے۔" موحد کے ساتھ شام کو لان میں واک کرتے ہوئے عائشہ نے اچانک پوچھا۔
"سب سے پہلے تو اسے "دوست" ہرگز نہیں کہنا چاہیے' کیونکہ اگر اس کو دشمنوں والا کام ہی کرنا ہے تو اسے دوستوں کی لسٹ میں کیوں شامل کیا جائے۔" موحد نے ہلکے پھلکے لہجے میں جواب دیا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پھر گویا ہوئی۔
"لوگ دھوکا کیوں دیتے ہیں؟" وہ بری طرح الجھی ہوئی تھی۔ موحد نے بھی اسے ٹوکا نہیں۔ وہ چاہ رہا تھا کہ اس کی یہ سادہ سی بہن آج کھل کر اپنے ذہن کی تمام گرہیں سلجھا ہی لے۔
"بعض لوگ اس لیے دھوکا دیتے ہیں کیونکہ وہ فطرتاً ایسے ہوتے ہیں' ان سے کسی کو بھی فیض نہیں ملتا۔ بعض خود غرض ہوتے ہیں' ویسے تو ٹھیک چلتے ہیں لیکن جہاں اپنے مفادات کی پتنگ کو ڈولتے دیکھتے ہیں وہیں داؤ پیچ لڑا کر اپنی ڈور تیز کر لیتے ہیں۔ پھر ان کے راستے میں جو بھی آئے' اس کی پروا نہیں کرتے۔ جب کہ بعض برے نہیں ہوتے بس کبھی کبھار کمزور لمحوں کی زد میں آجاتے ہیں اور اپنے پیاروں کو ہرٹ کر جاتے ہیں لیکن انہیں اس چیز کا کبھی نہ کبھی احساس ضرور ہوتا ہے۔" موحد کے تفصیلی جواب پر اس نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔
"اپ سیٹ کیوں ہو؟" موحد نے محبت سے لبریز لہجے میں پوچھا۔
"ایسے ہی آج ماہم کے ساتھ میں کچھ غلط باتیں کر گئی' اب افسوس ہو رہا ہے۔" وہ شرمندگی سے بولی۔
"اس نے فوراً" صفائی دیتے ہوئے کہا۔
"کچھ ایسا بھی غلط نہیں' لیکن کچھ باتیں صرف اسے جتانے کے خیال میں کہہ دیں' اب افسوس ہو رہا ہے کہ نہ ہی کہتی۔"
"کوئی بات نہیں' اس پر کون سا اثر ہوگا۔" موحد نے دونوں ہاتھ جھاڑتے ہوئے خوش دلی سے کہا تو وہ بھی ہنس دی۔
"ویسے بھی جو لوگ دوسروں کے جذبات سے کھیلنا

اپنا حق سمجھتے ہوں تو ان کو بھی کبھی کبھی اس احساس سے گزرنا چاہیے تاکہ انہیں معلوم ہو کہ درد کا ذائقہ ہر زبان پہ ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔" موحد کی بات پر وہ چونکی۔
"تو بھائی! پھر ان میں اور ہم میں کیا فرق رہ جائے گا۔" عائشہ کو اس کی فلاسفی پسند نہیں آئی۔
"بھئی! ہم نے کوئی درد سہنے کا ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا یا دوسروں کو یہ پرمٹ تو نہیں دیا ہوا کہ وہ جب چاہیں ہمیں بے وقوف بنا جائیں۔" موحد تھوڑا سا تلخ ہوا۔
"پھر بھی۔" عائشہ نے بوگن ویلیا کی بیل کو تھوڑا سہلاتے ہوئے افسردگی سے کہا۔
"تمہیں پتا ہے کہ ہم اپنے آدھے سے زیادہ غم اچھا بننے کی کوشش میں خود خریدتے ہیں۔ لوگوں کو خود موقع دیتے ہیں کہ وہ ہمیں بار بار ہرٹ کریں۔"
"پھر کیا کرنا چاہیے؟" عائشہ نے بے دھیانی میں پوچھا۔
"ان کو فوراً "شٹ اپ کال" دینی چاہیے۔" موحد کی بات پر وہ ہکا بکا رہ گئی۔ جب کہ وہ اپنی وہیل چیئر اب پھولوں کی باڑ کے پاس لے گیا۔
"یہ پھول میری دنیا کی سب سے اچھی بہن کے لیے' جو اکثر دھوکے اپنی مروت پسند طبیعت کے ہاتھوں خود کھاتی ہے۔" موحد کے شرارتی لہجے پر وہ ایک دم شرمندہ سی ہوئی۔
"بھئی' جب لوگ ہزاروں دھوکے دے کر بھی شرمندہ نہیں ہوتے' تو تم کیوں دھوکے کھاتے ہوئے خفت کا شکار ہو رہی ہو۔" موحد نے اسے چھیڑا۔
"بھائی! اب آپ زیادتی کر رہے ہیں۔" عائشہ نے احتجاج کیا۔
"ہاں بالکل ایسے ہی اپنی خلاف ہونے والی زیادتی پر فوراً احتجاج کرتے ہیں۔ یہی چیز تو میں تمہیں سمجھانا چاہ رہا ہوں۔" موحد کے ہلکے پھلکے انداز پر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس دی۔

☆ ☆ ☆

"کون تھا وہ' کہاں رہتا تھا اور ماموں ممانی ساتھ کیوں نہیں آئے' تم نے کچھ تو پوچھا ہوتا۔" ثنائلہ کے لہجے میں ہلکی سی جھنجلاہٹ تھی۔ وہ ابھی ابھی ماہم کے کلینک سے گھر لوٹی تھی۔ آتے ہی نابیہ نے اسے اس کے کزن کے آنے کی اطلاع دے دی۔ سارا قصہ سننے کے بعد اسے ایک دم غصہ ہی آگیا۔
"میں کیا کرتی' وہ خود ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا۔" نابیہ نے اپنی طرف سے صفائی دینے کی کوشش کی۔
"امی کو ہی اٹھا دیتیں' اب ان کو پتا چلے گا تو پتا ہے کتنا خفا ہوں گی۔" ثنائلہ نے اپنا بیگ چارپائی پر رکھا اور دراز ہو گئی۔
"تم خالہ کو ابھی مت بتانا' وہ کل اپنے والدین کے ساتھ خود آئے گا۔" نابیہ نے اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے ایک گلاس پانی بڑھایا۔
"سخت نامعقول لڑکی ہو تم۔" اس نے گلاس پکڑتے ہوئے اسے جھاڑا۔
"میں کیا کرتی' وہ تم لوگوں کے بارے میں ہی سوال جواب کیے جا رہا تھا۔" نابیہ نے ہلکی سی خفگی سے کہا۔
"ہونہہ' چاہے کوئی چور اچکا ہی ہو' نیا نیا گھر بنا دیکھ کر جائزہ لینے آگیا ہو۔" ثنائلہ کو ایک اور خدشے نے گھیرا۔
"خیر اب ایسا بھی کوئی محل نہیں کھڑا تم نے کر لیا کہ اچھے خاصے ہینڈسم لوگ چور بننے کے لیے مچل جائیں۔" نابیہ کو بھی غصہ آگیا تھا۔
"اچھا ہینڈسم تھا؟ ویسے ماموں خود بھی جوانی میں بالکل کسی فلمی ہیرو کی طرح تھے۔" ثنائلہ اپنی خفگی بھول کر ایک دم اشتیاق بھرے لہجے میں بولی۔
"ہینڈسم نہیں بلکہ ٹھیک ٹھاک ظالم پرسنالٹی تھی۔" نابیہ کا موڈ بھی خوشگوار ہوا۔
"چلو' پھر تمہارا کام تو بن گیا۔" ثنائلہ بڑے اطمینان سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔
"خیر اب اتنی بھی اس کی مت نہیں ماری گئی کہ مجھ جیسی لڑکی کے ساتھ اپنے کام بنانے لگے۔" نابیہ خطرناک حد تک صاف گو تھی۔
"کیوں تمہیں کیا ہوا' اچھی خاصی ہو' نازک سی'

اسمارٹ سی' دراز قد' گورا رنگ اور یہ ناگن کی طرح لہراتی تمہاری چوٹی۔۔۔ بنی بنائی کسی پاکستانی فلم کی ہیروئن۔" ثنائلہ نے اسے چھیڑا۔

"اوہ بہن! معاف کرو مجھے۔" نابیہ نے سچ مچ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

"چلو چھوڑو۔" ثنائلہ نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ "بس تم ابھی امی سے ذکر نہ کرنا۔ کہیں خدانخواستہ کل وہ لوگ نہ آئیں تو والدہ صاحبہ تو گلی میں جاکر بیٹھ جائیں گی۔"

"ہاں یار! مجھ سے بھی بڑی غلطی ہوگئی' مجھے کم از کم اس سے فون نمبر تو لینا چاہیے تھا۔" نابیہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

"اور کیا' اس کا نہ سہی کم از کم اپنا سیل نمبر تو دے دیتیں اسے۔" ثنائلہ نے اس کا تاسف کم کرنے کے لیے بات کو ہلکا پھلکا سا رنگ دیا۔

"یہ تو اس سے بھی بڑی غلطی ہوگئی۔" نابیہ اس کی شرارت سمجھ کر کھلکھلا کر ہنسی پھر کچھ یاد آنے پر بولی۔ "تم بتاؤ تمہاری آخری میٹنگ کیسی رہی؟"

"بہت زبردست یار! وہ بہت لاجواب لڑکی ہے' اس کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ اللہ نے اسے کتنے پیار سے بنایا ہوگا۔" ثنائلہ نے توصیفی لہجے میں کہا۔

"کیا بہت خوب صورت ہے وہ؟" نابیہ کو تجسس ہوا۔

"خوب صورتی کی اگر کوئی مجسم تعریف ہوتی تو وہ اس کا بہترین نمونہ ہوتی۔" ثنائلہ نے اس کے تجسس کو ہوا دی۔

"سب سے بڑی بات کہ وہ ایک بہترین سائیکولوجسٹ ہے۔ انسان کے زخموں پر اتنی نرمی سے مرہم لگاتی ہے کہ درد کا احساس ہی نہیں ہوتا۔" ثنائلہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ماہم کی شان میں ایک آدھ کتاب لکھ دیتی۔

"لیکن ایسے لوگ جب خود کسی کو زخم دیتے ہیں تو ان کو پھر پوری دنیا میں کہیں شفا نہیں ملتی۔" نابیہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"ماہم جیسے لوگ کسی کو دکھ دے ہی نہیں سکتے۔" ثنائلہ کے لہجے میں کوئی اندھا یقین بولا تھا۔

"کیوں' وہ انسان نہیں ہوتے کیا؟ یا تم خوب صورت لوگوں کو انسانوں کی کیٹیگری میں رکھتی ہی نہیں ہو۔" نابیہ کا لہجہ عجیب سا ہوا۔

"پتا نہیں' لیکن مجھے ماہم ایسی نہیں لگتی۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔

"اللہ کرے وہ ویسی ہی ہو جیسا تم سوچتی ہو۔" نابیہ نے نرم انداز اختیار کیا۔ "لیکن لوگوں کے بڑے بڑے بت مت بنایا کرو' کیونکہ جب وہ ٹوٹتے ہیں تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔" نابیہ کے لہجے میں چھپا دکھ اس کے چہرے پر لہرایا تو وہ اپنی سب سے پیاری دوست کو دیکھتی رہ گئی۔

"یہ رامس کیسا لڑکا ہے عائشہ؟" وہ ماما کے ساتھ کچن کے کاموں میں ہاتھ بٹا رہی تھی۔ ان کی بات پر چونک اٹھی۔ ماما کو آج کافی دنوں کے بعد اپنے ہاتھ سے کوکنگ کرنے کا شوق اٹھا تھا۔ انہوں نے اپنے ساتھ فارغ بیٹھی عائشہ کو بھی لگالیا۔

"رامس اچھا ہے ماما! لیکن میں اسے بہت زیادہ نہیں جانتی۔" عائشہ نے سادگی سے جواب دیا۔

"پھر تمہیں کہاں مل گیا؟" ماما نے حیرت کا اظہار کیا۔

"یہ ماہم کا پیشنٹ تھا۔" اس کی بات پر ماما ٹھٹک کر رک گئیں۔

"ماہم کا پیشنٹ؟ لیکن اسے کیا ہوا؟" ماما حیرت کے عالم میں اپنا اگلا کام کرنا ہی بھول گئیں۔

"کچھ نہیں ماما' بس کچھ ڈپریشن وغیرہ کا مسئلہ تھا۔" اس نے سرسری انداز میں بتایا تو ماما نے سکون کا سانس لیا۔

"فیملی بیک گراؤنڈ کیسا ہے اس کا؟" ماما کے سوال نے عائشہ کو الجھن میں مبتلا کیا۔

"ماما! آپ کو اچھی طرح پتا ہے کہ میں لوگوں سے سوال نہیں کرتی اور نہ ہی مجھے پسند ہے کہ کوئی مجھ سے کرے۔"

"افوہ! تم جیسی بے وقوف لڑکی میں نے دنیا میں آج تک نہیں دیکھی۔ تمہاری جگہ ماہم ہوتی تو پہلی ملاقات میں گڑے مردے بھی اکھاڑ لیتی۔" انہوں نے فریج کا دروازہ زور سے بند کیا۔

"سوری۔ میں ماہم کبھی نہیں بن سکتی۔" اس نے ہلکی سی ناگواری سے کہا اور ساتھ ہی ایپرن باندھنے لگی۔ "یہ چکن ڈیپ فرائی کرنا ہے نا؟"

"ہاں۔" ماما نے ایک نظر ڈال کر کہا تو وہ آئل نکالنے لگی۔

"ویسے لڑکا تو مجھے بہت اچھا لگا ہے۔ سلجھا ہوا' کسی اچھے خاندان کا لگتا ہے۔" ماما کی سوئی رامس پر اٹک گئی تھی۔

"جی ہاں' ماہم بتا رہی تھی کہ اس کی والدہ بھی ایجوکیٹڈ اور خاصی ڈیسنٹ خاتون ہیں۔"

"ماہم اس کی والدہ سے بھی مل چکی ہے۔ کہیں۔۔۔" ماما کے چہرے پر پریشانی کی لہر نمودار ہوئی۔ "کوئی پروپوزل وغیرہ کا چکر تو نہیں۔"

"ہاں' رامس کی والدہ تو انٹرسٹڈ تھیں لیکن ماہم نے انکار کردیا۔" اس نے گول مول سا جواب دیا۔

"ماہم نے انکار کردیا؟" ماما کو دھچکا سا لگا۔ "اچھا خاصا پڑھا لکھا اور اسٹیبلش لڑکا ہے' انکار کیوں کردیا۔" انہوں نے سخت حیرت کا اظہار کیا۔

"ایسے ہی الٹے دماغ کی تو ہے' کوئی چیز نہیں پسند آئی ہوگی۔" عائشہ نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"پھر بھی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی۔" ماما کی تسلی نہیں ہو پا رہی تھی۔

"ماما! کوئی وجہ نہیں تھی' بس محترمہ کی ناک کے نیچے کوئی چھوٹی موٹی چیز نہیں آتی۔ آپ کو معلوم ہے۔ پھر' ابھی شادی ہی کرنا نہیں چاہتی۔" عائشہ نے ان کو مطمئن کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور کامیاب بھی ہوگئی۔

"ویسے مجھے یہ لڑکا بہت اچھا لگا ہے۔" ماما نے کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا تو عائشہ کا ماتھا ٹھنکا۔

"آپ کیا سمجھ رہی ہیں ماما؟" وہ ان کی طرف دیکھ کر بڑے پراعتماد انداز میں بولی تو ماما تھوڑا سا گڑبڑا سی گئیں۔

"بھئی میں تو بس جنرل سی بات کررہی تھی۔ مجھے لگا کہ اس کا جھکاؤ تمہاری طرف ہے۔" ماما نے بھی کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کرہی لیا۔

"کم آن ماما! ایسی کوئی بات نہیں۔" عائشہ نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ "اول تو ایسا کچھ نہیں۔ اگر ہو بھی تو مجھے اس لحاظ سے بالکل پسند نہیں۔"

"کیوں' کیا برائی ہے اس میں؟" ماما نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"بات برائی کی نہیں' پسند یا ناپسند کی ہے ماما! اور جب مجھے پتا ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں' پھر اس موضوع پر بحث کا فائدہ۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

ماما چپ کرگئیں لیکن ان کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ ان کا مزاج برہم ہوچکا ہے۔ وہ خاموشی سے کوکنگ میں مصروف ہوگئیں۔

"اوہ مائی گاڈ! آپ یہاں کیسے؟" ماہم اپنے کلینک میں علی کو دیکھ کر تقریباً حواس باختہ سی ہوگئی۔ وہ تو اپنے روٹین کے کاموں میں مصروف تھی' جب انٹرکام پر اس کی اسسٹنٹ نے کسی کے آنے کی اطلاع دی۔ آج صبح سے کوئی خاص اپائنٹمنٹ بھی نہیں تھی اس لیے وہ تقریباً فارغ تھی۔

"کیوں' مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا کیا۔" ماہم کی حیرانی پر اس نے متانت سے پوچھا اور سامنے سنگل صوفے پر بیٹھ گیا۔

"ناٹ ایٹ آل' میں نے تو یونہی کہا' ورنہ آپ کو اپنے کلینک میں دیکھ کر یقین کریں بہت خوشی ہورہی ہے۔" ماہم کے چہرے کے ہر نقش سے مسرت محسوس ہورہی تھی۔ وہ بے اختیار اٹھ کر اس کے سامنے رکھے صوفے پر آن بیٹھی۔

"بہت اچھا سیٹ اپ بنایا ہے آپ نے۔" اس نے کھلے دل سے سراہا۔

"بس گزارا چل رہا ہے۔" ماہم کے منہ سے نکلنے والے انکساری سے بھرپور الفاظ نے اسے چونکا دیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ لڑکی بھی عاجزی یا انکساری کا بھی اظہار کر سکتی ہے۔ اس کے بارے میں اس کا ایک اندازہ غلط ہوا۔

"فنٹاسٹک ہے سب کچھ۔" وہ کھڑے ہو کر اس کے کلینک کا بغور جائزہ لینے لگا۔ "کلر اسکیم بہت کول رکھی ہے آپ نے' یہ مریضوں کو اچھا تاثر بخشتی ہو گی۔" وہ چلتے چلتے دیوار کے پاس رک گیا اور بے اختیار وہاں لگی پینٹنگ کو دیکھنے لگا۔ ماہم نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اسے معلوم تھا یہ پینٹنگ عائشہ نے اسے گفٹ کی تھی۔

"کیا لیں گے آپ' چائے یا کافی؟" ماہم نے اس پینٹنگ سے اس کا دھیان ہٹانے کے لیے کہا لیکن علی کی نظریں تو گویا اس پینٹنگ پر چپک سی گئی تھیں۔

"بلیک کافی۔" اس نے مڑے بغیر بے تکلفی سے جواب دیا۔

"اور ساتھ میں؟" ماہم نے مزید پوچھا۔

"سینڈوچ۔" مزید بے تکلفی کا مظاہرہ ہوا۔

"کیسی چل رہی ہے آپ کی جاب؟" وہ بمشکل اپنی نگاہیں اس تصویر سے ہٹانے میں کامیاب ہوا۔

"جاب الحمد للہ بہترین چل رہی ہے' آپ سنائیں کیسا چل رہا ہے آپ کا کام؟" ماہم نے اپنے دھڑکتے دل پر قابو پا کر بمشکل پوچھا۔

"بس اوپر والی ذات کا کرم ہے۔" اس کے لفظوں سے زیادہ لہجے میں انکساری تھی۔

"میں اور میری آپی ایک چیریٹی شو کرنا چاہ رہے تھے۔ اگر آپ بھی اس میں شرکت کریں۔" ماہم نے اپنی طرف سے بڑا سوچ سمجھ کر پتا پھینکا۔

"چیریٹی شو؟" وہ بھرپور انداز سے چونکا۔ "آپ کو ان چیزوں سے دلچسپی ہے؟" اس کے منہ سے بے اختیار پھسلا۔

"کیوں میں انسان نہیں ہوں' مجھ پر اپنے اردگرد کے حالات کا اثر نہیں ہو سکتا کیا؟" اس کی صاف گوئی نے اسے شرمندہ سا کیا۔

"اصل میں' آپ کو دیکھ کر لگتا نہیں ہے کہ آپ اس قسم کے کاموں میں دلچسپی لیتی ہوں گی۔" علی نے بھی بلا جھجک اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"ایک بات کہوں' برا نہ مانیے گا۔" ماہم کی بات پر وہ ذرا سنبھل کر بیٹھا۔

"نیکی کا احساس ہر دل میں ہوتا ہے' کچھ لوگ اپنے چھوٹے سے چھوٹے کام کا بھی ڈھنڈورا پیٹتے ہیں' لوگوں کو پکڑ پکڑ کر بتاتے ہیں کہ وہ دکھی انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں' لیکن میری فلاسفی تھوڑی مختلف ہے۔" ماہم کی باتیں آج اسے سخت حیران کر رہی تھیں۔ اسے اپنی گزشتہ سوچوں پر شرمندگی ہوئی۔

"میرا نظریہ ہے کہ اگلے بندے کی عزت نفس کا بھرپور احساس کیا جائے اور ایسے مدد کی جائے کہ کسی کے کانوں کان خبر نہ ہو' ایسے ہی تو نہیں کہا گیا کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو۔" ماہم آج فل فارم میں تھی۔ علی نے توصیفی نگاہوں سے اپنے سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھا اور لاپروائی سے بولا۔

"یہ تو آپ نے بالکل ٹھیک کہا' لیکن اگر آپ کو چیریٹی کا کام کرتے دیکھ کر کوئی اور بھی انسپائر ہوتا ہے تو اس کا ثواب بھی تو آپ کے کھاتے میں جائے گا۔"

"ہاں' ہو سکتا ہے' لیکن اپنا اپنا نظریہ ہے۔" ماہم نے بھی کندھے اچکائے۔ وہ اب بلیک کافی کا کپ اس کی جانب بڑھا رہی تھی۔

"بھئی آپ کی مدر ٹریسا دوست آج کل کہاں گم ہیں۔" علی نے آخر وہ سوال کر ہی لیا' جس کے لیے خصوصی طور پر یہاں آیا تھا۔

"کون' عائشہ؟" ماہم کو بلیک کافی آج سے پہلے اتنی کڑوی کبھی نہیں لگی۔

"جی' کافی عرصے سے نظر نہیں آئیں وہ۔" علی کا لہجہ سرسری سا تھا۔

"اس کی ماما آج کل اس کے دھڑا دھڑ پروپوزل دیکھ

رہی ہیں' بس ایک آدھ ہفتے میں فائنل ہو جائے گی اس لیے بزی ہے۔" ماہم کی بات نے علی کا سارا سکون درہم برہم کیا۔

"اوہ....." اس نے گرم گرم کافی کا کپ لبوں سے لگایا' جس نے ایک دم سے جلن کا احساس بھر دیا۔ اس نے فوراً کپ ٹرے میں رکھا۔ ماہم کی کھوجتی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"ارے دھیان سے' ٹیک اٹ ایزی۔" ماہم نے فوراً اٹھ کر ٹھنڈے پانی کا گلاس اس کی جانب بڑھایا۔

"بہت گرم کافی تھی' پتا ہی نہیں چلا۔" وہ زبردستی مسکرایا۔

"کوئی بات نہیں' شروع شروع میں جلن کا احساس زیادہ ہوتا ہے' پھر سکون آجاتا ہے۔" ماہم کے ذومعنی انداز پر وہ چونکا اور پھر سنبھل کر دوبارہ کافی کا کپ اٹھالیا۔

عابدہ پروین کے صوفیانہ کلام نے پوری محفل میں ایک سماں باندھ رکھا تھا۔ عائشہ آج بہت عرصے کے بعد موحد کے ساتھ ایسی محفل میں شریک ہوئی تھی۔ اس سے پہلے شہر میں ہونے والی ہر محفل موسیقی میں ان تینوں کی تکون ہوتی تھی' لیکن آج صرف وہ دونوں ہی تھے۔

"السلام علیکم موحد بھائی اور آپ کیسی ہیں اچھی لڑکی۔" رامس اچانک اس منظر کا حصہ بنا۔ دونوں بہن بھائی چونک گئے۔ موحد بڑی گرم جوشی سے رامس سے مل رہا تھا۔ عائشہ کو اسے یہاں بھی دیکھ کر ہلکی سی جھنجلاہٹ ہوئی' لیکن اس نے اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

"بھئی تم کہاں؟" عائشہ نے سوالیہ نظروں سے پوچھا۔

"بھائی کے ساتھ آیا تھا' وہ ایسی کوئی محفل نہیں چھوڑتے۔ انہیں عابدہ پروین کا عارفانہ کلام بہت پسند ہے۔" رامس نے موحد کے ساتھ بے تکلفی سے بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ اس وقت کوئی نو آموز گلوکارہ اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس لیے سب ہی کی توجہ وقتی طور پر دائیں بائیں ہو گئی تھی۔

"تم اس دن میرے ساتھ وعدہ کر کے گئے' دوبارہ آئے ہی نہیں۔" موحد نے اس سے فوراً شکوہ کیا۔

"میں ان شاء اللہ بہت جلد آؤں گا اور لنچ بھی کر کے جاؤں گا۔" اس نے ہنستے ہنستے وعدہ کیا۔ ان دونوں کو آپس میں گفتگو کرتا چھوڑ کر عائشہ دوسری جانب آ گئی۔ رات کی خوب صورتی اپنے عروج پر تھی۔ آسمان کسی دلہن کے آنچل کی طرح لگ رہا تھا' جس پر کسی نے ننھے ننھے بے شمار ستارے ٹانک دیے ہوں۔

وہ جس طرف آئی تھی' وہ جگہ اسٹیج سے کچھ فاصلے پر تھی اور یہاں اکا دکا لوگ ہی تھے' اس لیے خاصا سکون تھا۔ البتہ اسپیکر چاروں طرف لگے ہونے کی وجہ سے اسٹیج پر پرفارم کرنے والوں کی آواز بالکل صاف آ رہی تھی۔ آج بھی عائشہ کے دل پر اداسی پنجے گاڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس لیے عارفانہ کلام کا ایک ایک لفظ اسے اپنے دل میں اترتا محسوس ہو رہا تھا۔

"یار کو ہم نے جابجا دیکھا' کہیں ظاہر' کہیں چھپا دیکھا۔"

عابدہ پروین نے اپنے مخصوص دلکش انداز میں لے اٹھائی تو عائشہ کو اپنا دل ڈوبتا سا محسوس ہوا۔ گھٹنوں میں منہ دیے وہ اس آواز کے حسن میں مکمل طور پر گرفتار ہو گئی۔ اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ کون اس کے پاس آن بیٹھا ہے۔ ایک مخصوص پرفیوم کی دلفریب خوشبو نے شور مچایا تو عائشہ نے سر اٹھا کر دیکھا اور اپنے سے ایک سیڑھی نیچے بیٹھے شخص کو دیکھ کر وہ اپنی جگہ پر ساکت ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی پھول تھا جس کی پتیاں وہ ایک ایک کر کے اضطرابی انداز میں توڑ کر نیچے پھینک رہا تھا۔

"جب انسان کسی پر کوئی فرد جرم عائد کرتا ہے تو اسے صفائی کا موقع بھی دیتا ہے۔" اس نے گلہ آمیز لہجے میں عائشہ کو ہی مخاطب کیا تھا۔

"میں نے کسی پر کوئی فرد جرم عائد نہیں کی۔" اس کا لہجہ بھرپور خفگی کا گواہ تھا۔

"دنیا کی ظالم سے ظالم عدالت بھی ایسا نہیں کرتی۔" علی نے رنج سے کہا۔ عائشہ چپ رہی۔ "اپنا جرم پوچھ سکتا ہوں میں۔" وہ اب مڑ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا تھا۔ عائشہ کو اپنا دل اپنے ہاتھوں سے نکلتا ہوا محسوس ہوا۔

"اپنے دل سے پوچھیں۔" وہ نروٹھے پن سے بولی۔

"دل تو اس دن سے بالکل چپ ہو گیا ہے، جب سے آپ خفا ہوئی ہیں۔" اس کے لہجے سے زیادہ اس کی آنکھیں بول رہی تھیں۔

"مجھے نہیں معلوم، کب کہاں، کیا چیز آپ کو بری لگی، آپ کم از کم بتاتیں تو سہی۔" اس کی آنکھوں میں ایک شکوہ مچلا۔

"مجھے آپ کی کوئی بات بری کیوں لگے گی، ہمارے درمیان کون سا ایسا ریلیشن شپ تھا، جس کے حوالے سے میں مائنڈ کرتی۔" عائشہ نے دل پر کڑا ضبط کر کے بول ہی دیا۔ اسے بیٹھے بیٹھے شاک سا لگا۔

"ہمارے درمیان کچھ نہیں تھا عائشہ؟" اس کے لہجے میں دکھ، بے یقینی اور گہرا صدمہ تھا۔

"نہیں۔" عائشہ نے دل پر پہلا قدم بڑی مضبوطی سے رکھا۔

"ادھر میری طرف دیکھ کر بات کریں۔" علی نے ہلکے سے اس کے ہاتھ کی پشت کو چھوا۔

"آپ نئے نئے راستے کے مسافر ہیں، کسی ایک جگہ پر پڑاؤ آپ کو زنگ لگا دے گا۔" عائشہ نے تلخ لہجے میں طنز کیا۔

"میں نئے راستوں کا مسافر ہوں یا آپ خود اپنا راستہ بدل چکی ہیں۔" دل پر جبر کر کے اس نے بھی ایک حساب برابر کرنے کی کوشش کی۔

"جو بھی سمجھ لیں۔" عائشہ اپنی جگہ سے اٹھی اور تیزی سے چلتے ہوئے پارکنگ کی طرف بڑھ گئی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ وہ اب گاڑی میں سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے رو رہی تھی۔ اسے لگا تھا کہ وہ کچھ غلط کر آئی ہے۔

آج صبح سے نابیہ اور ثنائلہ نے پورے گھر کو چمکا کر رکھ دیا تھا۔ صحن، برآمدہ، کمرے، کچن ہر جگہ لش لش کر رہی تھی۔ اس کی امی ان دونوں کے اس قدر متحرک ہونے پر حیران تو تھیں اور کئی دفعہ پوچھ بھی چکی تھیں لیکن دونوں ہی ہر دفعہ ٹال جاتی تھیں۔ تنگ آکر پڑوس میں نابیہ کے گھر میں چلی گئیں۔

"آج بہت لشکارے مار رہی ہو، خیر ہے نا۔" ثنائلہ نے معنی خیز نگاہوں سے نابیہ کو دیکھا، جو بھاگ کر اپنے گھر سے نہا دھو کر بھی آگئی تھی اور اس وقت لان کے پرنٹڈ سوٹ میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔

"حلیہ بہت ہی رف ہو گیا تھا۔" نابیہ نے بوکھلا کر صفائی دی تو وہ شرارت سے کھنکھاری۔

"کیا تکلیف ہے، ایسے کیوں گھور گھور کر دیکھ رہی ہو۔" نابیہ اس کے ساتھ کچن میں فرش پر چوکی رکھ کر بیٹھ گئی۔

"دیکھ رہی ہوں کہ رخساروں پر آج ویسے ہی گلابیاں بکھری ہوئی ہیں یا کوئی ہار سنگھار کر کے آئی ہو۔" ثنائلہ نے رول فریز کرتے ہوئے اسے چھیڑا۔

"کہاں کی گلابیاں، یہ پنک دوپٹے کا عکس پڑ رہا ہے۔" نابیہ آج نہ جانے کیوں بار بار گھبرا رہی تھی۔

"ویسے شام کے چار تو بج چکے ہیں، ماموں لوگ ابھی تک آئے نہیں۔" ثنائلہ نے برآمدے میں لگے وال کلاک سے ٹائم دیکھا۔

"پتا نہیں یار۔" نابیہ تھوڑا سا بے زار ہو چکی تھی۔ وہ دونوں کچن کا کام نبٹا کر باہر صحن میں آن بیٹھیں، جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا۔ دونوں کے چہروں پر مایوسی کی تہہ گہری ہوتی جا رہی تھی۔

"تم نے دھیان سے سنا تھا نا کہ اس نے آج ہی آنے کا کہا تھا۔" ثنائلہ نے کوئی تیسری دفعہ پوچھا تو وہ چڑ سی گئی۔

"مبہری تھوڑی ہوں میں۔ اس نے یہی کہا تھا اور میں نے بھی یہی سنا تھا۔" اس نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

"ظاہر ہے تم نے یہی سنا ہوگا۔ جب ہی تو صبح سے کبھی گھر کو کبھی خود کو لشکانے کا پروگرام جاری تھا۔" ثنائلہ نے اسے چھیڑا تو وہ ہلکی سی خفگی کے ساتھ رخ موڑ کر بیٹھ گئی۔

"ان لوگوں کے وکیل صاحب نے بھی تو خالہ کی فون پر بات کروائی تھی تو کیا نمبر نہیں دیا تھا۔" نابیہ کو اچانک یاد آیا۔

"نہیں، انہوں نے اپنے سیل سے بات کروائی تھی اور مجھے ان کا بھی نمبر لینے کا دھیان نہیں رہا۔" ثنائلہ نے بھی صفائی دی۔

"کبھی بھی وقت پر کوئی ڈھنگ کا کام نہ کرنا۔" نابیہ کو اس کی لاپروائی پر غصہ آیا۔

"چلو، تجھے تو دھیان نہیں رہا، جو خود کل میرے کزن کے ساتھ خوش گپیاں مارتی رہی ہو، تب تم ہی عقل مندانہ کام کر لیتیں۔" ثنائلہ نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

"مجھے کیا پتا تھا کہ اتنا دعدہ خلاف ہوگا وہ بندہ۔" نابیہ کو اب اس کے کزن پر غصہ آنے لگا۔

"دفع کرو، کسی نہ کسی دن آ ہی جائیں گے۔" ثنائلہ نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"ہاں تب تک بندہ انتظار کی سولی پر لٹکا رہے۔" نابیہ کے منہ سے پھسلا تو اس نے چونک کر اپنی دوست کا چہرہ دیکھا۔ جس پر ایک داستان رقم ہو چکی تھی۔

"کہاں گم ہو گئے تھے آپ، نمبر بھی مسلسل بزی مل رہا تھا اور آفس سے بھی غیر حاضر تھے۔" ثنائلہ آج کافی دن کے بعد موحد کے آفس میں تھی۔ دونوں کا کئی دن سے رابطہ منقطع تھا۔

"بس، عائشہ کی وجہ سے اپ سیٹ تھا۔" موحد نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اس سادہ سی لڑکی کو دیکھا۔

"کیا ہوا عائشہ کو؟" ثنائلہ کو علم تھا کہ عائشہ اس کی چھوٹی بہن ہے اور موحد کی ہر تیسری بات میں اس کا ذکر ضرور ہوتا۔

"پتا نہیں، وہ کس الجھن میں ہے، نہ شیئر کر رہی ہے اور نہ خود سیٹ ہو پا رہی ہے۔" موحد حقیقتاً اس کے لیے پریشان تھا۔

"اس کی کوئی دوست نہیں ہے کیا؟ اس سے پوچھیے ذرا۔" ثنائلہ نے اپنی طرف سے اچھا مشورہ دیا۔

"میری بہن بہت سادہ، مخلص اور انسانیت سے محبت کرنے والی ہے۔ مروت اتنی زیادہ ہے کہ جان بوجھ کر دھوکے کھا جاتی ہے۔" موحد کے لہجے میں اپنی بہن کے لیے پیار محسوس کر کے ثنائلہ مسکرا دی۔

"اس کی دنیا میں ایک ہی دوست ہے، جو سارے جہاں کی خود غرض اور خود پسند لڑکی ہے۔" موحد نے انتہائی بے زاری سے ماہم کا ذکر کیا۔

"خود غرض اور خود پسند لوگ تو کسی کے دوست نہیں ہوتے۔" ثنائلہ نے سنجیدگی سے سامنے بیٹھے شخص کا چہرہ دیکھا جو اسے بہت پیارا لگنے لگا تھا۔

"یہی بات میں اس بے وقوف کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن وہ سمجھ کر بھی اسے سمجھنا نہیں چاہتی۔" موحد نے افسردگی سے کہا۔ وہ پہلی دفعہ اس سے اپنے گھر سے وابستہ کسی شخص کی پریشانی کا تذکرہ کر رہا تھا۔ ورنہ عموماً وہ اس سے عام سی ہلکی پھلکی باتیں ہی کرتا تھا۔

"میں اسے ملواؤں گا تم سے، وہ بہت خوش ہوگی۔" موحد کی بات پر وہ ہلکا سا گھبرا گئی۔

"اسے میں پسند آجاؤں گی کیا؟"

"عائشہ کی طرف سے بے فکر رہو، اس کے سامنے میں کسی بھی لڑکی کو کھڑا کر دوں گا۔ وہ بہت پیار سے ملے گی۔ وہ لوگوں کے ظاہری حلیوں میں نقص نہیں نکالتی۔" موحد کی بات پر اسے کچھ تسلی ہوئی۔

"لیکن پچھلے دنوں وہ کافی زیادہ بیمار رہی ہے، ساری ساری رات لان میں گزار دیتی تھی۔ پتا نہیں کون سا

سی بات ہے جو وہ مجھ سے شیئر نہیں کر پا رہی حالانکہ مجھ سے کبھی کوئی بات نہیں چھپاتی تھی۔"

"کیا مسئلہ ہو سکتا ہے اسے؟" ثنائلہ عائشہ کے بارے میں کیا کہہ سکتی تھی۔

"مجھے لگتا ہے کہ کوئی ذہنی الجھن ہے، جس کا سرا جاننے کے باوجود نہیں مل رہا۔" موحد نے انٹر کام پر اس کے لیے چائے کا آرڈر دیتے ہوئے کہا۔

"ذہنی الجھن؟" ثنائلہ چونکی۔ "میں ایک مشورہ دوں اگر آپ مائنڈ نہ کریں۔" ثنائلہ نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔

"ہاں، شیور۔" موحد نے دلچسپی سے اس کا گھبرایا ہوا انداز دیکھا۔

"آپ مائنڈ تو نہیں کریں گے نا۔" ثنائلہ ابھی بھی تذبذب کا شکار تھی۔

"کم آن یار! میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر مائنڈ نہیں کرتا۔" موحد نے اسے تسلی دی۔

"آپ اسے کسی سائیکولوجسٹ کو کیوں نہیں دکھاتے۔" اس نے روانی سے کہا اور اگلے ہی لمحے موحد کے چہرے پر بڑی سرعت سے پھیلی سنجیدگی کو دیکھ کر فوراً وضاحت کی۔

"پلیز غلط مطلب مت لیجیے گا، جن دنوں میں بھی بہت زیادہ الجھنوں کا شکار تھی تو ایک سائیکولوجسٹ کے پاس جایا کرتی تھی۔"

"پھر؟" موحد نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"الحمد اللہ، اللہ نے بہت کرم کیا اور کچھ وہ سائیکولوجسٹ اتنی زبردست اور شان دار تھی کہ اس نے میرے ذہن کی تمام گتھیاں ایک ایک کر کے سلجھا دیں۔ میں تو سخت امپریس ہوں، ان سے۔" ثنائلہ کی وضاحت پر موحد نے ایک لمبی سانس فضا میں خارج کی۔

"اچھا؟ کس سائیکولوجسٹ کے پاس جاتی تھیں؟"

"ماہم منصور کے پاس۔" ثنائلہ نے کمرے میں بم پھوڑا تھا۔ موحد کے چہرے کے تاثرات میں واضح تبدیلی آئی۔ اس کا چہرہ کسی چٹان کی مانند سخت، کھردرا اور سپاٹ سا نظر آنے لگا۔

"ماہم منصور جن کا کلینک ایف ٹین مرکز میں ہے۔" موحد نے عجیب سے لہجے میں دریافت کیا۔

"جی۔ جی، وہ ہی، کیا آپ جانتے ہیں انہیں؟" ثنائلہ کے لہجے میں بچوں کا سا اشتیاق تھا۔

"جی ہاں۔" موحد کے ماتھے کے بلوں میں ایک دم ہی اضافہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ثنائلہ کی چھٹی حس نے اسے کچھ غلط ہونے کا احساس دلایا۔

"کیسے؟" اس کے منہ سے پھسلا۔

"دنیا میں اگر مجھے کسی سے بے پناہ نفرت ہے تو وہ یہی لڑکی ہے، جو میری بہن عائشہ کی بہترین دوست ہونے کا دعوا کرتی ہے۔ جس کے خوب صورت چہرے کے پیچھے ایک مکروہ اور بدصورت چہرہ ہے۔ وہ چہرہ جس کسی کو بھی نظر آجائے، اسے خوب صورتی کے احساس سے ہی نفرت ہو جائے۔"

موحد کے لفظوں سے نکلتا زہر اور چہرے پر ٹپکتا تنفر ثنائلہ کو اپنی جگہ پر منجمد کر گیا۔ اس کے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ اسے لگا جیسے موحد جھوٹ بول رہا ہو۔

"آپ کے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے؟ آپ شیئر کیوں نہیں کرتیں۔" عائشہ کافی دنوں کے بعد فاطمہ جناح پارک میں موجود تھی اور رامس نے اس کی مخصوص جگہ پر بڑا کامیاب چھاپہ مارا تھا۔ وہ جو بڑی بے دلی کے ساتھ پینٹنگ پر کام کر رہی تھی۔ اس کو اپنے پیچھے کھڑا دیکھ کر خود بھی سامنے بینچ پر آن بیٹھی۔ یہ تو طے تھا کہ اس کی موجودگی میں کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

"آپ کے ساتھ کیا مسئلہ ہے جو ہر جگہ میرا پیچھا کرتے ہوئے پہنچ جاتے ہیں۔" وہ تھوڑا سا چڑی۔

"مجھے لگتا ہے کہ آپ کو کسی اچھے دوست کی ضرورت ہے۔" وہ اسی بڑے سے مخصوص پتھر پر بیٹھ چکا تھا جس پر کسی زمانے میں وہ دشمن جاں بیٹھ کر اسے

کام کرتا دیکھا تھا۔

"یہ الہام خیر سے آپ کو کیوں ہوا؟" عائشہ نے بے ضرر سی طنزیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"میری چھٹی حس کہتی ہے۔" دوسری جانب اس نے غیر سنجیدگی سے کہا۔

"پہلے اپنی پانچ حسوں کا تو علاج کروالیں۔" عائشہ کے لہجے میں طنز کی آمیزش شامل ہوئی۔ آج نہ جانے کیوں اسے اپنی تنہائی میں اس کا مخل ہونا بالکل اچھا نہیں لگا۔

"علاج کروانے ہی تو گیا تھا ہیلن آف ٹرائے کے پاس۔" اس کے ذو معنی انداز پر چونکی۔

"بھئی آپ کی بیسٹ فرینڈ کو ہیلن آف ٹرائے کہہ رہا ہوں۔" اس نے فوراً ہی وضاحت کی۔ "ایسا ایسا علاج کیا انہوں نے کہ ابھی تک دماغ کی ساری چولیں ہل رہی ہیں۔" اس نے اتنے مزے سے کہا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی عائشہ کو ہنسی آگئی۔

"ویٹس گڈ' ایسے ہی ہنستی رہا کریں' یقین کریں بہت اچھی لگتی ہیں۔" وہ کھلے دل سے کہہ رہا تھا۔

"یہ مکھن والی فیکٹری اپنے گھر ہی چھوڑ کر آیا کریں۔" عائشہ نے بھی اسے چھیڑا۔

"آج کل تو سارا ہی کام ٹھپ ہوا پڑا ہے' اللہ میرے بزنس پارٹنر کے ضمیر کو جگائے رکھے' ورنہ میں نے تو اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔" اس نے کھلے دل سے اپنی کوتاہی کا اعتراف کیا۔

"تو ادھر ادھر مٹر گشت کرنے کے بجائے ذرا اپنے کام کاج پر توجہ دیں' کس نے مشورہ دیا ہے کہ سارا دن سڑکیں ناپتے رہیں۔" عائشہ نے بھی اس کی ٹھیک ٹھاک کلاس لی۔

"بھئی غم جاناں سے نکلوں تو غم دوراں کی طرف توجہ دوں نا۔" وہ ابھی بھی غیر سنجیدہ تھا۔

"ویسے اچھی لڑکی! میں سوچ رہا ہوں کہ ایک آدھ محبت اور کر ہی لوں۔" رامس کی آنکھوں میں شرارت کے سب ہی رنگ تھے۔

"پہلی فرصت میں کرلیں' کم از کم میرا تو پیچھا نہیں کریں گے نا۔" عائشہ نے جل کر کہا۔

"آپ کا پیچھا تو ساری زندگی کروں گا' یہ آج لکھ لیں آپ۔" اس کے لہجے میں کچھ تھا جو عائشہ بری طرح الجھن کا شکار ہوئی۔

"وہ کس خوشی میں۔" اس نے سپاٹ انداز سے پوچھا' اسے اب اس باتونی شخص سے گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔

"خوشی کا کیا ہے' کوئی بھی بنالیں۔" وہ ہاتھ جھاڑ کر کھڑا ہوا اور دونوں بازو سینے پر باندھ کر بڑے اطمینان سے بولا۔

"میرا خیال ہے کہ مجھے اب چلنا چاہیے' بہت تنگ کرلیا آپ کو۔" اس کی بات پر عائشہ نے سکون کا سانس لیا۔

"ویسے میری ماما آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ وہ دیکھنا چاہ رہی ہیں کہ آخر وہ کون سے دو بہن بھائی ہیں جن کا میں سارا دن ذکر کرتا ہوں۔" رامس کی آخری بات نے اسے پھر بے سکون سا کیا۔

"مجھ سے مل کر انہیں مایوسی ہی ہوگی۔" عائشہ پر قنوطیت سوار تھی۔

"اس کا فیصلہ تو بعد میں ہوگا' یہ بتائیں کہ ماما کو کب لے کر آؤں آپ کے گھر' پھر اس کے بعد آپ کو ایک خاص شخصیت سے بھی ملواؤں گا۔" رامس کی گول مول باتوں نے حقیقت میں اس کا سر گھما دیا تھا۔

"جب دل چاہے لے آئیے گا اور کس خاص شخصیت سے ملوانا ہے مجھے۔" اس کے چہرے پر تجسس دیکھ کر وہ شوخی سے بولا۔

"پکچر ابھی باقی ہے میرے دوست۔" وہ جاتے جاتے ایک دفعہ پھر شرارت کر گیا۔ عائشہ کو سچ مچ غصہ آگیا۔

"یہ دیکھو' جان چھوڑو' مجھے اس پینٹنگ پر کام کرنا ہے۔" عائشہ نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے تو وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"پہلے اپنی زندگی کے کینوس کے رنگ تو بہتر کرلیں جو روکھے پھیکے ہو رہے ہیں' پھر کسی نئی پینٹنگ پر بھی

کر لیجیے گا۔" اس کے شوخی بھرے انداز پر وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام کر اسی بینچ پر دوبارہ بیٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"کیسی طبیعت ہے بیٹا آپ کی؟" ڈاکٹر نجم انصاری جو کچھ دن پہلے ہی ٹرانسفر ہو کر اس وارڈ میں آئے تھے۔ خاصے سینئر تھے اور آج کل راؤنڈ بھی وہ ہی لے رہے تھے۔ ڈاکٹر خاور کچھ دن کی چھٹی پر تھے۔ ڈاکٹر نجم انصاری کو بھی سکینہ کے ساتھ کچھ ہی دنوں میں خصوصی لگاؤ ہو گیا تھا۔ آج ان کے ساتھ ڈاکٹر زویا بھی تھیں' جو خاصی کینہ توز نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"بہتر ہوں ڈاکٹر صاحب۔" سکینہ نے اٹھنے کی کوشش کی تو انہوں نے اسے لیٹے رہنے کا اشارہ کیا۔

"کمر کا درد کیسا ہے؟" انہوں نے اگلا سوال کیا۔

"وہ تو دن بہ دن بڑھتا ہی جا رہا ہے۔" سکینہ نے صاف گوئی سے بتایا۔

"ڈاکٹر صیب! یہ نمانی تو ساری ساری رات کروٹیں بدلتی ہے درد کی وجہ سے۔" جمیلہ مائی نے ذرا تفصیل سے سکینہ کا احوال دیا۔

"اللہ کرم کرے گا۔ میں نے کچھ انجکشن لکھ دیے ہیں' رات والی ڈرپ میں لگا دیے جائیں گے۔ اس کے بعد نیند بہتر طریقے سے آجائے گی۔" ڈاکٹر نجم نے جمیلہ مائی کی تسلی کروانے کی بھرپور کوشش کی۔

"انصاری صاحب ذرا اور تسلی کروا دیں' یہ ڈاکٹر خاور کی بہت خاص پیشنٹ ہیں۔" زویا کے طنزیہ لہجے پر جمیلہ مائی کے چہرے پر ایک تاریک سا سایہ دوڑا۔

"بھئی' ڈاکٹرز کے لیے تو سارے ہی مریض اہم ہوتے ہیں۔" ڈاکٹر نجم نے سکینہ کی فائل پر ایک نوٹ لکھتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔

"لیکن کچھ سب سے اہم بھی ہوتے ہیں۔" زویا کا لہجہ تنفر میں ڈوبا ہوا اور آنکھوں سے شعلے سے نکل رہے تھے۔

"ایسی بات ہے تو آج سے سکینہ ہماری بھی خاص

پیشنٹ ہوئیں' کیوں بیٹا!" ڈاکٹر نجم کے محبت بھرے انداز پر سکینہ کا دل بھر آیا۔ اس نے فوراً" آنکھیں جھکا لیں۔

"ڈاکٹر زوبیا کی باتوں کو دل پر لینے کی ضرورت نہیں' یہ تو حسد کی آگ میں جل کر پاگل ہو رہی ہے۔" سسٹر ماریہ نے ان دونوں ڈاکٹرز کے باہر نکلتے ہی سکینہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔ اس کی بات جمیلہ مائی نے بھی سن لی تھی۔

"اللہ ہم سب کو ہدایت دے۔" جمیلہ مائی نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ وہ جائے نماز بچھا کر نماز حاجت کے لیے کھڑی ہو گئیں۔

"اماں خیر ہے نا' تو کل سے کچھ چپ چپ سی ہے۔" سکینہ نے قرآن پاک پڑھتے ہوئے اماں کا اداس چہرہ دیکھا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ اماں کل سے بالکل خاموش ہیں۔

"ٹھیک ہوں پتر' اللہ خیر سکھ کا ویلا لائے۔" جمیلہ مائی نے اپنا مخصوص جملہ بولا اور تسبیح میں مگن ہو گئیں۔

"اماں کوئی پریشانی ہے کیا؟" سکینہ نے قرآن پاک بند کر کے غلاف چڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"دوسروں کی خوشیوں کی خبریں پریشانی والی تھوڑی ہوتی ہیں۔" جمیلہ مائی نے بہت عجیب سی بات کی' سکینہ چونک گئی۔

"کون سی خوشی کی خبر؟" سکینہ نے اماں کا سنجیدہ چہرہ غور سے دیکھا۔

"کوئی نہیں پتر۔" جمیلہ مائی نے نہ جانے کیوں اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

"بتا دے نا اماں! آج نہ سہی' کل تو بتائے گی نا۔" سکینہ نے اس سے اگلوانے کے لیے اصرار کیا۔

"جاجی کی بے بے نے اس کی بات اپنی بہن کے گھر طے کر دی ہے' مجھے تیرے ابے کا فون آیا تھا۔" جمیلہ مائی نے بلی تھیلے سے باہر نکال ہی دی۔

"جاجی کی بات؟" سکینہ چونکی' اس کے اندر سکون کا ایک دل آویز سا احساس دور تک اترتا گیا۔ "اماں! یہ تو واقعی اچھی بات ہے' تو نے بے بے کو فوراً" مبارک باد دینی تھی نا۔" اس کے انداز میں اطمینان کا عنصر نمایاں تھا۔ جمیلہ مائی تسبیح کرنا بھول کر اس کا چہرہ غور سے دیکھنے لگیں۔

"پتر! تجھے دکھ تو نہیں ہوا؟" جمیلہ مائی نے محبت اور شفقت سے بھرپور لہجے میں کہا۔

"دکھ؟ وہ کیوں اماں!" سکینہ کے لہجے میں آہستہ آہستہ توازن آتا جا رہا تھا۔ جمیلہ مائی تھوڑا سا تذبذب کا شکار ہوئیں۔

"تو اس کی بچپن کی منگ جو تھی۔" جمیلہ مائی نے تھوڑا سا جھجک کر کہا تو سکینہ کھلکھلا کر ہنسی۔

"دفع کر اماں' ایسی باتوں کو میں تو شروع دن سے خار کھاتی تھی' تجھے پتا تو تھا۔" سکینہ کے لہجے میں حقیقی خوشی کی کھنک تھی۔ یہ ہنستے ہوئے اسے اچانک یاد آیا۔

"کہیں اماں! تجھے اس بات کا رنج تو نہیں ہو رہا۔" سکینہ نے بغور اپنی ماں کا چہرہ دیکھا۔

"تھوڑا سا دکھ تو ہوا تھا پتر! پھر خیال آیا کہ اللہ سوہنے کو یہی منظور ہو گا۔" جمیلہ مائی نے کمال ضبط سے آنکھیں بند کر کے اور تیزی سے تسبیح کے دانے گرانے شروع کر دیے۔ سکینہ کو پتا چل گیا تھا کہ اماں کے لیے یہ مرحلہ سخت دشوار اور صبر آزما ہے۔ اس لیے اس نے بھی اسے مزید نہیں چھیڑا۔

☆ ☆ ☆

ماہم' علی کے ساتھ ایک بھرپور لنچ کر کے ابھی ابھی گھر پہنچی تھی۔ خوشی کا احساس اس کے انگ انگ سے نمایاں تھا۔ اس نے علی کو آج متاثر کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔ اتنا تو اسے بھی احساس ہو گیا تھا کہ علی کو ظاہری خوب صورتی کے بجائے باطن کی خوب صورتی زیادہ مائل کرتی ہے۔ یہی وجہ تھی اس نے اپنا ہوم ورک مکمل کر کے اس پر کام شروع کیا تھا۔ اتنا تو ماہم منصور کو بھی پتا تھا کہ اسے اپنے کسی بھی قسم کے پروجیکٹ میں کبھی ناکامی کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ وہ جو دل میں ٹھان لیتی تھی۔ اس کے بعد اس کو پایہ

تکمیل پر پہنچا کر ہی دم لیتی تھی۔

"ہائے ممی! آپ کے چہرے پر کیوں بارہ بجے ہوئے ہیں۔" ٹی وی لاؤنج میں آتے ہی ماہم نے انتہائی بے زار بیٹھی ثمن آپی کو مخاطب کیا۔

"دیکھو کتنی گھٹیا نکلی انفر کی فیملی۔" وہ پھٹ پڑیں۔ "ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے نہیں اور اس کے رشتے کی تلاش بھی شروع کر دی۔" ماہم نے حیرت سے ان کا غصے کی زیادتی سے بگڑا چہرہ دیکھا۔

"تو آپی کرنے دیں' آپ کو کیا مسئلہ ہے۔" اس نے ہلکے پھلکے انداز سے کہا۔

"مجھے مسئلہ یہ ہے کہ میرا بیٹا ہے ان جاہل لوگوں کے گھر۔" ثمن آپی کو پہلی دفعہ احیان کی یاد آئی تھی۔

"تو آپ کورٹ کے ذریعے اپنا بیٹا واپس لے لیں۔" ماہم نے سادہ سا حل بتا کر ٹی وی آن کیا۔ جس پر ثمن کا ہی شو دوبارہ ٹیلی کاسٹ ہو رہا تھا۔

"واہ آپی! آفت لگ رہی ہیں آپ۔" ماہم کی تعریف پر ان کا چہرہ کھل کر انار بن گیا۔ ایک لمحے کو تو احیان اور انفر کی فیملی کا دکھ بھی انہیں بھول گیا۔

"وہاں سیٹ پر بھی سب کی نظریں مجھ پر سے نہیں ہٹ رہی تھیں۔" انہیں یاد آیا۔

"ہٹ بھی کیسے سکتی تھیں۔ قسم سے پورے سیٹ پر صرف آپ ہی ہیں' جس پر سے نظر ہٹانا دشوار ہو رہا ہے۔" ماہم کے توصیفی لہجے نے ان کی ساری کوفت کا مداوا کر دیا۔

"اب تو ایک اور چینل والے بھی مجھے اپروچ کر رہے ہیں۔" ثمن آپی کو اپنا بیٹا بالکل ہی بھول گیا تھا۔ "اتنی گلیمرس لائف اور آدھی دنیا آپ کے پیچھے پاگل ہو تو کس کافر کا گھر بیٹھنے کو دل کرتا ہے۔" وہ کھل کر میدان میں اتر آئیں۔ مگر ان کے سیل فون پر آنے والی کال نے ان کی گفتگو میں تعطل ڈال دیا۔ ان کی لمبی کال سے تنگ آ کر ماہم اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ فریش ہو کر اس نے کھڑکی سے پردے ہٹائے۔ سامنے پہاڑیوں پر ایک خوب صورت شام اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ اتر رہی تھی۔

وہ ٹیرس کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے طبیعت کو طمانیت کا احساس بخشا تھا۔ آج کا لنچ اس کی زندگی کا خوب صورت ترین لنچ تھا۔ اس نے علی کے ساتھ ڈھیروں باتیں کیں۔

"وہ وقت دور نہیں' جب میں جیسا چاہوں گی' ویسا ہی ہو گا۔" اس نے ایک دفعہ پھر خود کو یاد دلایا۔ سامنے پہاڑیوں پر لگے سبزے کو دیکھتے ہوئے اچانک اس کی نظر سڑک کے دوسری جانب عائشہ کے بنگلے پر پڑی۔ جس کا گیٹ کھل رہا تھا۔

"رامس اور اس کی ماما عائشہ کے گھر۔۔۔" درمیانی فاصلہ زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے اس نے ایک نظر میں گھر سے نکلنے والی گاڑی میں بیٹھے رامس اور اس کی ماما کو پہچان لیا تھا۔

"یہ لوگ' اس کے گھر کیسے؟" ماہم کے دماغ میں دھماکا سا ہوا۔ وہ سخت بے یقینی سے گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے رامس کو دیکھ رہی تھی جو اپنی ماما کی کسی بات پر کھل کر ہنس رہا تھا۔

"یہ عائشہ اور رامس میرے ساتھ کیا کھیل' کھیل رہے ہیں؟" اس کا دماغ بھک کر کے اڑا۔ ماہم کا شمار ایسے لوگوں میں ہوتا تھا جو اپنی پسندیدہ چیز سے دل بھر جانے کے بعد بھی کسی اور کے حوالے کرنے کا حوصلہ نہیں کرتے۔ ایک دم سے ماہم کی نظر کھلے گیٹ سے پورچ کی جانب بڑھتی ہوئی گھر کے داخلی دروازے پر ٹھہر گئی' جہاں موحد' عائشہ اور اس کی ماما یقیناً" مہمانوں کو سی آف کرنے کے لیے گیٹ تک آئے تھے۔

"اتنا اسپیشل پروٹوکول' آخر کس سلسلے میں۔۔۔" ماہم نے بڑی سرعت سے سوچا' لیکن کوئی بھی سرا ہاتھ نہیں لگا۔ اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ عائشہ کو جا کر کھری کھری سنا آئے۔ دماغ میں ایک لاوا سا کھول رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"وہ آخر مجھے اتنا بے وقوف کیوں سمجھتا ہے۔"

عائشہ جب سے گھر آئی تھی، بس یہی ایک بات سوچ رہی تھی۔ اس دن محفل موسیقی سے وہ موحد کو زبردستی خرابی طبیعت کا بہانہ کر کے گھر لے آئی تھی اور گھر آکر بھی بے چین رہی۔

"پہلے ماہم اتنا عرصہ مجھے بے وقوف بناتی رہی، اب اس کی کمی رہ گئی تھی۔" اپنے اسٹوڈیو کی صفائی کرتے ہوئے ایک تلخ سوچ نے اس کے ذہن کا احاطہ کیا۔

"انسان کو اتنا سادہ دل بھی نہیں ہونا چاہیے کہ اس کی سادگی ہی اس کا سب سے بڑا امتحان بن جائے۔" موحد کی وہ بات اس کے ذہن میں ابھری۔

"لیکن، ان دونوں نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا۔" قنوطیت نے بڑی قوت سے ایک بھرپور حملہ کیا۔ وہ وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔

"اب وہ مجھے کس خوشی میں صفائیاں دینا چاہتا ہے۔" وہ حد درجہ بدگمان تھی۔

"تم نے بھی تو آج اگلے پچھلے سارے ہی حساب برابر کر دیے۔ اس لیے اب کیوں افسردہ ہو۔" دل نے عجیب سے موقع پر یاد دلایا۔

"میرا حق بنتا تھا۔ آخر لوگ کب تک میرے ساتھ برا کرتے رہیں گے۔" دماغ نے اسے سیدھی راہ پر رکھنے کی کوشش کی۔

"لیکن وہ بے چارہ، کتنا پریشان اور کمزور سا لگ رہا تھا۔ تم کم از کم اسے ایک صفائی کا موقع تو دیتیں نا۔" دل نے دہائی دی۔

"تم نے بھی تو دن رات کی اذیت سہی ہے۔ اسے بھی کچھ اس کا احساس ہونے دو۔" دماغ نے اس کی طرف داری کی۔ دل اور دماغ کی اس کشمکش سے تنگ آکر وہ اسٹوڈیو سے باہر نکل آئی۔ سامنے ہی لاؤنج میں موحد اپنے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھتے ہوئے کسی گہری سوچ میں تھا۔

"کیا ہوا بھائی؟" عائشہ کو اس کے چہرے پر کسی انہونی کا احساس ہوا۔

"کچھ نہیں، اپنے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھ رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ کیا کسی بھی خوشی پر میرا حق نہیں۔" موحد کی بات پر اس نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"آپ آج آفس نہیں گئے۔" عائشہ کو اس کے رف سے حلیے سے احساس ہوا۔

"دل نہیں چاہ رہا تھا۔" وہ افسردگی کی انتہا پر تھا۔

"دل کی باتوں پر چلنے سے بزنس نہیں چلتے اور دل کا کام تو بس خوار کرنا ہے۔" عائشہ اس کے پاس ہی فلور کشن پر بیٹھ گئی۔

"تمہیں ہاتھ دیکھنا آتا ہے عائشہ۔" موحد نے بڑے عجیب لہجے میں پوچھا۔

"نہیں بھائی، مگر ہوا کیا ہے۔" عائشہ نے محبت سے اس کے ہاتھ تھامے۔

"پتا نہیں میری خوشیوں کی ہر راہ پر وہ لڑکی آکر اس خوشی کو ملیامیٹ کیوں کر دیتی ہے۔" موحد افسردہ کم اور مایوس زیادہ تھا۔

"ماہم۔" عائشہ چونکی۔ "اب کیا کیا اس نے۔"

"یہی تو سارا مسئلہ ہے کہ وہ کچھ نہیں کرتی، لیکن پھر بھی بہت کچھ کر جاتی ہے۔" موحد کی بات پر وہ بری طرح الجھ سی گئی۔ اس نے کھوجتی نگاہوں سے اپنے بھائی کا چہرہ دیکھا۔

"آپ کی دوست کیسی ہے۔ کوئی لڑائی تو نہیں ہو گئی۔"

"لڑائی تو نہیں ہوئی، لیکن مجھے نہیں لگتا کہ وہ مجھ سے دوبارہ کوئی تعلق رکھے گی۔" موحد نے پہلی دفعہ کھل کر اس سے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

"اللہ نہ کرے، ایسا کیوں کہہ رہے ہیں آپ۔" عائشہ نے دہل کر اس کا چہرہ دیکھا، جو خاصا تاریک تھا۔

"میں نے اس کے سامنے ماہم کے بارے میں کھل کر اپنے خیالات کا اظہار جو کر دیا۔" وہ بچوں کی سی معصومیت سے بولا۔

"تو کیا ہوا۔" عائشہ الجھی۔ "اس سے، اسے کیا فرق پڑتا ہے۔" اس نے ہلکی سی خفگی سے پوچھا۔

"وہ اس کی بہت بڑی فین ہے۔" موحد کی بات پر عائشہ کو کرنٹ سا لگا۔ "ماہم کی فین۔" اسے یقین نہیں آیا۔

"ہاں، اس کے پاس وہ اکثر جاتی رہتی ہے۔" موحد نے سنجیدہ انداز میں کہا اور گلاس وال سے باہر برستی بارش کو دیکھنے لگا۔

"کیا اس نے آپ سے کوئی ایسی بات کہی ہے۔ جس سے آپ پریشان ہو گئے ہیں۔" عائشہ نے اس کے ہاتھوں کو سہلاتے ہوئے پوچھا۔

"محبت میں ضروری تو نہیں کہ ہر بات کہی جائے، انسان بعض دفعہ تو بس مبہم اشاروں سے بھی ساری گفتگو سمجھ لیتا ہے۔" موحد نے اسے لاجواب کیا۔

"اگر اسے واقعی آپ سے محبت ہوئی تو بے فکر رہیں، وہ کہیں نہیں جائے گی۔" عائشہ نے اسے تسلی دی تو وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا۔ جیسے اس کی بات کا یقین نہ آرہا ہو۔ عائشہ کچھ دیر تو اس کے پاس بیٹھی رہی۔ لیکن شاید موحد کا مزید گفتگو کرنے کا کوئی موڈ نہیں تھا۔ اس لیے اٹھ گئی۔ اپنے کمرے میں جا کر اس نے شاور لیا اور گاڑی کی چابی لے کر باہر نکل آئی۔

بک بینک پر کتابوں کے درمیان گھنٹوں وقت گزارنا عائشہ کا من پسند مشغلہ تھا۔ اس لیے اسے جب بھی وقت ملتا۔ وہ کتابوں کی خریداری کے لیے یہاں کا رخ کرتی۔ اس وقت بھی وہ انگلش سیکشن سے نکل کر اردو سیکشن میں آگئی تھی۔ نئی آنے والی کتابوں کی لسٹ اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اس شاپ کی ایک ریگولر کسٹمر تھی۔ اس لیے زیادہ تر ملازمین اسے پہچانتے تھے۔

اپنی پسند کی کتابیں ریک سے نکال کر وہ دھیرے دھیرے سیڑھیاں اترتے ہوئے گراؤنڈ فلور پر واقع کاؤنٹر کی طرف بڑھی لیکن وہاں پہلے سے موجود لڑکی کو دیکھ کر وہ چونک گئی۔ وہ کاؤنٹر پر موجود لڑکے کے ساتھ بحث کر رہی تھی۔

"یہ تو وہ ہی لڑکی ہے جو اس دن علی کے ساتھ تھی۔" وہ اپنی جگہ پر ٹھٹک کر رہ گئی اور آخری سیڑھی پر آکے رک گئی۔ اس کی نگاہیں اس لڑکی پر جمی تھیں جو اچھی خاصی خوب صورت اور دلکش تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ غصے کی زیادتی سے سرخ ہو رہا تھا۔

"دیکھیں میم! ہمیں آپ کے ہزبینڈ نے اسی کتاب کا آرڈر کیا تھا۔" کاؤنٹر پر کھڑے ملازم نے اسے صفائی دینے کی کوشش کی۔

"علی نے میرے سامنے آپ کو آرڈر لکھواتے وقت یاد دہانی کروائی تھی کہ اس کا نیو ایڈیشن منگوایے گا۔" اس کی بات پر سیڑھیوں پر کھڑی عائشہ کے پاؤں وہیں منجمد ہو گئے۔ اس کا دماغ سن سا ہو گیا۔ وہ منہ کھولے سخت حیرت، صدمے اور بے یقینی سے اسی لڑکی کو دیکھے جا رہی تھی۔ جس نے اشتعال کے عالم میں کال ملائی۔

"علی... ذرا اسے بتائیں کہ آپ نے اسے نیو ایڈیشن کا کہا تھا یا اولڈ کا۔" اس لڑکی کا استحقاق بھرا انداز عائشہ کو ایک لمحے میں یقین دلا گیا کہ وہ غلط نہیں تھی۔

"یہ لیں میرے ہزبینڈ سے بات کریں۔" اس نے سیل فون شاپ کیپر کی طرف بڑھایا جبکہ عائشہ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ سیڑھیاں طے کر کے گراؤنڈ فلور پر جا سکے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سمیرا حمید

محبت مرحوم

عدن کیپ ٹاؤن کے ساحل پر اکیلے ہی چہل قدمی کر رہا تھا۔ غصے میں جی تو اس کا چاہا کہ قریب و جوار میں نامناسب لباس پہنے، چہل قدمی کرتی، شوخ و شنگ کسی ایک آدھ لڑکی کی کمر میں اپنے بازو حمائل کر دے اور نہیں تو انہیں آنکھ ہی مار دے اور اس اشارے پر جب کوئی اس کے قریب آجائے تو وہ اسے لنچ کے لیے لے جائے۔ رات میں ڈنر کے لیے اور پھر ڈسکو کے لیے اور پھر۔۔۔

لیکن ماریہ سے بدلہ لینے کی شدید خواہش کے باوجود اس کا جی نہ مانا کہ وہ اپنے دوسرے ہنی مون پر یہ سب کرے۔ شادی سے پہلے کی اور بات تھی۔ اس وقت جب کبھی وہ دوسرے ملک تفریح کے لیے گیا، ایسے بہت سے کام کیے۔ ویسے ہی کام جو مذہب کے دائرے سے پرے تو ہیں ہی۔ ساتھ ساتھ معاشرتی مزاج پر بھی بہت بھاری پڑتے ہیں۔

ذرا سے فاصلے پر بنے کپل ہٹیں (HUTS) میں سے ایک میں ماریہ سو رہی تھی۔ ماریہ۔۔۔ زمنی حور۔۔۔ ازبکستان کی پیدائشی۔ اپنی ماں کی طرح گہری سبز آنکھوں والی اس کی بیوی الٹی پلٹی سی۔۔۔ عدن نے بہت سے الٹے مزاج کے لوگ دیکھے تھے۔ ایک وہ خود بھی تھا۔ لیکن ماریہ جیسی الٹی شخصیت اسے اب تک ایک ہی ملی "ماریہ خود"۔

جب وہ آرہا تھا تو اس نے کہا کہ اسے سونا ہے۔ اب جب وہ واپس جائے گا تو وہ کوئی فلم دیکھ رہی ہوگی یا گھنٹوں سے واش روم میں ہی ہوگی۔ اسے واپس آئے چند منٹ ہی گزریں گے تو وہ خود چہل قدمی کے لیے باہر

مکمل ناول

جائے گی۔ اگر اسے جانا ہی تھا تو اس کے ساتھ کیوں نہیں؟ اب اگر وہ یہ بات پوچھے گا تو ہنی مون تباہ کرے گا۔ ڈھیٹ بن کر وہ اتنا ضرور کہے گا۔

"میں بھی آؤں ساتھ....؟"

وہ پلٹ کر دیکھے گی بھی نہیں اور چلی جائے گی۔ عدن کو جواب دیے بنا صرف وہی ایسے جا سکتی ہے۔ جا کر وہ واپس آنا بھول جائے گی۔ فون کشن کے نیچے، باتھ ٹب کے پاس یا کسی ڈرا میں رکھا ہو گا۔ وہ اپنے ساتھ صرف امریکن کریڈٹ کارڈ لے کر نکلتی ہے۔ ناچار وہ اکیلا ہی ڈنر کرے گا۔ ایک بار وہ اسے ڈھونڈتا کلب جا پہنچا۔ وہ بے خود ایک کونے میں پڑی تھی۔ اگر وہ نہ جاتا تو وہ ساری رات وہیں پڑی رہتی۔ لیکن ایسا فی الحال ایک ہی بار ہوا تھا۔ مگر دوبارہ ہو بھی سکتا تھا کیونکہ وہ اسے ساتھ کم ہی رکھتی تھی۔ دل چاہا تو ساتھ۔ ورنہ دور دور۔

وہ اچھے سے اچھے ہوٹل، ریسٹورنٹ، مون لٹ ایریاز، ٹریولرز ہنٹ انواع اقسام کے کلبوں کے بارے میں معلومات کرتا ہوٹلوں میں سیٹیں، سمندر میں جہاز بک کرواتا۔ مگر وہ جا کر نہ دیتی۔ اگر چلی بھی جاتی تو منہ ایسے بنایا ہوتا۔ جیسے کسی ناگوار، بدبودار جگہ آ بیٹھی ہو۔ یہ ان کا ہنی مون تھا۔ جس پر ماریہ کے ڈیڈ نے بے تحاشا پیسہ خرچ کیا تھا۔

"تم کتنا بور ہوتی ہو۔" دراصل وہ کہنا چاہتا تھا کہ تم کتنا بور کرتی ہو۔

ماریہ نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا اور کھانا کھاتی رہی۔ خاموشی کا یہ وقفہ عدن کی بے عزتی کیے جا رہا تھا۔

"میرے تجزیہ نگار نہ بنو۔" کچھ وقت کے بعد اس نے جواب دیا۔ لیکن کیا خوب دیا۔ اس رات کا ڈنر بھی تباہ ہو گیا۔

وہ کسی بات، کسی چیز سے خوش ہوتی ہی نہیں تھی چیزیں تو خیر اس نے بہت برتی ہوں گی۔ مگر شوہر تو وہ پہلا تھا۔ کبھی وہ خوش کر دیتی۔ کبھی خوشی چھین لیتی۔ کبھی کندھے پر خود ہی سر رکھ دیتی اور کبھی اپنے کندھے پر سر رکھنے بھی نہ دیتی۔

"یہ تمہارا پلان کیا ہوا ہنی مون ہے؟" ایک دن وہ بری طرح سے چڑ گیا۔

"میرا نہیں ڈیڈ کے سیکریٹری کا۔"

"اس نے تمہاری پسند سے ہی کیا ہو گا۔"

"ہاں! تو مجھے یہ سب پسند ہے۔"

"لگتا تو نہیں ہے۔" سچی بات بھی اس کے سامنے ڈر ڈر کے کرنا پڑتی تھی۔

"کیسے لگے گا؟" وہ صاف برا مان گئی۔

عدن کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ نہ ہی کوئی نیا سوال، جواب بھی بہت تھے اور سوال بھی۔ لیکن اس اکلے مزاج والی کے لیے اب کچھ اور کہنا نہیں چاہتا تھا۔

"ایم او کے... کول ... پرفیکٹ۔ اس طرح منہ پھاڑ کر مجھ پر تبصرہ نہ کیا کرو۔"

عدن چپ ہو گیا تھا لیکن وہ نہیں رکی اس کے منہ پھاڑ انداز پر وہ تلملا کر رہ گیا۔ زیر لب گالیاں دیں۔ اپنے ہنی مون پر صرف چالیس دن پرانی بیوی، سویٹ ہارٹ کو گالی دی۔

شاید یہ گالی دینے کی نوبت اتنی جلدی نہ آجاتی۔ اگر دبئی پام سٹی میں اس نے ماریہ کے ساتھ اس کے ذاتی ولا میں قیام نہ کیا ہوتا۔

ان دونوں کی شادی پاکستان میں ہوئی تھی ولیمہ دبئی پام سٹی میں دیا گیا ولا میں ہی دونوں نے دو ہفتے قیام کیا۔ دونوں کی فیملیز واپس جا چکی تھیں۔ شروع کے دن کافی پربہار اور ہنگامہ خیز تھے۔ دونوں گھنٹوں سوئمنگ کرتے، نت نئے ہوٹلز جاتے، ماریہ کے دوستوں کی طرف سے دی گئی چند پارٹیز اٹینڈ کیں۔ کلب اور سینما کے چکر لگائے۔

ماریہ کے ایک شیخ دوست طاہر البشر نے انہیں ڈنر پر بلایا۔ بقول شیخ "رہائش گاہ" اور بقول عدن "چھوٹے سے محل" میں انہیں دعوت طعام دی گئی واپسی پر انہیں دبئی کے ایک پوش علاقے میں واقع ایک اپارٹمنٹ گفٹ کیا گیا۔ لیکن یہ سب بھی اتنا

توجہ نہیں تھا۔ نہ شیخ کا محل۔ نہ ہی سونے چاندی کے برتن۔ بس وہ خوش آمدیدی اور الوداعی انداز... دائیں بائیں گال پر بوسے، جو شیخ اور ماریہ دونوں کی طرف سے تھے۔

ان روایتی ملاقاتی اندازوں کو عدن خوب جانتا تھا۔ لیکن صرف یہ روایتی انداز ہی نہیں تھا۔ ماریہ نے بغیر آستین کا سنہرا گاؤن پہنا تھا اور شیخ کو ماریہ کے علاوہ کچھ نظر ہی نہیں رہا تھا۔ عدن نے کمال بے غیرتی سے نظریں ادھر ادھر کیں۔ لیکن اس کے اندر سوال جواب شروع ہو گئے۔ نیا نیا تھا نا۔ ابھی عادی نہیں تھا۔ شیخ صاحب کمال مہربانی سے اپنی ساری توجہ ماریہ پر نچھاور کرتے رہے۔ کمال کے انسان تھے۔ شوہر نام کی چیز پر صرف ایک نظر ہی ڈالی۔

اور اتفاقاً اس کی نظر بھی اس نام پر پڑ گئی، جو ماریہ کو اس کے گھر سے فیکس کی گئی رپورٹس پر لکھا تھا۔ وہ نام بھی "شیخ طاہر البشر" تھا۔

وہ اپنے لیپ ٹاپ پر چند ای میلز چیک کر رہا تھا۔ جب لائبریری میں ذرا قریب رکھی فیکس مشین میں فیکس آیا۔

"تمہارا فیکس آیا ہے ماریہ۔"

وہ ماریہ کو جانتا تھا کہ وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں ہے، جو شادی کے بعد شوہروں اور شادی سے پہلے بوائے فرینڈز کو اپنے پاس ورڈز دیتی ہیں۔ وہ یکجائی کی نہیں "الگ الگ" کی قائل تھی۔ وہ تو اس کے موبائل کو بھی ہاتھ تک نہیں لگا سکتا تھا۔ اگر وہ لیپ ٹاپ پر کام کرتی، کہیں اٹھ کر چلی بھی جاتی تو وہ اچک کر یہ کبھی نہیں دیکھ سکتا تھا کہ وہ اتنی دیر سے لیپ ٹاپ پر کیا کرتی رہی ہے۔ میڈ کو اس نے کہہ دیا تھا کہ اس کا ایک ضروری فیکس آنے والا ہے۔ وہ ضروری فیکس عدن کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی نظر نے صرف شیخ طاہر البشر کا پڑھا۔

وہ سوانا باتھ لے رہی تھی۔ چلائی... "ٹیبل پر رکھ دو۔" اسے یہ ڈر نہیں تھا کہ اس کا فیکس پڑھ لیا جائے گا۔ ڈریں غریب غربا... ماریہ کیوں ڈرے؟ آغا کی بیٹی کیوں ڈرے۔

تیار ہو کر وہ گاڑی لے کر نکل گئی۔ دو دن ایسے ہی صبح و شام جاتی رہی۔

"آج تو کہیں نہیں جانا؟" تیسرے دن اس نے ایسے ہی پوچھ لیا۔ اپنی موسٹ وانٹڈ بیوی سے۔ اس کے گال پر چٹکی بھر کر... لاڈ کرتے ہوئے... رومانس کے انداز میں۔

اس نے چٹکی بھرتے ہاتھ کو جھٹکا۔ "کیا مطلب؟"

"ایسے ہی..." ہاتھ جھٹکے جانے پر اسے پہلی بار پہلا صدمہ ملا۔

"چلی بھی جاؤں... آج بھی... اور جب بھی... تمہیں کیا؟" الفاظ سے زیادہ انداز برا تھا۔

"ہاں جی! ٹھیک۔ عدن کو کیا..." وہ منہ پھلا کر پہلی بار ناراض ہو کر باہر نکل گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ضرور محسوس کر کے اس کے پیچھے آئے گی۔ لیکن ڈیڑھ گھنٹے بعد جب وہ واپس گیا تو وہ جا چکی تھی۔ ملائیشین میڈ سے پوچھا۔ اس نے رٹی ہوئی انگریزی طرز پر کہا۔

"آئی ڈونٹ نو سر۔"

عدن کو کچھ سبکی سی محسوس ہوئی۔ اس جیسا لڑکا، جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر طیش میں آ کر موبائل فرش پر، دیوار پر دے مارتا تھا۔ اب صرف غصے میں ٹہلنے لگا۔ کس کے سامنے موبائل دیوار پر دے مارے۔ ٹی وی کے چینل بدلنے لگا۔ شام گزر گئی۔ ماریہ آئی۔ جوتوں سمیت بیڈ پر لیٹ گئی۔ بیگ بیڈ روم کے دروازے کے پاس گرا پڑا تھا۔ موبائل کی چین، سن گلاسز کو صوفے پر اچھالا گیا تھا۔ سن گلاسز صوفے کے کنارے سے گرنے کے قریب تھے۔

"ماریہ!" وہ اس کے اوپر جھکا۔ غصے کو ایک طرف کیا۔ اس کے بالوں کی ایک لٹ کو چھونا چاہا۔ اس نے جواب میں ایک مختصر سی اوں.... ں.... کی۔ اس انداز پر غصہ دوبارہ آ گیا۔ دراصل ماریہ ایک چیز تھی تو وہ بھی بہت زعم میں تھا۔ ماریہ پہاڑ کی چوٹی ہی کیوں نہ ہو۔

لیکن خود کو وہ' وہ جھنڈا سمجھ رہا تھا' جو فاتح لگاتا ہے۔ اس کے خیال میں ماریہ کو اس کے پیروں تلے ہو جانا چاہیے۔ بے شک خود گردن اکڑا کر چوٹی بنی کھڑی رہے۔

غصے سے وہ باہر آنے لگا تو دروازے کے پاس پڑا بیگ اٹھا لیا۔ باہر لے آیا... کھولا... اندر تین کاغذ تہہ کیے رکھے تھے۔

وہ بہت پڑھا لکھا تھا... امیر تھا... بہت سے مینرز جانتا تھا۔ لیکن اب غصے میں آکر وہ کاغذات پڑھنے لگا۔

مسز ماریہ شیخ طاہر البشو۔

اس نے آنکھیں سکیڑیں... لمحے بھر کو ذرا سا کانپا۔ باری باری تینوں کاغذات پڑھے... ایک فیکس تھا جو امریکا سے اسے کیا گیا تھا۔ دو رپورٹس تھیں جن کی تاریخ ایک دن پہلے کی تھی۔ تینوں کاغذات پڑھتے ہی اس کا دماغ ابلنے لگا۔ سوئی ہوئی ماریہ کو جھنجھوڑا۔

"یہ کیا بکواس ہے؟"

"واٹ؟" نیند سے اٹھائے جانے پر وہ غصے سے بولی۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے کاغذات اس کے سامنے لہرائے۔

وہ لپک کر اٹھی اور اس کے ہاتھ سے کاغذات جھپٹ لیے... "تمہاری اتنی جرأت..." وہ انگلش میں دھاڑی۔ وہ انگلش میں ہی بات کرتی تھی۔ اردو بہت کم بول اور سمجھ سکتی تھی۔ عدن اس کی جرأت پر حیران رہ گیا۔ الٹا وہ اسے یہ جتا رہی تھی کہ اس نے اس کے کاغذات کو بیگ میں سے نکالنے کی ہمت ہی کیسے کی۔ کمال کی بات ہے نا؟

"تم شیخ کی بیوی تھیں؟" اس کی آواز اور غصہ اور بلند ہو گیا۔

اس نے جیسے سنا ہی نہیں... کاغذات کو ہاتھ میں لیے الماری تک گئی۔ پٹ کھولا اور اندر رکھ کر مقفل کر دیا۔

"ماریہ!" عدن چلایا... مشرقی خوب صورت مرد اور خاص کر مشرقی شوہر کی بات کا جواب نہ دیا جائے اسے پیٹھ دکھا دی جائے۔ اس سے اچھا ہے کہ اس کے منہ پر چانٹا مار دیا جائے۔

"کیوں چلا رہے ہو؟" وہ پلٹی اور سنگل صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھی۔ ذرا سا جھک کر ایک ہاتھ سے پمپ شوز اتارے اور اسی ہاتھ کی سمت میں شوز اچھال دیا دوسرا شوز اتارا اور ویسے ہی اچھالا... اور ایک پاؤں کو جھلانے لگی۔ یوں جیسے اسے کسی بات کی پروا نہ ہو۔

"میں ڈاکٹر ہوں۔" وہ تنا ہوا کھڑا تھا۔ مرنے مارنے کے لیے تیار۔ غیرت مند پاکستانی شوہر۔

"تو...؟" انداز میں حیرت تھی' نہ سوال میں۔

"تمہاری رپورٹس پڑھ لی ہیں۔"

"گڈ..." پاؤں ہل رہا تھا۔

اس انداز پر عدن کا جی چاہا کہ اسے اٹھا کر باہر پھینک دے۔

"کچھ اور...؟" سوال تھا یا مذاق۔

"کتنے ابارشن کرا چکی ہو؟" عدن نے اپنی طرف سے اسے تھپڑ مارا کہ وہ بلک اٹھے گی۔

"صرف دو تک ہی نوبت آئی تھی۔" الٹا وہ بدکا۔ الٹا تھپڑ اسے ہی لگا۔ وہ تو مزے سے کہہ گئی۔

اگلے ڈیڑھ دو گھنٹے ان میں لڑائی ہوتی رہی۔ لڑائی بھی کیا۔ عدن ہی بھڑک بھڑک جا رہا تھا۔ وہ آزاد خیال بھی ہے اور آزادی بھی رکھتی ہے۔ وہ جانتا تھا۔ لڑ جھگڑ کر وہ قریبی ہوٹل آگیا۔ پاپا کو فون کیا۔

"وہ اس کی بیوی نہیں گرل فرینڈ تھی۔" اس نے ماریہ کی کہی ایک ایک بات پاپا کو بتا دی' تو انہوں نے کمال الفاظ سے اسے تسلی دی۔ "ایکس گرل فرینڈ۔"

ماریہ کو کچھ پیچیدگیوں کا سامنا تھا۔ اسی لیے اس نے دوبارہ دبئی کے اسی کلینک سے اپنا چیک اپ کروایا تھا۔ جس کے لیے اس نے امریکا سے اپنی رپورٹ منگوائی۔ اس کی تازہ ترین رپورٹ میں بھی بہت سے مسائل ہی تھے۔ اس کی طرف سے اب وہ مرے یا جیے... یا

بچے کے پہلو میں جا بیٹھے۔

"اتنا بوکھلا کیوں رہے ہو یار... تم بھی گرل فرینڈ ہی سمجھو۔ بیوی کسی اور کو بنا لینا... چند سال گزار لو... ابھی وہ تمہارے ساتھ ہے۔ تم اس کے شوہر ہو۔ وہ اپنے ڈیڈ کو پیاری ہے۔ اس کے ڈیڈ تمہیں پیار کریں گے۔ نا سمجھ مت بنو عدن... اتنے بڑے ہو گئے ہو... ایسے کیسے غصہ کرنے لگے ہو... وہ امریکا میں رہی ہے... پاکستان میں رہنے والیاں کم نہیں ہیں... لڑ ائی ہوا اس سے... وہ اپنے ڈیڈ کو بتائے گی۔ تمہیں بھی بتائے گی تو لڑ کر تم کر بھی کیا لو گے... میں بھی اسے جانتا ہوں... اس کے استاد صاحب نہ بنو... اس غلطی پر رکا... اس پر ڈانٹا... یار! عقل کہاں ہے تمہاری؟"

"پھر بھی... آپ کی بہو ہے وہ۔"

"یار! میں ان چکروں میں نہیں الجھتا۔ اتنا میں نہیں سوچتا۔ وہ بھی ایسے معاملات میں... چار دن نہیں ہوئے تمہاری شادی کو اور یہ سب... سیدھے رہو۔ ورنہ آنکھ کان بند کر لو... جب سنو گے نہیں' دیکھو گے نہیں تو ٹولو گے کیا۔"

وہ پہلو ہی بدلتا رہا۔

"سوچ کیا رہے ہو؟ جواب دو... ارے یار!"

"کیا جواب دوں؟"

"اچھا! چلو نہ دو... جاؤ! ماریہ کے پاس واپس۔"

ماریہ سے متعلق اس کے پاپا کے ہمیشہ سے ہی خیالات نادر رہے تھے۔ ماریہ ان کے لیے ایک عجوبے کی طرح تھی۔ جس کے سامنے کھڑے ہو کر وہ "کھل جا سم سم"... منتر پڑھ کر خزانے تک جا سکتے تھے۔

پاپا نے اسے اچھی طرح سے ٹھنڈا کر دیا۔ چند ہی گھنٹوں بعد وہ واپس چلا گیا۔ ماریہ کو ساتھ لیا۔ ڈنر کیا اور سب کچھ اوکے ہو گیا۔ پھر وہ ساؤتھ افریقہ آگئے۔

ماریہ کے ساتھ اپنی پہلی لڑائی اور پاپا کے ساتھ پہلے مکالمہ کے بعد اس نے خود پر بے غیرتی کے سب ہی دروازے کھول لیے۔ دراصل وہیں سے دوسرے بہت سے دروازے بند ہو گئے۔ لیکن بند ہونے والے دروازوں کی پروا کرتا کون ہے۔ اب وہ اسے اپنی گرل فرینڈ سمجھ رہا تھا۔ جبکہ وہ اس کی بیوی تھی اور یہی بیوی نما گرل فرینڈ "کھل جا سم سم" تھی۔

ساؤتھ افریقہ میں ماریہ کے مزاج کے مطابق دن گزار کر وہ امریکا' ہوسٹن آگئے۔ دو منزلہ چھوٹا سا اسپتال تیار کیا تھا۔ تزئین و آرائش اس نے اپنی مرضی سے کروائی۔ جراحی آلات' دیگر ساز و سامان اپنی نگرانی میں منگوایا۔

پہلی قسط اسپتال تیار تھا۔

پاکستان سے اس کے پاپا' ماما اور بہن آئی۔ سفید ربن کو اس کے سسر نے کاٹا۔ بلند بانگ قہقہہ اس کے پاپا نے لگایا۔ اس نے تالیاں بجائیں اور سب اسپتال میں داخل ہو گئے۔

پاپا نے اسے ایک آنکھ ماری جیسے۔

"اب کہو... کیا خیال ہے۔"

اس نے بھی جواباً" یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "جی... کمال کا خیال ہے۔"

اس افتتاح میں ماریہ شامل نہیں تھی۔ اس کی پروا کسے تھی۔ چند دن بعد وہ اسپتال آئی... ادھر ادھر گھوم پھر کر دیکھا۔ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ نہ جانے کیا ہوا۔ اس کی مسکراہٹ کے انداز پر عدن کا منہ بن گیا۔ لیکن ڈھیٹ ہی بنا رہا۔

"جتنے مرضی طنز کرلے گدھی۔" اسے ساتھ لے کر وہ لنچ کے لیے آگیا۔

ماریہ آج کل گھر سیٹ کررہی تھی۔ حیرت کی بات تھی کہ اپنی ازدواجی زندگی کی بنیاد گھر کو وہ بہت دل جمعی سے سیٹ کررہی تھی اور اس بنیاد کی بھی بنیاد "تعلق" پر اس کی نظر نہیں تھی۔ کبھی کبھار وہ اس سے بھی مشورہ لے لیتی... اس کی پسند کا پوچھ لیتی۔ پورے گھر میں ڈرائنگ روم کی ایک سائیڈ ٹیبل عدن کی پسند کی آئی تھی۔ وہ بھی نہ آتی تو عدن کو فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ یہی کافی تھا کہ ان کی بول چال میں تبدیلی آگئی تھی۔ ہلکی پھلکی دوستی بھی ہوگئی تھی۔ ایک ساتھ پرامن ڈنر کرلیتے۔ کبھی کبھار باہر چلے جاتے۔ سب ہی سُر نہ سہی ایک آدھ سُر ان کے رشتے کا ٹھیک بج ہی جاتا تھا۔ وہ اس کے لیے کریم کافی بناتی اور اس کی گردن پر ایک چٹکی بھرتی۔

کبھی کبھی وہ خوامخواہ ہنسنے لگتی۔ جب وہ کار کا دروازہ کھولتا۔ کھانے کی میز کی کرسی کھسکا کر کھڑا رہتا۔

"ڈیڈ ٹھیک کہتے ہیں... ٹھیک۔" انگلی لہراتی کہتی جاتی۔

اور وہ ہر بار یہ پوچھنے کی غلطی نہیں کرتا تھا کہ ڈیڈ کیا کہتے ہیں۔ ایک بار یہ عظیم غلطی کی تھی۔

"ہوں..." اس نے صرف دو انگلیوں کو موڑ کر ٹھوڑی کے نیچے رکھا۔ ہونٹوں کو نیم وا کیا۔ بولی کچھ نہیں۔ آنکھیں ذرا سی ترچھی اس کی طرف نکالیں۔ عدن کو مارلن منرو کی مشہور زمانہ تصویر یاد آگئی، جو کالج کے دنوں میں اس کے باتھ روم کے دروازے پر چسپاں تھی۔ بعدازاں اس نے اس کی جگہ کیٹی پیری کو چسپاں کردیا تھا۔

"انہوں نے کہا۔ وہ غلام علی غلام کا بیٹا ہے... جیسے چاہے سدھا لو۔"

عدن مسام در مسام بھیگ گیا۔ پاکستان کے نامور، اپنے شعبے میں قابل اور باکمال ڈاکٹر عدن اپنا دم خم کھو بیٹھا۔

"اور سنو... انہوں نے کہا... جو لوگ کاری ضرب دیتے ہیں۔ ان سے بچ کر رہنا... عدن سے تمہیں بچاؤ کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اس میں اتنا دم خم نہیں ہے۔"

بات کہہ کر نزاکت سے اٹھ کر وہ چلی گئی۔ جیسے فٹ بال میچ کے آخری لمحات میں فیصلہ کن گول کیا ہو اور اس کی ٹیم جیت گئی اور اتنی دیر سے، جو وہ محتاط کھیل رہا تھا... وہ پوچھ لینے کی ایک بڑی غلطی کا مرتکب ہوا تھا۔ بتا کر ماریہ نے اسے اور بڑا دشمن بنالیا تھا۔

کس بات کا دم خم؟ آنے والے وقت میں شاید وہ اسے بتا ہی دے گا۔ جتا بھی دے گا۔ اس کے ڈیڈ کے پاس صرف چند ہزار ملین ہی زیادہ تھے اس کے بابا سے... پیسے کا بس اتنا سا ہی فرق۔ ان کے پاس رقم روپوں میں تھی اور ان کے پاس ڈالروں میں۔ طاقت اور عقل تو مرد کے پاس ہی ہوتی ہے نا۔ تو اس طرف دو مرد تھے۔ عدن اور اس کے بابا غلام علی غلام اور اس طرف صرف آغا عباس حیدر... اور پھر عدن شوہر تھا۔ کتنے پوائنٹس تو ایسے ہی اپنے آپ مل جاتے ہیں۔ صرف شوہر ہی ہونے سے... وہ لائق فائق ڈاکٹر تھا۔ دنوں میں ہی کہاں کا کہاں پہنچ جائے گا اور ماریہ... حسن کی دیوی۔ اس حسن کے بل بوتے پر بھی ماڈلنگ کی فیلڈ میں کوئی نام نہیں بنا سکی۔ چند کمرشلز ہی کرسکی۔ باپ کا پیسہ بھی کام نہ دلوا سکا۔ ہالی ووڈ کی فلمیں تو بہت ہی دور کی بات تھی۔ عدن کو خود کو مطمئن رکھنے کے لیے بہت سے فلسفے مل جاتے تھے۔ بہت سی خامیاں۔ اسے ہر جگہ اپنی ہی کامیابی نظر آئی تھی... کاری ضرب تو وہ واقعی شاید نہ ہی دے سکے لیکن چھوٹی چھوٹی ضربیں وہ تیار کرسکتا تھا۔ جو کاری بن

جائیں گی اکٹھی ہو کر۔

وہ ماریہ سے فاصلے پر، لیکن دوست بن کر رہنے لگا۔ وہ کیا کررہی ہے۔ کہاں آجا رہی ہے۔ کس کس سے مل رہی ہے اور ایسی ہی دوسری باتیں امریکا میں رہتے تو وہ پوچھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اب اس نے توجہ دینی بھی چھوڑ دی۔ جب کبھی وہ اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتی، وہ چلا جاتا۔ وہی ماریہ کے ٹائپ کی پارٹیز... وہاں وہ ناچتی... نچاتی... اور لڑکھڑاتی واپس آجاتی۔ جی تو اس کا چاہتا کہ اسے کسی سڑک پر دھکا دے کر گرادے اور کوئی کار اس کا سر کچل دے۔ لیکن وہ اسے سہارا دے کر بیڈ تک لاتا۔ وہ جوتوں سمیت بیڈ پر اوندھی گرجاتی۔ عدن بڑبڑاتا اور دوسرے کمرے میں جاکر سوجاتا... پھر وہ اس کے ساتھ جانے سے ہی کترانے لگا۔ وہ بھی شوق میں اسے لے کر نہیں جاتی تھی۔ صرف وہیں جہاں کپل کیدر رنگ ہوتی۔ وہ نہ جاتا تو ماریہ کے ڈیڈ اس پر چلانے لگتے۔

"تم سے شادی کس لیے کی ہے اس کی؟" سب نئے نئے فرعون بنے تھے شاید۔ باپ، بیٹی ایک ہی انداز میں بات کرتے تھے۔ لفظوں کو چباتے ہوئے آواز کو دباتے ہوئے، پھر بھی دل دہلاتے ہوئے۔

عدن کو کیا معلوم کہ اس سے کیوں کی ہے۔ اسے تو صرف اپنی طرف کا ہی معلوم تھا۔ وہی "کھل جا سم سم۔"

"اس کے ساتھ جایا کرو۔ اس کا خیال رکھا کرو۔"

مارے بندھے اسے ساتھ جانا ہی پڑتا۔ پارٹیز میں وہ انجوائے تو بہت کرتا۔ لیکن ماریہ کا برتاؤ اس کے خون کا دباؤ بڑھا دیتا۔ وہ ہر کسی کی بانہوں میں جھول جاتی۔ گلے ملتی... گال سے گال رگڑتی اور... اور... اف...

ایسے وقت اسے مشکل لگتا۔ صرف اسے گرل فرینڈ سمجھنا... غیرت اُمڈ اُمڈ آتی اس میں۔

"تم روز روز ایسی پارٹیز میں آکر تھکتی نہیں؟"

وہ دیر تک چھوٹے بچوں کی طرح نہ... نہ... میں گردن ہلاتی رہی۔ عدن اسے دیکھ کر رہ گیا۔ جس نے اپنے باپ کی نہیں سنی، وہ اس کی کیا سنے گی۔

"میں تمہارے ساتھ وقت گزارنے کے لیے ترس گیا ہوں۔"

گولڈن ہائی ہیل اتار کر اس نے اپنی گود میں رکھی ہوئی تھیں۔ عدن کے اس طرح کہنے پر ایک ایک کرکے سینڈل اٹھائی اور لاپروائی سے اس کی طرف اچھال دی۔ ایک منہ اور ٹھوڑی سے رگڑ کھا کر کھڑکی کی طرف ٹک گئی اور ایک کندھے اور سینے کو چھو کر اس کی گود میں گری۔ اس انداز پر وہ جیسے جھینپ رہا، وہی جانتا تھا۔

"سچ؟" اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

اس بار عدن صرف مسکرایا۔

"تم ایک قابل شوہر ہو۔" اگلی بات نے اس کی مسکراہٹ کا گلا گھونٹ دیا اور وہ گلا پھاڑ کر ہنسی۔ ایک آنکھ دبا کر آنکھ ماری۔ اب اس کا جی چاہا کہ اسی کی ہائی ہیل سے اس کی یہی آنکھ پھوڑ ڈالے۔ لیکن کیسے پھوڑ ڈالتا، اسپتال ابھی نیا نیا تھا۔ وہ بھی وہاں نیا تھا۔

آنے والے دنوں میں وہ بھی تھوڑی قابل بیوی بننے لگی۔ میڈ کو دیکھ لیتی۔ گروسری کے لیے جاتی۔ اس کے لیے بھی شاپنگ کرتی۔ کبھی کبھار اسپتال آکر اس کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھالیتی اور کبھی کبھار ہی اس کے چھوٹے بڑے کام بھی کردیتی تھی۔ اب اسے ڈر لگتا کہ یہ اچھی بیوی ہی نہ بن جائے۔ کیونکہ وہ اس سے محبت کرنے کے موڈ میں اب نہیں تھا۔ "اس کے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔" اس کی فہرست میں نہیں تھا۔ "اس کے ساتھ وقت گزارنا ہے۔" یہ ضرور فہرست میں درج تھا۔

ویک اینڈ پر وہ ڈیڈ کی طرف چلے جاتے۔ اس کے ڈیڈ چپکے چپکے ماریہ کی طرف دیکھتے اور پھر اپنی بیوی کی طرف۔ دونوں میاں، بیوی نظروں ہی نظروں میں بہت کچھ کہہ سن لیتے۔ جیسے کہتے ہوں۔

"دیکھو! دیسی ٹوٹکا کام کرگیا نا۔ بہل گئی نا ماریہ۔ ٹھیک ہوجائے گی... اور ٹھیک ہوجائے گی۔ دیسی گھی، دیسی مرغی، دیسی لوگ بہت کام کے ہوتے ہیں۔ دنیا گھوم پھر لو۔ اپنا دیس کام ضرور آتا ہے۔"

اور ازبک بیوی جواب دیتی ہو۔" ہاں! مان لیا۔"

عدن ایسی نظروں کو پکڑ لیتا تو اور اکڑ جاتا۔ اس کے پاپا غلام علی غلام نے کہا تھا۔

" عدن! کوئی تو وجہ ہے کہ اس کا جھکاؤ ہماری طرف زیادہ ہے۔" اور وجہ یہی تھی کہ عدن جیسا قابل انسان ہی قابل شوہر بن سکتا تھا۔ ڈرنک اور سگریٹ تو ماریہ کے ناشتے کھانے تھے۔

ازبک ماں نے کہا کہ وہ کسی طریقے سے ماریہ کو ان سے دور کرے۔ ان دونوں کا خیال تھا کہ ان دونوں میں کچھ تو محبت پیدا ہو ہی چکی ہے اور اس محبت کے نام پر ماریہ بہت کچھ کرلے گی۔

عدن نے سب اٹھا کر پھینک دیا۔ ماریہ ہنسی۔

"کسی نے آج تک اتنی جرأت نہیں کی۔"

"میں جرأت بھی کروں گا اور اصرار بھی۔" اس بار واقعی عدن نے ہمت سے ہی کام لیا تھا۔

"آ..... آ..... آئی سی۔" اس نے ابرو اچکائی۔ پھر مسکرا دی۔

عدن واقعی ایک قابل انسان تھا۔ ماریہ ذرا سا اور بدلی تو عدن کی یادداشت بھی کمزور ہونے لگی۔ وہ شیخ طاہر البشر کو بھولنے لگا..... ماریہ کے دوستوں' بے تکلفی' لاپروائی' طنز' لڑائی اور ادھر ادھر کے دوسرے چھوٹے بڑے واقعات کو بھی بھولنے لگا۔ ویسے بھی وہ مرد مومن تو تھا نہیں کہ حرف آخر رکھتا۔ نہ مرد آہن کہ ڈٹ جاتا۔ وہ ماریہ پر جان نثار کرنے لگا۔ نیا نیا عاشق سا لگنے لگا۔ دونوں ایک ساتھ گھومتے پھرتے' مزے کرتے' اکثر ماریہ کی فیملی بھی ساتھ ہوتی۔

"ڈاکٹر صاحب! تم بہت شرارتی ہو۔" اس کے گلے سے وہ جھول جاتی۔ جب بھی وہ ساحل سمندر پر بیٹھ کر اسے خالص پاکستانی انداز میں کوئی دیسی لطیفہ سناتا..... اور وہ ریت پر لوٹ پوٹ ہو جاتی۔

"مسز عدن! تم بہت خوب صورت ہو۔"

"تم پکے فلرٹ ہو۔"

"تم پکی کشمیر کی کلی ہو۔"

"پاکستان تک نہ لے جاؤ مجھے' میں اگر کچھ ہوں تو ازبک ہوں۔"

"پاکستان تک تو آ گئی ہو۔" اس نے دونوں بازوؤں کا گھیرا اس کے گرد بنایا۔

"پھنسا لیا تم نے۔"

"پھانس لیا تم نے۔"

اس کی آنکھوں میں پھونک مار کر وہ بھاگی۔ آنکھوں کو جھپکتا وہ بھی اسی کے پیچھے بھاگا۔

چند ہفتوں کے لیے وہ پاکستان سے بھی ہو آئے۔ غلام علی غلام نے زور' زور سے اس کے کندھے پر تھپکیاں دیں۔ "ماسٹر نکلے تم تو بھئی۔"

وہ مسکرانے لگا۔ جیسے نوبل انعام ملا ہو۔ شکریہ کی تقریر اسے ابھی کرنی تھی۔

"گدھے کی بچی کو الو بنا لیا۔" جناتی قہقہہ بلند ہوا۔ "کمال کر دیا' بھئی واہ' مزا آ گیا' مزا آیا۔" پھر رک کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "دل لگی کر رہے ہو کیا؟"

وہ سٹپٹا گیا۔ ماریہ اسے اب پھر سے اچھی لگ رہی تھی۔ وہ اس کی محبت میں تیسری بار نئے سرے سے مبتلا ہو رہا تھا۔

"جو بھی ہے' جاری رکھو..... گدھے کی گردن میں کتے کا پٹا ڈال دو' بس پھر ٹھیک ہے؟"

"جی! ٹھیک ہے۔" اس کا باپ کتے کا پٹا اسے ڈالنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ وہاں وہ خود اس کے کتے جیسا تھا۔ اس کا باپ چاہتا تھا کہ وہ رنگ ماسٹر بن جائے۔ شیر سے بھیڑیے تک سب کو سدھا لے..... وہ ایسا کر ضرور لیتا۔ اگر اپنے باپ کی طرح ہوتا۔ ابھی وہ نیا نیا تھا۔ کچھ کتابوں میں پڑھے اخلاق اس کے اندر تھے۔ کچھ ان سب کا ابھی وہ عادی نہیں ہوا تھا اور کچھ وہ کبھی کبھی کوفت کا شکار ہو جاتا تھا۔ ورنہ سب ٹھیک چل رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تمہاری ماڈلنگ کا کیا ہوا؟" رات کو چہل قدمی کرتے ایسے ہی عدن نے پوچھ لیا۔ ماریہ نے جھٹکے سے

اس کے کندھے پر رکھا سر اٹھایا۔

"تم نے کیوں پوچھا؟"

"ایسے ہی۔" اور اس نے ایسے ہی پوچھا تھا۔ جیسے کوئی بھی بات کرلی جاتی ہے۔

"دوبارہ مت پوچھنا۔" پرانا تنا ہوا انداز واپس لوٹ آیا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے کہہ دیا۔ لیکن ٹھیک ہوا نہیں۔

بیڈ روم کا دروازہ بند کر کے وہ ڈرنک کرتی رہی۔ عدن کو تشویش ہوئی۔ بہت چاہا کہ وہ دروازہ کھول دے لیکن وہ انگلش میں گالیاں دینے لگی۔

عجیب مصیبت تھی۔ عدن نے اسے بھاڑ میں ڈالا اور دوسرے کمرے میں جا سویا۔ اگلے دن اور اس سے اگلے دن بھی یہی ہوتا رہا۔ پھر ماریہ کی مام آئیں۔ ماریہ ان کا فون نہیں اٹھا رہی تھی۔ تین دن سے وہ کمرے سے نکلی نہیں تھی۔ قریب جاتے ہی گالیاں دیتی۔ چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکتی' چلاتی' نہ جانے کیا کیا بکتی۔

"تو تم مجھے بتاتے۔" مام اس پر غصہ کرنے لگیں۔

"جب میں ہینڈل نہیں کر سکا تو آپ۔"

"میں کر لیتی' سمجھے تم! اس طرح اتنی تکلیف میں اسے اتنے دن رکھنے کی ہمت کیسے ہوئی..... تم اس کے پاپا کو فون کر کے بتاتے..... تم تو کسی کام کے نہیں ہو۔" وہ چلا کر چلی گئیں۔

"پاگل..... سنکی..... سارے۔" اس نے یہ صرف سوچا' کہا نہیں۔

مام' ماریہ کو زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے کر گئیں۔ نفسیاتی ڈاکٹر کے پاس اس کے سیشن ہونے لگے۔ چند دنوں بعد عدن کی بھی ملاقات کروائی گئی ڈاکٹر کے ساتھ کہ اسے ماریہ کے ساتھ کیسے رہنا ہے' کیا کہنا ہے۔ کیا نہیں کہنا' کس رویے کا اظہار کرنا ہے' کس کا نہیں کرنا' کون سی بات اسے ڈپریشن میں لے جائے گی اور کون سی احساس کمتری میں..... اسے دورے پڑیں گے۔ وہ چلانے لگے گی۔ ڈرنک کرنے لگے گی۔ ڈرگز کی طرف پھر سے آ جائے گی۔ اور اس سب کا ذمہ دار اس کا عدن ہوگا۔

تین دنوں کے آٹھ گھنٹوں میں ڈاکٹر نے اس کا دماغ خوب چاٹا..... ماریہ سے متعلق اس کی معلومات میں اور سے اور اضافہ ہوا۔

کشمیر کی کلی' ازبک کی پری' خوب صورتی میں مس یونیورس' ایک کامیاب ماڈل نہیں بن سکی تھی۔ بے تحاشا خوب صورت ہونے کے باوجود اور اس سب کے ساتھ ہی وہ ایک کامیاب ماڈل کے جو اس کا بوائے فرینڈ تھا ساتھ تعلق قائم نہیں رکھ سکی تھی۔ بوائے فرینڈ کی کامیابی کا گراف بڑھنے لگا۔ وہ ماڈلنگ سے کمرشلز اور پھر فلم تک جا پہنچا۔ پھر اس کے لیے ایک گرتے ہوئے گراف کی ماڈل کی کوئی حیثیت نہ رہی۔ اگر وہ دنیا میں اکلوتی خوب صورت ہوتی تو شاید کوئی بات بھی بنتی۔

اب یہ سچی محبت کے کھو جانے کا دکھ تھا یا کیریر نہ بننے کا غم..... ماریہ نے ان ہی دنوں ڈرگز لینی شروع کی۔ سگریٹ' ڈرنک' سب کچھ وہیں سے آیا۔ شیخ بھی اسی بے راہ راوی کا نتیجہ تھا۔ ڈپریشن کے ان ہی دنوں میں اس نے بہت کچھ کیا۔ اسے دنیا گھمائی گئی۔ لیکن ہر بار اس نے نیا ہی کارنامہ انجام دیا۔

ڈاکٹر اور اپنی ساس کے ساتھ آخری ملاقات میں اس کا جی چاہا کہ وہ جاتے ہی ماریہ کو فارغ کر دے۔ اتنی تھوکی ہوئی لڑکی وہ چاٹ رہا ہے۔ ذات کی اتنی بد' عمل میں اتنی کمتر' اس رات وہ صبح تک بار میں بیٹھا رہا۔ اسے بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔ آج اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اپنے بال نوچے..... دولت کے ساتھ ہی سہی' لیکن اس نے کبھی ایسی زندگی کا نقشہ نہیں بنایا تھا۔

وہ کیسی زندگی گزار رہا ہے۔ اپنی جوانی کے سنہرے دن کس کے ساتھ گزار رہا ہے۔ وہ کر کیا رہا ہے؟

"آپ نے یہ سب ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا؟" وہ خالص پاکستانی انداز میں اپنے سسرالیوں پر چڑھ دوڑنا چاہتا تھا۔

"کیا سب؟" ساس کی بھی فرعونوں جیسی گردن اکڑ گئی۔

"اپنی بیٹی کے کرتوتوں کا۔"

"تم نہیں جانتے تھے اسے؟"
"صرف اسے جانتا تھا۔"
"تم اور تمہارے پاپا تو یہاں آتے رہتے تھے۔ تمہیں معلوم تھا ماریہ کا لائف اسٹائل۔ اس لب و لہجے اور اتنی اونچی آواز میں دوبارہ مجھ سے مخاطب نہ ہونا... میں ماریہ کی ماں ہوں، تمہاری نہیں۔"
"آپ کو اسے سمجھانا چاہیے۔" ہنٹر کھا کر وہ سنبھل گیا۔
"سمجھا لیا، اب تم سمجھاؤ، سنبھالو اسے۔" انداز ایسا، جیسے تمہیں تنخواہ دیتے ہیں اپنی ڈیوٹی کرو۔
"وہ میری نہیں مانتی، مجھے اس کی فکر ہے، میں اسے ایسے نہیں دیکھ سکتا۔"
انہوں نے آنکھیں پھیلا کر ذرا کی ذرا اسے دیکھا۔ یہ وہی ہے، جو ابھی کرتوتوں کی بات کر رہا تھا اور اب فکر کر رہا ہے۔
"کوشش کر رہے ہیں ہم... تم بھی کرو۔ کبھی کبھی وہ ڈسٹرب ہو جاتی ہے۔ ہو جاتا ہے ایسا، سب کے ساتھ، ہو جاتا ہے۔" ساس سے ہار کر وہ پاپا کو فون کرنے لگا۔
"وہ چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکتی ہے۔ گالیاں دیتی ہے۔ میں نے کبھی کسی کے ایسے رویے نہیں دیکھے۔"
"تو تم سامنے سے ہٹ جایا کرو سن!" وہی جناتی قہقہہ لگا۔
"پاپا... پلیز۔"
"یار... بچے ہو کیا تم؟"
"جنگلی ہے وہ۔"
"جنگل کا کون سا ایسا جانور ہے جسے انسان نے پالتو نہیں بنایا۔ پنجرے میں لا نہیں بٹھایا۔"
"سانپ نہیں پالنے میں نے۔"
"تو بین بجاؤ، نچاؤ اسے۔"
"وہ مجھے نچاتی ہے۔ میرا سکون تباہ ہو رہا ہے پاپا!"
"دور رہو اس سے، کرنے دو جو کرتی ہے۔"
"اس کا باپ کہتا ہے۔ اس کا خیال رکھو۔ دور کیسے رہوں؟"

"اس گدھے کو الو نہیں بنا سکتے تم؟"
"وہ مجھے گدھا بنا رہا ہے۔"
"عدن! لڑکیوں کی طرح رونا بند کرو، مرد بنو۔"
اور وہ مرد بن گیا۔ ماریہ کا حال چال پوچھتا... بات کرنے کی کوشش کرتا، بات کر لی تو ٹھیک، ورنہ ادھر ادھر ہو جاتا، خود وہ اپنے معمولات میں سیٹ تھا۔ صبح اٹھتا، جوگنگ، ورزش کرتا، اپنا ناشتا خود بناتا اور اسپتال آ جاتا، ماریہ سے کہیں زیادہ اسے اسپتال کی فکر تھی۔ رات کو دیر سے آتا۔ ماریہ کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوتا تو اسے دیکھ لیتا۔ ورنہ بند دروازہ دیکھ کر شکر ادا کرتا۔ اپنے کمرے میں آ کر سو جاتا۔ ماریہ کے دورے کی حالت طویل ہو کر ختم ہونے لگی تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔
"ایک بار تم نے مجھے کہا تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔" اتنا عرصہ پہلے کی بات اسے یاد تھی۔
"ہاں کہا تھا۔"
"اب بھی کرتے ہو؟" اس نے پوچھا... اور اس وقت وہ ہنسی تھی۔
عدن گڑبڑا گیا۔ ہاں ہی کہنا پڑا۔
"نہیں، تم نہیں کرتے۔" وہ ہسٹریائی ہنسی، بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی اٹھا کر اس کی طرف لہرائی۔ "نہیں کرتے نا؟" ہاتھ گود میں گرا لیا۔
"تم تو میرے شوہر ہو بس... قابل شوہر... بس۔" وہ تاسف اور گہرے دکھ سے بولی۔ کچھ پل چپ رہی۔ پھر منہ پر ہاتھ رکھ کر پگلی سی ہنسی ہنسنے لگی، پھر جھٹ سے عدن کی شرٹ کے کالر کو دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔
"عورت ہوں... پاگل نہیں ہوں۔ کتنی ہی بے حس ہو جاؤں، محبت کی حس رکھتی ہوں۔" وہ کالر کو جھنجھوڑنے لگی۔
"چھوڑو مجھے۔" پھر دورہ پڑا۔ اس نے دل میں سوچا۔
"نہیں چھوڑتی۔"
"ماریہ!" وہ نرمی سے بولا۔ کالر آزاد کروا کر اسے

اپنے سینے سے لگایا۔
ماریہ نے کہا کہ وہ عورت ہے۔ لیکن پاگل نہیں۔ لیکن سینے سے لگا کر وہ اسے بتا دے گا کہ وہ پاگل ہے یا نہیں، صرف چند ہی جملوں میں۔
"محبت نہ کرتا تو تم سے شادی کرتا؟" پہلا جملہ۔
"تم پر پل پل مرتا ہوں۔ مر مٹنا چاہتا ہوں اور تم..." دوسرا جملہ۔
"اور میں...؟" اس نے بہت معصومیت سے پوچھا۔
"تمہیں نہ جانے کیا ہو جاتا ہے۔" وہ جیسے بہت دکھی تھا اس کے لیے۔
"کیا ہو جاتا ہے عدن؟" اس کی طرف بہت آس سے دیکھا۔
"میں تو ٹھیک ہوتی ہوں۔ خراب تو دوسرے ہو جاتے ہیں۔"
"میں دوسرا نہیں ہوں، تمہارا شوہر ہوں۔"
"میرے ہو تم؟"
"ہاں! صرف تمہارا۔"
"صرف میرے؟" بہت پیار سے پوچھا گیا۔
"صرف تمہارا۔" بے حد پیار سے کہا گیا۔
محبت کے نام کی بین بجا کر عدن نے اسے سلا ڈالا۔ وہ بہل گئی، ٹھیک نظر آنے لگی، صبح اٹھ کر اس کے ساتھ جوگنگ کے لیے جاتی۔ بھاگتے ہوئے ٹانگوں میں اپنی ٹانگ اڑا کر اسے منہ کے بل گرا دیتی۔ وہ چلاتا۔ وہ بھاگ جاتی۔ رات کو وہ سوتا تو فل والیوم میں میوزک لگا کر خود دوسرے کمرے میں بھاگ جاتی۔ اس کے کپڑے اور گاڑی کی چابی چھپا دیتی۔ گھر میں وہ آگے آگے بھاگتی۔ وہ پیچھے پیچھے بھاگتا۔
پندرہ منٹ کی ڈرائیو پر ڈیڈ کا گھر تھا۔ آج کل ناشتا وہ ان کے ساتھ کرنے لگے تھے۔ اس کے ڈیڈ اس سے لاڈ کرتے۔ اس کی پلیٹ بھرتے، اس کے ہاتھ کی ہتھیلی کو ہونٹوں سے لگاتے اور اس کے بالوں کو ذرا سا کھینچتے۔
"گھوم پھر کیوں نہیں آتے تم لوگ۔" بیٹی ذرا سا سنبھلی تو ٹرپ آفر کیا جانے لگا۔
"آفر اچھی ہے۔" ماریہ نے جوس کا ایک گھونٹ بھر کر کہا۔
عدن کا خیال تھا وہ نہیں جائے گی۔ کیونکہ وہ سنجیدہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ لیکن وہ سنجیدہ ہی تھی۔ اس نے پلان کر لیا تھا اور کیا خوب پلان کیا تھا۔
عدن کو لگا کہ اس نے کوئی غار اور دہانہ نہیں چھوڑا۔ اس ٹرپ میں وہ اتنی سنجیدگی سے ان سب کا جائزہ لیتی رہی جیسے ان پر کتاب لکھ رہی ہو۔ عدن میں موج مستی کا عنصر زیادہ تھا۔ اسے کھنڈرات سے ایسی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔
کسی زمانے میں اسے شوق ہوا تھا اجڑی عمارتوں کو دیکھنے کا۔ چند ماہ اس نے دل لگا کر دیکھیں بھی... پھر...
وہ جاپانی زیر زمین ٹرین سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا اور ماریہ نے اسے ریڈ وڈ جنگل میں چلنے والی گھٹیا سی سیاحتی ٹرین میں بٹھا دیا۔ یہ ٹرپ اس کے باپ کی طرف سے تھا تو مرضی بھی باپ کی بیٹی کی ہی چلنی تھی۔ اس کا ٹرپ تو خاک ہوا۔ ماریہ البتہ تر و تازہ ہو گئی۔
"ڈیڈ ٹھیک کہتے ہیں۔" بہت دنوں بعد اس نے یہ جملہ دہرایا۔
"تمہارے جیسے شوہر مزے سے بندھے رہتے ہیں... نہ جاتے ہیں، نہ جانے دیتے ہیں، سر جھکائے مانے جاتے ہیں۔"
بہت ذہین تھی۔ اسے قائل ہونا پڑا۔ شاید ڈیڈ نے یہاں بھی کچھ کہا تھا۔ دنیا میں کسی ایک مرد کی تو وہ سنتی تھی مگر... وہ مرد اس کا باپ تھا۔ اس لیے نہیں وہ مرد اس سے ہر حال میں محبت کرتا تھا اس لیے... ہر انسان کو ایک ایسے ہی انسان کی ضرورت ہوتی ہے، جو ہر حال میں اس سے محبت کرے اور گندے سندے راستوں میں صرف ایک محبت کا ہی راستہ ہوتا ہے، جو گند سے نکال باہر کرتا ہے۔ اب یہ اس محبت کے فلسفے اور اساس پر ہے کہ وہ گند کسے سمجھتا ہے۔

☆ ☆ ☆

اسپتال کا سارا منافع عدن کی جیب میں ہی جاتا تھا۔

اس کا اکاؤنٹ دن بدن بڑھ رہا تھا۔ غلام علی غلام کے ساتھ اس نے ایک فیکٹری میں حصہ داری کرلی۔

"اپنے سسر کے برابر ہو جاؤ تو مانوں۔" وہ اسے ہمیشہ بڑا ٹارگٹ ہی دیتے تھے۔ سو میٹر کی ریس اس نے جیتی تو انہوں نے کہا۔

"پہلے نمبر پر تو کوئی بھی آجائے گا' کوئی ریکارڈ بناؤ کہ کوئی توڑ نہ سکے۔"

جناب آغا عباس حیدر۔۔۔ اس کے سسر!

جس کا اپنا ایک ذاتی طیارہ تھا۔ امریکا میں پھیلی ہوئی اسٹورز کی چین تھی۔ آس پاس کے ملکوں میں گھر اور اپارٹمنٹ تھے اور عدن کے باپ کے پاس صرف تین فیکٹریاں تھیں' جو مختلف مشینی آلات بناتی تھیں۔ صرف پاکستان کے دو شہروں میں دو بنگلے تھے۔ ایک فارم ہاؤس تھا' بس۔

ایک فیکٹری پر مقدمہ چلتا رہا تھا۔ اس مقدمے نے ان کی ساکھ خراب کردی تھی۔ پیسہ الگ پانی کی طرح لگ رہا تھا۔ طرح طرح کے لوگوں کو خریدا جا رہا تھا۔ بے نقص منصوبہ تھا آگ لگانے کا۔ بیمہ کمپنی کے تفتیشی جاسوسوں نے پکڑ لیا۔ غلام علی غلام نے الٹا بیمہ کمپنی پر مقدمہ کردیا۔ بیمہ کمپنی بھی سینہ ٹھونک کر میدان میں اتر آئی۔

یہ سب اس کی شادی سے پہلے ہوا تھا۔ بعد ازاں۔۔۔ مقدمے کو کسی نہ کسی طرح ختم کروایا۔ فیکٹری کو نئے سرے سے کھڑا کیا۔ اسی فیکٹری کا آدھا مالک عدن تھا جس نے اپنے حصے کے سارے پیسے اسپتال کے منافع سے دیے تھے۔

جب کبھی ماریہ پر دورے پڑتے تھے۔ جی تو اس کا چاہتا کہ مار مار کر اس کا حال برا کردے۔ لیکن ایسی مار اس کا اپنا حال بدترین کردے گی۔ اب وہ اپنے سسر کو پیچھے رکھنا چاہتا تھا تو اسے ماریہ کو آگے رکھنا ہی تھا۔ ابھی ماریہ کو مارنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ شام کو اسی کے لیے وہ گھر جلدی چلا جاتا۔ وہ اس کے لیے کوکنگ بھی کرلیتی تھی۔ اس کے کپڑے ترتیب سے ہینگ کردیتی تھی۔ اس کے نخرے بھی اٹھالیتی تھی۔ وہ بھی لاڈ کرلیتا'

لیکن اس سب کے دوران بھی وہ اس کے لیے ایک امتحان بنی ہوتی۔

عدن حسن پرست تھا اور کتنا بھی حسن پرست تھا' عورت میں شرافت کا قائل تھا۔

وہ اندر سے ایک گھسا پٹا روایتی مرد تھا۔ نیک سیرتی کا تمنائی' شرافت اور حیا کا دلدادہ' قدر کرے' نہ کرے' تعریف کرے' نہ کرے' پر تمنائی ضرور تھا۔ کالج میں اس نے ایک سے بڑھ کر ایک حسن کے عجوبے سے دوستی کی' فلرٹ کیا' لیکن ان عجوبوں کے قریب ہوتے ہی وہ انہیں مختلف فہرستوں میں درج کرلیتا۔ یہ فلرٹ کے لیے' یہ صرف دوستی کے لیے' یہ ہائے ہیلو کے لیے۔ یہ صرف مسکرا کر دیکھنے' کبھی کبھار بات کرنے کے لیے۔ یہ ذرا ذائقہ بدلنے کے لیے' یہ ہلڑبازی کے لیے' یہ بور ہوتے وقت فون پر بات کرنے کے لیے۔

ان میں سے ایک بھی "یہ شادی کے لیے" والی فہرست میں نہیں آئی تھی۔ امیر سے امیر ترین بھی نہیں۔۔۔ ایک' دو نے اسے بہت شوق سے اپنے خاندانوں سے ملوایا' لیکن وہ ان سے مل کر بھی پرے پرے ہی رہا۔ ایسا بھی کڑا وقت اس پر نہیں آیا تھا کہ سیکنڈ ہینڈ کتابیں لے کر پڑھے اور اسے دوم پر کچھ پسند بھی نہیں تھا۔ نہ انسان' نہ حیوان' نہ چیزیں' نہ درجے۔۔۔ اس کا ہر پیمانہ اول تھا۔ عورت کے پیمانے پر ایک اول اسے ملا تھا۔ لیکن دولت کے نمبر پر اس کے پاس آخری نمبر بھی نہیں تھے اور یہی اول اسے اکثر یاد آجاتا۔

جب وہ گرے ہوئے نمبروں والی ماریہ کو بوسے لیتے ڈرنک کرتے' ناچتے اور دوڑنے کی حالت میں دیکھتا۔ اس کے منہ سے گندی گندی گالیاں سنتا تب بھی۔

بس اسی لیے عدن نے ماریہ کو ایک نقطہ ہی بنا لیا تھا' تاکہ جب چاہے اسے کاغذ سمیت پھاڑ کر پھینک دے۔

جسمانی طور پر وہ کچھ ایسی پیچیدگیوں کا شکار تھی کہ آئندہ چند سالوں تک وہ ماں نہیں بن سکتی تھی۔ عدن کے پاس یہی چند سال تھے۔ اسے گرے ہوئے نمبروں

والی سے گرا ہوا بچہ نہیں چاہیے تھا۔ لیکن ساتھ ساتھ وہ جانتا تھا کہ اگر ماریہ کے جی میں آئی تو وہ ہر پیچیدگی کو بالائے طاق رکھ کر ماں ضرور بن جائے گی لیکن ابھی ان کے درمیان بچے کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

تیرہ ماہ کی شادی شدہ زندگی کی چارج شیٹ سے غلام علی غلام صاحب مطمئن تھے۔ عدن کے اکاؤنٹ سے پیسہ ان کے اکاؤنٹ میں جاتا تھا۔ وہاں سے فیکٹری میں لگتا۔ منافع اکہرے سے دہرا اور دہرے سے تین گنا بڑھنے لگا۔

"تم ایک اور اسپتال کیوں نہیں بنوا لیتے؟" ماریہ خوش تھی۔ زندگی سیٹ تھی تو پاپا نے بروقت مشورہ دیا۔ اس نے وقت نکال کر اپنے سسر سے ان کے آفس میں ملاقات کی۔ انہوں نے نہ تائید کی' نہ انکار' وہ بولتا رہا' وہ سنتے رہے۔ جیسے "سر! آپ کے شوز پالش کردیے ہیں۔"

اور سر۔۔۔ سر اٹھا کر "ہوں" بھی نہیں کہتے۔

چند ہفتوں بعد اسے معلوم ہوا کہ ماریہ کے نام ایک پراپرٹی لی گئی ہے۔ چند ہفتے اور گزرے تو اس کے سسر اسے اسپتال دکھانے لے گئے۔ عدن کو اس سے فرق نہیں پڑتا تھا کہ کاغذات ماریہ کے نام ہیں۔ اسے منافع سے غرض تھی۔ آگے کے اس کے پلانز بھی بہت کمال کے تھے۔ وہ کسی تیسرے شخص سے (دراصل خود) اپنے سسر کے اسٹورز میں شیئرز لے گا۔ وہ ان ہی کے پیسوں سے ان ہی کے کاروبار میں گھس جائے گا۔

اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرنے کے لیے ماریہ نے یونیورسٹی جانا شروع کردیا۔ وہ ہسٹری میں ماسٹرز کررہی تھی۔ جب اس کا تعلیمی سلسلہ چھوٹا تھا۔ اب ذہنی طور پر وہ کچھ بہتر ہوئی تو دوبارہ ایڈمیشن لے لیا۔ عدن دوسرے اسپتال کو بھی سیٹ کرنے لگا۔ میڈ گھر کو دیکھتی۔ بوسٹن میں سب ٹھیک تھا۔ پاکستان میں بھی سب ٹھیک تھا۔

بات وہاں سے بگڑ گئی۔ جب وہ ماریہ کے ساتھ ایک تقریب میں چلا گیا۔ آج کل ماریہ بہت کم پارٹیز میں جاتی تھی۔ اس کی دوستوں نے اصرار کیا تو وہ اسے ساتھ لے کر آگئی۔ وہ دونوں اور اس کی دو دوستیں ساتھ ساتھ کھڑے باتیں کررہے تھے کہ اچانک ایک دوست نے اس کے کان کے پاس منہ لا کر کچھ کہا۔ ماریہ نے ذرا سا گردن کو خم دے کر پیچھے دیکھا۔

عدن نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔ لیکن ہجوم میں اسے تو کچھ نظر نہیں آیا۔

"ہو رہی ہوگی کسی کے ملبوس یا جیولری کی بات۔" اس نے خیال نہ کیا مگر ماریہ کی جیسے حالت غیر ہوگئی۔ وہ رنگ بدلنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اوپن ایریا میں سکڑتے سمٹتے ہجوم میں اس نے کئی بار نظریں گھما کر اسے دیکھنا چاہا۔ لیکن وہ اسے نظر نہیں آئی۔ اس کی دوستیں بھی غائب ہوگئیں۔ وہ ٹہل ٹہل کر اسے ڈھونڈنے لگا۔ لیکن وہ نظر نہیں آئی۔ اس نے فون کیے لیکن وہ کال کا جواب نہیں دے رہی تھی۔ بہت دیر بعد اس کا میسج آیا۔

"میں اپنی دوستوں کے ساتھ ہوں' تم چلے جاؤ۔"

"تم ہو کہاں؟"

"تمہیں اس سے کیا؟" بھڑکتا ہوا جواب آیا تو وہ گھر آگیا۔ چند گھنٹوں بعد اسے بھی آجانا تھا لیکن وہ نہیں آئی' اگلے دن شام تک نہیں۔ اس کا فون بھی بند تھا۔ اس نے اس کی مام کو فون کرکے بتا دیا۔ اب وہ اس کا کوئی الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتا تھا۔

"وہ اپنی فرینڈ کے ساتھ ہے۔ طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو اسی کے ساتھ چلی گئی۔" ازبک مام نے نہ جانے کس کس فرینڈ کو فون کر کرکے اس کا پتا کیا اور اسے بھی بتا دیا۔

اس کی طبیعت کو وہ جانتا تھا۔ رات کو وہ واپس آئی تو وہ پوچھے بنا رہ نہیں سکا۔ وہ الماری کھولے کپڑے نکال نکال کر دیکھ رہی تھی جیسے سنا ہی نہیں کپڑے ساتھ لگا لگا کر دیکھتی رہی۔ عدن کا جی چاہا کہ گردن سے پکڑ کر اسے زمین پر پٹخ دے۔

"میں کچھ پوچھ رہا ہوں۔"

"کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"بیوی ہو تم میری۔" اتنی مشرقی بات مغربی بیوی

کے سامنے۔۔۔

”تم بھی میرے شوہر ہو‘ میں نے تو کبھی نہیں پوچھا۔“

دانت پر دانت جما کر آواز کو دبا کر وہ بولا۔ ”تو پوچھ لیا کرو۔“

”اگر پوچھا تو بتانا بھی پڑے گا۔“ ایک تو یہ باپ بیٹی چالاک بہت تھے۔ ہر چیز کی حد بندی کیے بیٹھے تھے۔

”تم نہ بھی پوچھو تو تمہیں یہ بتانا ہی پڑے گا تم کہاں تھیں کل رات‘ ڈرنک کرتی رہی ہو اپنی حالت دیکھو کس کے ساتھ تھیں تم؟“

اب وہ سیدھی ہوئی ”بتاؤں“ آواز میں تمسخر بھی تھا اور اتراہٹ بھی ”ریکس کے ساتھ تھی۔“

”تمہارا وہی ماڈل بوائے فرینڈ۔۔۔؟“

”کمال کی یادداشت ہے تمہاری۔“ تالی بجانے جیسا انداز۔

”تم اس سے ملیں؟“

”کیوں نہ ملتی۔ دو سال بعد ملاقات ہوئی تھی۔“

”رات بھر۔۔۔“ عدن کا سر گھوم گیا۔ وہ آزاد خیال ہے‘ لاپرواہ ہے‘ ڈھیٹ ہے‘ پر اتنی۔۔۔ وہ نہیں جانتا تھا‘ جو کچھ شادی سے پہلے کیا۔ وہ اس پر ڈھیٹ بن گیا۔ بے غیرت ہی سہی۔ مگر ابھی وہ زندہ تھا۔ اس کی موجودگی میں اسے نہ کوئی ڈر نہ لحاظ۔ جو اصل تکلیف تھی عدن کو‘ وہ یہی تھی کہ اس کی کوئی وقعت ہی نہیں۔ دو قدم بڑھا کر ایک زوردار تھپڑ اس کے سفید گال پر مارا اتنی زور سے کہ وہ بل کھا کر نیچے گری۔ ہونٹ سے خون کی ایک باریک لکیر نکلی۔

”بے غیرت۔۔۔ ذلیل!“ کچا چباتی آواز۔

فرش پر گرے سر اٹھا کر اس نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

”میری بیوی ہو کر تم رات بھر کسی اور کے ساتھ رہیں۔“

ٹانگوں کو سمیٹ کر وہ اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔ دوسرے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ عدن غصے سے بل کھاتا ٹہلنے لگا۔ اب وہ اس عورت کے ساتھ اور نہیں رہے گا۔ بہت ہو گیا۔۔۔ ذلیل۔۔۔

سائرن بجنے لگا۔ عدن نے توجہ نہ دی۔ سائرن کی آواز قریب آتی گئی۔ ماریہ کمرے سے نکلی۔ لپک کر داخلی دروازہ کھولا۔ دو پولیس آفیسرز اندر آئے۔ ماریہ نے عدن کی طرف اشارہ کیا اور تیز تیز بولنے لگی۔ آفیسر نے بڑھ کر اسے ہتھکڑی لگائی۔

”ماریہ!“ اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ میاں بیوی کے جھگڑے گھروں میں نہیں رہتے۔ یہ امریکا ہے ”میں تیرا لباس تو میرا لباس“ یہاں یہ نہیں چلتا۔ طاقت کے بے دریغ اور غلط استعمال پر یہاں حدیں لگا دی جاتی ہیں مار کھا کر چھپ کر رویا نہیں جاتا۔

ماریہ صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ جما کر بیٹھ گئی۔ ایک ٹانگ جھلانے لگی۔

”چور مچائے شور۔“ اردو کا یہ فقرہ اسے بروقت یاد آیا۔ اس کے نزدیک چور صرف ماریہ تھی۔

✵ ✵ ✵

پاکستان میں ٹاپ کرنے والے دیوانے کے باپ غلام علی غلام کو کانوں کان خبر بھی نہ ہونے دی گئی کہ وہ جیل میں ہے۔ عدن کے وکیل نے اس کے سسر کو بتایا۔ انہوں نے ماریہ سے بات کی اور جب وہ باہر آیا تو سیدھا ان ہی کے دفتر گیا۔ اس کا خون ابل رہا تھا اس گھٹیا عورت کے اس درجے کے گھٹیا پن پر۔ اپنا ہمدرد بنانے کے لیے اس نے انہیں ساری بات بتائی انہیں غیرت دلانا چاہی کہ ان کی بیٹی ساری رات کسی کے ساتھ تھی۔

وہ اپنی بیٹی کی طرح ٹانگ پر ٹانگ جمائے بیٹھے رہے جیسے ان کا بنگران سے احکامات لے رہا ہے۔ سگار پیتے رہے نہ تائید نہ انکار۔ نہ مزید کی حوصلہ افزائی۔

”تم نے اسے مارا کیوں؟“ ساری بات سن کر بھی یہی پوچھا۔

”ہاتھ اٹھ گیا تھا میرا۔“ سوال اسے پسند نہیں آیا۔

”تم نے اس کی پوری بات سنی۔ وہ ریکس سے ملی۔ اس نے سب کو ڈنر آفر کیا تو ساتھ چلی گئی وہ اور دوست بھی ساتھ تھے‘ رات وہ اپنی دوست کے پاس رک گئی اور تم نے اسے مارا۔“

سمٹ سمٹا کر ساری غلطی عدن کی نکلی۔

”یہ پاکستان نہیں ہے۔“ کیسا باپ تھا۔

”اسے مجھے فون کر کے بتانا چاہیے تھا۔ اس نے کہا ریکس کے ساتھ ساری رات۔۔۔“

”تو ساری رات۔۔۔ کیا ساری رات دو دوست باتیں نہیں کر سکتے؟“ اپنے سسر کی اس اعلا درجے کی مثالی بے غیرتی پر اسے بہت تاؤ آیا۔

”میں اس کا شوہر ہوں۔ اجازت نہ لیتی‘ بتاتی تو سہی کیا میں اپنی بیوی کے ساتھ ریکس کے ڈنر میں نہیں جا سکتا تھا۔“ دراصل آج عدن نے سوچ لیا تھا کہ اس باپ کو یہ بتا کر ہی اٹھے گا کہ اس کی بیٹی کے کرتوت کیا ہیں۔

”اسپتال سے کتنا منافع آتا ہے تم اسے بتاتے ہو؟“

شٹ اپ۔۔۔ آگے پیچھے سے اسے ہنٹر لگنے لگے۔

”اور وہ منافع کہاں جاتا ہے یہ۔۔۔؟“

اتنا اندھا بھی نہیں تھا اس کا سسر جو وہ اور غلام علی غلام سمجھے بیٹھے تھے۔

وہ لب بھینچ کر رہ گیا۔ ہر بار لاجواب ہو کر ہی اٹھتا تھا۔

”ریکس اس کا صرف اچھا دوست ہے اور بس۔ شوہر اس کے تم ہی رہو گے۔ فکر نہ کرو۔“ جاندار قہقہہ لگا اور شٹ اپ شٹ اپ ہنٹر اسے لگے۔

اس کے اندر نفرت کی آگ جلنے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ ان دونوں کو اس نوبت تک لے آئے کہ وہ اس کے تلوے چاٹیں اور وہ انہیں ہش ہش کرے‘ ایسی کاری ضرب کی شکست دے کہ دونوں انگلش میں بات کرنا بھول جائیں۔

لیکن ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ ابھی چپ رہ کر انتظار کرنا تھا‘ یہ سب جو اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔ وہ سے کچھ کا کچھ بناتا جا رہا تھا تیرہ ماہ پہلے وہ ایسا نہیں تھا اور تیرہ ماہ بعد وہ ویسا نہیں رہا تھا۔

جب وہ گھر آیا تو ٹیبل پر پاؤں رکھے ماریہ نیل پالش لگا رہی تھی۔ اس پر ایک نظر ڈالے بغیر اپنا کام کرتی رہی۔ وہ ٹی وی کے آگے بیٹھ گیا۔ وہ اٹھی ڈریسنگ گاؤن سے بلیو لانگ گاؤن میں آئی۔ رولرز کھولے‘ میک اپ کیا اور ٹک ٹک کرتی چلی گئی۔

عدن اپنا سر تھام کر بیٹھ گیا۔ وہ ذہنی مریض بن جائے گا ماریہ کے ساتھ رہتے۔ اس کا لمحہ بھر کو جی چاہا کہ لات مارے سب پر اور بھاگ جائے۔ جیل ہو آیا تھا‘ سسر کے ہنٹر کھا آیا تھا۔ پاکستان کے لائق فائق خوبصورت لڑکے کا یہ حال ہو رہا تھا۔ خود کو نارمل کرنے کے لیے اس نے اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں اور بہن سے بات کی۔ پر وہ اور ڈسٹرب ہو گیا۔ اس کا جی کسی اور کوئل کی آواز سننے کو چاہنے لگا۔

”تم بتاؤ۔ تمہیں کیا پریشانی ہے؟“

”تم کیا کرو گی؟“

”میں دعا کروں گی۔“ کوئل نے بہت اعتماد سے کہا۔

”میں نے کبھی اپنے لیے دعا نہیں کی۔ کسی سے کیا کراؤں گا۔“ قہقہہ۔

”تم نے تو خود سے میری طرح محبت بھی نہ کی ہو گی‘ یہ دعا بھی مجھے ہی کرنے دو۔“

”میں اتنا پکا مذہبی نہیں ہوں۔ پکا کیا مذہبی ہی نہیں ہوں۔“

”اللہ کے تو ہو ناں۔۔۔ اللہ کے بنائے۔۔۔ یا وہ بھی نہیں؟“

”عالم مت بنو۔“ اس نے اکتا کر فون بند کر دیا۔

✵ ✵ ✵

ماریہ پہلے والی ماریہ بن گئی‘ رات رات غائب رہتی‘ کبھی کبھار ہی عدن کو اس کی شکل دیکھنے کو ملتی۔

”مر جائے۔“ اس کی طرف دھیان جاتے ہی وہ سوچتا۔

”چند سالوں کی بات ہے۔ صرف چند سال۔“

وہ کچھ دنوں سے ایک فون نمبر کو یاد کرنے کی کوشش

کررہا تھا۔ لیکن ہر بار مایوسی ہی ہوئی، نمبر یاد نہیں آرہا تھا۔ وہ نمبر بھول چکا تھا۔ جس سم میں وہ نمبر تھا وہ سم اس نے پاکستان میں اپنے باتھ روم کے فلیش میں بہادی تھی اور اب وہ نمبر یاد کرنا چاہ رہا تھا۔

آج اسے میامی جانا تھا اسپتال کے لیے کچھ آلات لینے۔ کام تو ایک ہی دن کا تھا لیکن وہ ایک ہفتے کے لیے جارہا تھا۔ بیگ لے کر وہ ایر پورٹ آگیا ابھی وہ کاؤنٹر تک نہیں گیا تھا کہ دو امریکن اس کے آگے پیچھے آکر کھڑے ہوگئے۔ اپنے کارڈ نکال کر اسے دکھائے، عدن کی آنکھیں کھل گئیں۔

"کم دواز۔" (ہمارے ساتھ آؤ)

"لیکن کیوں؟" عدن حواس باختہ ہوگیا، امریکن پولیس اور سی آئی اے کی کہانیاں وہ اخبارات میں آئے دن پڑھتا تھا۔

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک نے کمر کے پیچھے اس کے ہاتھ لے جاکر لاک کیے اور اسے آگے دھکا دینے لگا دوسرے نے بازو پکڑلیا۔

"میں نے کیا کیا ہے۔ کیوں لے جارہے ہیں مجھے آفیسرز!" اس کی آواز بلند ہونے لگی۔

وہ دونوں گونگے بہرے بنے اسے ساتھ لے کر کار تک آئے، سر پر ہاتھ رکھوا کر اسے اندر دھکیلا اور کار چلادی۔ وہ سارے راستے کیوں، کیا، کیسے جیسے سوال کرتا رہا کوئی جواب نہیں ملا۔

اسے ایک اندھیرے سیل میں بند کردیا گیا۔

وہ اس وقت جیل میں ہے اس کا جرم کیا ہے۔ وہ نہیں جانتا، جن دو لوگوں کے ساتھ وہ آیا انہوں نے اسے سیکرٹ سروس کارڈ دکھایا تھا۔

"یہ کیا مذاق ہے؟

"یہ کیا ہورہا ہے؟" وہ رونے کے قریب ہوگیا۔

کیا یہ ماریہ نے کیا ہے، لیکن وہ ایسا کیوں کرے گی، اگر چاہے بھی نہیں کرسکتی۔ امریکا میں ایسی فون کالز نہیں چلتیں جن کے ملاتے اور بات ہوتے ہی بے گناہ لوگ جیل میں دھر لیے جائیں اگر ایسا ہوتا بھی ہے تو اس پیمانے پر نہیں کہ ماریہ جیسی کر گزرے۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ کسی کو یہ دھمکی بھی نہیں دے سکتا تھا کہ وہ کس باپ کا بیٹا ہے اور اس کا سر کون ہے۔ بے خیالی میں وہ دیوار سے سر ٹکا کر بیٹھا رہا۔ اب ان امریکن کو کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے تو ٹھیک ہے یہ کلیر کرلیں اس کا حساب صاف تھا، چند گھنٹے اونگھنے کے بعد اسے پیاس لگی، لیکن پانی نہیں تھا اس کے ہاتھ پیچھے کمر پر بندھے تھے۔

وہ واٹر واٹر چلانے لگا۔ کافی دیر تک چلاتا رہا لیکن گلا پھاڑ آواز سیل میں ہی گونجتی رہی۔ اس کا حلق اور خشک ہوگیا۔ رات تک چلانے کی ہمت بھی جاتی رہی صبح تک وہ بھوک اور پیاس سے فرش پر بچھ گیا اٹھ کر بیٹھنے کی سکت بھی نہ رہی۔ سیل کے اندر کوئی نہیں آیا۔ نہ ہوا نہ پانی، نہ کھانا، نہ انسان۔

اس کے پیٹ سے آوازیں آنے لگیں دوبارہ وہ نیم بے ہوش ہوا، غنودگی طاری ہوئی لیکن نیند نہ آئی۔ گزرتے گزرتے پل گھنٹے بن کر ایک اور پورے دن میں ڈھل گئے۔ شام ہوئی رات آئی۔ پیاس سے اب وہ بالکل مرنے کے قریب تھا۔ اب وہ اپنی زندگی بھر کی کمائی ایک قطرہ پانی پر لٹا سکتا تھا۔ کسی کا قتل کرسکتا تھا ایک بوند کے لیے وہ سب کچھ کرسکتا تھا اس نعمت کی قدر اسے آج سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ صرف دو دنوں میں ہی وہ بھول گیا کہ وہ کون ہے، کتنا لائق فائق ہے، کتنی فیکٹریوں کا مالک ہے، وہ آج کا آئندہ کا بھول گیا، لیکن حیرت انگیز طور پر اسے گزشتہ سے پیوستہ یاد آنے لگا۔

چند اور گھنٹے گزرے۔ رات گہری ہوگئی۔ وہ فرش پر ہی ادھ موا پڑا رہا۔ ہونٹ سوکھی لکڑی کی مانند ہوگئے اس نے کئی بار ارادہ کیا کہ اٹھ کر چلائے۔ لیکن اٹھ نہ سکا، باقاعدگی سے ورزش کرنے والے کو معلوم نہیں تھا کہ وہ اتنا کمزور ہے۔ کچھ باتیں بہت چالاک ہوتی ہیں وقت آنے پر ہی کھلتی ہیں۔ بھلے سے پہلے کتنے بھی تجربے کرلو پرکھ لو۔ حساب کتاب لگالو۔ جب کھلتی ہیں تو ہی اصل پرکھ دیتی ہیں۔

جب وہ پیاس سے بالکل مرنے کے قریب ہوگیا تو اس کے سیل کا دروازہ کھلا۔ دو لوگ اسے اٹھا کر لے گئے۔

اسے ایک کرسی پر بٹھادیا گیا۔ اس کمرے میں موجود تیسرا شخص اپنا منہ اس کے منہ کے قریب لایا۔

"ہو آر یو" (کون ہو تم) پیاس سے مرنے کے قریب عدن کو کچھ اندازہ ہوا کہ اس سوال سے اس کا مطلب کچھ اور ہی ہے۔

"ڈاکٹر... عدن... ہزبینڈ آف... سن آف..."

ایک گھونسا اس کے جبڑے پر آکر لگا۔ "نام نہیں پوچھا۔ ڈاکٹر اڈن سن آف غلم عالی غلم... نام نہیں پوچھا۔"

جبڑے پر پڑے گھونسے کی تکلیف سہتے، بند ہوتی آنکھوں کو بمشکل اٹھاتے اور سوکھے حلق کی تکلیف کو سہتے اس نے اس سب پر غور کرنا چاہا کہ اگر وہ اتنا کچھ جانتا ہے تو اس سے پوچھ کیا رہا ہے۔ اس کا سر ایک طرف لڑھک گیا۔

جب اسے ہوش آیا تو اس کے منہ کے ساتھ پانی لگا تھا۔ جیسے ہی اس نے زبان سے پانی اندر کیا، پانی ہٹالیا گیا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھے چھوڑ دو۔" وہ بڑبڑایا۔

اس کے سامنے چند تصویریں ایک ایک کرکے لائی گئیں۔ چند قطرے ہی اس کے حلق میں گئے تھے۔ سر ابھی بھی گھوم ہی رہا تھا، تصویریں دیکھ کر بھی اس نے نہیں دیکھیں۔ ایک اور گھونسا جبڑے پر آیا۔

"دیکھو انہیں کون ہیں یہ؟"

اس نے آنکھیں پوری کھول کر غور سے دیکھنا چاہا۔ ایک کو دیکھا دوسرے کو دیکھا۔ تیسرے کو دیکھا۔ وہ انہیں پہچان نہیں سکا۔

"میں نہیں جانتا انہیں۔" اس نے نہ میں گردن ہلائی۔

"غور سے دیکھو انہیں۔"

اس نے پھر غور سے دیکھا۔ وہ ایک اور گھونسا کھانا نہیں چاہتا تھا ایک کی شکل کو اس نے ذرا سا پہچانا لیکن یاد نہیں آیا کہ وہ کون تھا۔

"میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔" اس نے صاف صاف بتادیا۔

"گڈ... باقی بھی بس اگل دو۔"

"میں نے اسے کہیں دیکھا ہے اور بس... میں نہیں جانتا یہ کون ہے۔"

"یہ تمہارا ساتھی ہے۔"

"میرا ساتھی؟" آوازیں اسے دور سے آتی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ بہت قوت لگا کر بول رہا تھا۔

"یہ ہمیں مطلوب ہیں اور یہ تمہارے ساتھی ہیں۔ کہاں ہیں یہ؟" اس نے تصویروں کی طرف اشارہ کیا۔

"میں انہیں نہیں جانتا... یہ میرے ساتھی نہیں ہیں۔" وہ مسام مسام بھیگ گیا۔

"یہ تمہارے ساتھی ہیں۔" وہ اس کے کان کے پاس منہ لاکر چلایا۔ جیسے وہیں سے گردن میں دانت گاڑ دے گا۔

"میں انہیں نہیں جانتا۔" اس نے بھی زور لگا کر چلانا چاہا۔

"یہ تینوں تمہارے پاس علاج کے لیے آئے تھے۔" اس نے بند مٹھی کا ایک اور گھونسا تیار کیا۔

بجلی سی کوندی اور عدن کو یاد آیا کہ اس نے انہیں کہاں دیکھا ہے۔ ان میں سے ایک اس کا مریض تھا۔ ہاتھ کا زخم لے کر ایک بار آیا تھا۔ زخم کی نوعیت ایسی تھی کہ اس نے عدن کو اچھی خاصی رقم دی تھی اور خاموش رہنے کے لیے کہا تھا۔ عدن نے رقم رکھ لی اور علاج کردیا۔ چند ہفتوں بعد اسی شخص کا حوالہ دے کر دو اور لوگ کمر اور پیٹ کے ویسے ہی گہرے زخموں کے لیے اس کے پاس آئے تھے۔ یہ تیز دھار چاقو کے زخم تھے۔ رقم اس بار بھی زیادہ ملی اور عدن بھول بھی گیا کہ ایسا کوئی اس کے پاس آیا بھی تھا لیکن وہ یہ بھول گیا کہ وہ امریکا میں ہے اور وہاں کسی بات کو نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ وہ تینوں سفید فام تھے۔ غیر مسلم تھے۔ لیکن ان کا تعلق مشرق وسطیٰ کی خفیہ تنظیموں سے تھا۔

"ہاں... یہ میرے پاس علاج کے لیے آئے تھے۔" عدن نے سب سچ سچ بتادیا۔ یہ بھی کہ ان سے بہت پیسے ملے تھے لیکن اس کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

اس پتلے سے باڈی گارڈ ٹائپ آدمی کے چہرے پر تمسخر ابھرا۔

"کہاں ہیں وہ اب...؟"

"میں نہیں جانتا... میں قسم کھاتا ہوں۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔ میں قسم کھاتا ہوں یہ خود میرے پاس آئے تھے۔"

"کون ہیں وہ... تمہیں کہاں ملے... تمہارا رابطہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ سوال پر سوال پوچھنے لگا۔ اس کے اعصاب پر حاوی ہو چکا تھا۔

"میں قسم کھاتا ہوں' میں نہیں جانتا۔" عدن کی آواز رندھ گئی۔ اس کا سر گھومنے لگا۔ اسے آس پاس شرارے نظر آنے لگے۔ نیم اندھیرے میں رقص بسمل... زخم خوردہ نیند میں جان لیوا خواب۔

"تم ان کے ساتھی ہو... تم ایک دہشت گرد ہو؟"

وہ اسی بات سے ڈر رہا تھا۔ امریکی جیل میں ایک امریکی کے سامنے مردوں کی طرح بیٹھا وہ یہی دعا کر رہا تھا کہ وہ اس پر "دہشت گرد" کا لیبل نہ لگادیں۔

اخباروں میں پڑھی گئیں' ٹی وی میں دیکھی گئیں خبریں اس کے آگے پیچھے گھومنے لگیں۔ اس پر بیان سے باہر دہشت طاری ہو گئی۔ وہ صرف تفتیش نہیں کر رہا تھا' اسے دہشت گرد ثابت کر رہا تھا۔ اس سے منوا رہا تھا۔

اس نے ایک غلطی کی تھی ان سے زیادہ رقم لینے کی اور اسی لالچ کی وجہ سے وہ ان کے ساتھ منسلک کردیا گیا۔ جیسے وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ کبھی وہ امریکی سیل میں بھی ہوگا۔ ایسے ہی اب وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ باہر آئے گا بھی کہ نہیں...

اب اسے ماریہ یاد آرہی تھی۔ وہ اس کی بیوی تھی۔ اسے اس کے لیے کچھ کرنا چاہیے اور وہ ضرور کرے گی جب غلام علی غلام کو اس کے اندر ہونے کی خبر ملے گی تو وہ بھاگے چلے آئیں گے اپنے سارے اثر و رسوخ استعمال کرلیں گے اور اس کے سسر وہ کیسے برداشت کریں گے کہ ان کا داماد' ان کی اکلوتی بیٹی کا شوہر جیل میں رہے۔

وہ جلد ہی باہر آجائے گا... جلد ہی... اتنی دولت... اتنے تعلقات کب کام آئیں گے۔ وہ ایک پڑھا لکھا' امن شہری ہے' ڈاکٹر ہے' مسیحا' دہشت گرد نہیں ہو سکتا۔ اس کے حق میں بہت سے ثبوت ملیں گے۔

☆ ☆ ☆

جیل آنے کے آٹھ ماہ بعد اس نے بیرونی دنیا کے جس پہلے شخص کو اپنے پاس پایا۔ وہ اس کا وکیل عبدالعزیز تھا۔ سیاہ فام امریکی مسلم تھا۔ اس کے سامنے وہ دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔ عزیز اسے بتا رہا تھا کہ کن مشکلات سے اس سے یہ ملاقات ہو پائی ہے۔

"پاپا نہیں آئے؟" اس کا پہلا سوال یہی تھا۔ وہ لاغر' کمزور ہو چکا تھا۔ یہ جسمانی بات تھی۔ وہ اندر سے کیا کچھ ہو چکا تھا۔ یہ دوسری بات تھی۔

"وہ نہیں آسکتے... تم سے صرف میں ہی مل سکتا ہوں۔"

"کہاں ہیں وہ؟ انہیں آنا چاہیے تھا۔" ہر چیز کو ممکن کرنے والے پاپا کے لیے یہاں آنا کیا مشکل تھا۔

"وہ امریکا میں نہیں ہیں۔"

"پھر کہاں ہیں؟" اسے اپنے جیل آنے سے زیادہ صدمہ اس بات کو جان کر ہوا کہ وہ اپنے لاڈلے بیٹے کے پاس امریکا میں نہیں ہیں۔

"میرے پاس وقت کم ہے۔ تم مجھے ہر بات بتاؤ۔ میں نے جتنی بھی معلومات اکٹھی کی ہیں' وہ ناکافی ہیں۔"

"میرے پاپا کہاں ہیں؟" بھاڑ میں جائے اس کا کیس۔ اسے اپنے باپ کی فکر تھی کہیں... وہ... وہ...

"وہ پاکستان میں ہیں... مجھے انہوں نے ہی پاکستان سے ہائر کیا ہے۔" اس نے تحمل سے جواب دیا۔ "پ ب تمہارے کیس پر بات کریں۔"

"پاکستان میں..." اسے ایک اور صدمہ ملا۔ وہ یہاں جیل میں اور اس کا باپ پاکستان میں ہے۔ ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ تو پہلی فلائٹ لے کر یہاں بھاگے چلے آئے ہوں گے۔

"وہ ٹھیک ہیں؟ ٹھیک ہیں وہ؟" وہ صدمے سے مرنے کے قریب تھا۔ "وہ زندہ ہیں نا" وہ سمجھا اس کے صدمے نے ان کی جان لے لی ہوگی۔

"وہ بالکل ٹھیک ہیں' میری ان سے یہاں آتے ہوئے بات ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا کہ تم گھبرانا نہیں۔"

اس بات پر وہ الجھ گیا۔ "وہ خود کیوں نہیں یہاں آئے۔"

"وقت ختم ہو رہا ہے۔ اپنے کیس سے متعلق بات کرو۔" وہ جھنجلا گیا۔

ناچار عدن نے اسے ایک ایک بات شروع سے آخر تک بتادی۔

"ان کے پاس ویڈیو بھی ہے۔ ان تینوں کی' تمہارے اسپتال میں آتے وقت کی... وہ رات گئے آئے' تقریباً "منہ چھپاکر۔"

عزیز نے اس سے کافی باتیں کیں۔ جاتے ہوئے اس نے تسلی کے نام پر دو لفظ نہیں کہے۔ شاید وہ جھوٹی تسلی دینے والوں میں سے نہیں تھا۔

شروع کے دنوں میں وہ چیختا چلاتا رہا تھا۔ سوال پر سوال کرتا تھا۔ پھر مار کھاتا تھا۔ کئی کئی دن بھوکا رکھا جاتا تھا۔ پھر اسے چپ لگ گئی۔ اب وہ بنا آواز اور آنسو کے روتا۔ نیند آجاتی تو شکر کرتا' ورنہ جاگتا رہتا۔ ٹی وی پر دیکھی ڈاکومنٹریاں اسے یاد آنے لگتیں۔ اب وہ کبھی یہاں سے نہیں نکل سکے گا۔ پہلے ہی ہفتے اسے یقین ہو گیا۔

اس نے باہر آنے کی امید چھوڑ دی' وہ صرف موت کا انتظار کرنے لگا۔ وہ اپنی قید کے دن گننے لگا۔ اب عزیز ہی اس کے پاس رابطے کا واحد ذریعہ تھا۔

اس کا اسپتال سیل ہو چکا تھا۔ اکاؤنٹ فریز کردیے گئے تھے۔ غلام علی غلام کو ان کے پاکستانی وکیل نے مشورہ دیا تھا کہ ان کا امریکا جانا ٹھیک نہیں۔ "سی آئی اے" کی تحویل میں وہ بھی آسکتے ہیں۔ ایسا سو فیصد ہو سکتا تھا۔ انہیں پاکستان ہی رکنا پڑا۔ وہیں سے ساری کوششیں کرنی پڑیں۔ اسپتال کے فروخت ہوتے ہی۔ ماریہ اور اس کے خاندان پر بھی کڑی نگرانی رکھی گئی تھی۔ کئی ہفتے ان سے تفتیش ہوتی رہی تھی۔ آغا عباس حیدر کو اسٹورز کی ساری چین ہاتھ سے نکلتی دکھائی دی۔ ان کی اپنی امریکی قومیت خطرے میں پڑ گئی۔

اس موقع پر وہ رپورٹ کچھ کام آئی جو ماریہ نے عدن کے تھپڑ پر کروائی تھی اور پولیس عدن کو پکڑ کر لے گئی تھی۔ ماریہ کی مام ڈیڈ اور اس کے اکلوتے بھائی نے اپنے وکیل کے مشورے پر صاف صاف یہ بیان دیا کہ وہ اس کی عادات اور حرکتوں سے پہلے ہی سے تنگ تھے۔ وہ خود اس کی طرف سے مشکوک تھے۔ اس کے رویے سے نالاں تھے۔ وہ اسے نہیں جانتے۔ وہ پاکستانی تھا۔ وہ امریکا میں رہے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس کا تعلق کن کن لوگوں سے تھا۔

آغا عباس حیدر زیادہ گھاگ تھے۔ انہوں نے چھوٹی چھوٹی اور کئی باتیں سوچ کر گھڑ کر سنائیں۔ انہیں بس اپنی جان چھڑوانی تھی۔

ساتھ ہی ماریہ نے عدالت میں طلاق کے لیے درخواست دائر کردی۔ ازبک مام نے اسے لالچی اور پیسے کا رسیا ثابت کرنا چاہا۔ وہ ایک لمبے عرصے سے امریکا میں رہ رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ امریکا میں کسی مسئلے سے کیسے نکلنا ہے۔

عدن کے خلاف ڈھیروں بیانات اکٹھے ہو گئے۔

"اس کا ساتھ دینے کے بجائے تمہاری بیٹی اس سے طلاق لے رہی ہے۔" بیوی کو گرل فرینڈ بنا کر رکھنے کا مشورہ دینے والے پاپا یہ شکوہ کر رہے تھے۔

"یہ فیصلہ وہ پہلا تھپڑ کھانے پر ہی کر چکی تھی۔" امریکیوں سے پہلے انہوں نے مان لیا تھا کہ وہ دہشت گرد ہے۔

"اس کی مدد کرنے کے بجائے تم یہ سب کرو گے۔ مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی اور نہیں تو دوست کا بیٹا ہی سمجھ لو اسے۔"

"اس کی مدد کے لیے تم کیوں نہیں یہاں آجاتے.... باپ ہو تم اس کے۔"

"قانونی باپ تو تم بھی ہو اس کے۔"

"میں صرف ماریہ کا باپ ہوں اور اسے وہ مارتا رہا ہے۔ کتنے لالچی ہو تم لوگ' اس کے اکاؤنٹ سے پیسے تمہارے ہی اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہوتے رہے ہیں۔ تمہارے بیٹے نے تو یہاں ڈالرز کی فیکٹری لگا رکھی تھی' دہشت گرد ہے وہ۔"

"نہیں ہے وہ دہشت گرد۔" وہ غصے سے کھول اٹھے۔

آغا جی نے جناتی قہقہہ لگایا۔ "مان لو یہ بات' امریکی غلط نہیں ہوتے' اگر غلط ہوں تو بھی اسے غلط نہیں رہنے دیتے۔"

"تم نے پھنسوا دیا ہے اسے۔" فون کے پار وہ دھاڑے۔

"مجھے اس چوہے کو پھنسوانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایسی ٹڈی کو میں پیروں تلے بھی نہیں کچلتا' چوہے کے لیے شیر کا پنجرہ.... ہونہہ.....!"

"اسی ٹڈی کے ساتھ تم نے اپنی کال گرل بیٹی کو بیاہ دیا۔ جس پر ہر امریکی تھوک گیا تھا۔" ان کا بس نہیں چل رہا تھا' آغا کی گردن دبوچ لیں۔

"اس تھوکی ہوئی کو تمہارے بیٹے نے کیوں چاٹا آخر۔" آغا نے بہت آرام سے پوچھا اور فون بند کر دیا۔

اس کے بعد عدن سے متعلق آنے والی کوئی فون کال ریسیو نہ کی گئی۔ ماریہ کو امریکا سے باہر بھیج دیا۔ کچھ ہی عرصے بعد خود بھی فرانس چلے گئے۔ اپنے بزنس کو وہ کہیں سے بھی ہینڈل کر سکتے تھے۔

ماریہ نامی باب' آغا نامی دولت کو بہت شان و شوکت سے عدن کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔ بہت دھوم دھڑکا تھا ان کے نام اور دولت کا' عدن اور اس کے باپ کے لیے ایک سال آٹھ ماہ پیشتر ان ناموں کا بہت ڈنکا بجا تھا۔

رنگ ماسٹر غلام علی غلام نے بہت لمبی پلاننگ کی تھی۔ دونوں دوست تھے۔ ساتھ ساتھ پڑھے تھے آغا امریکا چلے گئے۔ غلام علی نے اپنے باپ کا کاروبار سنبھال لیا۔ مختصرے میں آغا کہاں سے کہاں جا پہنچے اور غلام علی صرف تین فیکٹریاں ہی بنا سکے۔ جس طرح وہ اپنے بیٹے کو بڑے بڑے ٹارگٹ دیتے تھے۔ اسی طرح اپنے لیے بھی بڑے ٹارگٹ ہی رکھتے تھے اور ان کا ٹارگٹ آغا کو کٹ کرنا تھا۔ لیکن ایسا ہو کر نہیں دے رہا تھا۔ وہ گاہے بگاہے امریکا چکر لگاتے رہتے۔ آغا پر قریب سے نظر رکھتے۔ ماریہ بھی ان کی نظر میں تھی اور اس قریب کی نظر میں ہی وہ جان گئے کہ ماریہ جیسی لڑکی ان کے ہاتھ نہیں آئے گی۔ بہت ہی مشکل ہے' وہ کرے گی تو اپنی مرضی سے' ورنہ کوئی اسے عدن کے لیے منا نہیں سکے گا اور آغا کیوں عدن کی طرف جھکے گا۔ ساتھ ساتھ غلام علی نے دو' تین اور خاندانوں پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ لیکن آغا عدن کی طرف جھک ہی گیا۔ ماریہ انہیں مل ہی گئی' لیکن' پھر بھی کیا ہوا۔ آغا خود کو بچا کر ایک طرف ہو گئے۔ بیٹا تو ان کا ہی گیا نا۔

غلام علی کو یقین تھا کہ اس سب کے پیچھے آغا کا ہاتھ ہے۔ آغا نے کسی حسد یا جلن میں عدن کو پھنسایا ہے۔ کوئی بدلہ لیا ہے۔ غلام علی سے.... اور غلام علی دھوکا کھا گئے۔ آغا پر سارا الزام دھرتے وہ اس آگ کو بھول گئے جو چلتی فیکٹری میں لگا کر بھڑکائی گئی تھی۔ فیکٹری دیوالیہ ہو رہی تھی۔ انہیں بیمہ کی رقم چاہیے تھی۔ فیکٹری کو حادثے کی ضرورت تھی۔ اس حادثے کا منصوبہ انہوں نے بنا لیا۔ غلام علی' عدن' عدن کے بھائی' ان کے چند دوستوں نے مل کر کمال کا منصوبہ تشکیل دیا۔ چلتی فیکٹری' دن کے وقت پچاس ورکرز کی موجودگی میں آگ بھڑکی اور فیکٹری کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اس آگ نے کیا کچھ نہیں تباہ کیا تھا۔ صرف غلام علی غلام کو ہی تباہ نہیں کیا تھا' دس' نو عمر لڑکے جھلس کر

مر گئے۔

باقی جو زندہ رہے' وہ جگہ جگہ سے جھلس گئے' تین ہفتوں کے وقفے سے مر گئے۔ کہتے ہیں آگ کا جلا نہیں بچتا' جو مر گئے تھے ان کے گھر والے پیچھے سے مر گئے۔ کسی کا جوان بھائی گیا' کسی کا شوہر' کوئی تین بچے یتیم کر گیا' کوئی سات۔

مرنے والے مر گئے۔ فیکٹری بند ہو گئی۔ باقی ماندہ بیروزگار ہو گئے۔ امداد کے نام پر ان کو ایک روپیہ نہ دیا گیا۔ نہ علاج کروایا گیا' نہ کھانے کو دیا گیا' فیکٹری میں کام کرنے والے پچاس ورکرز اپنی موت اور آگ سے انجان وہاں پر روز کی طرح کام کرنے آئے تھے۔ ان میں سے کئی بعد ازاں دمے کے مریض بن گئے۔ ان کے ساتھ یہ سب اچانک ہوا اور بھیانک ہوا۔ اتنے جوان بیٹوں' شوہروں' باپوں کو نگل لینے والا غلام علی غلام اپنے صرف ایک بیٹے کے لیے تڑپ رہا تھا۔

آغا کے لیے ان کے اندر ایسی آگ بھڑکی تھی کہ ان کا جی چاہتا تھا کہ ان کے سینے پر چڑھ کر اس کا کلیجہ کچا کھائیں۔ لیکن وہ بے بس تھے۔

غلام علی غلام کو اب اپنی طاقت اور حیثیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ زندہ لوگوں کو جلانے والے' کاغذ کے نوٹ اکٹھے کرنے والے' فرعون بنتے ہیں' بھول جاتے ہیں تھپڑ کا جواب گھونسے سے ملے گا اور ضرور ملے گا۔

غلام علی غلام کا بس نہیں چل رہا تھا ایک ایک امریکی کو خرید لیں لیکن نہ ان کے پاس اتنے پیسے تھے۔ نہ ہی سارے امریکی بک رہے تھے۔ امریکا وہ جا نہیں سکتے تھے۔ ان کے وکیل نے سختی سے منع کیا تھا۔ عدن کے اکاؤنٹ سے پیسے انہیں ہی ٹرانسفر کیے جاتے رہے تھے۔ انہیں بھی دہشت گرد سمجھ لیا جائے گا۔ پاکستان سے ہی انہوں نے ایک قابل وکیل کو ہائر کیا۔ تمام تر کوششوں کے باوجود عدن کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ کس ریاست' کس شہر' کس جیل میں' کوئی بھی انہیں کچھ بھی بتانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

آٹھ ماہ غلام علی غلام نے جلتے کوئلوں پر گزارے' پیسہ پانی کی طرح جا رہا تھا۔ وہی پیسہ جو پانی کی طرح کمایا گیا تھا۔ وہ ہر وقت عزیز سے رابطے میں رہتے تھے۔ عدن سے ملاقات کی روداد سن کر غلام علی غلام رونے کے قریب ہو گئے۔ انہیں ایسا وقت بھی دیکھنا تھا۔ ان کا دیوتا غلام بنا لیا گیا تھا۔ ان کے بار بار پوچھنے پر بھی عزیز نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ وہ دیکھنے میں کیسا ہو گیا تھا۔ وہ کیس ہی ڈسکس کرتا رہا۔ عزیز نے انہیں ایک فیصدی بھی آس نہیں دلائی تھی کہ اس کا کیس مضبوط ہے اور وہ جلد ہی باہر آجائے گا۔

"سب کچھ اس کے خلاف ہے۔ اس کے پاس اپنے حق میں ثابت کرنے کو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"وہ بے قصور ہے۔" غلام علی کے پاس صرف یہی ایک دلیل تھی۔

"اس نے ان سے پیسے لیے تھے۔"

"وہ پیسے علاج کے لیے تھے۔"

"وہ پیسے ان کی شناخت کو چھپانے کے لیے تھے۔ عدن نے رات گئے اپنے آفس میں تنہا انہیں ڈیل کیا۔ ان کا علاج کیا اور....."

"وہ پھر بھی بے قصور ہے۔ دہشت گرد نہیں ہے۔ ان کا ساتھی نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے وہ.... تم اسے جلد سے جلد باہر نکلواؤ' جتنا چاہے پیسہ لگے' میں دوں گا۔"

"پیسہ نہیں.... ثبوت چاہیے' یہاں پیسے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"پیسے سے سب ہو جاتا ہے۔" غلام علی کے پاس ایک ہی حل تھا پیسہ.....

عزیز چپ ہی رہا۔ سوچنے لگا' کیسا انسان ہے۔ بات سمجھ ہی نہیں رہا۔ پیسہ پیسہ کر رہا ہے۔ جیسے قانون میری جیب میں ہے۔ عدالت میرے حکم سے چلتی ہو اور میں وکیل نہ ہوں۔ کوئی دکان دار ہوں کہ سب خرید کر دے دیا۔ وہ ایسے ہی مشرقی لوگوں سے اس کا واسطہ پہلے بھی پڑ چکا تھا لیکن اس بار اسے حیرت تھی۔ کیونکہ غلام علی مسلمان تھا۔ وہ خود بھی مسلمان تھا۔ اس شخص کے ساتھ وہ پچھلے آٹھ ماہ سے رابطے میں تھا

اور اس کی کسی ایک بھی بات نے عزیز کو متاثر نہیں کیا تھا۔ بہرحال یہ اس کا پیسہ تھا اور اسے دل جمعی سے کام کرنا تھا۔ وقفے وقفے سے اس کی کئی ملاقاتیں عدن سے ہوئیں۔ اب وہ کچھ سنبھل رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ جلد ہی باہر آجائے گا۔

"تم دوبارہ ان سے کبھی ملے؟"

"نہیں، کبھی نہیں، پھر کبھی نہیں۔"

"ان کے نام بھی نہیں جانتے؟"

"نہیں... انہوں نے کہا۔ کچھ مت پوچھو صرف علاج کردو۔"

"برائے مہربانی مجھے ایک بار پھر سے یاد کر کے بتاؤ۔ وہ تم سے کہیں اور ملے یا دوبارہ تمہارے پاس آئے یا تمہیں فون کیا؟"

"میں کتنی بار بتا چکا ہوں... نہیں... نہیں... نہیں۔"

"تمہیں اپنے اعصاب قابو میں رکھنے چاہئیں۔" عزیز نے تحمل سے کہا۔

"کچھ بھی میرے قابو میں نہیں ہے۔" وہ چڑ گیا۔

"اکثر باتیں بے معنی نظر آتی ہیں۔ لیکن وہ بے حد اہم ہوتی ہیں۔ اگر وہ تیسری، چوتھی بار تمہارے قریب سے بھی گزرے ہوں گے تو میرے لیے تمہارے کیس کا دفاع مشکل ترین ہو جائے گا۔"

عدن نے اپنی سوچوں کو اکٹھا کرنا چاہا۔ بہت باریک بینی سے، پھر سے اپنی یادداشت کا جائزہ لیا۔

"نہیں۔" اس نے کہا۔ "میں انہیں جانتا ہی نہیں۔ وہ میرے پاس خود آئے تھے۔"

"یہ نہیں مانیں گے، تم نے ان کی شناخت رجسٹرڈ نہ کر کے بہت بڑی غلطی کی۔"

"یہ کیسے نہیں مانیں گے۔ میں ایک ڈاکٹر ہوں، پولیس والا نہیں کہ علاج سے پہلے تفتیش کروں۔ مجھ سے یہ غلطی ہوئی کہ میں نے ان کے ناموں کے اندراج نہیں کیے۔ ان کے زخموں کی نوعیت کو چھپایا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں ان کا ساتھی ہوں یا وہشت گرد ہوں۔ مجھے میرے حصے کی سزا ملنی چاہیے مگر اتنی بڑی سزا نہیں۔"

"یہ دلائل تو جج کے سامنے ہی دیے جائیں گے۔"

اس جواب پر عدن غصے سے عزیز کو دیکھ کر رہ گیا۔

"اپنی پشت پر ایک ہاتھ ایسا ضرور رکھو جو وقت پڑنے پر تھپکی بھی دے اور ہاتھ بڑھا کر گڑھے سے بھی نکال لے۔ اپنی پشت پر یہ ہاتھ تمہیں خود بنانا ہوگا۔ یہ من و سلویٰ نہیں کہ بیٹھے بٹھائے مل جائے۔"

عزیز کی بات درست تھی مگر پشت پر تھپکی دینے والا وہ ہاتھ اسی پشت کو کنویں میں اور نیچے دھکا دے کر جا چکا تھا۔

اس کا اپنا سگا باپ امریکا کے ڈر سے امریکا نہیں آرہا تھا۔

"امکانات تو بہت سے ہیں۔ یہ بھی کہ مقدمہ عدالت تک جائے گا ہی نہیں اور یہیں کہیں تمہارا فیصلہ ہو جائے گا۔"

ایک اور تیز نگاہ اس نے عزیز پر ڈالی کچا کھا جانے والی۔

"ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔ میں ایک عام انسان ہوں۔ پڑھا لکھا۔ ایسے کیسے؟" وہ چلایا۔

عزیز نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

"تم ماریہ کے ڈیڈ سے رابطہ کرنے کی کوششیں کرو، بہت سے سرمایہ دار ان کے دوست ہیں۔ بڑے بڑے لوگ ان کے گھر آتے جاتے ہیں۔ کچھ قانون دان بھی ان کے جاننے والے ہیں۔ میڈیا سے روابط ہیں ان کے۔"

"جو بیانات انہوں نے تمہارے خلاف دیے ہیں، مجھے نہیں لگتا کہ وہ تمہاری کوئی بھی مدد کریں گے۔ مگر پھر بھی ٹرائی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔"

"ماریہ سے بات ہوئی تمہاری؟"

"اس کے وکیل سے ہوئی تھی۔"

عدن نے تین، چار غلیظ گالیاں ماریہ کے نام کی، وہ امریکی قانون دانوں کو گالیاں دینے لگا۔ جنہوں نے اس جیسے شریف، پڑھے لکھے انسان کو قید کر لیا تھا۔

پھر گیارہ ماہ گزر گئے۔ کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔ وہ اس کی منت سماجت پر آگیا۔

"میں کوشش ہی تو کر رہا ہوں عدن!"

"مجھے یہاں سے نکالو، پلیز، کچھ کرو۔" اس نے رونے میں شرم محسوس نہیں کی اور عزیز کے سامنے رونے لگا۔

"اگر تم پر کچھ ثابت نہ ہوا تو تم ضرور باہر آؤ گے۔"

"اگر ثابت ہو گیا۔ انہوں نے ثابت کر دیا... پھر... پھر؟"

"ٹیک اٹ ایزی پلیز۔" وہ اتنا ہی کہہ سکا۔

"مجھے کون بے گناہ ثابت کرے گا۔"

"میں کوشش کروں گا، کر رہا ہوں۔"

"کوئی میری ضمانت بھی نہیں کروا سکتا؟"

عزیز کو اس کے بھولپن پر تمسخرانہ ہنسی سی آئی۔

"ابھی تو اوباما بھی تمہیں ضمانت پر رہا نہیں کروا سکتا۔"

"پھر کون کروا سکتا ہے؟" اس وقت وہ پاگل پن کی حد کے قریب تر تھا۔

عزیز نے کندھے اچکائے۔ پھر جیسے کچھ یاد آیا۔

"خدا۔"

"خدا!" عدن بڑبڑایا۔ جیل میں رہتے بھی اس نے کبھی نماز نہیں پڑھی تھی۔ دکھ میں ہی سہی۔

جسے مانگنا آتا ہے۔ اسے مل ہی جاتا ہے۔ عدن کو مانگنا آتا نہیں تھا۔ جسے آتا تھا اس کا دعوا تھا اسے سب مل جاتا تھا۔

"تم ایک کام کرنا عزیز... پاپا کو فون کرنا، غور سے سنو، کہنا، انار کلی، نیلا گنبد گلی نمبر چار میں جائیں۔ سبز رنگ کے دروازے والے گھر میں آواز دے کر کہیں مجھے آزاد کروا دے۔ صرف ایک اور احسان کر دے۔ گھر چھوٹا ہے۔ گلی تنگ ہے لیکن پاپا سے کہنا، ضرور جائیں۔ وہ مانگتی ہے اور اسے ملتا ہے۔ میری آزادی بھی مل جائے گی۔"

عزیز اس کی طرف دیکھے گیا۔ وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ "میں کہہ دوں گا۔"

"تم یاد سے کہہ دینا۔" اس نے آنکھیں پونچھیں۔

انار کلی نیلے گنبد سے اندر رہائشی آبادی میں پہلی سڑک سے نکلتی گلیوں میں دو گلیاں چھوڑ کر تیسری گلی میں، جو بند بھی ہے اور تنگ بھی اور جس میں صرف دو ہی گھر ہیں، جس میں سے ایک گھر میں وہ رہتی ہے افق کشمیری حسن والی، خشک میوے کے ڈھیر پر، سرخ کشمیری سیب سی، وہ اس وقت فرما بنا رہی ہے۔ صبح گجر دم اٹھ کر گھر کے کام سے فارغ ہو کر وہ لکڑی کے چوڑے تختے نما چوکی کے سامنے چوکڑی جما کر بیٹھ جاتی ہے۔ دوپہر تک چوکڑی ایسے ہی جمی رہتی۔ پانی کا جگ بھر کر وہ اپنے پاس ہی رکھ لیتی۔ تاکہ دوپہر سے پہلے اٹھنا نہ پڑے۔ گھٹنوں سے پیوست چوکڑی لمحے بھر کے لیے کھلتی تو درد کی لہریں نکلتیں، پھر دوبارہ بیٹھنے میں درد ہوتا۔ وہ ٹھیک دو بجے اٹھ جاتی۔ روٹی پکاتی، سالن پکاتی۔

اب سب آتے جائیں گے۔ کھانا کھاتے جائیں گے۔ پہلے اسد اور جمال آئیں گے۔ کھانا کھائیں گے اور پڑھنے بیٹھ جائیں گے۔ ان سب کے پاس ایک ہی چیز کی کمی تھی وقت کی، ورنہ فارغ وقت میں وہ پہاڑ بھی کھودنے بیٹھ جاتے۔ سارے وقت میں وہ بس کام ہی کرتے رہتے۔ روٹی پکانے اور کھانے میں صرف ہونے والا یہ آدھ گھنٹہ بھی افق پر بڑا بھاری گزرتا۔ جی چاہتا کہ فرما بس جلدی جلدی بن جائے۔ اسے ڈر رہتا تھا کہ اگر اس نے وقت پر فرما بنا کر نہ دیا تو اسے مزید کام نہیں ملے گا اور اگر کام نہیں ملے گا۔ تو پیسے کہاں سے آئیں گے۔ یہ ڈر اسے ہر روز لاحق ہو جاتا۔ چھوٹی سی تھی تو چھوٹے چھوٹے ڈر رکھتی تھی۔ ہر وقت ڈری ہی رہتی۔

تین بجے اماں آئیں، بنا کھانا کھائے ہی لیٹ گئیں۔ فرما بناتے وہ اٹھی۔ "کیا ہوا، تھک گئیں؟"

وہ مسکرائیں۔ "میں کھانا کھا لوں گی، تم اپنا کام کرو۔"

"اچھا جی!"

"کھانا کھایا تم نے؟"

"جی!" کام کرتے ہوئے کہا گیا۔

"کچھ دیر آرام کرلو۔"

"نہیں جی!" وہ تیزی سے ہاتھ چلانے لگی۔

دونوں اسی طرح اپنے فرائض پورے کردیتیں۔

افق تیزی سے ہاتھ چلا رہی تھی۔ ہزار کا فرما تھا۔ ایک ایک کاغذ کو نمبر دیکھ کر فولڈ کرنا ہوتا ہے۔ اس کی تہہ بٹھانی ہوتی ہے۔ شام چھ' سات بجے دکان سے لڑکا آتا ہے تیارہ شدہ فرمالے جاتا اور مزید تیار کرنے کے لیے دے جاتا۔ کبھی کبھی فرمے کی جگہ خاکی لفافے بنانے کے لیے دے جاتا۔ ہفتہ وار اجرت مل جاتی۔

"افق! چائے لے لو۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

اس نے جھک کر کاغذ کی تعداد دیکھی اور تیزی سے ہاتھ چلانے لگی۔ چھ سے ساڑھے چھ ہوگئے۔ فرما بن گیا۔ اس نے ٹھنڈی چائے پی لی' لڑکا آیا' فرما اٹھا کر لے گیا۔ نئے بنانے کے لیے رکھ گیا۔ اب یہ والے فرمے وہ رات کو شروع کرے گی۔

تھوڑی دیر لیٹ کر وہ کتابیں لے کر بیٹھ گئی۔ اماں کھانا بنانے لگیں۔ چند گھنٹے پڑھنے کے بعد اسے پھر سے کام سے لگ جانا تھا۔ اس گھر میں رہنے والے چاروں افراد کو زندگی گزارنے کے لیے بہت سخت محنت کرنی پڑتی تھی۔ افق گھر میں کرتی تھی۔ اماں اسکول کی کینٹین میں' دونوں بھائی پریس میں' بہت سالوں سے ان کی زندگی ہر روز ایسے ہی شروع ہو گئی تھی۔

اماں آٹھ پاس بھی نہیں تھیں۔ اسکول کی پرنسپل اچھی تھیں۔ انہیں کینٹین کے لیے رکھ لیا تھا۔ دو بجے تک وہ چھوٹی سی دکان نما کینٹین میں کاپی' پنسل' جوس' برگر بیچتی تھیں۔

شروع میں پندرہ سو ماہوار پر رکھا گیا۔ سال گزرنے پر ان کی تنخواہ میں چند سو بڑھ جاتے۔ اب انہیں ڈھائی ہزار ملتے تھے۔

جمال اور اسد سرکاری اسکول کے فنڈ سے پڑھتے تھے۔ بیماری کی صورت میں وہ فنڈ سے پیسے لے سکتے تھے جو انہوں نے کبھی نہیں لیے تھے۔ انہیں صرف کتابیں ہی چاہیے تھیں۔ جمال کا خیال تھا کہ وہ جلد ہی اپنا نام فنڈ کی فہرست سے خارج کروا دے گا۔ سوائے پڑھائی فیس خود دینا چاہتا تھا۔ وہ دونوں آدھے گھنٹے کی مسافت طے کر کے پیدل اسکول آتے جاتے تھے انہوں نے اس بات پہ کبھی آنسو نہیں بہائے کہ شام کو کھیلنے کے بجائے انہیں پریس کیوں جانا پڑتا ہے۔

انسان کا پیٹ کتنا اچھا ہے۔ کتنا بھلا مانس' شریف' چپ' مان لینے والا' ایسے ہی افق نے کیا' افق نے آٹھویں تک اسکول سے پڑھا تھا۔ میٹرک پرائیویٹ کیا۔ آج کل ایف اے کی تیاری کر رہی تھی۔ وہ بڑی معصوم سی' گم صم سی لڑکی تھی۔ اتنا کام کرتی' اتنا کہ اماں اسے دیکھ دیکھ رونے کے قریب ہو جاتیں۔ انہیں ڈر لگتا کہ تختے پر جھکے جھکے وہ بڈھی ہو جائے گی۔ جھکی کمر اس کا کب نکال کر ہی چھوڑے گی۔

"افق بس کرو۔" رات گئے ان کی آنکھ کھلی تو حسب معمول کہا۔

"جی اچھا! ابھی کر دیتی ہوں۔" وہ اکلوتے کمرے کے آگے بنے برآمدے میں بیٹھی تھی۔ اماں کمرے میں سو رہی تھیں۔

اماں کے سامنے وہ کمر سیدھی کر کے آہ بھی نہ کرتی۔ ورنہ اماں دو وقت کی روٹی پر سب کو لے آتیں۔

ایک کمرے' برآمدے اور چھوٹے سے صحن پر مشتمل گھر تھا۔ آہستہ آہستہ پیسے جمع کر کے اماں نے فرش اور دیواروں کی مرمت کروالی تھی۔ اماں ہر سال سفیدی کرواتی تھیں۔

اکلوتے کمرے میں لنڈے کا قالین بچھا تھا۔ کمرے کا یہی واحد سامان تھا۔ اسی پر وہ سب تکیے رکھ کر سو جاتے تھے۔ تکیے اٹھا کر بیٹھ جاتے تھے۔ دیوار پر سامنے ایک گھڑی' ایک طرف کیلنڈر اور دوسری سامنے دیوار پر افق کے مرحوم والد کی ایک تصویر ٹنگی تھی۔ برآمدے میں دو موڑھے' ایک میز اور ایک لوہے کی الماری رکھی تھی۔ موڑھوں کو اٹھا کر افق اپنا چوکی نما تخت بچھا کر فرما' خاکی لفافے بناتی' چھوٹے سے صحن میں چند گملے رکھے تھے۔ بس یہی سب کچھ تھا انار کلی

کے اس گھر میں۔

وہ سب خوش اور مطمئن تھے اپنی زندگی سے وہ دولت کے بارے میں صرف اتنا ہی سوچتے تھے جتنی ان کی ضرورت تھی۔

افق کے والد ایک فیکٹری میں ٹرک ڈرائیور تھے۔ دوسرے شہروں میں مال سپلائی کرتے تھے۔ لوڈنگ کے دوران وزنی مال ان پر آگرا۔ چند دن اسپتال میں رہ کر وہ خالق حقیقی سے جا ملے۔ فیکٹری مالکان نے چند لاکھ دیے۔ جس سے اماں نے یہ بوسیدہ گھر خرید لیا۔

آہستہ آہستہ جب ہر رشتے دار کی اصل شکل سامنے آنے لگی تو وہ زندگی کے سامنے ڈٹ گئیں۔ اپنے بچوں کی طرف دیکھتیں اور مضبوط ہوتی چلی جاتیں۔

جو سبق انہوں نے خود کو پڑھایا' وہی اپنے بچوں کو ازبر کروا دیا کہ وہ یتیم ہوئے ہیں' لاچار نہیں۔ زندگی کا ڈٹ کا مقابلہ کریں۔ آنسو پونچھ لیں کہ انہیں صاف کرنے والا ہاتھ گیا اور حالات کو ہرا دیں اور انہوں نے واقعی رونا چھوڑ دیا۔ بنیاد میں سیسہ بھرا جائے تو دیوار کی جگہ پہاڑ کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ ان کی ماں ان کی بنیاد تھی۔ انہیں تو پہاڑ بننا ہی تھا۔

آہستہ آہستہ ان کے گھر کی صاف' ستھری حالت کو دیکھ کر اکا دکا آنے والے رشتے دار سمجھنے لگے کہ وہ خوش حال ہو رہے ہیں۔ اگر وہ رات کو دو' دو بجے تک پریس میں کام کرنے والے جمال اور اسد کو دیکھ لیتے تو شاید حیران نہ ہوتے۔ پانچویں اور ساتویں جماعت کے بچے بستر پر سونے کے بجائے پریس میں مشینوں پر کھڑے کام کر رہے ہوتے۔ اگر وہ افق کو کئی کئی گھنٹے فرما بناتے دیکھ لیتے تو اس کے ہاتھ چوم لیتے۔

اماں چھٹی کے دن افق کو گھر کا بھی کام نہ کرنے دیتیں۔ اس دن وہ انہیں پلاؤ یا آلو گوشت کھلاتیں۔ جمال اور اسد کو کھیلنے کے لیے بھیجتیں اور افق کو ساتھ لے کر انار کلی چلی جاتیں۔ اسے آئس کریم کھلا کر لاتیں۔ وقت اور حالات کے ہاتھوں ترتیب دی گئی ان کی زندگی ٹھیک ٹھاک ہی تھی نا۔ اس ٹھیک ٹھیک زندگی میں ایک گھنٹی بجی۔

"افق کے پاس آج کوئی کام نہیں تھا کرنے کے لیے۔ نہ فرما' نہ خاکی لفافے' دکان والے نے کہا کہ دس' پندرہ دن کے لیے کام نہیں آئے گا' آرڈرز نہیں آرہے۔ وہ اپنی کتابیں کھولے پڑھ رہی تھی۔ اس کی انگریزی زیادہ خراب تھی بار بار گرامر کی مشق کر رہی تھی۔ اس کے پاس جو فون تھا۔ اس پر کم ہی کسی کی کال آتی تھی۔ کبھی کبھار ماموں کی یا فیصل آباد والے چچا کی۔ زیادہ تر اماں ہی اسکول کے آفس سے فون کرتی تھیں۔

فون اس کے پاس ہی رکھا تھا۔ بجا تو اس نے اٹھایا' کان سے لگایا۔

"میری عرشیہ سے بات کروادیں؟"

"عرشیہ تو نہیں ہے جی؟" وہ اجنبی مردانہ آواز سن کر گھبرا گئی۔

"فضا ہوگی؟"

"جی وہ بھی نہیں۔" وہ اور گھبرا گئی' اپنے ماموں اور چچا کے علاوہ اس نے کبھی کسی سے بات نہیں کی تھی۔

"عرشیہ بھی نہیں ہے' فضا بھی نہیں ہے' تو شانزہ تو ضرور ہی ہوگی۔" ذرا ہنس کر کہا گیا۔

افق نے فون بند بھی نہ کیا' رانگ نمبر بھی نہ کہا۔

"کیسی لڑکی ہو تم' کچھ ہے ہی نہیں تمہارے پاس' اچھا چلو عائزہ بھی نہیں تو حریم' تحریم' زریم' کوئی ایک تو ہوگی' دیکھو اب نہ' مت کہنا' ٹھیک نہیں ہوگا' میں نے بتادیا ہے پہلے ہی۔" دبی دبی ہنسی۔

"نہیں' کوئی بھی نہیں ہے۔" اس نے ذرا سی بے چارگی اور افسوس لیے کہا' جیسے خود سے ہی کوئی گناہ ہو گیا ہو۔

"کوئی نہیں' ہاہاہا۔" ایک طویل قہقہہ لگایا گیا۔ فون کرنے والا جی بھر کر لطف اندوز ہوا۔

"یار! کیا نام ہے تمہارا' کب سے ہو اس دنیا میں' تمہارے اس انداز پر جی چاہتا ہے کہ تمہارے قدموں میں بچھ جاؤں اور اپنی جان دے دوں۔ تم کہاں آگئیں ہم سے بدمعاشوں میں... جواب دو جلدی سے۔"

"مجھے آپ کو اپنا نام نہیں بتانا۔" اس کے ہنسنے پر اسے غصہ بھی آیا اور عقل بھی کہ کوئی تنگ کر رہا ہے۔ اس نے فون بند کر دیا۔ پھر بجا اور بجتا ہی رہا۔ اس نے نہیں اٹھایا' پھر میسج آنے لگے۔ ہر میسج میں ایک نیا نام تھا۔

"اسماء ہو؟ شایان ہو؟ نمرہ ہو؟ جویریہ ہو؟ ہادیہ ہو؟ نادیہ ہو؟ سلویٰ ہو؟ حیا ہو؟"

اتنے نام' اتنے میسجز' اس کا ان باکس بھر گیا۔ پھر فون بجنے لگا۔ اماں آئیں تو اس نے فون بند کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ اگلے کئی دن ایسے ہی کالز اور میسجز آتے رہے۔ افق کا سارا دھیان بٹ گیا۔ فون اٹھاتی نہیں تھی۔ لیکن فون بجتے ہی فون کی طرف دیکھنے لگتی۔ اب نہیں بھی بجتا تھا تب بھی دیکھتی تھی کہ بج کیوں نہیں رہا۔ میسج آتے تو پڑھتی۔ نہ آتے تو پہلے والے پڑھتی۔

چند دنوں میں ہی ایسا ہوا' لیکن ہو گیا۔ بیرونی دنیا سے زیادہ واسطہ نہیں تھا اس کا۔ جتنا بھی واسطہ تھا' اس میں ایسی شرارتی باتیں کرنے والے' خوب صورت آواز والے شامل نہیں تھے۔ اب وہ زریم' تحریم' شایان' سوچے جاتی' سوچے جاتی' مسکرانے لگتی۔ اس کا جی چاہا کہ اماں کو یہ لطیفہ سنائے' پھر سنا نہیں سکی۔

"چھوٹی ہو' بڑی ہو' موٹی ہو' لمبی ہو' پیاری ہو' بری ہو' کون ہو؟"

روزانہ نئے سرے سے اس کا ان باکس بھرنے لگتا۔

"گونگی ہو' بول نہیں سکتیں' اپنی مترنم آواز میں گانا تو سناؤ' گالیاں ہی سنا دو یا اپنا کوئی سبق ہی۔ آج کیا کھاؤ گی' کہاں بیٹھی ہو' کیا کر رہی ہو' کچھ بولو' کچھ سنو' کچھ پوچھو' چلو کچھ کریں' چلو آؤ کھیلیں۔"

سچی بات تھی یہ دو' دو حرفی میسجز پڑھتے پڑھتے افق ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی' اماں نے سبزی بناتے بناتے اسے دیکھا۔ موبائل اس نے کتاب میں رکھا ہوا تھا۔ قریب ہی ایک پرانا سالہ رکھا تھا۔

"کیا ہوا افق؟ ایسے کیوں ہنس رہی ہو؟"

"کچھ نہیں جی؟" ہنسی چھپا کر کہا۔

افق کا جی چاہا۔ اپنی کسی سہیلی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کے کان میں ایک ایک بات بتائے۔ سہیلی اس کی کوئی تھی نہیں۔ کالج وہ جاتی نہیں تھی۔ چچا زاد' خالہ زاد' ماموں زاد کوئی ان کے گھر آتا نہیں تھا۔ وہ اپنی دنیا میں اکیلے تھے تو تجربات میں بھی اکیلے تھے اور افق کی تجرباتی زندگی کا تو ابھی آغاز بھی نہیں ہوا تھا۔ کہاں کا مشاہدہ اور کہاں کی عقل۔

افق دل کھول کر ان میسجز پر ہنستی رہی۔ کئی دن ایسے ہی چلتا رہا۔ ایک دن ایک انجانے نمبر سے فون آیا۔ اس نے اٹھا لیا' لیکن چپ رہی۔

"رکو' رکو... تمہیں قسم ہے اپنی آواز کی' جلدی بتاؤ اپنی آواز کی سرجری کہاں سے کروائی ہے؟"

اسی لڑکے کی آواز سن کر وہ پہلے سے زیادہ بوکھلا گئی۔

"جی..." اتنا ہی کہا۔ اسے کیا پتا کہ آواز کی سرجری بھی ہوتی ہے۔

اور قہقہہ اتنا بلند ہوا کہ وہ دیر تک ہنستی رہی۔ فون بند نہ کیا' کہا بھی نہ گیا۔

"مجھ سے دوستی کرو گی۔" جھٹ سے پوچھا۔

"جی؟" اس کے منہ سے پھر بے ساختہ نکلا۔

"جی... چلو ڈن ہوا... میرا نام امان ہے۔ ابھی پڑھ رہا ہوں۔ پھر جاب کروں گا۔ پھر شادی' صرف دو بچے کروں گا' لڑکے کا نام بازل رکھوں گا۔ لڑکی کا نام ردا۔"

افق نے گھبرا کر فون بند کر دیا۔ اس کی ہتھیلیاں بھیگ گئی تھیں۔

میسج آیا "فون بند کر دیا۔ کوئی آ گیا تھا کیا؟ تو میں کہہ رہا تھا کہ ردا رکھوں گا۔ ردا انجینئر بنے گی اور بازل نٹ بالر بنے گا' پیسہ کمائے گا' اس پیسے کو میں جمع کرتا جاؤں گا۔ جب بہت زیادہ ہو جائے گا تو ہوائی میں جزیرے

دو گھر لوں گا۔ ایک بازل کے لیے' ایک اپنی گرل فرینڈ کے لیے... گرل فرینڈ کو بیوی سے چھپا کر وہاں رکھوں گا' شش... بتانا نہ کسی کو' اور... کیا۔"

"اف... توبہ... اللہ جی۔" افق کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔

"کیا تم میری بیوی بنو گی؟"

ایک ذرا لمبے وقفے کے بعد یہ میسج آیا۔ فون اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ ایک کرنٹ اس کے اندر سے ہو کر گزرا۔ انجان نمبر تھا۔ انجان شخص تھا۔ غلط انداز تھا' غلط ہی زمانہ تھا۔ اتنا وہ جانتی تھی' پھر بھی اس نے رات تک کئی بار اس فقرے کو پڑھا۔

"میری بیوی بنو گی؟"

ہر بار کرنٹ ہی کرنٹ سا لگتا۔ وہ ڈر جاتی۔ کانپ جاتی۔ پھر بھی بار بار پڑھتی۔

ساری رات اس فقرے کے آگے پیچھے بھاگتی رہی۔

اماں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ منہ اندھیرے اٹھنے والی بے سدھ پڑی تھی۔ اماں نے اسکول سے چھٹی کر لی۔ اسے تیز بخار تھا۔ دونوں بھائی پریشان صورت لیے اسکول گئے۔ افق بیمار ہو گئی۔

اماں اس کی بیماری سے بہت پریشان ہو جاتیں۔ انہیں شرمندگی ہوتی۔ انہیں لگتا سب ان ہی کی وجہ سے ہے۔ اتنا کام کرتی ہے وہ۔ کتنے سالوں سے کر رہی ہے۔ کالج بھی نہیں جا سکی۔

انہوں نے سوچا۔ اسے ماموں کے یہاں بھیج دیں۔ ان کے بچوں سے دوستی نہیں تو سلام دعا ہی سہی۔ ایک دو مہنگے سوٹ لے دوں گی۔ ماحول بدل جائے گا۔ چار دن تو ماموں مہمان بنا ہی لیں گے۔

شام تک اس کا بخار اتر گیا۔ فون کے ساتھ الٹ پلٹ لگی رہی۔ اماں نے اس کی تیاری کی۔ کپڑوں کے لیے اسے ساتھ لے جانا چاہا۔ پر وہ نہیں مانی' ماموں کے بچے کالج یونیورسٹی جاتے تھے۔ اس کے ساتھ سلام دعا رکھتے تھے بس۔ مامی جی اسے کاموں میں لگائے رکھتیں۔ آتے ہوئے سیما باجی' زینو باجی کے استعمال شدہ کپڑوں' جوتوں کی گٹھڑی باندھ کر پکڑا دیتیں۔ اسد دہی بھلے لے آیا۔

"افق باجی! ٹھیک ہو نا؟" وہ بے چارہ بہت فکر مند ہو جاتا تھا۔

"ہاں! میں ٹھیک ہوں۔"

"افق باجی! بیمار نہ ہوا کرو۔" وہ اور بے چارہ نظر آنے لگا۔ "مجھے بڑا رونا آتا ہے کسی کو بھی بیمار دیکھ کر۔"

"میں نہیں ہوتی اب بیمار۔" وہ مسکرائی۔

"میرے پاس کچھ اور پیسے بھی ہیں۔ میں چوک سے ملک شیک لا دوں۔" وہ پھر مسکرا دی۔

اماں اسے لے کر سڑک پار پارک چلی گئیں۔ سبزے پر وہ دیر تک ٹہلتی رہیں۔ جنگلے سے سڑک دیکھتی رہیں۔

"میری بیوی بنو گی۔" وہی آواز سبزے پر بچھ گئی۔ درختوں پر لہرا گئی۔ درختوں پر چڑھے پرندے ایک ساتھ خوب آسمان رنگ گیا۔

سبزے پر چاندنی بھی پھیل گئی اور قوس قزح بھی... پھول' پودے لہرا لہرا کر جھومنے لگے۔ یہ منظر اس کے اندر کا تھا۔ وہ آپ ہی آپ مسکرانے لگی۔ بخار اتر گیا۔ اماں خوش ہو گئیں۔ پارک سے اسے آئس کریم کھلانے لے گئیں۔ فون کو ہاتھ میں لیے لیے ہی وہ سو گئی۔ پھر کوئی میسج نہیں آیا تھا۔

"میری بیوی' میری بیوی۔" اس نے رات کے نہ جانے کس پہر اور کس اوٹ میں چھپ کر کہا۔

ننھی سی' پیاری سی لڑکی بولی "ہاں" خود سے بھی چھپ کر' ڈر کر' کانپ کر رات کے اندھیرے میں۔

کئی دنوں بعد فون آیا۔ بجتے بجتے بند ہو گیا۔ لیکن اس کا دل دھڑکتا رہا۔ پھر میسج آنے لگے' وہی الٹے سیدھے۔

"کوئی ہے؟ کوئی چڑیا' کوا' شیر' ہاتھی' چلو گھوڑا ہی سہی... گائے' بھینس بھی چلے گی۔"

"خاموشی اتنی حسین ہے تو کلام کتنا غضب ڈھائے گا۔"

اماں نے پوچھا۔ "افق! آٹا گوندھ لیا؟"
"جی شیر...." ہڑبڑا گئی۔
"شیر....؟" اماں حیران پریشان۔

ڈر کے مارے اس نے رات تک فون کو ہاتھ نہ لگایا۔ جب سب سو گئے تو باورچی خانے میں جا کر چپکے سے کتاب کھول کر اس میں فون رکھا اور پڑھنے لگی۔ ایک بار' دو بار' نہ جانے کتنی ہی بار.... اس کی تسلی نہیں ہو رہی تھی یا دل نہیں بھر رہا تھا پتا نہیں....

☼ ☼ ☼

اس کے امتحان ہونے والے تھے' تو اماں نے اس کے سارے کام ختم کروا دیے تھے وہ بی اے کے بعد اسے کوئی اچھی نوکری مل سکتی ہے۔ مگر اب اس کا دھیان ہی قائم نہیں رہا تھا۔ ہا تھی.... شیر.... لکھا نظر آتا۔ وہ ہنس دیتی۔

فون آتے رہے' میسج بھی آتے رہے۔ وہ خاموشی میں ہی اس سے ہم کلام ہوتی رہی۔ وہ اس کی زندگی کا جز بن گیا۔ سانس کی طرح جو آتے جاتے دکھائی نہیں دیتی' لیکن ہوتی ہے اور بہت ضروری ہوتی ہے۔

چند دنوں سے نہ فون آ رہے تھے' چڑچڑی ہو گئی۔
"آخری بار اس نے اتنا ہی لکھا تھا کہ وہ مر جائے گا تو ہی جواب آئے گا۔"

افق کو حیرت ہوتی تھی کہ وہ کتنا مستقل مزاج ہے اور اب یہ مستقل مزاج چپ ہو گیا تھا۔ مصروف ہو گا' بیمار ہو گا یا بھول گیا ہو گا۔

دو ہفتے گزر گئے' کیسے گزرے افق ہی جانتی تھی۔
"وہ مر ہی گیا ہو گا!" افق کا دل دہل گیا۔
"افق پڑھ لو۔" اماں نے کہا۔ پہلے انہیں کہنا نہیں پڑتا تھا۔

رات تک کوئی میسج نہیں آیا تھا۔
رات سے صبح ہو گئی۔ اماں اسکول چلی گئیں۔ وہ اکیلی رہ گئی۔
"کوئی ہے؟" اس نے پہلی بار دیکھا۔

رات گئے تک کوئی جواب نہیں آیا۔
دو دن گزر گئے۔ اتنی ہمت کر کے کیے گئے سوال کا کوئی جواب نہیں آیا۔
"کہاں گئے سب؟" پھر لکھ کر بھیجا۔
جواب پھر بھی نہ آیا' دو دن اور گزر گئے۔
"اب تو وہ مر ہی گیا ہو گا پکا۔" فون بھی بند ہو گا۔ اس نے کال کے بٹن کو دبایا۔ پہلی ہی بیل پر۔
"یہاں ہیں سب' اور تم۔" سوال کا جواب اور جواب کے لیے سوال۔
"اور تم...." افق کا دل پھڑپھڑانے لگا۔
"ارے بھئی.... اور تم...." وہ پوچھ رہا تھا۔
اس نے فون بند نہ کیا' سنتی رہی۔
"ڈر رہی ہو کہ کون لفنگا اور بدمعاش ہے۔ بولتی نہیں ہو' سانس بھی لیتی ہو کہ نہیں؟ کھاؤں گا نہیں تمہیں۔ قتل بھی نہیں کروں گا سچ۔ اب بھی تمہارا فون نہ آتا تو مر جاتا' اپنی قسم کھاتا ہوں' مر جاتا' بولو بھی' کیا کوئی ہے؟"
"ہاں!" اس نے کہا' اسے کہنا ہی پڑا' بچوں سی پیاری لڑکی کو کہنا ہی پڑا' یقین جانیے کہنا ہی پڑتا ہے' انسانی فطرت' عورت اور مرد کی ازلی جوڑی دار سانجھ اور کشش.... کوئی اس کشش سے کہاں جا چھپے۔
"تمہارا نام...." اس نے اتنے پیارے انداز سے پوچھا۔
"افق...."
نام بتاتے ہی بات چل نکلی۔
افق کو ایک سہیلی مل گئی۔ وہ کب روئی' کب ہنسی۔ وہ اسے بتانے لگی۔
محبت نے عجب ستم ڈھایا اس پر.... وہ اپنی اماں کی' گھر کی' کام کی چھوٹی چھوٹی سوچوں سے دور نکل گئی۔ اسے اس سے بات کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ اس نے کہا۔ اگر وہ اتنی ہی منکسر المزاج رہی تو فرشتہ بن جائے گی۔ وہ ہنس دی۔
"تمہیں میری ہر بات پر ہنسی آتی ہے؟"
"آپ کی ہر بات ہنسانے والی ہوتی ہے۔"

"مجھے جوکر سمجھا ہے؟"
"ہاں سمجھ لیتی ہوں۔" کھی کھی کھی۔
"ایک دن ایسے ہی ہنستے میں تمہارا گلا دبا دوں گا۔"
"ہائے اللہ!" اس کے سنجیدہ انداز پر وہ واقعی سنجیدہ ہو گئی۔
"ہاہاہا!" وہ دل کھول کر ہنسا۔

اپنے تعارف میں اس نے اپنا نام امان بتایا تھا۔ کالج میں وہ اسی نام سے مشہور ہے۔ دراصل چند ماہ شوق شوق میں وہ ہاسٹل رہا تھا۔ ہاسٹل میں اندرون خانے انہوں نے بہت سے کارنامے انجام دیے تھے۔ ان کے گروپ کا نام "ایگل" تھا اور وہ سب ایک دوسرے کو فرضی یا نک نیم سے بلاتے تھے۔ یہ صرف ایک سیف سائیڈ پلان تھا کہ کوئی گڑبڑ ہو جائے اور بات تفتیش تک جا پہنچے تو کوئی ان تک پہنچ ہی نہ سکے۔ چوکیداروں کو بھی ان کے اصل نام معلوم نہیں تھے۔ آئے دن وہ نت نئی شرارتیں کرتے' ہاسٹل میں رہنے کا شوق پورا ہو گیا۔ وہ ہاسٹل چھوڑ آئے۔ نام ساتھ ہی لے آئے۔ امان نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ وہ پچھلے دنوں فون پر لڑکیوں کو تنگ کرتا رہا تھا۔ ایک نمبر پر وہ ملی تو اس کی آواز' انداز پر فدا ہو گیا۔ وہ دوسرے شہر سے یہاں پڑھنے کے لیے آیا تھا۔ ڈی ایچ اے میں ایک بنگلے میں اپنے چار دوستوں کے ساتھ رہتا ہے۔

وہ بات اس انداز سے کرتا کہ پیارا لگتا۔ اس میں ایک بات تھی کہ وہ سچ بڑے دھڑلے سے بولتا تھا۔ جب اس نے یہ کہا کہ وہ لڑکیوں کو تنگ کر رہا تھا۔ افق خاموش ہو گئی۔
"کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔ وہ خاموش ہی رہی۔
"اپنے چھوٹے سے ذہن پر زیادہ زور مت ڈالو۔ چور' ڈاکو نہیں ہوں میں۔ قدر کرو میری' میں کتنا سچ بولتا ہوں۔ چاہتا تو یہ بات نہ بتاتا' تم سی بھولی لڑکی سے زیادہ تو بھالو عقل والا ہو گا۔ نہ بتاتا تو کیا معلوم کر لیتیں تم یہ؟"
اس نے اتنی بڑی دلیل دی کہ افق قائل ہو گئی۔
"ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا میرا' بور ہو رہا تھا میں' کالج جا نہیں رہا تھا۔ ایک جگہ پڑے پڑے تھک گیا تھا۔ ورنہ کالج میں مجھے لڑکیوں کی کمی نہیں۔ ہر لڑکی میری دوست بننا چاہتی ہے۔"

کالج میں لڑکیوں کی کمی نہیں۔ یہ بات افق کو بری لگی۔ افق نے فون بند کر دیا۔ اسے بے عزتی کا احساس ہوا۔ اس احساس میں بھی اس نے امان کو برا نہ سمجھا۔ صرف اس کی حرکت کو ہی۔
"رونا مت۔" میسج آیا' پھر یہی میسج بار بار آتا رہا۔ وہ مسکرا ہی دی۔
"بہت لڑکیوں سے دوستی ہے۔ بہت سوں سے بات کرتا ہوں افق.... لیکن.... "میری بیوی بنو گی۔" صرف تمہیں کہا' سمجھیں.... میں تم سے ڈرتا نہیں ہوں۔ میں نے یہ صرف تمہیں ہی کہا۔ دوبارہ ایسے فون بند مت کرنا۔ ورنہ میں تمہارے گھر آ جاؤں گا۔ تمہیں اٹھا کر لے جاؤں گا۔"
افق نے کہا۔ "سب لڑکیوں سے دوستی چھوڑ دو۔"
اس نے قہقہہ لگایا اور کہا۔ "اچھا جی!"
"ان سے بات نہ کرنا۔"
"ٹھیک ہے۔"
"ایسا کرنا ٹھیک نہیں۔"
"اچھا یار! ٹھیک ہے اور کچھ؟"
"بس اتنا ہی...." وہ فوراً" سمجھ کر مان جاتی تھی۔
"تم سے ملنا ہے۔" اب وہ صرف یہی ایک بات کرتا۔
"دیکھتے ہیں۔" وہ ہنسی۔
"تو پھر ملو نا' پھر دیکھتے ہیں۔" التجا بھی' فرمائش بھی۔
"یہ بھی دیکھتے ہیں۔" وہ کھل کر ہنسی۔

☼ ☼ ☼

اس کا رزلٹ آیا۔ وہ فیل تھی دو پرچوں میں۔ امان بہت ہنسا۔ "یہی ہونا تھا۔"
افق کو دلی صدمہ ہوا۔ اماں کی ساری امیدیں خاک ہو گئیں۔ وہ دنوں اداس رہی۔ پھر سوچیں' اتنا کام کرتی ہے' پھر ایسے میں کہاں کی پڑھائی۔ انہوں نے افق کو

سمجھایا کہ وہ چوبیس گھنٹوں میں ایک وقت کی روٹی بھی کھا سکتے ہیں۔ اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ سمجھ گئی۔ لیکن مسئلہ کچھ اور تھا۔ کام نہیں تھا۔ آج کل وہ جو کام کر رہی تھی وہ تو بہت آسان تھا۔ ریڈی میڈ کپڑوں پر بٹن لگانے کا کام تھا۔ وہ ہینڈز فری کان میں لگا کر ایک طرف بیٹھی کام کرتی رہتی اور باتیں بھی....

امان بہت مصروف انسان تھا۔ لیکن وہ ہر روز اس سے بات ضرور کر لیتا تھا۔

امان نے کہا کہ اس نے ٹاپ کیا ہے۔ وہ خوش تو ہوئی۔ لیکن حیران بھی ہوئی۔ امان سے بات کر کے وہ فیل ہو گئی۔ لیکن افق نے فخر ایسے کیا جیسے اس نے خود نے ٹاپ کیا ہو۔ اتنا دکھ تو اسے اپنے فیل ہونے کا نہیں ہوا تھا۔ جتنا اس کے ٹاپ کرنے کی خوشی ہوئی تھی۔

اب وہ ملنے کی ضد کرنے لگا تھا' افق میں حوصلہ نہیں تھا۔ افق سیکریٹریٹ کی طرف بنی فیکٹری میں کام کرنے لگی تھی۔ وہاں فریمے اور خاکی لفافوں کی نسبت کام آسان بھی تھا اور پیسے بھی زیادہ تھے۔ اسے صرف چھ گھنٹے کام کرنا ہوتا۔ ماہوار چھ ہزار... تین گھنٹے اور لگانے پر آٹھ ہزار... افق آٹھ بجے جاتی' تین بجے تک واپس آجاتی۔ جمال اور اسد اس کے ساتھ ہوتے تھے۔ اسے چھوڑ کر وہ اپنے اسکول چلے جاتے۔ امان کے بار بار کہنے پر اس نے اسے نیشنل کالج آف آرٹس کے آگے کھڑا ہونے کے لیے کہہ دیا۔ اسے اسی سڑک کے فٹ پاتھ پر سے گزرنا تھا۔

جمال آگے آگے چل رہا تھا اور اسد ذرا سا پیچھے چل رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کے قدم افق کے بالکل برابر آ ملتے۔

"افق باجی! تیز چلو... آج اتنی آہستہ چل رہی ہو۔"

اس نے دو قدم تیز اٹھائے۔ پھر آہستہ ہو گئی۔ وہ کار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس نے نیلے رنگ کی ٹی شرٹ کے بارے میں افق کو بتایا تھا اور افق نے اسے ہلکے گلابی رنگ کی شلوار قمیص اور کالی سیاہ چادر کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ کار کے بونٹ کی طرف کھڑا تھا۔

پہلے امان نے اسے دیکھا۔ شاہراہ قائداعظم کی پرشور سڑک پر کشمیری حسن سے مجسمے کو سڑک پر چلتے دیکھا۔ حیران رہ گیا۔

افق فٹ پاتھ پر اس کے قریب سے گزر کر چلی گئی۔ اس نے ایک بار نظر اٹھا کر نیلی شرٹ والے کو دیکھا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔

امان زندگی میں لڑکی نام کی چیز سے متاثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ لڑکیوں کو پسند کر لیتا تھا۔ دوستی بھی' فلرٹ بھی' لیکن متاثر نہیں ہوا تھا۔ مگر وہ افق سے متاثر ہو گیا۔ اس کے حسن سے... اس نے رات کو فون کیا تو بولنا ہی بھول گیا۔

"تم اتنی خوب صورت ہو!"

اس نے اس انداز سے کہا جسے افق نہیں سمجھتی تھی۔ دنیاوی پیمانوں سے ابھی وہ نہیں گزری تھی۔ خوب صورتی اگر کوئی فائدہ ہے تو وہ اسے فی الحال کوئی فائدہ نہیں دے رہی تھی اور اگر یہ کوئی خوبی ہے تو یہ خوبی ان کے لیے بے کار تھی۔

"مجھے نہیں معلوم' میں کیسی ہوں۔" اس نے سچ کہا۔

"تمہیں معلوم ہو بھی نہیں سکتا۔" امان کا انداز کھو گیا۔

"مجھے معلوم کرنا بھی نہیں۔" اس بار بھی اس نے سچ ہی کہا۔

"اگر تم نے معلوم کرنا چاہا تو غضب ہو گا۔"

وہ حیران ہوئی۔ "کیا مطلب؟"

"ہمارے کالج میں ذرا جو خوب صورت لڑکیاں ہیں نا' وہ کمال کے نائک کرتی ہیں' پھر تم سی بھی ایسے ہی نائک کرتیں۔"

"نائک...؟"

"چھوڑ دو اس بات کو یہیں۔"

اس نے چھوڑ دیا۔ اتنی عقل والی نہیں تھی کہ باتوں سے ہزار ہزار مطلب نکال لیتی۔

امان نے کرید کرید کر اس سے بہت سے سوال

کیے۔ ابا اور ان کی موت کے بارے میں... خاندان کے بارے میں' یہ سوالات اس نے پہلے نہیں پوچھے تھے۔ وہ اپنی باتیں کرتا' اپنی شرارتیں' تھوڑا بہت وہ جانتا تھا' جو کچھ پوچھتا' افق سچ سچ بتا دیتی تھی۔

اسے پہلی بار دیکھنے کے بعد اس نے بہت سنجیدہ گفتگو کی تھی اس کے ساتھ۔ اس کی باتوں سے افق کو اندازہ تھا کہ وہ امیر ہے۔ لیکن اتنا امیر ہے وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ اسے اپنے خاندان کے بارے میں بتانے لگا۔

وہ چاہتا تھا کہ وہ فیکٹری نہ جائے۔ وہ اسے چھ ہزار دے دیا کرے گا۔ اس کی یہ بات افق کو اتنی اچھی لگی کہ وہ خوشی سے نہال ہو گئی مگر اس نے انکار کر دیا۔ وہ اس سے پیسے لے لیتی۔ فیکٹری نہ جاتی تو اماں کو کیا بہانہ کر کے پیسے دیتی۔ امان سمجھ کر چپ کر گیا۔ افق کا انکار کرنا اسے بھی اچھا لگا۔

آنے والے دنوں میں وہ کئی کئی بار اس کے راستے میں کار روک کر کھڑا ہوا۔ چادر کا پلو منہ میں دبائے وہ قریب سے گزرتی رہی۔ ایک نظر دیکھتا اور اگلی نظر کے لیے بے چین ہو جاتا۔ اس نے اس سے زیادہ خود ہی اصرار نہیں کیا۔

اب امان چاہتا تھا کہ افق اچھے نمبرز سے امتحان پاس کرے تو وہ اسے کسی اچھے کالج میں داخل کروا دے۔ کم از کم اس کے پاس ایک اچھی ڈگری تو ہو گی۔ امان کے لیے وہ سب اچھی ڈگریاں حاصل کر سکتی تھی۔ وہ اس کی ہر بات مان لیتی تھی۔ ضدی تو وہ تھی ہی نہیں۔

✡ ✡ ✡

وقت اور زمانے نے کچھ چیزوں' کچھ افکار' کچھ قدروں کو نادر و نایاب بنا دیا ہے۔ اب چور بازاری اتنی ہے کہ شریف النفسی پر جان دینے کو جی چاہتا ہے۔ جھوٹ اتنا ہے کہ سچ کو اٹھا کر طاق میں رکھنے کو جی چاہتا ہے۔ دغا بازی' فریب' چالاکی' مکاری' فرعونیت اس حد تک سرایت کر چکی ہے معاشرے میں کہ معصوم اور بھولے بھالے کسی بھولے بھٹکے آدم زاد کو گھر میں تالا بند کرنے کو جی چاہتا ہے... سادگی' معصومیت' نیکی' شرافت' اعلا کرداری' یہ نوادرات کی فہرست میں درج ہو گئے ہیں۔ امیر لوگ لاکھوں' کروڑوں لٹاتے ہیں ان نوادرات کو اپنے گھروں میں سجانے کے لیے۔

سادہ' معصوم' بوکھلائی سی افق کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور وہ ہاتھ امان کے تھے۔ بات محض وقت گزاری' تفریح اور دل لگی سے شروع ہوئی۔ اب دل کی طرف جا رہی تھی۔ امان کے دل کی طرف۔

افق کے حسن کا تیر عین نشانے پر لگا۔ اس کی سادگی نے امان کا دل موہ لیا۔ کبھی جو اس نے عورت کے لیے ایک معیار بنایا تھا۔ افق اس معیار پر پوری اتر رہی تھی۔ وہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا لڑکا ہے۔ وہ جانتا تھا آخری بھی ہو گا۔ وہ قسم کھا سکتا تھا۔ افق سے سادہ طبیعت لوگ نہ منزل بدلتے ہیں' نہ راستے۔ لوگ اور محبت تو بدلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ امان اس کی ہر ہر بات کو بہت پسند کرتا تھا۔

اس نے کبھی اس سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ وہ اس سے بات کرتا تھا۔ افق کے لیے یہی محبت تھی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ ٹھیک تھے۔ افق امان تک جانے میں اور امان افق کے پانے میں۔

✡ ✡ ✡

ایک پورا دن امان کا فون نہیں آیا اور نہ ہی اگلے دن... کوئی بڑی بات نہیں تھی لیکن افق پریشان ہو گئی۔ اگر وہ فون نہیں کرتا تھا تو میسج ضرور کر دیتا تھا۔ تیسرا دن آ گیا۔ اس کا فون بند جا رہا تھا۔ ایسا کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔ وہ چھپ چھپ کر فیکٹری میں روتی رہی۔

اتنے سے ہی دنوں میں اسے لگا کہ وہ اسے چھوڑ گیا ہے۔ یہ خوف مسلسل اس کے اندر قائم تھا۔ امان پر مکمل یقین کے باوجود یہ خوف گاہے بگاہے اس میں در آتا۔

چار دن گزر گئے اسے اپنے خوف پر یقین ہونے لگا... پانچویں دن امان کی کال آئی۔

"آپ کہاں تھے۔" اس نے پہلا سوال یہی کیا۔
"میں جیل میں تھا..... دبئی جا رہا ہوں..... وہاں سے آگے بھی جا سکتا ہوں..... کسی سے کوئی رابطہ نہیں کر سکوں گا۔" جلدی جلدی کہا۔ اتنی ساری باتیں سن کر وہ سمجھ گئی کہ بس اب وہ جا ہی رہا ہے۔
"چھوڑ رہے ہیں مجھے؟" روتے ہوئے پوچھا۔
"میں جیل میں تھا افق..... ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا مجھ سے کسی کا..... کل باہر آیا ہوں ضمانت پر۔ آج شام کو دبئی جا رہا ہوں۔" وہ چلایا..... افق سہم گئی۔
"نہ جاؤ امان!" اس نے سہم کر بھی یہی کہا۔
"تم پاگل ہو گئی ہو کیا؟" وہ جلدی میں تھا۔ فون بند کرنا چاہتا تھا۔
"پاگل ہو جاؤں گی نہ جاؤ..... مجھے اکیلے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔" افق باقاعدہ رونے لگی۔
"میں جیل میں نہیں سڑ سکتا..... تمہیں حالات کا اندازہ ہی نہیں ہے..... حالات بہتر ہوئے تو تم سے رابطہ کر لوں گا۔"
"ایسے نہ جاؤ امان....." سب جان کر بھی اس کی ایک ہی ضد۔
"تو پھانسی لگ جاؤں؟" اسے پہلی بار اس پر شدید غصہ آیا۔
"کیوں ہو گی پھانسی؟" وہ ڈر گئی۔
"میں جا رہا ہوں۔" وہ فون بند کرنے لگا۔
"نہ جاؤ....." پھر وہی بات وہی انداز۔
تو مر جاؤں.....؟
"میں مر جاؤں گی....." وہ تیز آواز میں رونے لگی اب یہ جا رہا ہے نجانے کب آئے، آئے بھی کہ نہ آئے..... "کچھ بھی نہیں ہو گا..... سب ٹھیک ہو جائے گا..... یہیں رہو۔" روتے روتے بھی اس نے یہی کہا۔
"تمہیں نہیں پتا..... کیسے ہو جائے گا سب ٹھیک۔" امان جھنجلا گیا ساتھ ہی ذرا سا لہجہ نرم کیا۔
"میں دعا کروں گی..... میں بہت اچھی دعا کرتی ہوں۔ بہت دل لگا کر..... اب بھی کروں گی۔"
"دعا.....!" امان کا انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہا ہو کیا بک رہی ہو۔
"جا رہا ہوں میں....." کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ افق نے دوبارہ نمبر ملایا تو فون آف تھا۔ وہ خوب ہی روئی۔ اماں نے اس کی آنکھیں دیکھیں۔
"کیا ہوا افق؟" نفی میں صرف سر کو ہلا کر وہ باتھ روم میں گھس گئی۔ کتنی دیر باتھ روم میں ہچکیاں دباتی رہی۔
"وہ جا رہا ہے..... وہ جا رہا ہے..... وہ جا رہا ہے۔"
اسے صرف یہی یاد تھا۔
باقی معاملات کے بارے میں اس نے نہ سوچا نہ ہی ان پر غور کیا۔ حادثہ کیسے ہوا کب اور کیوں ہوا۔ حالات کیسے اتنے بگڑ گئے کہ اسے بھاگنا پڑ رہا ہے۔ ٹھیک کہتا ہے امان کہ اس کے پاس عقل ہے ہی نہیں، وہ موقع کی نزاکت کو نہیں سمجھ رہی تھی اپنی ہی بات کیے جا رہی تھی اور ایسے وقت جب امان کو جیل جانے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا بھلا وہ یہ سوچتا کہ افق کا کیا ہو گا۔
پندرہ دن گزر گئے۔ رو رو کر وہ بیمار ہو گئی، فیکٹری سے اماں نے ایک ماہ کی رخصت لے دی اماں کہتیں اسے چور بخار ہے۔ رات کو آتا ہے دن کو چلا جاتا ہے اسی بخار میں شاید افق مر جاتی لیکن امان کا فون آگیا۔
"کب مل رہی ہو؟" اس نے چہک کر پوچھا۔
جواب دینے کے بجائے وہ رونے لگی۔
"کب مل رہی ہو؟" سوال پھر کیا۔
"کبھی نہیں....." رندھی آواز لیے کہا۔
"واپس جیل چلا جاؤں.....؟" وہ بہت خوش تھا۔
وہ خاموش رہی۔
بہت چھپ کر بھیس بدل کر امان دبئی جا رہا تھا لیکن ایئر پورٹ پر پکڑا گیا..... اور اسے جیل میں ڈال دیا گیا۔ اس سے ایک بڑے بزنس مین کے چھوٹے بھائی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا، ڈرائیونگ امان کر رہا تھا۔ وہ رات گئے اپنے دوستوں کے ساتھ ایک پارٹی سے واپس آ رہا تھا، حادثہ سر سرا حادثاتی تھا لیکن اسے حادثاتی مانا نہیں جا رہا۔ انہیں ڈی ایچ اے سے رات

گئے گرفتار کر لیا گیا۔ ان کا موقف تھا کہ ان سب نے ڈرنک کی ہوئی تھی۔
حادثے میں لڑکے کی جان تو بچ گئی تھی لیکن وہ کافی زخمی ہو گیا تھا، امان کے والد اور دوسرے تینوں لڑکوں کے خاندان والوں نے بہت کوشش کی کہ کیس عدالت تک نہ جائے وہ جرمانہ بھرنے کو تیار تھے۔ لیکن وہ مان نہیں رہے تھے۔ ناچار ان کے ارادے دیکھتے ہوئے ان سب کو ایک ایک کر کے مختلف ملکوں کی طرف بھگانا چاہا..... مگر یہ حربہ بھی ناکام ہو گیا..... وہ پھر جیل چلے گئے۔
وہ سب مقدمہ بھی لڑ سکتے تھے اور سالوں بعد ہی سہی انہیں سزا سے بھی بچا سکتے تھے لیکن اس سب میں ان کا حال تباہ ہو جاتا، وہ ایک گھنٹہ جیل میں رکنے کے لیے تیار نہیں تھے کہاں سالوں گزارتے۔
"اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہوتا ہے امان! اس نے میری دعا قبول کی۔"
جدید صدی کے جدید بچے کے لیے دعا جیسی چیز بہت پرانی اور فرسودہ سی تھی..... جیسے اونٹوں پر سفر کرنا..... جیسے ستاروں سے راستہ معلوم کرنا..... جیسے طبیب سے علاج کروانا۔
"گھروں میں بیٹھی لڑکیاں اور کر ہی کیا سکتی ہیں سوائے رونے اور گڑگڑا کر دعائیں مانگنے کے۔"
اس نے جیسے کھلا تمسخر اڑایا۔ جس بات پر اسے یقین نہیں ہوتا تھا۔ اس کا وہ مذاق ہی اڑاتا تھا، سب ایسے ہی کرتے ہیں وہ بھی یہی کرتا تھا۔ دعا اس کے لیے محض ایک رسم تھی۔
"ہاں! میں ضرور گھر میں بیٹھی تھی لیکن جس سے مانگا تھا اس پر ہر ممکن اعتقاد رکھ کر مانگا تھا۔"
امان نے اس کے فلسفے کو مانا نہیں لیکن بات اور انداز اسے یاد رہ گیا۔
ایسے ہی چند لمحوں کے لیے اسے خیال آیا کہ اچانک کیسے وہ بزنس مین پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے فیصلہ واپس لے لیا اور جیسے جھٹ سے سب بگڑ گیا تھا ویسے ہی سب جھٹ پٹ سنور بھی گیا۔
اس نے پہلی بار خود سے افق کو دعا کے لیے اس وقت کہا، جب اس کے دو عدد پرچے اس کی پسند کے مطابق نہیں ہوئے تھے۔
"میں دعا کروں گی کہ تم پاس ہو جاؤ۔"
روایت زندہ رہی امان ٹاپ کر گیا۔
"میں جانتا تھا۔" اس نے اس انداز میں اطلاع دی جیسے بادشاہ تو میں ہی تھا نا..... تو تاج پوشی بھی میری ہی ہونی تھی۔
افق احساس کمتری کا شکار ہو گئی۔ ایک وہ تھی ہر معاملے میں پیچھے تھی، اس نے ایف اے اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا اور حقیقتاً" اس نے بہت محنت کی تھی۔ اس نے اے گریڈ لیا تھا۔
اس بار بھی اماں کو یقین تھا کہ وہ بہت اچھے نمبر لے گی الٹا وہ فیل ہو گئی، تو یہ جو عورت ہے وہ اس مرد کو اور مرد کی محبت کو اتنا سر پر کیوں سوار کر لیتی ہے کہ فیل ہی ہو جاتی ہے۔ پھر ایسی عورت تھی اور کسی کام کی نہ ہوئی نا..... یہ سب سوچنے کا اس عورت کے پاس وقت نہیں ہوتا جو ناکام ہی ہوتی چلی جاتی ہے۔
افق سب سے انجان ہو گئی..... جمال سے اسد سے اپنی اماں سے..... ان کے کام کر دیتی۔ ان سے بات کرنے کا وقت رہا نہ ڈھنگ..... کم گو پہلے ہی تھی۔ اتنی کم گو بھی نہیں تھی اور باتیں ہی سب کچھ نہیں ہوتیں..... خون کا تعلق رکھنے والوں کے بڑے خونی حقوق ہوتے ہیں۔ وہ حقوق نہیں جو کتابوں میں لکھ دیے گئے ہیں..... کچھ غیر مرئی حقوق بھی ہوتے ہیں جنہیں انسانی رشتے اور تعلق قائم کرتے ہیں۔
جب وہ دونوں اسے فیکٹری تک چھوڑنے جاتے تو اتنی باتیں کرتے اور وہ ہوں ہاں بھی نہیں کرتی۔ چھٹی والے دن ایک دوسرے کے ساتھ جڑے رہتے۔ افق کمرے میں ایک طرف بیٹھی رہتی۔ کتاب کھلی ہوتی۔
اماں سوچتیں فیل ہونے کا صدمہ لے لیا ہے۔ ماموں زاد کالج جاتی ہیں، یونیورسٹی جاتی ہیں یہ ٹیوشن بھی نہیں جا سکتی الٹا فیکٹری جاتی ہے.....
"تم فیکٹری چھوڑ دو افق!" اماں نے اس کا سر

سہلاتے ہوئے کہا۔ "تم تھک جاتی ہو اور تمہیں پڑھنے کا بھی بہت شوق ہے۔"

"میں ٹھیک ہوں۔ اماں!" اس نے کہہ دیا۔

گھر کے لیے تمہارے ماموں سے تھوڑا قرض لیا تھا مجھے صرف اس کے اترنے کا انتظار ہے..... تمہارے بھائی بڑے ہوتے تو میں کبھی تمہیں اتنا کام نہ کرنے دیتی۔"

"میں جانتی ہوں اماں..... آپ فکر نہ کریں۔"

"مجھے دکھ ہوتا ہے۔"

"ایسے نہ کہیں اماں....." وہ شرمندہ ہوگئی۔ اس کے رویے سے اماں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ کما کر ان پر بہت بڑا احسان کرتی ہے اور انہیں پال رہی ہے جبکہ وہ سب تو ایک ساتھ ایک دوسرے کے لیے محنت کر رہے تھے۔

"تمہیں ٹیوشن رکھوا دوں..... معلوم کروں کسی کوچنگ سینٹر کا۔"

اس بار میں اچھی تیاری کروں گی..... آپ فکر نہ کریں۔"

"مجھے تمہاری بہت فکر ہے افق....." وہ آنکھیں صاف کرنے لگیں۔ ان کے بچوں نے کبھی انہیں روتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں ان کے بچے انہیں روتے دیکھ کر خود بھی روئیں۔

"آج آپ ایسے کیوں کہہ رہی ہیں۔"

"افق! نہ جانے کیوں..... تمہارے لیے میں اندر ہی اندر ڈرتی رہتی ہوں..... کوئی وجہ بھی نہیں..... کچھ ہوا بھی نہیں۔ لیکن بہت وہم آتے ہیں۔"

اس کا جی چاہا کہ اپنی ماں کی گود میں سر رکھ کر انہیں امان کے بارے میں بتادے تاکہ اس کی اماں بے فکر ہو جائیں اور وہم کرنا چھوڑ دیں۔

اماں اٹھیں تو وہ بھی اٹھ کر عصر کی نماز پڑھنے لگی۔ آج کل وہ ایک وظیفہ کر رہی تھی امان کی کامیابی اور ترقی کے لیے پھر تہجد پہ اٹھ کر ایک اور وظیفہ کرتی۔

امان نے کہا کہ اس کے والد کی فیکٹری میں آگ لگ گئی ہے۔ الٹا بیمہ کمپنی نے ہی مقدمہ کردیا ہے ان پر۔ وہ بہت بری طرح سے پھنس گئے ہیں۔ بہت برے حالات سے گزر رہے ہیں۔

"امان برے حالات سے گزر رہا ہے۔"

افق کی نیندیں حرام ہوگئیں۔ رات دن وظائف کرتی رہتی، نہ چاہتے ہوئے بھی نہ مانتے ہوئے بھی امان اسے کہہ دیتا کہ دعا کرنا.....

کئی بار وہ کہتا کہ اسے اس سے ڈر لگتا ہے کہ وہ اسے بددعا نہ دے دے۔

"کوئی خود کو بددعا دیتا ہے؟" افق برا مان جاتی۔

"ہوٹل جارہا ہوں دعا کرنا۔ ٹیبل مل جائے خالی ورنہ دو گھنٹے انتظار کرنا پڑتا ہے۔"

"کب سے کار بک کروائی ہے۔ ابھی تک نہیں آئی....."

"ایک پریشانی ہے بتا نہیں سکتا..... پر بہت پریشان ہوں۔"

"ایک آرٹیکل لکھا ہے اقوام متحدہ کے لیے دعا کرنا آؤٹ اسٹینڈنگ رہے۔"

آرٹیکل آؤٹ اسٹینڈنگ ہوجاتا، ہوٹل میں جاتے ہی ٹیبل مل جاتی، کار آگئی۔ کتاب مل گئی..... مقدمے سے جان چھوٹ گئی، ان کی پریشانی دور ہوگئی..... یہ سب اتفاق ہوسکتا ہے لیکن افق نے یقین کرلیا کہ وہ دل سے دعا کرتی ہے اس لیے اس کی دعا فوراً قبول ہوجاتی ہے.....

دوسری طرف امان اسے کہتا کہ وہ اس کے لیے اچھا سائن ہے، جیسے نجومی کسی خاص پتھر کو پہننے کے لیے کہتے ہیں اور وہ پتھر اچھا رہتا ہے..... سب ٹھیک ہونے لگتا ہے۔ امان کے لیے وہ اب وہی پتھر بننے لگی تھی وہ ایسا ہی شخص تھا جو نہیں مانتا تو خدا کو بھی نہیں مانتا اور ماننے پر آتا ہے تو ہر انسان کو خدا مان لیتا۔

وہ انجانی ترکیب کا عجیب انسان تھا، ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ نرالا تھا۔ ایسے ہزاروں لوگ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ کر مختلف بلاگز پر اپنی پریشانی لکھ کر ان کا حل مانگ لیتے ہیں۔ اپنے مسائل کے لیے گوگل پر بار بار ٹائپ کرتے ہیں لیکن ایک بار بھی اللہ کے پاس نہیں جاتے..... اللہ تعالیٰ..... اللہ میاں بہت احترام سے کہتے ہیں مگر معلوم نہیں ہوتا کہ اتنا احترام کیوں.....

عجب اور نرالا ہونا برا نہیں ہے ہاں انجان اور لاعلم ہونا بہت ہی برا ہے.....

✲ ✲ ✲

اچانک بیٹھے بٹھائے افق کو جو خوف گھیر لیتے تھے ان کے زیر اثر ایک دن اس نے خوفزدہ ہو کر امان سے پوچھ ہی لیا۔

"کیا کبھی مجھے چھوڑ کر جانے کے بارے میں سوچا۔" جواب میں اس نے ایک بلند بانگ قہقہہ لگایا۔

"میں مرجاؤں گی..... ایسے سوچنا بھی مت خدا کے لیے۔"

"کوئی نہیں مرتا..... خدا کے لیے تو مر بھی جاتے ہیں انسان کے لیے بالکل بھی نہیں۔"

"میں مر کر دکھاؤں گی....."

"میں دیکھوں گا....."

"میں مذاق نہیں کررہی۔"

"میں بھی مذاق نہیں سمجھ رہا۔"

اور میں مرجاؤں تو کوئی فکر نہیں؟"

"یہ میں نہیں جانتا۔ یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔"

"بعد کی..... میرے مرنے کے بعد کی؟" یہ کہتے ہوئے ہی وہ مرنے والی ہوگئی۔ دوسری طرف لوٹ پوٹ ہوتا قہقہہ بلند ہوا۔

"افق! ایسی باتیں کروگی تو میں تمہیں اٹھالاؤں گا اسی وقت۔"

سارا مرنا مارنا اڑنچھو ہوگیا۔ ڈر، خوف دائیں بائیں نکل گیا۔ افق چپ ہوگئی۔

"اب بولو نا..... اب بولتی بند..... تو میں تمہیں چھوڑ کر جارہا ہوں۔ آہم! بابا جی کو یہ بھی معلوم ہوگا کب..... ہو لیے بابا جی.....!"

"میری باتیں مذاق لگ رہی ہیں۔" رونے کی تیاری ہونے لگی۔

"مذاق نہیں ہیں امان کی جان..... مختلف ہیں ہونگی ہیں، عجیب تر ہیں، پر مذاق نہیں ہیں، مجھے یقین نہیں آتا لیکن جھوٹ بھی نہیں سمجھتا۔"

"پھر ایک بات سن لو امان..... اگر افق کو چھوڑنا ہی پڑے تو عزت سے چھوڑنا امان! مجھ سی بے کار لڑکی کی محبت بے کار نہیں ہے۔ اسے اتنا رتبہ تو ملنا چاہیے کہ عزت سے رکھا اور چھوڑا جائے۔"

"تم یہ سب باتیں کیوں سوچتی ہو؟"

"کیوں کہ میں غریب ہوں یتیم ہوں۔ چھوٹے سے ایک گھر میں رہتی ہوں۔ پڑھی لکھی بھی نہیں ہوں۔ کیا ہے میرے پاس۔ سب کچھ تو تمہارے پاس ہے۔"

"اور جس دن تمہیں معلوم ہوگیا کہ تمہارے پاس کیا کچھ ہے تو مجھ سے انسان کو تم اپنے قدموں پر گرالو گی۔"

"ہر بات مذاق....." اتنی سنجیدہ بات پر بھی ایسا جواب وہ چڑ گئی۔

"میں یہ سب نہیں جانتا افق! نہ ہی میں اتنی گہرائی میں جاکر سوچتا ہوں۔ بس ایک بات معلوم ہے کہ تم مجھے پسند ہو اور رہوگی۔ آج بھی زندگی میں ہو، کل بھی رہوگی۔ دوبارہ ایسی فضول باتیں نہ کرنا۔"

اور اس نے دوبارہ ایسی فضول باتیں کی ہی نہیں۔ وہ جانتی تھی وہ ہمیشہ اسے عزت ہی دے گا..... شادی کا وعدہ بھی اسی نے کیا تھا۔ اگر یہ وعدہ نبھا نہ سکا تو وہ دبنگ سچ بولنے والا اسے صاف صاف کہہ دے گا..... اور وہ جانتی تھی کہ اگر وہ اتنا سچا ہے تو وعدے کا پکا بھی ہوگا..... امان اسے کبھی چھوڑ کر نہیں جائے گا.....

امان نے کہا کہ اچھے نمبروں سے امتحان پاس کرے تو اس نے بھی اچھے نمبروں سے ایف اے پاس کرلیا۔ خبر سنتے ہی اس نے ضد پکڑ لی کہ اب تو اسے اس سے ملنا ہی ہوگا۔ ساری رات شش و پنج میں گزار کر صبح نماز کے بعد دعا مانگ کر اور امان پر مکمل یقین رکھ کر وہ فیکٹری سے دو گھنٹے پہلے ہی نکل آئی اور امان کے ساتھ

گاڑی میں آبیٹھی۔ اسے معلوم ہوا کہ دنیا کا ہر کام آسان ہے اس طرح امان کے ساتھ بیٹھنے سے..... وہ بیٹھ گئی اور گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو ہی دیکھتی رہی امان نے کئی بار گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا لیکن وہ گود میں رکھے ہاتھوں سے نظریں بھی اٹھانے کے لیے تیار نہ تھی اور امان یہی چاہتا تھا کہ وہ ایسے ہی بیٹھی رہے اور وہ اسے دیکھتا رہے۔

"کیا ہوا؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

مشکل سے اس نے صرف نہ میں سر ہلایا۔

"آنا نہیں چاہتی تھیں.....؟"

سر ناں میں ہلانہ ہاں میں..... نظر اٹھا کر نہ دی۔

جو لالی گالوں پر آجا رہی تھی وہ شرم بھی تھی اور شرمندگی بھی..... خوشی بھی اور پچھتاوا بھی..... من چاہا بھی اور زبردستی بھی۔

یہ ملاقات اس نے امان کی ضد پر کی تھی اور اب اس کا جی چاہ رہا تھا کہ زندگی بھر ایسی ملاقات دوبارہ نہ کرے.....

"تمہیں مجھ سے ڈر لگ رہا ہے افق؟" امان نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ وہ برف کا بت بن گئی۔ ہمت جاتی رہی اور جی چاہا کہ چلا کر کہے "مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، مجھے جانے دو خدا کے لیے۔"

ہاتھ وہیں رہا..... چیخ بھی اندر ہی رہی.....

اس نے امان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا جیسے فاختہ ڈار سے بچھڑ کر سرد بارش میں بھیگ گئی ہو.....

کشمیری حسن کے اس طرح بیٹھے رہنے پر اور نظر اٹھا کر ایسے دیکھنے پر ہر رنگ و نسل کی عورت کو دیکھ چکے، پرکھ چکے، مل چکے، جانچ چکے، ڈانس فلور کے شہزادے کو اس ادا پر کمال کا پیار آیا۔

جن کے ساتھ وہ دوستی کے نام پر فلرٹ کرتا تھا۔ وہ تو اس کے گلے میں جھول جاتی تھیں یہ تو محبت کی فہرست کی لڑکی تھی۔ شادی کے خانے میں نام درج.....

"چلو میں تمہیں واپس چھوڑ دیتا ہوں۔"

اس بار اس نے تائید میں سر ہلایا۔ کہیں وہ یہ ہی نہ سمجھ بیٹھے کہ وہ واپس جانا نہیں چاہتی۔

"میں یہاں رہتا ہوں افق!" امان نے گاڑی روک کر ایک بنگلے کی طرف اشارہ کیا۔ افق نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اس طرف دیکھا..... لایا تو وہ اسے اندر لے جانے کے لیے تھا لیکن مشکل ہی تھا۔

وہ اسے اس کے گھر پر چھوڑ گیا..... وہ اس کے لیے چند تحائف لایا تھا اس کے پاس ہونے پر..... پہلی بار ملنے پر..... اماں سے اس نے بہانہ بنا دیا کہ فیکٹری کی ایک سہیلی اس کے ساتھ انارکلی بازار خریداری کرنے آئی تھی۔ سامان زیادہ تھا تو کچھ شاپرز اسے رکھنے کے لیے دے دیے..... اماں نے لمحے کے ہزارویں حصے پر بھی اس کی طرف ایسے نہ دیکھا کہ تم کیا کہہ رہی ہو..... سچ کہ جھوٹ۔

اس نے سب کچھ اٹھا کر الماری میں رکھ دیا..... دیکھا بھی نہیں۔

امان نے کہا کہ وہ اسے کالج میں داخلہ دلا دیتا ہے لیکن اس نے انکار کر دیا..... اگر وہ کالج جائے گی تو فیکٹری کون جائے گا اور پھر گھر کیسے چلے گا۔

"میں تمہیں اتنے پیسے دے سکتا ہوں۔"

"میں اماں سے اتنے جھوٹ بولنا نہیں چاہتی۔"

"میں چاہتا ہوں افق! تمہارے پاس ایک اچھی ڈگری تو ہو۔"

"بی اے کے بعد میں یونیورسٹی ضرور جاؤں گی۔"

"اگر نہ گئیں....." وہ مذاق نہیں کر رہا تھا۔

"میں جاؤں گی۔"

"تم نہیں جاؤ گی....." بے انتہا سنجیدگی سے کہا گیا۔

"تم ایسے کیسے....." اسے دکھ ہو رہا تھا۔

"دیکھ لینا..... تم زندگی میں کبھی کچھ نہیں کر سکتیں..... لوگ ناکام ہوتے ہیں یا آخری نمبروں پر آتے ہیں۔ تم وہاں تک بھی نہیں جا سکتیں۔ تم جیسی لڑکیاں افق گھروں میں ہی رہ سکتی ہیں..... اچھا ہے گھر میں ہی

رہو لیکن اگر ضرورت پڑے اور مستقبل بنانا ہو تو تم جیسی لڑکیاں بے کار ہیں۔ ہر سال میرا ایک لڑکی کے ساتھ ہی مقابلہ ہوتا ہے اور میں ہر بار اسے ہرا کر ٹاپ کر جاتا ہوں پر اس لڑکی کی محنت کی داد دیتا ہوں..... کمال کی لڑکی ہے، اگر میں اس کی ٹکر پر نہ ہوتا تو اسی کے نام کے ڈنکے بجتے اور اگر تم اس لڑکی کی جگہ ہوتیں..... فرض کیا صرف..... نہیں یہ فرض بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

امان ڈنکے کی چوٹ پر سچ بولتا تھا۔ وہ یہ جانتی تھی لیکن اس سچ نے اس کی آنکھیں نم کر دیں۔ چار سال جو اس نے دن رات محنت کر کے فرما بنایا اور چھ گھنٹے جو وہ فیکٹری میں کھڑے ہو کر کام کرتی ہے۔ ایک دن بھی کسی کو اس کے کام سے شکایت نہیں ہوئی تھی۔ فیکٹری کے چھ گھنٹے اور فرما بنانے کے سولہ گھنٹے اگر وہ کتاب پر لگاتی تو پاکستان بھر کے طلبا کو پیچھے چھوڑ دیتی۔ جو شخص سیکنڈ ہینڈ کتابیں خریدتا ہے اور جن کتابوں میں بہت سے صفحے پھٹے ہوئے ملتے ہیں اور انہی صفحوں سے کوئی سوال آجاتا ہے تو ایسے شخص کے گریڈ گنتے ہوئے اس کی مشکلات بھی ضرور گننی چاہئیں۔ اگر وہ کالج جائے اور گھر آتے ہی اسے تین وقت کا کھانا ملے تو وہ بھی امان جیسے ہر طالب عالم سے ٹکر لے سکتی ہے۔ جو بھی ہو، اسے خود پر شرمندگی ہوئی۔

پہلی بار اس نے اپنی زندگی کو شکوے کی نظر سے دیکھا۔ اس نے غصے میں گلاس زمین پر دے مارا۔ اسے غصہ آیا کہ اس کے پاس وسائل کیوں نہیں ہیں..... وہ ہی کیوں غریب ہے..... فیکٹری گئی تو سارا کام الٹا پلٹا ہو گیا..... کہتے ہیں جس اناج میں 'حرام کا ایک دانہ آجائے وہ سارے اناج کو تباہ کر دیتا ہے۔' پہلے افق کے مزاج بدلے، وہ ہر وقت چڑچڑی رہنے لگی، بات بات پر غصہ کرتی، اماں حیران ہوتیں پھر پریشان رہنے لگیں۔

ایک دو بار پوچھا پر اس نے ایک لفظ نہ کہا..... اماں انجانی سوچوں سے شرمندہ ہوتی رہیں۔

ابھی پچھلے دنوں ماموں کے چھوٹے بیٹے کی منگنی کی خبر آئی تھی۔ کبھی ماضی میں ماموں نے کہا تھا کہ وہ کشمیر کی کلی کو اپنے اس بیٹے کے ساتھ باندھ دیں گے۔ اماں سمجھیں شاید اندر ہی اندر اس کی آس تناور درخت بن گئی۔ اب کاٹے نہیں کٹ رہی کیا معلوم پسند کرتی ہو اسے۔ بچپن تک اچھی ہی دوستی تھی دونوں میں..... شاید..... شاید..... کچھ اور بھی ہو۔

"اس نے صرف اماں کی گود میں سر رکھ دیا..... میرے لیے دعا کیا کریں اماں.....! مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔"

اس دوران ایک اور واقعہ ہوا۔ جس فیکٹری میں افق جاتی تھی ان کے پارٹنرز کے درمیان لیبر کی کٹوتی کو لے کر جھگڑا ہوا..... کبھی کسی کو فارغ کر دیا جاتا کبھی واپس بلا لیا جاتا۔ جھگڑا بڑھا اور فیکٹری غیر معینہ مدت کے لیے بند کر دی گئی۔ افق حقیقتاً "بہت پریشان ہو گئی۔ باقی کاموں میں اتنے پیسے نہیں بنتے تھے اور کوئی کام وہ کر نہیں سکتی تھی۔ کسی پرائیویٹ اسکول میں نوکری کرتی تو بمشکل ہی دو ڈھائی ہزار ملتے۔ اس نے اماں کو آرام کرنے اور خود ان کی جگہ جانے کے لیے کہا پر وہ نہیں مانیں۔

امان اپنے شہر گیا ہوا تھا، کبھی کبھار ہی اس سے بات ہوتی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس بار پاپا سے افق کی بات کرنے جا رہا ہے۔

وہ نہیں مانیں گے۔" وہ افسردہ ہو گئی۔

"ہے تو ایسا ہی....." اس نے بھی تسلی نہیں دی۔

"پھر؟" اب وہ یہی سوال پوچھ سکتی تھی۔

"وہ مانیں گے نہیں، یہ سچ ہے پھر ظاہر ہے کہ مجھے خود ہی اسٹینڈ لینا ہو گا اکیلے ہی۔"

"اکیلے کیسے....."

"پاگل لڑکی! تم اور میں..... میرے اکاؤنٹ میں پیسے ہیں اور میرا مستقبل روشن ہے..... مجھے کوئی مسئلہ نہیں۔"

"وہ مان جائیں تو کتنا اچھا ہو۔" ایک طرف افق کو یہ سن کر خوشی ہوئی کہ امان اسے اپنے بل بوتے پر پالے گا

چھوڑے گا نہیں۔ اپنے خاندان کو جانتا ہے اسی لیے فیصلہ کر چکا ہے۔ دوسری طرف وہ اسی فیصلے سے گھبرا گئی۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں نے سب کچھ پلان کر لیا ہے۔" وہ ایسے ہی آرام سے 'اطمینان سے انتہائی سنجیدہ باتیں کیا کرتا تھا' جیسے چیونگم چبا رہا ہو یا مووی دیکھ رہا ہو اور اپنے ملازم سے کہہ رہا ہو "ہاں ہاں اورنج جوس ہی۔"

"امان کا مستقبل روشن ہے۔" افق بے فکر ہو گئی خاندان کی مخالفت اپنی جگہ۔ امان کی حمایت۔

"پاپا سے 'ماما سے بات کروں گا..... ہر طرح سے انہیں راضی کروں گا۔ وہ مان جائیں گے۔ میری مان ہی جاتے ہیں۔ تمہیں دیکھیں گے تو اور مان جائیں گے۔"

"مجھ میں ایسا کیا ہے کہ وہ مجھے دیکھ کر مان جائیں۔" افق کے آگے اس کا چھوٹا سا گھر گھوم گیا۔

"دیکھیں گے تو ان ہی سے پوچھ لینا۔ جب وہ اپنی پلکیں بھی نہیں جھپک سکیں گے..... بت بن جائیں گے۔" افق مسکرا اٹھی۔

"ایسی بھی بات نہیں ہے۔"

"مجھے تو لگتا ہے کہ تم انہیں مجھ سے زیادہ اچھی لگو گی۔"

وہ ہر طرح کی تعلیمی سرگرمی سے تین ماہ پہلے ہی فارغ ہو چکا تھا۔ یہ عرصہ اس نے پارٹیاں کرنے اور چند دوستوں کی شادیاں اٹینڈ کرنے میں گزارا تھا۔ اس دوران وہ دوبار گھر ہو کر آچکا تھا لیکن افق کو نہیں بتایا تھا یہاں چھپانا مقصد نہیں تھا عادت وجہ تھی 'ایگل گروپ کے سب ہی کارکنوں نے ساریاں بتیاں بجھا کر سگریٹ لائیٹر جلا کر مشترکہ حلف لیا تھا کہ وہ اپنی تعلیم کے دوران کے اس عرصے کو ہر رنگ سے سجادیں گے۔ کوئی ٹینشن نہیں لیں گے۔ جو جی میں آئے گا کریں گے 'جو درد سر بنے گا اس کا سر پھوڑ دیں گے۔

تو اس ایگل گروپ کے ہر رکن نے ہر وہ کام کیا جو ان کے جی میں آیا..... ہاسٹل کے ہی ایک دوسرے گروپ کے ساتھ ان کی گرما گرمی ہو گئی 'انہوں نے ان کے کمروں میں ڈرگ اور شراب چھپا دی اور چھاپہ پڑوا دیا۔

ان ہی دنوں جب وہ زخمی ہو کر بستر پر تھا اس نے افق کو ڈھونڈ نکالا.....

جیسے کالے سیاہ آسمان پر پہلی تاریخ کا چاند ساری توجہ کھینچ لیتا ہے۔ ایسے ہی افق کی آواز اور انداز نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ اس نے "جی" کے نام سے نمبر محفوظ کر لیا۔ مختلف چیزوں کو دیکھتے دیکھتے ان چیزوں میں ایک بدنما یا عجیب ہی سہمی رکھی ہوئی مل جائے تو چلتے چلتے قدم رک ہی جاتے ہیں۔ ذرا سا دیکھ لینے کے لیے کہ یہ ہے کیا۔ اسی طرح افق کو ذرا سا دیکھنے کے لیے امان رک گیا۔

کسی لڑکی پر وہ اتنا وقت برباد نہیں کرتا تھا۔ جن لڑکیوں کو اس نے فون کالز کی..... اس کی دلکش آواز سنتے ہی دوسری بار انہوں نے خود کال کی مگر اس لڑکی نے فون ہی بند کر دیا۔ اسے وقتی حیرانی ہوئی..... پھر بات انا اور ذاتی ریکارڈ پر آگئی کہ یہ کون لڑکی ہے جو دوسری لڑکیوں کی طرح نہیں..... فون نہیں سنتی..... میسج کا جواب نہیں دیتی..... ہے کیا یہ لڑکی..... اتنا تو وہ اس کے انداز سے سمجھ ہی چکا تھا کہ اس بے چاری کے لیے "امان" پہلا تجربہ ہے۔ امان کا یہ ذاتی ریکارڈ افق جیسی لڑکی توڑ رہی تھی۔ بات وقت گزاری سے آواز کی پسندیدگی تک آئی..... ریکارڈ سے دل لگی تک جانے لگی۔

دل لگی سے بات ذرا سنجیدہ ہو گئی۔ امان نے سوچا کہ بے چاری حد سے زیادہ شریف ہے۔ اور غلط کو غلط ہی سمجھ رہی ہے 'وہ غلط کو غلط سمجھنے والی اسے ٹھیک لگی۔ اتنی لمبی فہرست میں کوئی ٹھیک بھی ہونا چاہیے۔ وہ بے چین تو نہیں ہوا ہاں اتنا ضرور ہوا کہ جب اس

نے سوچا کہ بھاڑ میں جائے تو سوچنے کے کچھ ہی دیر بعد وہ پھر سے اسے میسج لکھ رہا تھا اور انتظار بھی کر رہا تھا اسے لگا کہ اس کی ایک رگ اس خاموش لڑکی کے ساتھ پھڑک رہی ہے۔ اس نے ایک چھوٹا سا ڈرامہ کیا اور اس کا جواب آگیا۔ اسے اچھا لگا۔ خوشی ہوئی۔

اسے افق پسند آگئی۔ اس نے افق کو باقی لڑکیوں سے الگ ہی رکھا۔ اس سے اپنی ذاتی باتیں شیئر کر لیتا جو وہ کسی اور سے نہیں کرتا تھا' اسے کبھی باہر ملنے کے لیے مجبور نہیں کیا۔ وہ اسے اپنے دوستوں میں بیٹھ کر ڈسکس نہیں کرتا تھا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ایک آنکھ دبا کر اس کا کوئی دوست "کیسی ہے وہ" کہہ کر افق کے بارے میں پوچھے۔

زمانہ جدید کے لوگوں میں زمانہ قدیم کی افق پر اس کا دل آگیا۔ وہ اسے بے حد پسند تھی۔

وہ اس سے شادی کا وعدہ کر چکا تھا۔ پہلی بار صرف اسی سے کوئی وعدہ کیا تھا وہ جانتا تھا۔ افق کے معاملے میں وہ گھاٹے میں نہیں رہے گا۔

اس کے جیل جانے پر بہت سی لڑکیوں نے فون کر کر کے اپنی پریشانی ظاہر کی' اپنی مدد پیش کی لیکن جیل سے ضمانت پر رہا ہونے کے بعد جو آواز اس نے افق کی سنی' اس نے اسے حیران کر دیا۔ اسے اس پر پیار آیا وہ اسے اور اچھی لگنے لگی۔

پاپا خود ہی لاہور ڈی ایچ اے آگئے۔ اپنے دوست کی آمد کے بارے میں بتانے لگے' وہ سنتا رہا۔

"تمہارا دھیان کہیں اور ہے؟" انہوں نے برا مانا۔

وہ سنبھل کر بیٹھا۔ "کب آ رہے ہیں انکل؟"

"وہ تو آتا جاتا رہتا ہے۔ اس بار خاندان کے ساتھ آ رہا ہے۔ بہت سے لوگ اس کے انتظار میں ہیں اس بار۔"

"ضرور ہوں گے۔" وہ ابھی بھی متوجہ نہیں تھا۔

"تم مجھ سے اپنی بات کر لو... یا میری سن لو یا مجھے وقت دے دو لکھ کر کہ اس وقت بات کریں۔" آواز سختی اور غصے سے تن گئی۔

"مجھے کرنے دیں بات۔" وہ جان چکا تھا کہ اس دوست کے بارے میں کیوں بتایا جا رہا ہے۔

"ایک لڑکی ہے...." یہیں سے مناسب لگا بات شروع کرنا۔

وہ اسے دیکھ کر رہ گئے.... "آگے...؟"

اس سوال آگے نے اس کی جرأت کو پیچھے ہی کر دیا کیونکہ آگے پیچھے اور کچھ بتانے کے لیے تھا ہی نہیں۔

"افق.... وہ مجھے پسند ہے اور بس۔" اور یہ سب انہیں جاننا نہیں تھا۔ انہیں جو جاننا تھا وہ' وہ بتا کر شرمندہ ہی ہوگا۔

"وہ میرے کالج سے نہیں ہے...."

"اس شہر سے تو ہے نا...." ان کے انداز میں گہری تاڑ تھی۔

"آپ چلیں گے میرے ساتھ۔" اور تفصیل وہ اور کیا بتاتا۔

"ضرور چلوں گا لیکن تم جانتے ہو کہ جانے میں پہل میں نہیں کرتا.... تم انہیں یہاں بلوا لو...."

"وہ ایسے نہیں آسکتے...." بات پھر وہیں آگئی تھی۔

"پھر کیسے آسکتے ہیں وہ....؟"

اسے لگا کہ اس کا باپ ایک اچھا وکیل صفائی بھی ہے وکیل استغاثہ بھی اور جج بھی اعتراضات بھی وہی اٹھائیں گے اور فیصلہ تو کرنا ہی انہیں ہے۔

وہ جھنجلا گیا وہ جان گیا کہ پاپا کیا سمجھ رہے ہیں۔ انہیں لگ رہا ہوگا کہ وہ آگے پیچھے چلتی قیمتی کاروں میں ان کے فارم ہاؤس پر آئیں گے۔ لنچ ڈنر ساتھ ہوگا اور اسی دوران سب معلوم ہو جائے گا کہ کون کس کے ہم پلہ ہے۔

"ہماری کلاس کے نہیں ہیں وہ۔"

خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔ پھر وہ ایسے ہنسے جیسے پہلے سے ہی جانتے تھے۔

امان کی شکل پر آنے والے تاثرات دیکھنے لائق تھے۔ وہ گھی کو الٹی انگلی سے نکالتے تھے نہ ہی سیدھی

سے۔ وہ پیندے میں سوراخ کر دیتے تھے۔ تپش کے ذرا پاس رکھ دیتے اور پگھلا کر نچوڑ لیتے تھے۔

"تمہیں یاد ہوگا کہ تم ایک مسئلے میں کس بری طرح سے پھنس گئے تھے.... وہی کار ایکسیڈنٹ والا مسئلہ۔"

"یاد ہے۔" حیران ہوا۔

"جانتے ہی ہوگے کہ میں نے کیسے تمہیں اس مسئلے سے نکالا۔ کس کس سے رابطے کیے میں نے.... یہ سب تو میں نے اپنے بیٹے کے لیے کیا۔ وہ اپنے داماد کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ اگر تم کسی مسئلے میں پھنس جاؤ.... تم سے کوئی قتل ہو جائے' تم جیل چلے جاؤ یا نہیں اور دھر لیے جاؤ.... کسی دشمن کی پکڑ میں آجاؤ تو کسی گورنر' کرنل' جرنل' منسٹر کو فون کروا سکتے ہیں.... چلو کسی چھوٹے سے ایس پی کو ایم پی اے کو....؟ اگر تم دیوالیہ ہو جاؤ تو کسی بینک سے تمہیں چند کروڑ کا لون دلوا سکتے ہیں؟"

اس کے باپ نے تین فیکٹریاں رات سوتے میں سپنے دیکھتے دیکھتے ہی نہیں لگا لی تھیں۔ وہ تو فیکٹری میں کام کرنے والے چوکیداروں پر بھی نظر رکھتے تھے۔

اس کا چہرہ اتر گیا لیکن اس نے اپنے باپ کی ہر بات کو درست مانا۔

"مجھے وہ بہت اچھی لگتی ہے۔" محبت کا لفظ اس نے استعمال نہیں کیا اور اسی کا سہارا لیا جس سہارے سے اسے ہر چیز مل جایا کرتی ہے۔

"تمہیں کیا اچھا نہیں لگتا سن.... چند سال پہلے تم ایک ہالی ووڈ کی ماڈل کے بارے میں بہت باتیں کرتے رہے ہو اور تم یہ دعوا بھی کرتے رہے ہو کہ تم اسے ضرور حاصل کرو گے' تم نے اپنے کمرے کی دیواروں کو اس کی تصویروں سے بھر دیا تھا۔"

"وہ بچپنا تھا۔" اسے وہ ماڈل یاد آگئی۔

"تو یہ سب کیا ہے....؟"

"میں سنجیدہ ہوں۔" اس نے پہلو بدلا۔

"جیسے تم خلائی سفر پر جانے کے لیے سنجیدہ تھے۔"

"وہ مشکل تھا۔" اپنے پاپا کی یادداشت پر وہ عش عش کر اٹھا۔

"یہ بھی مشکل ہے سن.... بہت مشکل بلکہ ناممکن...."

"مجھے افق سے ہی شادی کرنی ہے پاپا.... آپ مان جائیں گے تو مجھے بہت اچھا لگے گا۔" بہت آرام سے درخواست کی۔

"فیصلہ کر چکے ہو؟" آرام سے ہی پوچھا گیا۔

وہ خاموش ہی رہا۔

"ٹھیک ہے کر لو.... تعلیم تو مکمل کر ہی چکے ہو۔ شادی بھی کر لو۔ مجھے یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں کہ پھر میرا تمہارا تعلق ختم ہو جائے گا۔"

"پاپا پلیز...."

خاموشی کا ایک اور وقفہ آیا۔

"آغا سے مل لو۔"

"میں ان سے مل چکا ہوں کئی بار...." آغا کا تذکرہ اسے برا لگا۔

"پھر ملو۔"

"ماریہ مجھے پسند نہیں ہے۔" اس کے اعصاب تن گئے۔

"تم اسے ایک بار پرپوز کر چکے ہو.... واپسی پر تم کافی ڈسٹرب رہے تھے اس کے انکار پر...." وہی مکمل کی یادداشت۔

"افق اس سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔"

"صرف خوب صورتی پر ہی فدا ہو گئے ہو.... تو پھر ڈبل ڈیل کرو نا.... ڈبل فائدہ لو.... ماریہ خوب صورت بھی ہے' آغا کی بیٹی بھی۔" دے تالی والا انداز تھا۔

"پاپا!" اس نے کچھ اور کہنا چاہا۔

"سن...." انہوں نے آنکھوں کو گہرا زاویہ دیا اور آواز میں تنفر اور تنبیہہ بھری۔ "اگر میں تمہیں کسی جھوٹے مقدمے میں جیل کروا دوں تو تم یا کوئی کیا کرے گا.... باہر آجاؤ گے.... شادی کر لو گے پھر اس لڑکی سے.... تو سن.... اپنی پشت پر ایک ہاتھ ایسا ضرور رکھو' جو وقت پڑنے پر تھپکی بھی دے اور ہاتھ بڑھا کر گڑھے سے بھی نکال لے.... یہ ہاتھ تمہیں خود بنانا

ہے۔"

اپنے باپ کے دلائل کے سامنے وہ ابھی بچہ تھا۔

"تمہارے جیسے لڑکوں کی پسند 'محبت' عشق سے میں خوب واقف ہوں' چند دن پہاڑوں پر چڑھتے ہیں پھر سمندروں سے عشق کرنے لگتے ہیں پھر غاروں میں جا چھپتے ہیں' چند دن جنگل جنگل..... پھر شہر شہر' گاؤں گاؤں' تم ایک جنس ہو اور کئی دوسری جنسوں میں حلول کرتے ہو' جڑتے ہو ٹوٹتے ہو اور پھر واپس خود میں آجاتے ہو..... تو میں تمہارا باپ ہوں۔ خود میں جھانک کر دیکھو۔ تم چاہتے کیا ہو..... کیا صرف وہ لڑکی' ہر چیز' ہر رتبے سے بالاتر صرف وہ لڑکی.....؟ وہ لڑکی تمہیں پسند ہے' ہمیشہ رہے گی یہ جانتے بھی ہو کہ نہیں..... "کندھے پر تھپکی دے کر وہ چلے گئے۔

زبردستی کے وہ قائل نہیں تھے ہاں ترکیب عمل کے بہت بڑے مداح تھے۔ اگلے ہی ہفتے اسے ساتھ لے کر امریکا آگئے کہ انہیں شرمندہ نہ کروائے اور آغا سے صرف مل لے پھر بے شک انکار کردے۔

آغا ان کے دوست تھے لیکن دولت نے ان میں چار پانچ پر زیادہ ہی لگا دیے تھے اسی لیے ان کی پرواز سب میں اونچی تھی' دوستی میں چھپے ہوئے گہرے عناد اور بغض کو غلام علی ہی نبھاتے تھے' کسی اور طرح تو آغا کی دولت ہاتھ آتی نظر نہیں آرہی تھی انہوں نے بہت بار کوشش کی کہ وہ ان کے پارٹنر بن جائیں' کئی بار امریکا بڑے بڑے منصوبے لے کر گئے لیکن وہ سگار پیتے سنتے رہتے۔ سب سن کر آخر میں سر ہلا کر دیتے۔

"ضرور کرو..... ضرور کرو..... بیسٹ آف لک۔"

ان کی اتنی بار کی بیسٹ آف لک کے باوجود غلام علی نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا..... کھوٹے سکے اور کھوٹے بیٹے کی طرح انہیں یقین تھا کہ یہ آغا بھی ضرور کام آئے گا۔ غلام علی کو یقین سا تھا کہ وہ رشتے داری پر آہی جائے گا۔

ہوٹل سے یہ لوگ پہلے ان ہی کے پاس گئے۔

ماریہ نے شاید شوق شوق میں پاکستانی لباس پہنا تھا۔ سفید شیفون کی قمیص اور سفید ہی چوڑی دار پاجامہ..... دوپٹا ہلکا گولڈن تھا اور ستاروں جیسا جھلملا رہا تھا۔

عدن نے ہاتھ آگے کیا تو اس نے تین انگلیوں سے اس کے ہاتھ کو چھو کر ہائے کا جواب دیا۔ دوپٹا جو اس سے سنبھالا نہیں جارہا تھا۔ وہ کبھی کندھے سے ڈھلکتا تو کبھی گردن سے۔ وہ اکٹھا کرکے گردن میں چن دیتی' پھر بھی ذرا سا ہلتی تو وہ ڈھلک کر گرنے کو آجاتا۔ تو وہ اسی مشغلے میں مشغول تھی۔

عدن ٹھیک آٹھ سال بعد اسے دیکھ رہا تھا..... اور اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وقت کے ساتھ لوگ بدل جاتے ہیں لیکن کیا وہ وقت کے ساتھ ساتھ اور سے اور خوب صورت ہوتے جاتے ہیں۔ ایک بار خوب صورت پیدا ہونے والے پھر بس کیوں نہیں کرتے۔ مصری حسیناؤں کی فرعونیت سی ادا لیے وہ لاتعلق سی ایک طرف بیٹھی تھی۔

عدن کی بہن شمائل نے اس سے باتیں کرنے کی کوشش کی مگر وہ چند ایک بار ہونٹ کھول کر بند کیے بیٹھی رہی' یہی کام عدن نے کیا تھا اور اس کا جواب بھی یہی ملا تھا۔

ڈنر کے لیے انتظام لان میں کیا گیا تھا۔ اس کے پاپا اور ماریہ کے ڈیڈ پہلے سے ہی وہاں موجود تھے' عدن کی ماما' ماریہ کی ماما سے بات کرنے کی کوشش کررہی تھیں۔

ڈنر کے لیے وہ باہر جانے لگیں تو ماریہ جو ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی تھی' اٹھی تو دوپٹا پھر پھسل کر ایرانی قالین پر ڈھیر ہوگیا۔ عدن ذرا سا جھکا اور دوپٹے کو پکڑ لیا وہ خود جھک کر اٹھانے والی نہیں تھی' وہ بنا دوپٹے کے ہی نکل جانے کے ارادے سے تھی۔ اتنے نخرے اس نے کبھی انسانوں کے نہیں اٹھائے تھے' کہاں ایک کپڑے کے اٹھاتی۔

شیفون کے جھلمل کرتے دوپٹے کو اپنے ہاتھ میں لے کر عدن نے ایک کندھے سے دوسرے کندھے پر جمایا..... اور دو انگلیوں سے اس کی ٹھوڑی کو چھوا۔

"آسمان سے اتر کر سیدھی یہیں آرہی ہو؟"

اس نے جیسے سنا ہی نہیں' قدم بڑھاتی آگے چلنے لگی..... عدن بھی اس کے پیچھے ہی تھا..... چند قدم آگے چل کر اسے خود سے دو قدم پیچھے محسوس کرکے اس نے گردن موڑی۔

"ابھی تک ویسے ہی ہو۔"

عدن نے اپنا جاندار قہقہہ اس کی پشت پر چھوڑا۔

جب وہ انیس سال کا تھا تو تیسری بار امریکا ان کے پاس گیا تھا۔ پہلی بار وہ صرف چھ سال کا تھا دوسری بار صرف نو سال کا اور تیسری بار میں نئے نئے جوش اور نت نئے خیالات سے بھرا انیس سالہ عدن تھا۔ پاپا تو آتے جاتے رہتے تھے لیکن وہ صرف تین بار ہی گیا۔

پاپا نے اس سے بار بار کہا تھا کہ وہ ماریہ سے دوستی کر لے..... اس کے ساتھ گھومے پھرے..... اس کے دوستوں سے ملے..... لیکن ماریہ کا ذکر اتنی بار سننے کے باوجود وہ اس بات کے لیے بالکل بھی راضی نہیں تھا وہ اپنی مرضی سے بولتا تھا' دوست بناتا تھا اور لڑکی نام کی چیز کو اس نے اب تک صرف زچ ہی کیا تھا۔ ماریہ کے ساتھ بھی وہ یہی سب کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن ہوا کچھ یوں کہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے اس نے گھٹنوں تک اسکرٹ' لانگ شوز اور لمبے بالوں کی پونی ٹیل میں ایک حور اسپورٹس کار میں بیٹھتے دیکھ لی اور کھڑے کھڑے ہی اس نے فیصلہ کیا کہ وہ صرف اسی سے شادی کرے گا بلکہ ساتھ ہی لے کر جائے گا۔

دو دن سے لوگ ان کے یہاں تھے لیکن ماریہ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس کی مام نے بتایا تھا کہ وہ کسی ایجنسی کے ساتھ پیرس ماڈلنگ کے لیے گئی ہے۔

ادھر ادھر گھومنے پھرنے کے لیے جانے کے بجائے وہ سارا دن ماریہ کا گھر میں ہی انتظار کرتا رہا۔ لنچ ہوگیا' ڈنر ہوگیا' رات گہری ہوگئی لیکن وہ نہیں آئی' انتظار کرتے کرتے وہ کھڑکی کے پاس ہی کرسی پر اونگھنے لگا.....

کار کے ٹائر چرچرانے کی آواز پر وہ جاگا جب تک گردن نکال کر دیکھا۔ اس کی پشت ہی نظر آئی' چڑ کر عدن بیڈ پر جاسویا' شادی کا ارادہ کرکے وہ اسے اپنی بیوی ہی سمجھ بیٹھا تھا اور ان کی بیوی اتنی دیر سے گھر آئی تھی' رات دیر تک جاگنے کے باوجود وہ صبح جلدی اٹھا کہ وہ پھر نہ چلی جائے' لیکن وہ دیر تک سوئی رہی۔ لنچ ٹائم پر ناشتا کیا۔

"ہائے۔" وہ صوفے پر بیٹھی تھی۔ نامناسب سا لباس پہنا تھا شیشے کی میز پر ٹانگیں رکھی تھیں اور ان ہی ٹانگوں کی سیدھ میں کاؤچ پر وہ آکر بیٹھا تھا۔

"اوہائے!" اس نے ہاتھ آگے کیا۔ "کیسے ہو..... کب آئے.....؟"

"ایک ہفتے سے یہاں ہوں۔" اس نے جیسے شکوہ کیا۔

"گڈ..... دیکھ لیا امریکا؟" ہر پاکستانی کو امریکا میں ایسے سوالات سے ہی کیوں نوازا جاتا ہے۔

"میں امریکا دیکھنے نہیں آیا۔"

"تو.....؟" براؤن بریڈ کا پیس اس نے ادا سے کترا۔

"اکیلے کیسے دیکھ لوں....." اسے نئی ترکیب سوجھی۔

"تمہارے مام ڈیڈ بھی تو آئے ہیں۔" فریش جوس کا گھونٹ لیا۔

"اگر تم پاکستان آؤ تو میں تمہیں خود سارا پاکستان گھماؤں۔"

وہ ہنسی۔ جوس کا ایک گھونٹ لیا "پاکستان گھومنا کون چاہتا ہے۔"

پاکستان سے تو عدن کو کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ بے عزتی اسے اپنی آفر کے ایسے مذاق اڑائے جانے پر ہوئی۔

گلاس میز پر رکھ کر وہ اٹھ کر چلی گئی' عدن منہ دیکھتا رہ گیا.....

اگلے تین دن وہ اس کا منہ دیکھنے کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ رات گئے آتی۔ صبح سویرے ہی چلی جاتی۔ بہانے سے اس نے پوچھا تو مام نے بتایا کہ آج کل ریہرسلز چل رہی ہیں۔ پتا لے کر وہ اسٹوڈیو ہی آگیا۔ کسی کمرشل کے لیے ریہرسل کی جارہی تھی' سو کے قریب لوگ تھے' عدن نے دور سے ہی ہاتھ ہلایا..... اسے دیکھ کر وہ صرف مسکرائی اور اپنا کام کرتی رہی..... ایک بار بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔

عدن لنچ ٹائم کا انتظار کرنے لگا..... لنچ ٹائم آیا.....

بیل ہوئی اور وہ ایک لڑکے کے ساتھ ایک طرف چلی گئی۔ وہ ایک طرف کرسی پر ہی بیٹھا رہ گیا۔ دوبارہ جب وہ نظر آئی تو لنچ بریک ختم ہو چکا تھا۔۔۔۔ درمیان میں اس نے ایک بار اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور اوب کر باہر آگیا۔ اگلے دن اس سے ملاقات ہوئی تھی تو جیسے اسے یاد ہی نہیں تھا کہ وہ اسٹوڈیو آیا تھا۔

"لنچ کے لیے چلیں ماریہ۔" اس سے پہلے کہ وہ پھر نکل جائے اس نے اسے دیکھتے ہی آفر کی۔

اس نے صرف ہونٹ سکیڑے یعنی نہیں۔

"ڈنر کے لیے؟" اس بار اس نے سر بھی نفی میں ہلا دیا۔

"کیوں؟" غصہ دبا کر وہ بولا۔ عدن کو انکار کیا جا رہا تھا۔

اس نے کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"میں شوٹنگ پر جا رہی ہوں۔۔۔۔ تم چاہو تو ساتھ آجاؤ۔"

وہ جانتا تھا ساتھ لے جا کر اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا۔

"اپنے مہمان کے ساتھ تمہیں ایک وقت کا کھانا تو کھانا ہی چاہیے۔"

"تم میرے مہمان نہیں ہو۔" اس نے بات ہی ختم کر دی۔ ماریہ کے ہاتھوں پہلا تھپڑ عدن کے گال پر آلگا۔

"تمہارا مہمان نہیں ہوں دوست تو بن سکتا ہوں نا؟"

تھپڑ کھا کر بھی عدن نے ہمت نہیں ہاری

اس نے رد عمل میں ایک ابرو اچکائی اسے دیکھا اور اٹھ کر چلی گئی۔ چونکہ وہ اسے شادی کر کے اپنے ساتھ لے جانے کا پکا ارادہ کر ہی چکا تھا سو اسے انگریزی القابات سے نہیں نواز سکا' خاموشی سے اس کی ادا کو پی گیا' یعنی کہ وہ جانتی ہے کہ وہ کس قدر خوب صورت ہے' اسی لیے ایسی ادائیں سیکھ لی ہیں۔

چند دنوں بعد وہ اسے لان میں بیٹھی مل گئی۔

"کیسا رہا شوٹ؟" اس کے پسندیدہ موضوع سے بات شروع کی۔

"ونڈر فل!"

"فارغ ہو؟" وہ اپنی بات کی طرف آنے لگا۔

اس نے کچھ دیر سوچا "تقریباً"۔"

"باہر چلیں۔۔۔۔" اس کا جی چاہا کہ اجازت بھی چھوڑے۔ اسے اٹھا کر گاڑی میں بٹھائے اور نکل جائے۔

"ٹھیک ہے چلو۔۔۔۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں نے ایک ساتھ سینما میں موووی دیکھی اور کافی پینے کے لیے ایک اوپن ریسٹورنٹ میں آگئے۔

"تم ایسے ہی سب کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہو؟"

بے حد رومانٹک ماحول میں سنجیدگی سے کی گئی یہ بات عدن کو اچھی نہیں لگی لیکن وہ اپنا موڈ خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"سب کو نہیں' صرف تمہیں۔" عدن نے بہت پیار سے کہا۔

اس نے سارس سی لمبی گردن کو ادا سے ہلکا سے خم دیا اور کرسی کی پشت سے لگ کر دائیں ہاتھ کو دائیں گال پر رکھ کر اسے دیکھا۔ وہ الفاظ سے ہی طنز کرنا نہیں جانتی تھی۔

"میں تمہیں کیسا لگتا ہوں۔۔۔۔؟" وہ اصل بات کی طرف آنے لگا۔

"جیسے تم ہو۔۔۔۔" کافی پیتے جواب دیا۔

"کیسا ہوں میں۔۔۔۔؟" اس کا دل لڑکیوں کی طرح دھڑک رہا تھا۔

"دم کہاں ہے تمہاری۔۔۔۔؟" سر کو ذرا سا جھکا کر پیچھے اس کی طرف دیکھنے کی اداکاری کی' نئے نئے محبت کے غبارے سے بھرے عدن کے ایک اور چانٹا آکر لگا۔

"کیا مطلب۔۔۔۔؟" یہ سوال اس نے اس لیے کیا کہ شاید وہ مطلب نہ ہو' جو وہ سمجھ رہا ہے۔ اس نے کندھے اچکائے اور کافی کا مگ اٹھا کر منہ سے لگا لیا جیسے سنا ہی نہیں' اس نے کچھ پوچھا ہی نہیں۔

اتنے دنوں سے عدن بہت جوڑ توڑ کر چکا تھا۔ اگر وہ بے حد خوب صورت تھی تو وہ بھی کم نہیں تھا۔ اگر وہ مس یونیورس تھی تو وہ مسٹر پاکستان تو ضرور ہی تھا۔۔۔۔ ایک پوائنٹ یہ ہوا۔۔۔۔ دونوں کے والد آپس میں دوست ہیں' دوسرا پوائنٹ۔۔۔۔ دونوں اس رشتے پر خوش ہوں گے تیسرا پوائنٹ اور سب سے اہم پوائنٹ کہ وہ اسے پسند کرتا ہے اور اس سے شادی کرے گا امریکیوں کی طرح نہیں کہ چند دنوں میں چھوڑ جائے۔

امریکا ایسے دھوکے باز معاشرے میں عدن جیسے ہیرے کو تو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔۔۔۔ یہ پوائنٹ زبردست تھا۔۔۔۔ بیٹھے بٹھائے اس نے اپنے اندر بے تحاشا خوبیاں کھوج لیں۔۔۔۔ اور اسے اپنی ذات اعلا و ارفع نظر آنے لگی دنیا کا ہر شخص ماریہ کے لیے بے کار اور ناکارہ نظر نہ آنے لگا اور ماریہ اسے اپنی محبت کا دم بھرتی نظر آئی۔

"تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔" اس نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

کافی کا مگ اس نے سامنے میز پر رکھا اور دونوں ہاتھ پیٹ کی طرف باندھ لیے۔ "رئیلی؟" اس کی ہمت بندھی اور اثبات میں سر ہلایا۔

"اتنی اچھی کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔"

اپنی طرف سے اس نے دھماکا کیا۔

"گڈ!" وہ اسی انداز سے بیٹھی رہی۔

"تم سے محبت کرتا ہوں ڈیئر۔" دوبارہ اس لیے کہا کہ اسے اچھی طرح بتا دے کہ یہ کوئی عام بات نہیں ہے۔ ایشیا کے مرد کی محبت بہت بڑی چیز ہے۔

"مجھ سے تو ہر دوسرا لڑکا محبت کرتا ہے۔"

"مجھ میں اور ان میں فرق ہے۔" اب وہ دلائل پر اتر آیا۔

"کیا فرق ہے؟" اب وہ دلائل لینا چاہتی تھی۔

"میں سچی محبت کرتا ہوں۔" اسے صرف یہی بات سمجھ میں آئی کہنے کے لیے۔

"سچی محبت کسے کہتے ہیں؟"

"میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اسے یہی جواب مناسب لگا۔

"میں تم سے شادی کیوں کروں؟"

"کیونکہ میں تمہارے لیے پرفیکٹ ہوں۔" گردن کو اٹھا کر فخر سے کہا۔

وہ اتنی زور سے ہنسی کہ آس پاس کی میزوں پر بیٹھے لوگ گردنیں موڑ کر اسے دیکھنے لگے۔

(باقی آئندہ ماہ)

رخسانہ نگار عدنان

ایک تھی مثال

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشریٰ ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشریٰ کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشریٰ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصلحتاً ”بیٹا“ بہو سے لگاوٹ دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشریٰ کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ پانچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشریٰ کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشریٰ دولہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشریٰ کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشریٰ اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشریٰ اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشریٰ کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہیں۔ عاصمہ کو فون کے ذریعے کوئی اطلاع ملتی ہے، جسے سن کر وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔

فون پر پتا چلتا ہے کہ شہر آتے ہوئے عفان اور فاروق صاحب ڈکیتی کی واردات میں قتل ہو گئے۔ عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے

وصول کرپاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقتولین کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ، نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشریٰ سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔

حمیدہ خالہ، عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زبیر کا اکیلے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں جبکہ عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس کو خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زبیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آجاتا ہے کہ وہ انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے، سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔

رقم مہیا نہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر بہو اور اس کے گھر والوں کو مورد الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشریٰ کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا ابارشن ہو جاتا ہے۔ عدیل شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے مگر وہ ہنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔

اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ اپنے حالات سے تنگ آکر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہو کر پاکستان آجاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو پتا چلتا ہے کہ زبیر نے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے راستے بند کر دیے ہیں اور اب مفرور ہے۔ بہت کوششوں کے بعد ہاشم، عاصمہ کو ایک مکان دلا پاتا ہے۔ بشریٰ اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کر دیتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل سخت پریشان ہے۔

—۸—

آٹھویں قسط

عدیل سے جواب میں کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

"بالکل سچ بول مجھ سے..... جھوٹ نہیں سنوں گی میں عدیل!" وہ اس کی خاموشی پہ اور بھی چمک کر بولیں۔

"امی! ایسا کچھ نہیں ہے، آپ جانتی ہیں۔" عدیل نے نرم لہجے میں کہتے ہوئے ماں کا ہاتھ سر سے ہٹانا چاہا۔

"مجھے کوئی چکر نہیں دینا۔ بغیر لگی لپٹی سچی سیدھی بات کر مجھ سے۔" وہ بھی سخت لہجے میں مضبوطی کے ساتھ سر پر ہاتھ جما کر بولیں۔

"ہاں امی! اس نے ایسا کہا ضرور ہے۔" وہ تھک کر بولا۔

"دیکھا امی! میں نہیں کہتی تھی۔ یہ بات جھوٹ ہو ہی نہیں سکتی۔" فوزیہ جو دوسری طرف خاموش بیٹھی اس مناظرے کا مزہ لے رہی تھی "فوراً" ہی شیر ہو کر بولی۔

"عدیل! تو ایسا نکلے گا۔" نسیم کی آنکھوں میں افسوس اور بے یقینی کے مارے آنسو ہی آگئے۔

"امی! میری پوری بات سن تو لیں آپ۔" وہ سخت جھنجلا کر بولا۔

"کیا رہ گیا ہے اب سننے کو باقی..... تجھے اس دن کے لیے پال پوس کر جوان کیا تھا کہ تو بوڑھی ماں اور جوان لاچار بہن کو چھوڑ کر چلتا بنے۔" وہ باقاعدہ رونے لگیں۔

"امی! خدا کے لیے روئیں نہیں، آپ کی طبیعت بگڑ جائے گی۔" وہ روہانسا ہو کر بولا۔

"جب قسمت بگڑ چکی ہو تو پھر طبیعت کی کس کو فکر ہوتی ہے۔ عدیل! تو نے دلاری بیوی کی فرمائش کو سر آنکھوں پر رکھتے ہوئے ایک بار بھی ہم دونوں کے بارے میں نہیں سوچا۔" وہ روئے جا رہی تھیں۔

"اُفوہ! میری بات تو پوری سن لیں۔ آپ کو تو بس ہر دوسرے تیسرے کی الٹی سیدھی بات پہ کان دھرنے کی عادت ہے سوائے میری بات کا یقین کرنے کے۔" اب کے وہ جھلاتے ہوئے سخت ناراض لہجے میں کہہ اٹھا۔

نسیم بیگم کچھ ٹھٹکیں۔ "اس طرح تو وہ ہم دونوں سے باغی ہو جائے گا یوں ہر وقت کے رونے دھونے اور مظلومیت کے ڈرامے سے۔" انہوں نے فوراً چہرے کے تاثرات بدلتے ہوئے آنسو صاف کیے۔

"تجھ پہ تو یقین مجھے خود سے زیادہ ہے۔ بلکہ سچی بات کہوں تو خدا کے بعد میرے بچے تو ہی تو ہمارا سہارا ہے۔" ذکیہ نے جس دھڑلے سے دعوا کیا کہ عدیل تو بشریٰ کے لیے علیحدہ گھر ڈھونڈ بھی چکا ہے تو یقین کر مجھے لگا میرا دل ابھی کا ابھی بند ہو جائے گا۔ کیا کروں عدیل! تجھ میں تو میری جان ہے۔ یہ سوچ کر کہ خدانخواستہ تو میری آنکھوں سے دور چلا جائے گا۔ میں تو اسی دن مر جاؤں گی۔ سچ کہتی ہوں۔" انہوں نے پھر سے آنکھیں آنسوؤں سے بھر لیں۔

"امی! میں نے کوئی الگ گھر نہیں دیکھا اور نہ میرا ایسا کوئی ارادہ ہے۔" ماں کی پل پل بدلتی حالت اسے اندر ہی اندر کچھ پریشان کر رہی تھی۔

"تو..... وہ دونوں جھوٹ بول رہی تھیں کیا؟" فوزیہ لقمہ دینے سے باز نہیں رہ سکتی تھی۔ "حالانکہ امی نے ان سے کہا بھی کہ وہ ہمارے ساتھ گھر چلیں مگر انہوں اس نے صاف انکار کر دیا کہ وہ تو اب اپنے نئے گھر میں ہی جائیں گی۔"

"اگر یہ بات سچ تھی تو پھر امی کا غصہ غلط نہیں تھا۔" عدیل نے دل میں سوچا۔

"امی! بشریٰ نے مجھ سے یہ مطالبہ ضرور کیا ہے لیکن میں نے اسے ہاں یا نہ کچھ بھی نہیں کہا ابھی۔" عدیل نے سارے ہتھیار پھینک دیے۔ اب سچ کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

"تو معاملہ ففٹی ففٹی کر رکھا ہے تم نے، مگر وہ تمہیں زیادہ نخرہ دکھائے گی تو تم مان بھی جاؤ گے۔" وہ تیز لہجے میں بولیں اور ساتھ ہی اپنے سینے اور بائیں بازو کو ہولے ہولے اپنے دوسرے ہاتھ سے سہلانے لگیں۔

عدیل پریشان ہو گیا۔

"یہ اتنا آسان نہیں ہے۔" وہ یہی کہہ سکا۔

"تو پھر وہ کیا اب عمر بھر ماں کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھی رہے گی، ماں بھی وہ جو زمانے بھر کا فتنہ ہو۔"

"مجھے خود کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" وہ بے بسی سے بولا۔ فوزیہ اور نسیم بیگم نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"تو کیوں اتنا لاچار ہو رہا ہے۔ کیا ہر ضد اسی کی مانی جائے گی۔ ہر فرمائش اسی کی پوری ہو گی۔"

"تو کیا کروں پھر آپ ہی بتائیں۔" وہ ہمیشہ کی طرح آخری فیصلے کے لیے ماں کی رائے کا محتاج تھا۔

نسیم بیگم کو بیٹے کی لاچاری سے بڑی کمینی سی خوشی محسوس ہوئی اور دل کو اطمینان بھی کہ بیٹا ابھی پوری طرح سے ہاتھوں سے نکلا نہیں ہے۔

"ایک بار مرد بن، جا کر اسے طلاق کی دھمکی دے۔ نہ سر پر پاؤں رکھ کر دوڑی آئی تو میرا نام بدل دینا۔" وہ اسی ڈنک لہجے میں بولیں جو ان کا خاصہ تھا۔

"امی! یہ ٹھیک نہیں ہو گا۔" وہ کمزور لہجے میں بولا۔

"کیا مطلب کیا ٹھیک نہیں ہو گا۔" وہ ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے خفگی سے بولیں۔

"وہ پہلے ہی خود مجھ سے علیحدگی کا مطالبہ کر چکی ہے۔ اگر میں نے بھی ایسا کہہ دیا تو معاملہ اور بگڑ جائے گا۔" وہ بستگی سے بولا اور ان دونوں نے تاسف سے عدیل کو دیکھا۔

"اس نے تجھ سے علیحدگی مانگی اور تو اس کے پاؤں پڑ گیا؟" وہ اسے غیرت دلانے کو آخری حربے کے طور پر بولیں۔

"ایسی بات نہیں امی! میں نے اسے سمجھایا تھا۔ مثال کی وجہ سے وہ مان گئی مگر الگ گھر کے مطالبے پر۔"

"الگ گھر کس سے؟ ہم دونوں ماں بیٹی سے اتنی نفرت کرتی ہے وہ کہ ہماری شکلیں نہیں دیکھنا چاہتی تو ٹھیک ہے عدیل! تو ایک کام کر اپنا گھر بچا۔ اپنی بیوی کی بات مان اور اس کو الگ گھر لے دے اور ہم دونوں پہ لعنت بھیج۔ عاقبت کس نے دیکھی ہے۔ جو اس کو سنوارنے کے جتن کریں تو بس اپنی دنیا سدھار۔ اس کو راضی کر لے باقی سب خیر ہے۔ جا میرا بیٹا! نہ پریشان ہو ہم ماں بیٹی کسی نہ کسی طرح جی لیں گے۔ تجھے خوش رہنا چاہیے۔ تیرا گھر بسا رہے۔ ہمیں اور کچھ نہیں چاہیے۔" رندھی آواز میں کہہ کر وہ فوزیہ کا سہارا لے کر جانے لگیں۔

"امی پلیز رکیں۔ میری بات تو سنیں۔ میں نے ایسا کچھ نہیں سوچ رکھا امی!" عدیل ماں کی جذباتی باتوں پر روہانسا ہو کر رہ گیا۔ نسیم بیگم ان سنی کرتی فوزیہ کے ساتھ چلی گئیں۔

عدیل سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

ایک بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی ماں اور بیوی کو ایک ساتھ راضی رکھنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ تو پھر اسے کس کو ناراض کرنا ہوگا۔ یہ فیصلہ بہت مشکل تھا۔ پل صراط پر چلنے سے بھی زیادہ مشکل۔

☼ ☼ ☼

"اپنا اور بچوں کا بہت خیال رکھنا عاصمہ! میں ہر روز نہ سہی دوسرے دن فون کر کے تم لوگوں کی خیریت پوچھتا رہوں گا۔" ہاشم کی فلائٹ کا ٹائم ہونے کو تھا۔ وہ گھڑی دیکھ کر بریف کیس اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

عاصمہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ہاشم نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ دیا۔

بہت حوصلہ کرنے کی ضرورت ہے تمہیں۔ اللہ نے تم پر بہت بھاری بہت بڑی ذمہ داری ڈال دی ہے۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ ان شاء اللہ وہ تمہیں ضرور سرخرو کرے گا۔" وہ رندھی آواز میں اسے ساتھ لگا کر نرمی سے بولا۔ بچے ان دونوں کے گرد کھڑے تھے۔

"اوپر اچھے لوگ ہیں۔ ڈیلر نے گارنٹی دی ہے کہ کرائے کے معاملے میں تنگ نہیں کریں گے۔ تمہیں ان شاء اللہ زیادہ پریشان نہیں ہوگی۔ میں خود بھی جتنی توفیق ہو سکی بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ بھجواتا رہوں گا۔"

وہ جانتی تھی ہاشم کے لیے یہ آسان نہیں ہوگا پھر بھی وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

"واثق ماشاء اللہ بہت سمجھ دار ہے۔ بس دو تین سال کی دقت ہے پھر ان شاء اللہ یہ سب کچھ سنبھالنے کے قابل ہو جائے گا۔ کیوں واثق بیٹا؟"

"جی ماموں!" وہ کچھ شرما کر بولا۔ ہاشم نے ہنس کر اسے گلے لگا لیا۔

"کچھ چاہیے عاصمہ! جو میں وہاں جا کر تمہیں بھجوا سکوں؟" جاتے جاتے اسے خیال آیا تو رک کر پوچھنے لگا۔

"نہیں بھائی! کچھ بھی نہیں۔ اپنا گھر مل گیا۔ کچھ تھوڑا بہت آمدنی کا بھی بندوبست ہو گیا ہے۔ ہم تھوڑے میں آسانی سے گزارہ کر لیں گے۔ آپ ہماری بالکل بھی فکر نہیں کیجیے گا۔" وہ اب کے ذرا مضبوط لہجے میں بولی۔ آخر بھائی نے اس کا اتنا ساتھ دیا تھا۔ وہ جاتے جاتے اسے رو کر کیوں رخصت کرے کہ وہ اس کی طرف سے پریشان صورت لے کر جائے۔

"اللہ ضرور تمہارے لیے اور بھی آسانی کرے گا۔ میں بھی دو ایک سالوں میں واپسی کی کوشش کروں گا۔"

باتیں کرتے دونوں بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

☼ ☼ ☼

"مثال کی خاطر..... پلیز۔" اس نے آخری کوشش کے طور پر بشریٰ سے ملتجی لہجے میں کہا۔

"نہیں۔" وہ پہلے دن کی طرح پھر سخت ہو چکی تھی۔

"بشریٰ!" عدیل یہی کہہ سکا۔

"نہیں۔" وہ اسی قطعیت سے بولی۔

عدیل اسے دیکھ کر رہ گیا۔ خاموشی کا بہت لمبا وقفہ دونوں کے درمیان آگیا۔

"اگر مجھے ان دونوں کے ساتھ ہی رہنا ہے تو پھر اسی ایک کمرے میں کیوں نہیں۔" وہ تلخی سے بولی۔

"تم سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"بہتر ہے یہ کوشش تم کرو۔" وہ سرد لہجے میں کہہ کر جانے لگی۔ عدیل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"پلیز بیٹھ جاؤ۔" کوئی بھی اس کی بات ماننے کو سمجھنے کو تیار نہیں تھا۔

بشریٰ کچھ دیر کھڑی رہی پھر کچھ سوچ کر بیٹھ گئی۔

"پتا ہے بشریٰ! آج کل میرا کیا جی چاہ رہا ہے۔ میں خود کو ختم کر لوں۔ تمہیں بھی سکون مل جائے گا اور امی اور فوزیہ کی بھی مشکل آسان ہو جائے گی۔" وہ تھکے ہوئے لہجے میں کہہ کر خاموش ہو گیا۔ بشریٰ نے اسے تند نظروں سے دیکھا مگر کچھ بولی نہیں۔

"میں ان دونوں کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔" بہت دیر بعد جیسے خود سے بہت لڑ چکنے کے بعد وہ بول سکی تھی۔

"تم علیحدہ رہو گی ہر طرح سے۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ اوپر کا پورشن اس کی سیڑھیاں بھی اگر تم کہو گی تو میں باہر سے نکال دوں گا۔ دو کمرے ہیں اوپر' باتھ بھی ہے' شان دار سا کچن تمہاری پسند کا بنوا دوں گا۔ تمہارا امی اور فوزیہ سے کچھ واسطہ نہیں ہوگا۔" وہ ہر طرح سے اس کو منا رہا تھا۔

بشریٰ اسے شکایتی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"پلیز۔ چند سالوں کی بات ہے۔ فوزیہ کی شادی ہو جائے گی۔ امی بیمار رہنے لگی ہیں۔ میں کیسے ان دونوں کو چھوڑ کر چلا جاؤں۔ کبھی رات کو ان کی طبیعت خراب ہو گئی تو۔"

"اور یہ بات میری تم لکھ لو۔ ان کی طبیعت رات ہی کو خراب ہوا کرے گی۔ وہ ہمیں کبھی بھی اوپر سکون سے نہیں رہنے دیں گی۔" وہ پھر سے غصے میں آکر بولی۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ وعدہ۔" وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر محبت سے دبا کر بولا۔

بہت دنوں بعد عدیل کو سکون بھری چند سانسیں ملی تھیں۔ جیسے سر پر دھری کوئی چٹان کھسکی ہو۔

"اگر ایسا نہ ہوا تو؟" بشریٰ بے یقین سی تھی۔

"پھر میں تمہیں واقعی الگ گھر لے دوں گا۔ وعدہ ہے میرا۔ اب تو یقین کر لو۔"

"آنٹی مان جائیں گی؟" بشریٰ کو پتا تھا نسیم بیگم اس بات پہ بھی ضرور ہنگامہ کریں گی۔

"تم فکر نہیں کرو۔ میں امی کو منا لوں گا کم از کم اس کے لیے۔ یہ بات کافی ہوگی کہ میں گھر چھوڑ کر نہیں جا رہا۔ وہ مان جائیں گی۔ بس مجھے ایک ہفتہ دے دو کچن بنوانے کے لیے' پھر میں تمہیں لے جاؤں گا۔"

وہ بہت پرجوش تھا۔ بشریٰ ناخوش سی! عدیل محسوس کر رہا تھا مگر وہ اب اسے چھیڑ کر مزید کسی نئی بحث کا آغاز

نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"دیکھو نا مثال کتنی ڈسٹرب ہے۔ اسے شروع سے ہم دونوں کے ساتھ رہنے کی عادت ہے۔ کتنی کمزور ہو گئی ہے وہ۔"

"ہوں!" وہ بے زار سے لہجے میں اپنی ہتھیلی پھیلا کر دیکھنے لگی۔

"اچھا چلو مثال کو بلاؤ ہم تھوڑی آؤٹنگ کر کے آتے ہیں۔ تمہیں کچھ شاپنگ کراؤں گا۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہو کر بولا۔

"عدیل! میرا دل نہیں چاہ رہا۔" وہ کوفت سے بولی۔

عدیل اسے دیکھ کر رہ گیا۔ "اس عورت کو خوش رکھنا کتنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔" وہ دکھ سے سوچ کر رہ گیا۔

ابھی تو نسیم بیگم کو منانے کا ایک اور مرحلہ باقی تھا۔ وہ بھی اس تقسیم پر آسانی سے تو راضی نہیں ہو سکتی تھیں۔

"ماما! آئس کریم کھانے چلتے ہیں۔ پاپا سے کہیں نا۔" مثال اندر آ کر ماں سے لپٹ کر بولی۔

وہ آج کل یوں بھی بہت خوش تھی کہ اس کے ماں باپ بہت سارے دنوں کے بعد پھر سے اکٹھے بیٹھنے لگے تھے۔ باتیں کرتے تھے۔ لڑتے تھے مگر ساتھ ساتھ تھے۔

"آپ چلی جاؤ جانو! میرا موڈ نہیں ہے۔" بشریٰ مثال کو پیار کرتے بولی۔ مثال اسے واقعی پہلے سے بہت کمزور لگی۔

"نہیں ماما! آپ بھی چلیں ہمارے ساتھ۔" وہ ماں کا منہ چوم کر ضد سے بولی۔

"مثال!" بشریٰ نے منع کرنا چاہا۔

"مما چلیں گی تو موڈ بھی اچھا ہو جائے گا آپ کا اور پھر ہم ڈھیر ساری شاپنگ بھی کریں گے۔ پاپا کا والٹ خالی کر دیں گے تو مزا آئے گا۔" وہ شرارت سے بولی۔

دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر بے اختیار ہنس پڑے۔

"چلو آپ لوگ گاڑی میں بیٹھو جا کر میں آتی ہوں۔" وہ خود بھی اتنے دنوں سے گھر میں پڑے پڑے اکتا چکی تھی، مسکرا کر بولی۔

عدیل مثال کی انگلی پکڑ کر باہر جانے لگا۔

"خوب اچھا سا تیار ہونا۔ ہم ڈنر بھی باہر ہی کریں گے۔" وہ جاتے جاتے رک کر بولا۔

اس کی نظروں میں محبت کا خاص پیغام تھا کہ بشریٰ کچھ شرما کر نظریں جھکاتے ہوئے مسکرا اٹھی۔

بہت دنوں بعد بہت اچھا سا محسوس ہوا تھا اسے۔ عدیل لحہ بھر اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"پاپا! اب چلیں نا مما آ رہی ہیں تیار ہو کر۔" مثال اس کا ہاتھ ہلا کر بولی تو دونوں باہر نکل گئے۔

"امی ٹھیک کہتی تھیں۔ اس سارے جھگڑے میں سب سے زیادہ نقصان میرا ہی تو ہونا تھا اور وہ دونوں ماں بیٹی جو کچھ چاہتی ہیں ہمیں خود ان کو وہ سب کچھ پورا کر کے دکھا رہی تھی۔ اپنا گھر اجاڑ کر انہیں خوش کر دیتی... کبھی نہیں۔"

وہ نئی سوچوں کے ساتھ جلدی جلدی تیار ہونے لگی۔

وہ کوفت بھری نظروں سے گردن موڑ کر انہیں دیکھ رہی تھی۔

چابی لگانے والا بھی کوئی سست الوجود انسان تھا۔ گھنٹے بھر سے اس سے تالے کی چابی نہیں بن سکی تھی۔

چوکیدار پوری مستعدی سے اس کے سر پر کھڑا تھا۔ دو گھنٹے ہونے کو آئے تھے اسے اس طرح سیڑھیوں پہ بیٹھے ہوئے۔ اسے بھوک بھی لگ رہی تھی اور پیاس بھی۔ مگر یہ بھی سچ تھا کہ اسے اب یہ دونوں چیزیں بہت دیر تک برداشت کرنے کی عادت ہو گئی تھی۔

بالآخر چابی بن گئی اور لاؤنج کا دروازہ کھل گیا۔

اگر اس دوران گھر والے آجاتے تو... اس سے آگے کیا ہوتا' وہ بالکل بھی سوچنا نہیں چاہ رہی تھی۔

"دو سو روپے مانگ رہا ہے چابی بنانے کے۔" چوکیدار منتظر نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کے پاس آ کر بولا۔

"ہاں... اچھا میں لاتی ہوں اندر میرے کمرے میں ہے پرس۔" وہ حقیقتاً "بوکھلا گئی تھی۔ اپنا بوسیدہ بیگ تھمیتی اندر چلی گئی۔

گھر اسی طرح سجا سجایا شاندار تھا جیسا سولہ دن پہلے وہ چھوڑ کر گئی تھی۔

اس نے ایک گہرا سانس لے کر گھر کے اپنے پن کو محسوس کرنے کی کوشش کی مگر ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔

ادھ کھلے دروازے سے چوکیدار اور چابی والا اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ آہستگی سے ماسٹر بیڈ روم میں داخل ہوئی۔

"شکر ہے یہ کمرا لاکڈ نہیں ہے۔" اس نے صاف ستھرے سجے سجائے کمرے کو طمانیت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے سوچا۔

اس نے کبھی چوری نہیں کی تھی لیکن آج اسے یہ کام بھی کرنا تھا۔ اسے معلوم تھا اگر اس گھر میں رقم اگر کہیں سے مل سکتی ہے تو وہ اس کمرے سے۔

اس نے ایک ایک کر کے ڈریسنگ ٹیبل کی درازیں بائیڈ ریکس اور پھر الماری کھول کر دیکھ لیں۔ کہیں بھی کچھ نہیں تھا۔

وہ مایوس ہونے کے ساتھ ساتھ سخت پریشان ہو چکی تھی۔

"اگر پیسے نہ مل سکے تو... چوکیدار شاید مجھے رہنے نہ دے یہاں اور اگر اس نے اپنے مالک کو فون کر کے صورت حال بتا دی تو... ظاہر ہے وہ تنخواہ اپنے مالک سے لیتا ہے۔ مجھ سے تو نہیں۔"

الماری میں لٹکا بلیک ہینڈ بیگ امید کی آخری کرن تھا اس کے لیے... وہ تیزی سے بیگ کی اندر باہر سے تلاشی لینے لگی۔

اندرونی جیب میں ایک ہزار کا اور ایک پانچ سو کا نوٹ موجود تھا۔ اس کی جان میں جان آ گئی۔ تیزی سے نوٹ لے جاتے ہوئے وہ رک گئی۔

پھر مڑ کر الماری میں بیگ کو اس جگہ پر لٹکایا چیزیں ترتیب سے رکھیں درازیں ڈھنگ سے بند کیں اور دروازے پر رک کر کمرے کو آخری نظر سے دیکھنے لگی۔ کہیں کچھ گڑبڑ تو نہیں۔ کمرا پہلے کی طرح لگ رہا ہے نا۔

اس کی بھٹکتی نظریں بے اختیار میز کے سائیڈ ریک پر پڑی مسکراتی تصویر پہ رک گئیں۔

اس کے قدم کسی نے جکڑ سے لیے۔

وہ کچھ دیر یونہی کھڑی رہی پھر آگے بڑھ کر تصویر اٹھا کر دیکھنے لگی۔

"سوری۔" تصویر واپس رکھتے ہوئے وہ آہستگی سے بولی اور آنکھوں کے کونے صاف کرتی تیزی سے باہر چلی گئی۔

"یہ دو سو چابی والے کو دے کر باقی کے پیسے آپ رکھ لیں۔" اس نے چوکیدار کو پانچ سو کا نوٹ تھما کر کہا۔

"میں جی!" وہ کچھ حیران ہوا۔

بخشش... اس کی توقع سے یا تو بہت زیادہ تھی یا بہت کم۔

"پلیز اگر فون آئے تو.... اس ڈپلی کیٹ چابی کا نہ بتائیے گا۔ وہ واپس آئیں گے تو میں خود بات کرلوں گی۔" اس نے تین سو روپے کی بخشش کا مطلب اسے سمجھایا۔

"جی بہتر!" وہ سرہلا کر چابی والے کے پاس چلا گیا۔

ایک ہفتے سے پہلے تو وہ لوگ واپس نہیں آئیں گے لیکن یہ کوئی حتمی بات بھی نہیں۔ وہ اس سے پہلے بھی آ سکتے ہیں۔ مجھے رہائش کے لیے اوپر والا کمرا ابھی استعمال میں رکھنا چاہیے جس کا بیرونی دروازہ کہیں کھلا رہ گیا تھا اور لاؤنج کی یہ ڈپلی کیٹ چابی میرے میں بھی کام آسکتی ہے کیونکہ یہ تو ان لوگوں کا معمول ہے۔" اس نے چابی کو مضبوطی سے مٹھی میں بند کرلیا۔

"لیکن ایسا کب تک ہوتا رہے گا۔ اب مجھے کچھ نہ کچھ تو اپنے بارے میں سوچنا چاہیے۔ زندگی صرف تیس دنوں کا نام تو نہیں۔ پندرہ دن ادھر تو پندرہ دن ادھر.... اس سے آگے بھی بہت کچھ ہے اور اچھا ہے یہ لوگ گھر پہ نہیں۔ مجھے اس خاموشی اور تنہائی میں اپنے لیے اب کوئی فیصلہ کرنا ہی ہوگا' اس سے پہلے کہ یہ سب لوگ میرے بارے میں کوئی فیصلہ کریں۔ اگرچہ ایسی فرصت شاید ہی کسی کو نصیب ہو' پھر بھی مجھے خود سے کچھ سوچنا ہوگا بلکہ کرنا ہوگا۔" وہ اوپری کمرے تک آتے آتے بہت کچھ سوچ چکی تھی۔

✡ ✡ ✡

"ارے آپ سچ کہہ رہی ہیں خالہ.... ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔" عاصمہ تو سن کر ہی بے یقین سی ہوگئی۔

"بھئی وہ کہتے ہیں نا کبھی کھوٹا سکہ بھی کام آجاتا ہے سمجھو! آج ہم جیسا کھوٹا سکہ بھی چل پڑا۔" حمیدہ خالہ خاصی خوش مزاج ہوتی جارہی تھیں۔

"یوں نہ کہیں خالہ! آپ خدانہ کرے جو کھوٹا سکہ ہوں۔ کم از کم میرے لیے تو مبارک ہیں اور خیال رکھنے والی ہیں ورنہ جیسے اتار چڑھاؤ ان چند مہینوں میں آئے اور جو کچھ میرے ساتھ بیتا تو آپ گواہ ہیں میرا ساتھ کس نے دیا سوائے آپ کے اور کون تھا۔" عاصمہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ پچھلے گزرے دنوں کا خوفناک نقشہ اس کی نظروں کے سامنے پھر سا گیا تھا۔

"ساتھ دینے والی تو اللہ کی ذات ہے۔ تم ایسی باتیں نہیں سوچو مجھے تو بس یہی فکر تھی کہ تم خدانہ کرے کسی بڑی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ۔" وہ سرہلا کر بولیں۔

"کیا مطلب؟" وہ کچھ چونکی۔

"کبھی ایسے ہوتا ہے۔" آدمی کسی بڑی افتاد سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے کسی ان دیکھی دلدل میں جا گرتا ہے۔ بس یہی ڈر تھا مجھے تمہاری حالت سے۔" وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں بہت کچھ جتا گئیں۔

عاصمہ سے کچھ دیر بولا ہی نہیں گیا۔

"چائے تو لیں آپ ٹھنڈی ہورہی ہے اور یہ مٹھائی تو لی نہیں آپ نے ابھی تک...." بہت دیر کی خاموشی کے بعد عاصمہ کو خیال آیا تو کہنے لگی۔

"تو پھر تم کل چلوگی میرے ساتھ؟" خالہ حمیدہ چائے کا بڑا سا گھونٹ بھر کر بولیں۔ "دیکھ لو۔ نہ کوئی انٹرویو کا چکر نہ کسی اور امتحان کا ڈر' بس سیدھا جاؤ ملو اور نوکری کا پکا کاغذ لے لو۔ ساری بات تو میں کر آئی ہوں۔"

"مگر خالہ پھر بھی.... میری تعلیم صرف ایف اے ہی تو ہے اور مجھے کبھی کسی اسکول میں بچوں کو پڑھانے کا تجربہ نہیں رہا۔" اندیشے تو اسے "فورا" ہی گھیرنے لگتے تھے کوئی بھی نیا کام کرنے سے پہلے۔ حسب عادت پریشان ہو کر بولی۔

"کچھ نہیں کرنا تم کو۔ اپنے بچوں کو بھی تو خیر سے پڑھاتی ہو نا وہاں بھی چھوٹے بچوں کو پڑھانا ہے چار سال سے اسکول کھول رکھا ہے میری بھتیجی کی نند نے۔ اب تو بہت چلنے لگا ہے۔ اتنی بڑی بلڈنگ لے لی ہے۔ اب نئی استانیاں رکھ رہی تھی تو مجھے تمہارا خیال آگیا۔ میں نے نویدہ سے بات کی اس نے اپنی نند سے پوچھا تھا۔ اسے حالات بتائے تو اس نے "فورا" سے کہہ دیا کہ بس آجائیں۔ سیٹ کرنا ہمارا کام ہے تو پھر ڈر کیسا۔" وہ پوری طرح اسے تسلی دے کر بولیں۔

عاصمہ سرہلا کر رہ گئی۔

"لیکن خالہ! یہ چھوٹی وردہ.... اس کو کس کے حوالے کرکے جاؤں گی۔" اسے پھر سے نئی پریشانی نے گھیرا اور یہ بات تو حقیقت بھی تھی۔

"اللہ مالک ہے۔ تم ایک بار جاکر مل تو لو۔ بات بن گئی تو اس کا بھی کوئی حل سوچ لیں گے۔ اسکول گھر سے زیادہ دور نہیں۔ صبح کے دو تین گھنٹے میں رکھ لوں گی۔ تم تفریح کے ٹائم آکر بچی کو کچھ کھلا پلا جایا کرنا تو کسی نہ کسی طرح رہ ہی جائے گی۔" وہ اسے ڈھارس دینے کو بولیں۔

عاصمہ نے عجیب سے انداز میں سرہلایا۔

"اچھا کل میں سویرے ہی آوں گی۔ تم بس تیار رہنا میں تمہیں لے چلوں گی پھر جو بات بنے گی دیکھ لیں گے۔" وہ جانے کو جوتیاں سیدھی کرنے لگیں۔

"خالہ! کچھ دیر تو اور رکیں اتنے دنوں بعد آئی ہیں۔" وہ ابھی نئے ہمسایوں سے اتنی گھل مل نہیں سکی تھی خالہ حمیدہ سے برسوں کی جان پہچان تھی۔

"پھر لگاؤں گی چکر تو دیر تک بیٹھوں گی۔ تم بھی ذرا یہ آمدنی اور خرچ کی فکر سے آزاد ہوجاؤ تو پھر بیٹھیں گے کسی دن دیر تک۔ یوں بھی چھوٹی میکے گئی ہوئی ہے۔ بڑی بیٹھی مجھے کوس رہی ہوگی۔ گھر سے تو میں سبزی لینے نکلی تھی۔ اس نے ہنڈیا بھی چڑھانی ہوگی۔" وہ چادر لپیٹ کر جانے کو تیار ہوگئیں۔

"لو بھول گئی میں۔ ذرا جانے سے پہلے ایک چکر اوپر تمہارے کرائے داروں کا تو لگا آؤں کیسے لوگ ہیں' تھوڑا آگا پیچھا تو معلوم ہونا چاہیے۔" وہ جاتے جاتے سیڑھیوں کی طرف جانے لگیں۔

"خالہ! ادھر سے راستہ بند ہے' مطلب دروازہ لگا کر بھائی نے تالا لگوا دیا ہے۔ باہر کی طرف سے سیڑھی لگوا دی ہے۔ وہاں سے چلی جائیں آپ۔" عاصمہ انہیں روک کر بولی۔ حمیدہ لمحہ بھر کے ٹھٹک کر رہ گئیں۔ پھر سرہلا کر جیسے ہاشم کے اس قدام کو سراہنے لگیں۔

"بہت سمجھ دار ہے خیر سے تمہارا بھائی' اللہ اسے لمبی زندگی دے۔ کیسی عقل مندی کا کام کرکے گیا۔ چلو میں باہر سے ہو کر چلی جاؤں گی۔ تم دروازہ بھیڑ لو۔" وہ کہہ کر چلی گئیں۔ عاصمہ دروازہ بند کرنے لگی۔

✡ ✡ ✡

اتنا شاندار کچن' ایسا ہی سجا سجایا گھر.... بشریٰ کے قدم تو آخری سیڑھی پر ہی رک گئے۔ صرف ایک ہفتے میں اس طرح اوپر کے کھنڈر پورشن کو سیٹ کردینا.... اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ سارے پورشن میں نیا رنگ و

روغن سے چمکتے روشن درودیوار، نئے پینٹ شدہ دروازے کھڑکیاں۔ اس کے سامان سے سجا اس کا شاندار بیڈروم اور ڈرائنگ روم، سامان سے بھرا کچن..... وہ تو مبہوت بس دیکھے جارہی تھی۔

مثال کسی تتلی کی مانند گھر کے اس نئے سجے بنے حصے میں اڑتی پھر رہی تھی۔

"کیسا لگا تمہیں یہ سب کچھ؟" عدیل نے شاید اس سے پوچھا تھا۔ وہ دیکھنے میں اتنی مگن تھی کہ جواب میں کچھ کہہ ہی نہ سکی۔

"یہ سب ایک ہفتے میں تو نہیں ہو سکتا ناعدیل؟" وہ مڑ کر رشک بھری نظروں سے اسے دیکھ کر بولی۔

"محبت یہ سب کچھ ایک گھنٹے میں بھی کرواسکتی ہے۔" وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پیار بھرے لہجے میں بولا۔

بشریٰ تو جیسے اس پر مرمٹی۔

ابھی کچھ دیر پہلے جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو نسیم بیگم اور فوزیہ نے کیسی کٹیلی کھاجانے والی نظروں سے اس کا استقبال کیا تھا۔ اس کے سلام کا جواب معلوم نہیں نسیم بیگم نے دیا تھا یا نہیں مگر ان کے ہونٹ ہلے تھے شاید کوئی کوسنا دیا ہو۔ بشریٰ نے دل میں یہی سوچا۔

کیسا سرد رویہ تھا دونوں کا۔

بشریٰ کچھ پریشان ہوگئی کہ ہو سکتا ہے عدیل نے اسے صرف اوپر والے پورشن کا جھانسا دیا ہو۔ ایسا کچھ بھی نہ ہو..... وہ کن انکھیوں سے عدیل کو دیکھنے لگی۔

وہ خود بھی ماں بہن کے رویے کی سرد مہری کو محسوس کر گیا تھا۔

"میرا خیال ہے۔ میں سامان اوپر چھوڑ آتا ہوں بلکہ آجاؤ بشریٰ! تم بھی دیکھ لو۔ کچھ رہ تو نہیں گیا۔ مثال..... بابا کی جانی۔ آؤ ناں!" وہ دور کھڑی مثال کو پاس بلا کر اسے پیار کرتے ہوئے ساتھ لگا کر باتیں کرتا اوپر کی طرف چل پڑا تو بشریٰ کی جیسے رکی ہوئی سانسیں بحال ہوگئیں۔

وہ نسیم بیگم اور فوزیہ کی طرف دیکھے بغیر بڑے فخریہ انداز میں چلتی عدیل کے ساتھ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

"امی! دیکھ رہی ہیں اس کا غرور، نخرہ اور دماغ..... بھائی نے ہی بیڑہ غرق کیا ہے اس کا سارا۔" بشریٰ نے خود اوپر جاتے ہوئے فوزیہ کی جلن بھری بڑبڑاہٹ سنی تھی۔

اس کے دل کو عجیب سا سکون ملا تھا۔ اسے لگا وہ سیڑھیوں پر قدم نہیں رکھ رہی ان ماں بیٹی کے دلوں پر پیر رکھ کر اوپر چڑھ رہی ہو۔ انہوں نے تو جلنا ہی تھا انہیں کب امید تھی کہ بشریٰ واپس آجائے گی۔

وہ مسکراتی ہوئی اوپر آگئی۔

"تھینکس عدیل! تھینک یو سو مچ۔" وہ خوشی سے مغلوب لہجے میں اس کے ہاتھ گرم جوشی سے اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔ وہ اس کے ہاتھ دباتے ہوئے اسے پاس کھینچنے لگا۔

"خالی تھینک یو؟" اس کے ریشمی بالوں کو سونگھ کر اس نے سرگوشی کی۔

"اونہوں، مثال دیکھ لے گی نا۔" وہ اسے مصنوعی خفگی سے پرے دھکیل کر بولی۔

"وہ اپنا روم دیکھنے گئی ہے اور ہاں ابھی اس کے روم کی بہت سی چیزیں رہتی ہیں۔ میں نے سوچا وہ ہم مثال کی مرضی سے خرید لیں گے کیا خیال ہے۔"

"بالکل..... وہ خوش ہو جائے گی۔" بشریٰ چہک کر بولی۔

"اتنے دن ہماری بچی ہم دونوں کی وجہ سے اتنا ناخوش رہی۔ اب تو ڈھیر ساری خوشیوں پر اس کا حق ہے۔" عدیل بیٹی کی محبت میں بولا۔

"اور ہمارا بھی۔" وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر محبت بھرے لہجے میں بولی۔

"اب تو خوش ہو نا بشریٰ؟" وہ بشریٰ کے رد عمل سے بہت مطمئن تھا جیسے اتنے دنوں سے سر پر پڑا کوئی پہاڑ سرک گیا ہو۔

"بہت زیادہ..... عدیل! آپ نے آنٹی کو کیسے منایا اس علیحدگی کے لیے؟" اسے خیال آیا تو پوچھنے لگی۔

"یہ مت پوچھو۔ ایک بہت مشکل جنگ لڑی تھی میں نے پہلے تم سے پھر امی اور فوزیہ سے۔ تم تو جانتی ہو انہیں کیسے جذباتی کرنا آتا ہے، پھر آج کل جس تواتر سے وہ فوزیہ کے لیے رشتے دیکھ رہی ہیں ان کا یہ کہنا تھا کہ لڑکے والے یہ اعتراض ضرور اٹھائیں گے کہ ایک ہی بھابی اور وہ بھی علیحدہ رہتی ہے۔ بشریٰ تم پلیز! جب بھی ایسی سچویشن ہو تم یہی شو کرنا کہ ہم اکٹھے ہی رہتے ہیں پلیز! اتنا تو کر سکتی ہو ناں میرے لیے۔ میری کچھ بچت ہو جائے گی امی اور فوزیہ سے۔"

اسے بے اختیار اپنے پیارے شوہر پر رحم سا آیا۔

"سب کچھ بیلنس رکھنے کے چکر میں آدمی کس طرح سے پھنس جاتا ہے۔" وہ دل میں سوچ کر رہ گئی۔

"عدیل! میں نے تو پہلے بھی کبھی ان کے ساتھ برا نہیں کیا۔ کبھی ان سے یا فوزیہ سے بدتمیزی نہیں کی۔ جب تک ان دونوں کی طرف سے انتہا نہیں ہوئی تو پلیز! آپ بالکل ٹینشن نہیں لیں۔ ایسا اگر کوئی موقع آئے گا تو میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی۔"

وہ اس کے لیے اتنا کچھ کر سکتا تھا تو کیا وہ اس کے بدلے میں یہ معمولی سی مروت بھی نہیں دکھا سکتی تھی۔

"تھینکس تم واقعی بہت اچھی ہو بشریٰ!" وہ سچ مچ مغلوب سا ہو گیا۔

"جی! میرے کمرے میں تو صرف ایک بیڈ پڑا ہے وہ بھی پرانے والا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ میں اپنے ٹوائز کہاں رکھوں گی۔ نہ کوئی ریک ہے نہ کپ بورڈ کچھ بھی تو نہیں۔" مثال روہانسی ہو کر ان کے پاس آکر بولی۔

"میری جان! بس آج کی رات صبر کر لو۔ کل میں آفس سے آؤں گا ویک اینڈ بھی ہو گا پھر ہم اپنی مثال کے لیے اس کی پسند سے ڈھیر ساری شاپنگ کریں گے۔" عدیل اسے اپنے ساتھ لپٹا کر پیار کرتے ہوئے بولا۔

مثال چند منٹوں میں کھل سی گئی تھی۔

"اللہ میری بیٹی کو کبھی کوئی دکھ نہ دکھائے۔ یہ ہمیشہ خوش رہے اسی طرح ہنستی مسکراتی" بشریٰ نے یک ٹک مثال کو دیکھتے ہوئے بے اختیار اس کے لیے دل سے دعا کی۔

"پرامس کریں کل مجھے سب کچھ مل جائے گا وہ بھی میری پسند کا۔" وہ باپ کے آگے ننھا سا ہاتھ پھیلا کر بولی۔

"پرامس میری جان! پہلے کبھی ہم نے اپنی ڈارلنگ سے کوئی جھوٹا وعدہ کیا ہے۔" وہ اس کے ہاتھ کو پیار سے تھامتے ہوئے بولا۔

"اوکے اتنا ویٹ تو میں کر ہی لوں گی۔" وہ سنجی بن کر بولی تو دونوں ہنس پڑے۔

☼ ☼ ☼

وہ بے یقین نظروں سے ہاتھوں میں پکڑے اس بے داغ سفید لفافے کو دیکھتا جارہا تھا۔ وہ اتنا بے یقین تھا کہ شدید خواہش کے باوجود اس لفافے کو کھول کر بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔

"اگر یہ اندر سے خالی ہوا تو؟" یہ اندیشہ اسے بے حرکت کیے ہوئے تھا۔

"ایسا ہمیشہ تو نہیں ہو سکتا۔" کسی نے نرمی سے اسے تسلی بھی دی تھی۔

لیکن وہ ابھی بھی وہ لفافہ نہیں کھول رہا تھا۔ اس کا سیل فون بجنے لگا۔

اس نے گہرے سکوت سے نکل کر سیل کی اسکرین پر چمکتا نمبر دیکھا۔

"کوئی اور بھی تو ہے، جو اس لفافے کا بھید جاننے کا مجھ سے بھی زیادہ مشتاق ہے۔ مجھے اب مزید انتظار نہیں کروانا چاہیے کہ کبھی کبھی حد سے بڑھا انتظار جان لیوا بھی ہو جایا کرتا ہے۔"

اس نے کال ریسیو نہیں کی۔ سیل واپس جیب میں رکھ دیا۔ اور آہستگی سے سحر زدہ انداز میں لفافے کی مہر ہٹائی۔ اندر رکھا بڑا کاغذ یوں باہر نکالا جیسے وہ کوئی متبرک مقدس تحریر ہو۔

اس کے لیے تو وہ واقعی بہت مقدس، بہت متبرک تحریر تھی کہ جیسے وہ اس کی تمام تر جدوجہد کا حاصل ہو۔

"حاصل" وہ جیسے خود پر ہنسا۔

اور پھر کھلے کاغذ کی تحریر پر نظریں دوڑاتا بے اختیار ہنستا چلا گیا۔

وہ اردگرد موجود لوگوں کی موجودگی سے بے خبر کسی دیوانے کی طرح ہنس رہا تھا۔ اس کا سیل فون پھر سے بجنے لگا تھا۔

اس نے پھر زور سے ہونٹ بھینچ لیے۔ کچھ جھینپتی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور دل میں اپنی دیوانگی کو کوسا۔ احتیاط سے لفافے میں وہ متبرک کاغذ ڈالا اور سیل پر آئے نمبر کو دیکھتے ہوئے کچھ سوچ کر اس نے کال ریسیو کرلی۔

"میں بس ابھی پہنچ رہا ہوں آدھے گھنٹے میں تو بتاتا ہوں۔" سامنے سے آتی مطلوبہ بس کو دیکھ کر اس نے جلدی سے کال نپٹائی اور اس کی طرف تیزی سے چل پڑا۔

٭ ٭ ٭

"سچ مما؟" واثق اور اریبہ خوش ہو کر ایک ساتھ بولے تھے۔

"بالکل سچ میری جان!" عاصمہ کے لہجے میں خوشی کی کھنک تھی۔

"دیکھو، جب آدمی دل میں مصیبتوں سے لڑنے کا پکا ارادہ کرلیتا ہے نا تو پھر اللہ میاں بھی اس کے لیے راستے کھولتے جاتے ہیں اور اس کی مشکلیں آسان ہوتی جاتی ہیں۔" اس نے کھانا نکالتے ہوئے دونوں کو آسان الفاظ میں سمجھایا۔ بچوں نے فخریہ انداز میں ماں کو دیکھا۔

"یہی ماں تھی جو چند مہینے پہلے تک اس بری طرح سے ٹوٹ کر بکھری تھی جیسے کوئی کانچ کی گڑیا ہو اور لگتا تھا اب کبھی جڑے گی نہیں لیکن وہ نہ صرف جڑ چکی تھی بلکہ ان چاروں کو ایک شان دار مستقبل دینے کے لیے دل میں بہت سے ارادے بھی باندھ چکی تھی اور اپنی ہمت کو بھی جواں کر چکی تھی کہ اب اسے ہر مشکل کو اپنی ہمت اور ارادے سے زیر کرنا تھا۔

وہ دستر خوان پر کھانا لگاتے ہوئے خود کو بہت مطمئن محسوس کر رہی تھی۔ آج جب میڈم نے اس کو بہت سرسری سے انٹرویو کے بعد سلیکشن کا بتایا تو وہ خوشی کے مارے رو ہی پڑی تھی۔

اس سے کتنی دیر تک کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

حمیدہ خالہ نے اسے ٹہوکا دے کر خود شکریہ ادا کرنا شروع کیا تو وہ بھی جیسے ہوش میں آگئی۔

پھر ورده کا مسئلہ کیسے چٹکیوں میں حل ہوا۔

"ہمارے اسکول میں ایک اور ٹیچر بھی ہیں ان کا بھی چھوٹا بچہ ہے جسے ہماری آیا نرسری میں ایک طرف بے بی کاٹ میں لٹا کر اس کا خیال رکھ لیتی ہے۔ آپ بھی بچی کو لے آیا کیجیے گا وہ آپ کی نظروں کے سامنے بھی رہے گی۔

اجرت بہت معمولی ہوگی۔ یقیناً" آپ کو اپنے مسئلے کے حل کے مقابلے میں کم ہی لگے گی۔" میڈم فاطمہ اسے واقعی کوئی رحمت کا فرشتہ ہی لگی تھیں۔

ورنہ وہ تو یہ سوچ سوچ کر ہول رہی تھی کہ دور رہ کر کہاں چھوڑے گی۔

حمیدہ خالہ کی پیشکش اپنی جگہ مگر ورده ان سے مانوس نہیں تھی پھر حمیدہ خالہ کی دونوں بہوئیں اس سخاوت پر یقیناً" ناک منہ چڑھاتیں اور یہ سلسلہ زیادہ دن تک نہیں چل سکتا تھا۔

آیا سے بھی وہ آتے ہوئے مل آئی تھی۔ بہت اچھی کم گو اور چہرے سے نہایت سلجھی ہوئی خاتون تھی۔ عاصمہ کے دل کو بہت اطمینان سا ہوا۔

"مما! کتنی سیلری دیں گے اسکول والے آپ کو؟" واثق نے اس کو اپنے خیالوں سے چونکایا تھا۔

"سیلری تو ابھی زیادہ نہیں پھر ورده کی دیکھ بھال کے لیے آیا کو بھی دینی ہوگی کچھ رقم لیکن واثق! کچھ نہ ہونے سے یقیناً" بہتر ہے۔ کچھ کرایہ آجایا کرے گا پھر شام میں، میں ٹیوشن کرلوں گی۔ میرے خیال میں ہمارے لیے یہ کافی ہوگا۔" اس نے مسکرا کر بیٹے کو تسلی دی۔

"ویٹس نائس..... تھری کلاس تک کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے میں میں بھی آپ کی ہیلپ کردوں گا۔" وہ مدبرانہ انداز میں بولا۔

"اوکے میری جان! یوں بھی تمہاری ہیلپ کے بغیر تو میں کچھ بھی نہیں کرسکتی۔" عاصمہ پیار سے اس کے بال بکھرا کر بولی۔

"اوہ ممی! آپ کو ایک چیز دکھانی تھی مجھے۔ میں آتا ہوں ابھی۔" وہ اٹھ کر تیزی سے اندر کمرے میں چلا گیا۔

عاصمہ مسکرانے لگی۔ اس نے ایک گہرا سانس لے کر اپنی جنت کو دیکھا۔

کچھ دن پہلے تک وہ کس درجہ مایوس ہوچکی تھی کہ اسے لگتا تھا زندگی کے دامن میں اب اس کے لیے کوئی خوشی نہیں بچی۔ وہ خدا کی رحمت سے مایوس ہوگئی تھی اور مایوسی کفر تک لے جاتی ہے تب ہی تو وہ بار بار حرام موت کے بارے میں سوچتی تھی اور اس پر عمل بھی کر بیٹھی تھی۔

آج اگر وہ بھی نہ ہوتی تو اس کے بچے اللہ جانے کہاں دھکے کھا رہے ہوتے۔ اس نے لرز کر سر جھٹکا اور بچوں کو کھانے کے لیے آوازیں دینے لگی۔

واثق اسے اپنی شان دار سی ڈرائنگ دکھا رہا تھا جس پر پرنسپل صاحب نے آج خود اپنے سائن کے ساتھ اسے تعریفی سرٹیفکیٹ دیا تھا اور سالانہ مقابلوں کے لیے اس کا نام بھی فائنل ہوگیا تھا۔

"ماشاء اللہ میری جان! کتنی خوب صورت ڈرائنگ تمہاری..... بالکل اپنے پاپا کی طرح، پتا ہے نا پاپا کی ڈرائنگ کتنی اچھی تھی۔" عاصمہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"ممی! میں نے بابا سے ہی تو سیکھی تھی اس طرح چیزوں کو ڈرا کرنا۔" وہ پیار سے ماں کے آنسو صاف کرکے بولا تو وہ مسکرانے لگی۔

"مما..... ماموں کا فون ہے۔ آجائیں جلدی سے۔" اریبہ سیل ہاتھ میں لیے دوڑتی ہوئی ماں کے پاس آئی تو عاصمہ جلدی سے فون سننے لگی۔

٭ ٭ ٭

انہوں نے مثال کے لیے بہت ساری شاپنگ کی تھی۔

خود بشریٰ نے اپنے نئے گھر کے لیے مزید بہت سی چیزیں خرید لی تھیں۔

عدیل نے بشریٰ کے لیے ایک خوب صورت سی ساڑھی بھی لی۔ اس کی محبت بشریٰ کے لیے جیسے اور بھی بڑھ گئی۔ بشریٰ اس کے والہانہ جذبات پر جیسے دل ہی دل میں مغرور ہوئی جارہی تھی۔ وہ آج کل صرف بشریٰ اور مثال ہی پر توجہ دے رہا تھا۔

صبح آفس جاتے ہوئے ماں اور فوزیہ سے کھڑے کھڑے دو چار باتیں کرتا ماں سے دواؤں کا نسخہ لیتا۔ ان کی کچھ اور ضرورت کی چیزیں پوچھ کر خدا حافظ کہہ کر چلا جاتا۔

بشریٰ اوپر کھڑکی سے دیکھتی رہتی۔

عدیل بھی یہ بات جانتا تھا۔ اس لیے وہ کم سے کم ٹائم ماں اور بہن کو دیتا۔ یوں بھی دونوں اس سے ابھی تک ناراض تھیں۔ وہ ٹھیک طرح سے بات نہیں کرتی تھیں۔ عدیل نے بھی منانے کی کوشش نہیں کی ورنہ لمبا چوڑا جھگڑا شروع ہو جاتا۔ انہیں نظر انداز کرنے میں ہی عافیت تھی۔ اس کا ٹوٹتا ہوا گھر جڑ گیا تھا۔ اسے اب کسی کی پروا نہیں تھی۔

بشریٰ بھی نیچے نہیں اترتی تھی۔

عدیل کی محبت نے اسے بے خوف کر دیا تھا ورنہ پہلے تو وہ ہر کام نسیم بیگم سے پوچھ کر کرتی تھی۔ ہاں ایک مصیبت ابھی بھی باقی تھی کہ آئے دن نسیم بیگم کسی نہ کسی رشتے دیکھنے والے کو بلائے رکھتیں جس کے لیے بشریٰ کو مارے باندھے نیچے اتر کر جانا بھی پڑتا اور نمائشی انداز میں ساس اور نند سے بات چیت بھی کرنا پڑتی۔

''پتا نہیں اس مصیبت کا کب نصیب کھلے گا تو میری جان چھوٹے گی۔'' وہ جل کر سوچتی۔ لیکن ابھی تو فوزیہ کے نصیب کے سلسلے میں نہ کسی کی دعا اثر کر رہی تھی نہ بددعا۔ وہ ہنوز ماں کے سینے پر پتھر بن کر بدر جہاں تھی۔

نسیم بیگم اسے دیکھ دیکھ کر آہیں بھرتیں۔ عدیل کی بے رخی کا غم بھی تازہ تھا۔ پھر بہو کے بے خوف' بے لحاظ انداز انہیں اور بھی آگ لگاتے مگر وہ خاموش تھیں۔

ان کی خاموشی سے بشریٰ کچھ پریشان تو تھی شروع میں مگر اب وہ سمجھ چکی تھی کہ نسیم بیگم نے سمجھوتا کر لیا ہے مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ سمجھوتا کرنا نسیم بیگم کی فطرت میں نہیں ہے انہیں صرف مناسب وقت کا انتظار تھا۔

فوزیہ خود ہر وقت سر جھاڑ منہ پہاڑ بنی پھرتی رہتی۔ اسے اب کسی کی پروا نہیں تھی حتیٰ کہ خود اپنی بھی نہیں رہی تھی۔ خود کو بنانا سنوارنا سب فراموش کر چکی تھی۔

دو چار دفعہ نسیم بیگم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر فوزیہ کے منہ توڑ جواب پر انہوں نے اسے کچھ کہنا موقوف کر دیا۔

دونوں ماں بیٹی یوں چپ تھیں جیسے بولنا ہی بھول چکی ہوں۔ نیچے والے پورشن میں ہر وقت سناٹا رہتا حتیٰ کہ کسی برتن کے گرنے یا بجنے کی آواز بھی نہیں آتی تھی۔

کھانا ایک دن پکتا۔ دونوں ماں بیٹی دو تین دن چلا لیتیں یا بازار سے منگوا لیتیں۔ آج کل تو ٹی وی بھی زیادہ تر بند ہی رہتا۔

اوپر والے پورشن سے آتی ہنسی' قہقہوں اور زندگی سے بھرپور شور کی آوازیں دونوں کی سماعتیں ڈستی رہتیں۔

فوزیہ آنسو بھری شکایتی نظروں سے ماں کو دیکھتی' ماں نظریں چرا کر کہیں اور ہی دیکھنے لگتی۔

نسیم بیگم فیصلہ کر چکی تھیں۔ صرف ٹھوک بجا کر اس کو صحیح وقت پر کرنے کا فیصلہ کرنا ابھی باقی تھا۔ فوزیہ کے مقابلے میں نسیم بیگم کے چہرے پر آج کل خاصا اطمینان اور گہرا سکون تھا۔ آتے جاتے کبھی بشریٰ اس سکون

بھرے چہرے کو دیکھتی تو دنگ رہ جاتی' مگر کچھ سمجھ نہ پاتی پھر سر جھٹک کر وہاں سے گزر جاتی۔

☼ ☼ ☼

آج دو تاریخ تھی۔

اسے گئے ہوئے تیسرا دن۔ ابھی اس کی واپسی میں بارہ دن تھے۔ یہ بارہ دن کیسے گزریں گے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا لیکن اس بار اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ مزید اس یک طرفہ آگ سے اپنا آپ نہیں جلائے گا۔

''اس بار میں اس سے ضرور اظہار محبت کروں گا۔ یہ نہ ہو کہ اگلی بار وہ جائے تو پھر کبھی واپس نہیں آئے جبکہ میں تو اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا' لیکن اب اور انتظار نہیں۔۔۔''

وہ گہری سوچوں میں گم ڈپارٹمنٹل اسٹور کی سیڑھیاں چڑھنے لگا اور بے دھیانی میں کسی سے یوں ہی ٹکرایا کہ ٹکرانے والا اس پر آ گرا۔ سنبھلتے سنبھلتے بھی دونوں سیڑھیوں کے ایک طرف بنے ہلو سے جا لگے اور اسے لگا اس کا دل بند ہو جائے گا۔

اگر وہ اس لمحے کوئی اور دعا کرتا تو وہ بھی قبول ہو جاتی شاید قبولیت کی گھڑی بالکل پاس ہی تو تھی۔ جیسے وہ اس رات کی طرح اس کے بازوؤں میں تھی۔

''اسے اتفاق کہیں گے نہ حسین اتفاق بلکہ قسمت' خوش قسمتی کہیں گے کہ قسمت ہم دونوں کو ملانا چاہتی ہے۔ اس لیے بار بار راستے میں ایک دوسرے کے اتنے قریب لے آتی ہے کہ۔۔۔''

وہ اسے دیکھتے ہوئے بے خود سا کہتا چلا گیا اور وہ جو ہاتھ میں پکڑے دونوں شاپرز کے گرنے پر ہی حواس باختہ تھی اس جانے پہچانے چہرے کو اتنے قریب دیکھ کر ایک دہرائے ہوئے منظر کو پھر سے ان ہی جزئیات کے ساتھ دہراتا پا کر۔۔۔ جیسے اس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔

''چھوڑو مجھے۔'' وہ اسے پوری قوت سے پرے دھکیل کر درشتی سے بولی۔

''نہ چھوڑوں تو۔۔۔ کہا نا یہ قسمت کا لکھا ہے کہ ہم دونوں کو بہت جلد ایک ہونا ہے۔'' وہ شوخی سے اس کے چہرے پر نظریں جما کر بولا۔

''تڑاخ'' کی آواز آئی اور وہ اسے تھپڑ مار کر پرے دھکیلتی تیزی سے دونوں شاپنگ بیگ اٹھا کر اندھا دھند بھاگتی بھیڑ میں گم ہو گئی۔

اور وہ رخسار پر ہاتھ رکھے ساکت سا اسے دور جاتے دیکھتا چلا گیا۔

یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

بشریٰ حیران نظروں سے ساس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

وہ اب شاپنگ بیگ سے سیاہ رنگ کا خوب صورت کڑھا ہوا سوٹ نکالنے کے بعد مثال کا سرخ رنگ کا سویٹر دکھا رہی تھیں۔ جس پہ خوب صورت موتی لگے تھے۔

''یہ تو مجھے اپنی مثال کے لیے اتنا پسند آیا مانو میں نے دکان دار سے قیمت بھی نہیں پوچھی۔ بس کہہ دیا تھا کہ اسے پیک کر دو۔ اس سویٹر میں میری مثال تو کوئی شہزادی لگے گی۔ تمہیں کیسا لگا یہ سویٹر؟'' وہ اب بہت پیار بھرے انداز میں پوچھ رہی تھیں۔

''مگر۔۔۔ ابھی کس لیے؟'' وہ کچھ رکھائی سے بولی۔ دوسرے لمحے اسے احساس ہوا تو فوراً لہجہ بدل کر بولی۔

"میرا مطلب ہے مثال کے پاس تو پہلے ہی کافی ڈریسز ہیں اور سویٹرز بھی۔ تو آپ یہ اتنا مہنگا کیوں لے آئیں بھلا۔" وہ رک رک کر لہجے کو متوازن کرتے ہوئے کہہ گئی۔

"ائے ہے میری شہزادی کے پاس ہزاروں ہوں بھلے۔ دادی کے دیے کا تو کوئی مقابلہ نہیں جس محبت اور خوشی سے میں لے کر آئی ہوں اُس کا کیا جوڑ۔" وہ جوش میں بولتے ہوئے کچھ غصہ کر گئیں۔

"نہیں امی! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" بشریٰ کو فوراً معذرت خواہانہ انداز اختیار کرنا پڑا۔

"اور مجھے تو لگتا ہے۔ تمہیں اپنا بھی سوٹ پسند نہیں آیا۔ حالانکہ یہ فوزیہ اتنے دل سے تمہارے لیے خرید کر لائی تھی کہ امی! بھابھی اسی گھر میں ہیں۔ بھلے علیحدہ ہو گئی ہیں۔ ہم نے ان کی خوشی کو منایا نہیں۔ انہیں کوئی گفٹ نہیں دیا تو وہ دل میں کیا سوچتی ہوں گی۔"

نسیم بیگم نئی سی کہانی اسے سنا رہی تھیں۔ جو اس نے پہلے نہ کبھی سوچی تھی، نہ سنی تھی۔

"نہیں... امی سوٹ تو بہت اچھا ہے بہت خوب صورت۔" وہ بے چارگی سے کہہ گئی۔

"بلکہ میں تو کہتی ہوں کہ یہ کلر فوزیہ پر بہت جچے گا آپ اسے دے دیں۔ اس نے پہنا میں نے پہنا بات تو ایک ہی ہے۔" اس نے طریقے سے سوٹ لوٹانا چاہا۔

"تو وہ اتنی چاہ سے تمہارے لیے لے کر آئی اور تم الٹا اس کو واپس کر رہی ہو۔" وہ خفا ہو گئیں۔

"اور اس نصیب ماری پر یہ سیاہ رنگ کہاں جچتا ہے۔ میں نے تو یوں بھی اسے یہ رنگ کبھی پہننے نہیں دیا۔ یہ تم پر بہت اٹھتا ہے۔ اب بحث نہیں کرو اور رکھ لو، نہیں پسند تو اپنی ملازمہ کو دے دینا۔ ہم نے تو تمہیں تحفہ دیا ہے۔ اب تمہیں نہیں اچھا لگا تو...." وہ دل گرفتی سے بولیں۔

"امی! ایسے تو نہ کہیں، سوٹ تو اتنا اچھا ہے اور باقی چیزیں بھی۔ میں تو صرف آپ کی تکلیف کے خیال سے کہہ رہی تھی اور میں ملازمہ کو کیوں دینے لگی۔ کل میں ٹیلر کو دے آؤں گی اور خود اپنے لیے بنواؤں گی۔" وہ فوراً لہجہ بشاش کر کے بولی۔ نسیم بیگم مسکرانے لگیں۔

"اور چائے تو میں بھول ہی گئی۔ آپ کے لیے رکھ کر آئی تھی چولہے پر ابھی لائی۔ فوزیہ کو بھی آواز دیتی ہوں، وہ بھی آجائے اوپر۔" وہ جاتے ہوئے بولی۔

"بخار ہے اسے تو دوا لے کر سوئی ہے۔ تم بس میرے اور اپنے لیے لے آؤ۔" وہ فوراً بولیں۔

بشریٰ لوازمات کی ٹرے اٹھا کر آگے رکھنے لگی۔ نسیم بیگم نظر پھرا کر اطراف میں دیکھنے لگیں۔

ہر طرح کی سہولت... سجا سجایا خوب صورت ڈرائنگ روم، نئے کارپٹس، خوب صورت پردے، قیمتی ڈیکوریشن پیسز۔ وہ تو جیسے آہ بھر کر رہ گئیں۔

"یہ مٹھائی لیں نا امی! یا" وہ محبت سے مٹھائی پیش کرنے لگی۔

"یہ کون لایا تھا؟ جہاں سے عدیل لاتا ہے، وہ والی مٹھائی تو نہیں لگتی۔" ذرا سا چکھ کر ہی وہ فوراً بولیں۔

"جی... یہ امی لے کر آئی تھیں۔ کل ذرا دیر کے لیے آئی تھیں۔ جب آپ اور فوزیہ مارکیٹ گئی ہوئی تھیں۔ امی پہلی بار میرے گھر... مطلب یہاں آئی تھیں، اس لیے مٹھائی لے کر آئیں۔" اس نے کچھ تیزی سے کچھ رک کر مٹھائی کا حدود اربعہ بتایا تو نسیم بیگم کو اپنے اندھیرے میں چلائے تیر کو نشانے پہ لگتے دیکھ کر عجیب سی خوشی محسوس ہوئی۔

"عمران کا رشتہ ہو گیا؟" ذرا دیر بعد یوں ہی پوچھنے لگیں۔

"بس سمجھیں ہو ہی گیا۔" "لڑکی تو امی کو پسند آ ہی گئی ہے۔ اس ہفتے لڑکی والے فائنل بتا دیں گے تو ہم کوئی رسم کر لیں گے۔" بشریٰ نے تفصیل سے بتایا۔

"اللہ بہتر کرنے والا ہے۔ میں تو فوزیہ کے حادثے کے بعد ایسی ڈری ہوں، سوچ لیا ہے کہ کبھی بچے، بچی کا رشتہ ایسی جگہ نہ کرو، جن لوگوں کو آپ ٹھیک سے جانتے نہ ہوں۔ بڑے بڑے فریب دھوکے ہو رہے ہیں آج کل اللہ سب کو امان میں رکھے۔"

"جی... آپ صحیح کہتی ہیں... یہ کباب تو لیں امی! میں نے کل ہی بنائے ہیں۔" اس نے دوسری پلیٹ پیش کی تو وہ خاموشی سے کچھ سوچتے ہوئے کباب کھانے لگیں۔

"مما! پاپا آگئے ہیں۔" مثال ہوم ورک مکمل کر چکی تھی۔ جب نیچے گاڑی رکنے کی آواز آئی تو وہ شور مچاتی باہر آکر بولی اور خود سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

بشریٰ نے جلدی سے چائے کا پانی چولہے پر رکھا اور خود اپنی لپ اسٹک کو فریش کرنے بیڈ روم میں چلی گئی۔

چائے کا پانی پک پک کر سوکھ گیا مگر عدیل اوپر نہیں آیا۔ مثال بھی باپ کے پیچھے نیچے چلی گئی تھی۔ اس نے بھی آکر کچھ نہیں بتایا۔ نیچے بھی مکمل خاموشی تھی۔

بشریٰ کو پہلے تو سخت کوفت اور غصہ آیا، پھر وہ کچھ پریشان ہو گئی۔ عدیل نیچے اتنا ٹائم کبھی نہیں لگاتا تھا۔

وہ نسیم بیگم کی طبیعت کی خرابی کا سوچ کر نیچے جانے کو تھی کہ عدیل اور مثال ہنستے باتیں کرتے اوپر آگئے۔

"خیر تو تھی... آپ نے نیچے اتنی دیر لگا دی؟" وہ سخت لہجے میں کہہ اٹھی۔

"امی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ فوزیہ کو بھی بخار تھا۔ انہیں پوچھنے بیٹھ گیا کہ ماموں کا فون آگیا سکھر سے۔ ان کی بیٹی کی شادی ہے تو اسی سلسلے میں انہوں نے امی کو فون کیا تھا۔ اس میں کچھ ٹائم لگ گیا۔ چائے تیار ہے؟" وہ بتا رہا تھا، مگر اس کی آنکھوں میں گہری سنجیدگی تھی۔ بشریٰ کو لگا کچھ اور بھی ہے، جو عدیل یا تو بتانا بھول گیا ہے یا اسے بتانا نہیں چاہتا۔

"ہاں... میں بس لے کر آتی ہوں۔ آپ فریش ہو جائیں۔" اس نے بحث کرنا ضروری نہیں سمجھا اور کچن میں چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

"ارے اتنا زبردست سیٹ۔ یہ کس کا ہے عدیل! فوزیہ کے لیے لائے ہیں؟" بشریٰ خوب صورت گولڈ کا لاکٹ سیٹ دیکھ کر بے اختیار تعریف کرتے ہوئے پوچھ بیٹھی۔

"فوزیہ کا جب وقت آئے گا تو اس کے لیے بھی لے آؤں گا۔ ابھی تو تمہارا کافی قرض ہے مجھ پر۔ وہ تھوڑا تھوڑا کر کے اتارنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" وہ مسکرا کر بولا تو وہ بے یقینی سی دیکھتی رہی۔

"تمہارے لیے ہے جان!" عدیل نے دھیرے سے اس کی ناک کی نوک کو چٹکی میں پکڑ کر ہلایا تو وہ بے وجہ ہی ہنس پڑی۔

"مائی گاڈ! یہ تو بہت زبردست ہے۔ یو آر سو سویٹ عدیل! اچھا جلدی سے پہنائیں مجھے۔" وہ چین اس کے آگے کر کے بولی تو وہ محبت سے اسے پہنانے لگا۔

سرخ یاقوت اس کی دودھیا گردن پر عجب بہار دکھا رہا تھا۔ عدیل دیکھتا رہ گیا۔ اس کی بے خود نظروں سے بشریٰ یوں ہی مسکرانے لگی۔

☆ ☆ ☆

"کہیں جانا ہے؟" وہ حیران ہو کر بولی۔

"ہاں ابھی میرے ساتھ... تمہیں شام کو واپسی پر پک کر لوں گا۔ مثال کی تو یوں بھی آج چھٹی ہے۔"

"مگر عدیل! مجھے تو تیار ہونا پڑے گا۔ اس حلیے میں چلی جاؤں کیا۔ آپ لیٹ ہو جائیں گے۔" وہ اپنے رات کے کپڑوں کو دیکھ کر بولی۔

"تم تیار ہو جاؤ۔ میں ویٹ کر لیتا ہوں۔" وہ تحمل سے بولا۔

"کیا امی کا فون آیا ہے۔ انہوں نے مجھے بلوایا ہے۔" وہ فکر مند ہو کر بولی۔

"او نہوں نو مور کوئسچن' پلیز تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ سب کچھ راستے میں بتا دوں گا۔" عدیل کے دو ٹوک انداز سے سمجھ گئی کہ اب وہ مزید کچھ نہیں بتائے گا۔

دس منٹ میں تیار ہو کر وہ عدیل کے ساتھ ذکیہ بیگم کی طرف جانے کے لیے گاڑی میں بیٹھ چکی تھی اور وقفے وقفے سے عدیل کے سنجیدہ چہرے کی طرف دیکھتی رہی تھی۔

"اب سنو میری بات غور سے۔" وہ بہت دیر بعد بولا تھا۔ بشریٰ کا دل اس کے لہجے سے ہی پھر بے طرح دھڑکنے لگا۔ اس کی بات اور بھی سہما دینے والی تھی۔ اتنی کہ وہ اس کی بات ختم ہونے پر شاکڈ سی کوئی سوال بھی نہیں کر سکی۔

گاڑی اس کی ماں کے گھر کے آگے رک چکی تھی۔ عدیل اس کی طرف کا دروازہ کھول چکا تھا۔

"میں شام میں تم دونوں کو پک کر لوں گا۔ او کے ٹیک کیئر جاؤ۔"

اس نے خود ہاتھ پکڑ کر بشریٰ کو گاڑی سے اتارا اور مثال کو پیار کر کے دوبارہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے پر بڑی جان دار مسکراہٹ تھی۔ بشریٰ جیسے پتھر کی ہو کر رہ گئی تھی۔ مثال نے ڈور بیل بجائی گیٹ کھلا اور مثال ہی بولتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی۔

☆ ☆ ☆

"یہ کیا بکواس ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ تم نے ان ماں بیٹے کا وہیں منہ کیوں نہیں توڑ دیا۔ یہ منحوس پیغام اٹھا کر ادھر کیوں لے آئیں؟" ذکیہ بیگم اور عمران دونوں ایک دم سے بھڑک اٹھے۔

بشریٰ بے بسی سے دونوں کو دیکھنے لگی۔

"امی! میں کیا کرتی۔ عدیل کا لہجہ اتنا خوفناک سا تھا' یقین کریں میں ڈر گئی۔ کچھ بول ہی نہ سکی۔" وہ بے چارگی سے بولی۔

"یہی تمہاری کمزوری ہے۔ جس کا وہ لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔" ذکیہ بیگم بھی بولیں۔

"اور امی! میں تو یہ مر کر بھی نہیں ہونے دوں گا۔ صاف صاف انکار کر دیں ان لوگوں کو۔ مجھے کوئی شوق نہیں قربانی کا بکرا بننے کا۔" عمران تو یوں بھی بے لحاظ سا تھا۔ بغیر کسی مروت کے کہہ کر چلتا بنا۔

"امی!" بشریٰ نے بے چارگی سے ماں کو دیکھا۔

"تم فکر نہیں کرو۔ میں اس کا ایسا حل تمہیں دوں گی کہ وہ لوگ کچھ بول ہی نہ سکیں گے۔" ذکیہ بیگم اسے تسلی دیتے ہوئے بولیں۔ بشریٰ ماں کو دیکھتی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

عمران مثال اور بشریٰ کو گیٹ کے باہر ہی اتار کر چلا گیا۔ بشریٰ بدقت مٹھائی بھاری ٹوکری اٹھائے گھر کے کھلے گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ عدیل کی گاڑی کھڑی تھی۔

بشریٰ نے عدیل کو آنے سے منع کیا تھا کہ اسے عمران ڈراپ کر جائے گا۔

اس کی توقع کے عین مطابق عدیل ماں بہن کے ساتھ نیچے لاؤنج ہی میں بیٹھا تھا۔

بشریٰ چہرے پہ بشاش سی مسکراہٹ لیے سب کو سلام کرتی اندر داخل ہوئی۔

"پاپا!" مثال اچھل کر باپ کی گود میں چڑھ گئی۔

تینوں کے چہرے ایک دم سے اجنبی ہو گئے تھے۔ بشریٰ کو کچھ ایسا ہی لگا۔ اس نے مٹھائی کی رنگین ٹوکری سینٹرل ٹیبل پر رکھی اور اپنا بیگ ایک طرف صوفے پر ڈال کر بیٹھنے لگی تھی کہ عدیل کھڑا ہو گیا۔

"کیا ہے یہ؟" اس کا لہجہ اتنا سرد تھا کہ بشریٰ کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔

"یہ... عدیل! عمران اور حنا کی رسم تھی آج... مطلب وہ لوگ آئے تھے شگن ڈالنے تو یہ مٹھائی امی نے دی۔ رشتہ طے ہو گیا نا عمران کا۔ اگلے سنڈے کو منگنی ہے اور ایک ماہ بعد شادی۔"

وہ رک رک کر بے ربطگی سے کچھ جوش سے بتانے لگی اور اس کا جواب پورا ہونے سے پہلے عدیل نے ایک زوردار تھپڑ بشریٰ کے منہ پر جڑ دیا۔

وہ تیورا کر گرنے لگی تھی کہ مثال نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"تم سے میں نے کہا تھا کہ تم عمران اور فوزیہ کے رشتے کی بات نہ صرف کر کے آؤ گی بلکہ طے کر کے آؤ گی اور تم مجھے یہ بکواس سنا رہی ہو۔ تمہاری ماں اور بھائی نے بس اتنا ہلکا لیا ہے مجھے۔ انہوں نے میری بات کو سمجھا کیا۔ اب اس کا مطلب میں تمہیں سمجھاؤں گا۔" اس کے چہرے پر صرف وحشت تھی۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

معصومہ اقبال

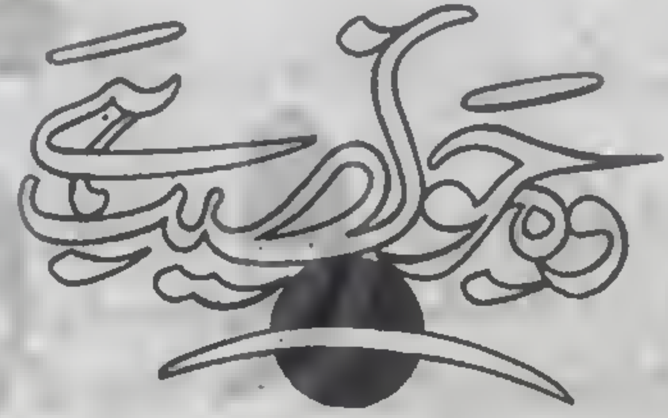

میں آج کل کی لڑکیوں سے بڑی خوف زدہ تھی۔ اصل میں 'بہو ڈھونڈ رہی تھی۔ مگران ہونی کا خوف مجھے ڈرا ڈرا دیتا تھا۔ بیٹے نے تو مجھے پورا اختیار دے رکھا تھا۔ مگر میں خود ہی ہچکچا رہی تھی۔ کہیں بھی بات ڈالنے کے لیے سوچتی تو قدم تھم جاتے اور کسی اچھی لڑکی کو دیکھ کر بھی۔ میں اس سچویشن سے بڑی تنگ تھی۔ لو بھلا بہو نہ ہو گئی کے ٹو کی چوٹی ہو گئی جو سر کرنی ہے۔ اللہ جانے وہ کیسی مائیں ہوتی ہیں جو بڑے آرام سے سال دو سال کے وقفے سے بڑی اچھی اچھی بہوئیں ڈھونڈ لاتی ہیں اور ذرا جو کوئی خوب صورت اور خوب سیرت نکل آئی تو کیسے اترا اترا کر سب کو بتاتی پھرتی ہیں۔

"ماشاء اللہ چندے آفتاب چندے ماہتاب بہو ڈھونڈی ہے میں نے۔

ارے بیٹے نے تو مکمل طور پر میری پسند پر چھوڑی ہوئی تھی۔ ماشاء اللہ بڑا سعادت مند ہے' میں نے کہا بھی میں کیا جانوں' تمہارے مزاج کی بیوی لا بھی سکوں گی یا نہیں مگر اس نے کہا۔ "نہیں آپ کی پسند ہی میری پسند ہو گی وغیرہ وغیرہ۔"

کوئی اور ان کے نصیبوں پر رشک کرے نہ کرے میں ضرور متاثر ہوتی۔ اکثر بیگمات مجھ سے پوچھتیں۔

"مسز طارق! آپ کب بہو لا رہی ہیں۔" اور میں ان کا منہ تکتی رہ جاتی۔ صرف بہو کا معاملہ نہیں۔ ہر معاملے میں اسی طرح باوجود لاکھ چاہ کے وہ کام مرضی کے مطابق نہ ہوتا تو بڑا جی کلستا۔

اسی طرح گھر میں اکیلے پن کے مارے ایک دن جی ایسا بولایا کہ بیٹے سے ٹکٹ منگا کر میں بہاول پور چلی آئی۔ یہاں میری دور کی چچا زاد بہن رہتی تھی۔ بڑے دن بعد اس کے گھر آئی تھی۔ پرجوش استقبال ہوا۔

"ارے کلثوم! یہ تمہاری بیٹیاں ہیں؟" میں حیرانی سے اس کی تینوں بیٹیاں دیکھ رہی تھی۔ سب ایک سے بڑھ کر ایک حسین مگر سب سے بڑی والی تو حور لگ رہی تھی۔

"خیر سے دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

"ارے ماشاء اللہ بالکل پریوں جیسا حسن ہے۔"

میں نے باری باری تینوں کو لپٹایا۔ پیار کیا۔

"اِئی تم نے تو کبھی بتایا ہی نہیں۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ رجب کا نصیب یہاں لے آیا۔"

"کیا بات ہے حلیمہ سب خیریت تو ہے؟" کلثوم بھی کہے بغیر نہ رہ سکی۔

"بس کیا بتاؤں بہن بڑے عرصے سے بہو کی تلاش میں تھی۔"

"اچھا....." انہوں نے ہنکارا بھرا۔

"رجب کے لیے؟"

"ہاں بہن! بس اب تو تم نے سب سے بڑی والی میرے رجب کے نام کر دینی ہے۔" مجھ پر حسن کا ایسا جادو چلا تھا۔ وہ بچی ماں کا منہ دیکھنے لگی۔

"ارے حلیمہ! ذرا سانس تو لو۔ اس کی نسبت طے ہو چکی ہے۔" وہ ہنسنے لگی۔ "تم باقی کی دو میں سے کوئی پسند کر لو۔"

"مگر مجھے تو وہ ہی پسند آئی ہے۔" میں نہ مانی۔

"ارے بول تو رہی ہوں حلیمہ! اس کی بات طے ہو چکی ہے۔ ہم زبان دے چکے۔ تم بھی کیا گھاس چر گئیں۔"

"میرا رجب اکلوتا ہے' خوش شکل ہے' سونے میں تول دے گا۔" میں جانے کیوں جذباتی ہو چلی تھی۔

"میں نے زبان دے دی میں نہیں پھرنے کی۔" اس نے صفاچٹ جواب دیا تو مجھے سخت برا لگا۔

اسی شام رجب کو بلوا کر میں نے واپسی کی راہ پکڑ لی کلثوم پیچھے پیچھے آئی۔

"ارے حلیمہ بہن! ایسے ناراض ہو کر کاہے جا رہی ہو۔ باقی کی لڑکیوں میں سے جو چاہے پسند کر لو۔"

"رہنے دو بہن ہمارے شہر میں لڑکیاں بہت۔" میں نے رکھائی سے کہا۔

"میں مانتی ہوں مگر دیکھو۔ تم کو بھی ضرورت ہے مجھ کو بھی ضرورت ہے کاہے بات گھر سے باہر جائے۔ چھٹکی لڑکیوں میں سے کسی ایک کو پسند کر لو۔" مگر میں منہ سیدھا کر کے نہ دی۔

"رہنے دو بھئی تم کو لڑکوں کی کمی نہ مجھ کو لڑکیوں کی کمی۔ پتھر بھی اٹھاؤ تو اس کے نیچے سے دو چار لڑکے لڑکیاں شادی کے لائق نکل پڑتے ہیں۔"

"اچھا بھئی جیسی تمہاری مرضی۔" اس نے اور اصرار نہ کیا اور میں بجھے دل کے ساتھ واپس چلی آئی۔

☼ ☼ ☼

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ مجھے رجب کی فکر کھائی جا رہی تھی۔ آس پاس کے رجب کی عمر کے سارے لڑکے بال بچوں والے ہو گئے تھے۔ خاندان کی تقریبوں میں ہر لڑکی کا بغور معائنہ کرتی۔ کوئی حسن تو ہو جو چونکا دے' آخر مجھے وہ گوہر نایاب مل ہی گیا۔

سنہری بال' نیلی آنکھیں اور سفید رنگ آسمانی رنگ کے سوٹ میں آسمانی پری ہی لگ رہی تھی۔ میں نے دیر نہ کی۔ جھٹ بات ڈالی اور منگنی کر ڈالی۔ منگنی میں وہ غضب ڈھا رہی تھی۔

"اِئی بھابھی! رجب کی منگیتر تو بڑی حسین ہے۔ رجب کا بڑا اچھا نصیب کھلا ہے۔" ہر ایک نے تعریف کی۔ مگر اپنی جٹھانی کی تعریف سے میرے دل کو خاص راحت ملی۔ اپنی بہو کی تلاش میں اس نے جوتیاں گھس لی تھیں۔ مگر اس کی بہو سلطانہ' میری مہ پارہ کے آگے پانی بھر رہی تھی۔

"ہاں واقعی حلیمہ! چن کے بہو لی ہے' ہونے والی نسل میں رنگین آنکھیں' چلیں گی۔"

میرے دل کی کلی کھل گئی اور تو اور میرے سمدھیانے کی مالی حیثیت بھی کم نہ تھی۔ ڈیفنس میں گھر تھا ذاتی۔

"میں سمجھی تھی رجب کی پسند ہے۔" جٹھانی نے کہا۔

"اے لو اس کی پسند کہاں سے ہو گئی۔ خالص میری پسند ہے' میرا بیٹا بڑا سعادت مند ہے میں تو جہاں اس کو کہتی کر لیتا بلکہ اس نے تو اپنی مرضی ہی مجھ پر چھوڑ رکھی تھی۔" میں نے مزید جلایا۔

"اچھا وہ سنا ہے تم کلثوم آپا کے ہاں گئی تھیں بہاول پور۔" اب کے جٹھانی نے میرے ہوش اڑا دیے۔

"ہائیں تم کو کیسے معلوم ہوا۔" میں حیران ہوئی۔

"اے وہ میرے رشتے میں دور کی ممانی لگتی ہیں انہوں نے بتایا کہ تم نے ان کی بڑی بیٹی۔"

"اے کاہے فضول کی باتیں پھیلا رکھی ہیں کلثوم نے میں کیوں بھلا بات پر بات ڈالوں گی۔" میں نے اس کو اور جٹھانی کو بے بھاؤ کی سنا ڈالیں۔

"حلیمہ! منگنی والا گھر ہے۔ تماشا بن جائے گا' خاموش ہو جاؤ۔" میری بھاوج نے ٹوکا۔

"یہ تو پرانی عادت ہے حلیمہ کی۔" جٹھانی نے بیزاری سے کہا۔ "عین تقریب کے موقع پر۔"

"میرا منہ نہ کھلواؤ خدیجہ (جٹھانی) بھابھی ورنہ تمہاری عادتیں بھی کھول دوں گی۔ ہاں میری بہو کو دیکھ کر دل میں حسد کے بھانبھڑ جل رہے ہیں نا تم لوگوں کے۔" میں لڑنے پر آ گئی۔

آخر میری بھاوج نے ہی بیچ میں کود کر دونوں کو خاموش کرایا۔

☼ ☼ ☼

ابھی منگنی کے بعد میں شادی کی تاریخ دیکھنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ مہانو ـــــ کا ایسا برا ایکسیڈنٹ ہوا کہ بچاری ایک ٹانگ سے معذور ہو گئی۔ یہ خبر سن کر میں دھک سے رہ گئی۔

"ہائے یہ کیا غضب ہو گیا مولا۔ ابھی تو میرے رجب نے آنکھوں میں ارمانوں کے دیے جلانے ہی شروع کیے تھے۔ ہائے یہ کس کی نظر کھا گئی۔ میرے بچے کو۔" اب وہی خواتین مجھ سے اظہار افسوس کرنے آتیں۔ اسی دوران میں نے ہاتھ پاؤں مار کر ایک اور لڑکی ڈھونڈ لی۔

صدیقہ خوب صورت تو تھی مگر مہانو کی بات ہی اور تھی۔ رہ رہ کر دل میں ہوک اٹھتی۔ مگر وہ بے چاری اب معذور تھی۔ سادگی سے منگنی ہوئی۔ تعریف تو سب نے کی مگر مہانو کو بہو نہ بنانے کی حسرت دل میں گڑی تھی۔ خیر زیادہ انتظار کرائے بغیر میں نے بچت نکالی اور دھوم دھام سے شادی کی تیاری شروع کر دی۔ اکلوتا بیٹا تھا ہر چیز ایک سے بڑھ کر ایک بنانے کی دھن تھی۔

اس دن بھی روز کی خریداری کے سلسلے میں بازار گئی کہ اب دلہن کا شرارہ خریدنے کا مرحلہ درپیش تھا ایک اونچی اور بڑی سی دکان میں لگے شرارہ پر نظر جم کر رہ گئی۔ سمجھو آنکھوں کو خیرہ کرنے والی خوب صورتی اس دکان میں سمٹ آئی۔ میرے تو قدم ہی پکڑ لیے زمین نے۔ مگر قیمت سن کر میرا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ ہائی کلاس کی دکان تھی۔ قیمتیں قوت خرید سے باہر۔ بڑا دل کو سمجھایا کہ ایک لہنگے کے پیچھے رقم مٹی نہ کرو مگر میرا دل مچلا جا رہا تھا' وہاں سے کچھ خریدنے کو آخر دماغ دل سے ہار گیا اور میں نے ایک بیش قیمت شرارہ خرید ہی لیا۔

نوے ہزار کا وہ گولڈن اور شاکنگ پنک شرارہ بے حد حسین تھا۔ افسوس بھی ہوا۔ کیا ایک ہی وقت میں اتنے پیسے ضائع کر دیے اتنے میں تو تین بھاری کنگن سیٹ آسانی سے بن جاتے' یا بری میں رکھنے والے جوڑے اور بڑھ جاتے۔ مگر ساتھ میں خوشی اپنی جگہ تھی کہ سمدھیانہ اور سسرال والوں پر کیسا اچھا رعب پڑے گا۔ بہرحال میں نے سوٹ پیک کروا کر سنبھال لیا۔ ساتھ میں اس نے کھسے بھی پیک کر دیے اور کولڈ ڈرنک پلا کر رخصت کیا۔ میں تصور میں صدیقہ کو اس شرارے میں ملبوس رجب کے پہلو میں کھڑا سوچ

کر مسکرانے لگی۔

خیر شادی سر پر آ گئی۔ بری کی ایک ایک چیز میں نے حیثیت سے بڑھ کر بنوائی۔ یہ کتنی کے موقع تو ہوتے ہیں خاندان والوں کو جلا کر لطف لینے کے۔ یہ الگ بات ہے اس کے لیے رجب کو بھاری قرضہ لینا پڑا۔

ہمارے خاندان میں رواج تھا کہ بری برات والے دن دولہا والے لے کر جاتے تھے اور میزوں پر سجا دیتے اور مہمان اس کی رونمائی کرتے۔ عین برات والے دن سامان اٹھوا کر گاڑی میں رکھوایا۔ آس پڑوس کی چند فضول سی پڑوسنوں نے بڑی فرمائش کی کہ' بری دکھا دو مگر میں نے دکھا کر نہ دی۔

"ائی بہن یوں بار بار کھولنے سے خراب نہ ہو جائے سامان۔ اتنی مشکل سے پیک کروایا ہے۔" میں وضاحتیں دیتی۔

میرے سسرال والے تو جل ہی جائیں گے شاندار بری دیکھ کر۔ خاص کر وہ دلہن کا شرارہ۔" [illegible] میں خوش ہوتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ ایک ایک چیز کی قیمت بتاؤں گی۔ ہماری دیورانی انہوں نے تو بڑی قیمتوں کی نمائش کی تھی اپنے بیٹوں کی بری کی اب دیکھو ذرا کیسا چہرہ اترتا ہے۔

"اے سیمیں ..... دیورانی کو پکارا۔" دلہن نہیں دیکھی تم نے وہ سیٹ سے نہ اٹھی تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ اب اپنے منہ سے کہتی آ کر بری دیکھو تو کھٹک جاتی پھر تو اٹھنے کا نام ہی نہ لیتا تھا اس نے۔ اتنے میں اس کی بیٹی آ گئی۔

"امی! میرا سر بھاری ہو رہا ہے' طبیعت سنبھل نہیں رہی۔" دیورانی کی بیٹی اپنا لہنگا ہاتھ میں اٹھاتی آئی۔ جو فرش سے لگ رہا تھا۔ مجھے سلام کیا۔ اس پر نظر پڑتے ہی میری نظر جم کر رہ گئی۔ جدید تراش خراش کا سلیولیس شاکنگ پنک اور گولڈن۔ بے انتہا بھاری شرارہ میری بہو کے شرارے سے حد درجہ مشابہت والا۔

"ارے واہ تمہارا سوٹ تو دلہن کے جیسا ہے۔" مجھے دل ہی دل میں سخت صدمہ ہوا تھا مگر ظاہر نہ ہونے دیا۔

"جی آنٹی! مظہر نے اسی ہزار کا دلوایا ہے۔ شہر کی سب سے مہنگی شاپ سے۔" میرا دل بیٹھنے لگا۔

"ہائے میں کتنا تیس مار خاں سمجھ رہی تھی خود کو۔ اس کی تو شادی کو بھی سال گزر گیا۔ دیورانی کو بھی پر لگ گئے تھے۔

"ائے میرے داماد کی تو نوکری ہی اتنی اچھی جگہ ہے۔ بڑے نصیب کھلے ہیں میری بیٹی کے۔"

میں نے پاس پڑی کرسی کا سہارا لیا۔

دیورانی فخریہ انداز میں بیٹھی تھی جیسے میدان مار لیا ہو پھر یکدم اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلیں حلیمہ بھابھی! دلہن دیکھنے چلتے ہیں۔"

"ارے پہلے بری تو دیکھ لو میں نے ان کا رخ سامان سے لدی ہوئی بڑی بڑی میزوں کی طرف کیا۔ وہ لاکھ کہتی رہ گئی۔ پہلے دلہن کو دیکھ لینے دو مگر میں زبردستی بری کی طرف کھینچ لائی اور پھر بری دیکھ کر اس کا جوش کچھ ٹھنڈا سا پڑ گیا۔ فخریہ اکڑی ہوئی گردن ڈھیلی پڑ گئی۔

"بڑی قیمتی بری بنوائی ہے تم نے بھابھی۔" اس کے لہجے میں مردنی تھی۔

"ہاں یہ ہی کوئی دو ڈھائی لاکھ روپے لگ گئے ہیں۔" میں نے بے نیازی سے جتایا۔ دو بھاری سیٹ بھی موجود تھے جس میں جھومر' نتھ' کڑے' ٹیکہ سب کچھ تو تھا۔ اس کی اپنی بہو کی بری تو مشکل سے ساٹھ ستر ہزار کی ہو گی اور بیٹی کو داماد نے سال میں ایک جوڑا مہنگا بنا دیا تو کیا ہوا اور کیا خبر کتنا پیچھے پڑی ہو گی میاں کے۔ کتنی بچتیں نکالی ہوں گی اس بے چاری نے۔

"مگر حلیمہ بھابھی! اتنی قیمتی بری بنانے کا کیا فائدہ جوڑے تو ایک ایک بار پہن کر لڑکیاں نکال دیتی ہیں۔ کہ بھاری ہے۔"

وہ خود کو سمجھا رہی تھی یا مجھے۔

"اے بھئی۔ ایک ہی تو موقع ہوتا ہے۔ جی بھر کر خرچ کرنے کا۔ چلو دلہن کے پاس چلتے ہیں۔" جتاتے ہوئے میں نے اسٹیج کی راہ لی۔ میں ابھی فاتحانہ

انداز میں مڑی ہی تھی کہ غیر معمولی نسوانی چیخیں کانوں میں پڑیں۔ ایک بھونچال آگیا تھا جیسے۔ وہ گاڑی بھر کر لڑکے تھے' منہ پر نقاب ڈالے اور ہر ایک کے ہاتھ میں پستول۔

"ہائے میرے مولا۔" میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ چند سیکنڈوں کا کھیل تھا۔ کچھ نے ہم کو یرغمال بنایا۔ کچھ نے سامان لوٹا۔ زیورات اتروائے دلہن کے اور عورتوں کے۔ بری کا سامان لوٹا اور یہ جاوہ جا۔

"ہائے یہ کیا غضب ہو گیا' ابھی تو میں نے دلہن والوں سے پوری طرح آؤ بھگت بھی نہ لی تھی۔ لاکھوں کی بری کی بنا پر۔ ارے ابھی تو بری کی دھوم بھی نہیں پھیلی تھی لوگوں میں ٹھیک سے۔" میرا صدمہ ناقابل بیان تھا۔ مردانہ حصہ کو خبر ہوئی۔ وہ دوڑے دوڑے آئے۔ پولیس کو خبر کی۔ مگر کیا فائدہ سب عورتیں سہمی کھڑی تھیں۔

"اچھا ہوا میں نے خالص جڑاؤ سیٹ نہ نکالا۔ یونہی ایمی ٹیشن کا زیور چڑھا لیا۔ آج کے دور میں کیا بھروسا اور پھر رات کا وقت۔" تب ہی جٹھانی کی آواز کان میں گونجی۔

دلہن ہوش سے بے گانہ ہو رہی تھی۔ میں بھی کرسی پر ڈھے گئی۔ رجب آکر مجھ سے لپٹ گیا۔ بمشکل میرے ہوش واپس آئے۔

"اے بیٹا! تیرے ساتھ کیا نحوست لگ گئی۔ ابھی تو یہ سامان برتنا بھی نصیب نہ ہوا تھا۔" میں ڈوبی ڈوبی آواز میں بولی۔

"چھوڑیں ناں امی! جان بچ گئی۔ شکر کریں چیزیں تو پھر آجائیں گی۔" وہ بردباری سے مجھے سمجھا رہا تھا۔

"ویسے حلیمہ بھابھی! کیا ضرورت تھی آپ کو اتنی مہنگی بری بنانے کی۔" سسرال والے غم پرسی کرنے آئے بھی تو یہ طعنہ دے دے کر چلے گئے۔ میں کیا جواب دیتی۔ ابھی تو قرضہ بھی چکانا تھا۔ رخصتی تو خیر ہو گئی۔ مگر میرا دل پھر بھی ناشاد رہا۔

ایک سال لگا تقریباً" پھر سے سیٹ ہونے میں' جب خیر سے رجب کی بچی پیدا ہوئی تو رجب بڑا خوش تھا۔ میں نے بی سی ڈالی تھی۔ وہ بھی ان ہی دنوں کھلی تو میں نے سوچا۔

"ذرا دھوم دھام سے عقیقہ کروں اور جتنی کسر شادی پر رہ گئی تھی سب پوری ہو جائے۔ وہ لوگ جو ابھی تک پرانے قصوں کو چٹخارے لے لے کر سناتے پھرتے ہیں ان سب کے دل اچھل کر حلق میں آجائیں کہ حلیمہ ابھی بھی ہلکی نہیں پڑی حیثیت میں میری پہلی پوتی ہے۔ جی بھر کر ارمان نکالوں گی۔" بی سی کے پیسوں سے خود جا کر بکرا خرید لائی۔ ایک دم سفید براق اور موٹا تازہ۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے قد اور قیمت میں گائے سے ذرا ہی کم تھا۔ میں بڑی خوش مگر جانے اس نے کیا الا بلا کھا لیا کہ دعوت سے ایک دن پہلے ہی اس کو ایسے موشن لگے کہ ادھ موا ہو گیا۔ رجب ڈر گیا۔ اس نے مجھے بتائے بنا جا کر چھری پھروا دی۔ صبح اٹھ کر میں نے صحن میں ترتیب سے گوشت تھالوں میں نکلا دیکھا۔ میں رجب سے خوب لڑی۔ ایک ہی تو ارمان تھا پوتی کا دھوم دھام سے عقیقہ کرنے کا وہ بھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ رجب بے چارہ لاکھ سمجھاتا رہا اگر اس کو حلال نہ کرواتے تو جان سے جانے کا اندیشہ تھا۔ اب حلال تو ہو ہی گیا آپ کی پوتی کے نام کا۔ اب آپ اپنے ہاتھوں سے حصے لگا دیں۔ حصے تو بنا دیے مگر دل بجھا رہا۔

جانے میرے نصیب کی خوشیوں کو کس کی نظر کھا گئی تھی۔ اب کب آگے پوتا پوتی کی خبر آئے۔ کس کو معلوم۔ مگر کیا فائدہ۔ پہلوٹی کے بچے کی بات اور ہی ہوتی ہے۔ ان ہی دنوں دیورانی کی چھوٹی بچی کا رشتہ آیا تو دل پہ چھریاں چلنے لگیں۔ یہاں تو ڈھنگ سے ایک خوشی نہ منا پائی تھی میں اور یہ لوگ...... دیورانی نے ہی بتایا۔

"بڑے ہی کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ امریکا سے شفٹ ہو کر پاکستان آئے ہیں۔ مگر برادری غیر تھی۔ بڑے امیر لوگ ہیں۔ ذاتی گاڑیاں اور فیکٹریاں ہیں۔" اس کو تو خوشی سے پر لگ گئے تھے۔ جب موقع ملتا وہ تعریفوں کے پل باندھنے لگتی۔

"ارے میری مانو تو میں نے بڑے امیر گھرانوں میں چھوٹے گھر والوں کی لڑکیوں کی مٹی پلید ہوتی دیکھی ہے اور پھر برادری بھی غیر ہے۔ خیر تم نے مشورہ تو کیا نہیں۔"

وہ ذرا سوچ میں پڑی پھر بولی "ہاں یہ تو ہے بھابھی مگر میری ثمرین سلیقہ میں اٹھنے بیٹھنے اور جوڑ توڑ میں طاق ہے۔ ایسی لڑکیاں ہر جگہ کھپ جاتی ہیں۔"

"ارے اگر کسی جگہ کھپانا ہی تھا تو اپنے خاندان میں رشتے بھرے پڑے تھے۔"

"یہ تو آپ نہ ہی کہیں تو اچھا ہے حلیمہ بھابھی! جب رجب کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی تھیں اس وقت پوچھا؟ مزے سے خاندان سے باہر کی لڑکی لے آئیں۔ اب میں بھی راجپوتوں میں بیٹی دے رہی ہوں تو میرا دماغ الجھا کر پریشان نہ کریں آپ۔"

"اچھا جو جی چاہے کرو۔ خود ہی بعد میں لکیر پیٹتی رہنا۔ ابھی تو پیسہ کی پٹی آنکھ پر بندھی ہے جب اترے گی تب ہی دکھائی دے گا۔" میں نے جل کر کہا۔

خیر ثمرین بھی نمٹ گئی۔ ولیمہ والے دن تو ہال کی سجاوٹ اور کھانوں کی اقسام نے ہی مبہوت کر دیا تھا۔ اور دلہن کو تو جیسے زیورات میں چھپا دیا۔ اس کی شادی کے بعد جنہوں نے اس کی شادی باہر کرنے پر اعتراض کیا تھا وہی اس کو ہاتھوں میں لیے بیٹھی رہتیں۔ آگے کو انہوں نے بھی اپنی جوان ہوتی "کھر چنیں" نمٹانی تھیں۔ اس تقریب میں یہ ہی دیکھ رہی تھی میں۔

"اے لو اس وقت تو سب مخالف تھے۔ اب دیکھو لوگوں کو۔ کیسی منافقت ہے توبہ۔" میں بڑبڑائی۔ پاس بیٹھی بھاوج نے سن لیا۔

"سب نصیب کی بات ہے بھابھی! کرنے والے اپنا کام کر جاتے ہیں ٹوکنے والے ٹوکتے رہ جاتے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں جہاں ثمرین کا جوڑ لکھا وہاں اس کی شادی ہونی ہی تھی وہاں ہو کر رہی۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے۔" میں نے اتفاق کیا۔

"بس حلیمہ بھابھی! میں تو کہتی ہوں اللہ نے ہر ایک کا نصیب لکھ کر ہم پر بڑا کرم کیا ہے اگر یہ نہ لکھا ہوتا تو کوئی ایک لقمہ بھی اپنے دسترخوان سے کسی کو نہ توڑنے دیتا اور یہ دیکھو اپنے کلام میں کیسے سمجھاتا ہے کہ اے بندے تو رزق کے پیچھے نہ جا رزق تیرے پیچھے آئے گا۔" میں پوری طرح سے اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ "اب ثمرین کو ہی دیکھیں حلیمہ بھابھی! اتنے حالات خراب تھے جب تمہارے دیور خلیل بھائی کی نوکری چھوٹی اور ادھر یہ گود میں آئی۔ ایسی تنگ دستی کہ ایک وقت کھانے کے بعد دوسرے وقت کا سوچنا پڑتا۔ اب دیکھو کیسے نصیب کھلے ہیں۔"

"سنا ہے لڑکے والوں نے جہیز لینے سے بھی انکار کر دیا تھا۔" میں نے اس کو بتایا۔

"بس مجھے تو لگتا ہے' جتنا برتنا ماں باپ کے گھر اس کا لکھا تھا وہ پورا ہوا۔ اور برتنے کی بات پر یاد آیا مجھے برا نہ ماننا حلیمہ بہن وہ رجب کی برات والے دن کا واقعہ تازہ ہو گیا۔ تم نے بری میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہ چھوڑی تھی مگر ملا کیا۔ کچھ نہیں۔"

"ارے میرے بیٹے کے نصیب میں ہی نہ تھا۔" میں دل گرفتہ ہو کر بیٹھ گئی۔

"ہاں یہ تو ہے بہن۔"

"اب تو احساس ہوتا ہے اتنا دکھاوا اور نمائش کچھ کام نہ آئی الٹا اپنے گلے پڑ گئی جگ ہنسائی ہی ہوئی۔"

"ارے بھابھی حلیمہ! اب غم نہ کریں۔ وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ اللہ پاک تسلی دیتا ہے کہ میں ہی دنوں کو لوگوں کے درمیان پھیرتا رہتا ہوں۔ بس اب آپ یہ کریں کہ اپنے دل کو صاف کر لیں ہر طرح کی جلن سے اور حسد سے اور دکھاوے سے۔ یہ سب تکبر کی بھی علامت ہے اور اللہ کو بڑا ناپسند ہے۔ ہاں جو لوگوں کی نظر میں آگیا تو سبحان اللہ نہ نظر آیا تو الحمد اللہ!"

بات مکمل کر کے وہ تو کسی سے ملنے کو اٹھ گئی۔ اور مجھ پر جیسے آگہی کے در وا کر گئی۔

آ کبھی شام کے علاوہ بھی
مل کبھی کام کے علاوہ بھی

کوئی منظر ہو دیکھنے کے لیے
ان در و بام کے علاوہ بھی

دامنِ دشت میں بہت کچھ ہے
گردِ ایام کے علاوہ بھی

ایک کردار ہے کہانی کا
آدمی نام کے علاوہ بھی

زندگی کیا نہیں بہت کچھ ہے
اپنے انجام کے علاوہ بھی

اور کچھ یاد ہے تجھے غائرؔ
یار! اس نام کے علاوہ بھی

کاشف حسین غائرؔ

میرے چہرے پہ ستارے وہ چُنا کرتا تھا
میری آنکھوں کو کنول پھول کہا کرتا تھا

اس کو معلوم نہیں یاد بھی ہو کہ نہ ہو
وہ جو پیمان محبّت میں کیا کرتا تھا

مل گئی ہوں تو گنواتا ہے مجھے بے دردی
مجھ کو پانے کی شب و روز دُعا کرتا تھا

ایک سکّہ تھا محبّت کا مگر تھا کھوٹا
کاسۂ دل میں برابر جو گرا کرتا تھا

مجھ کو شدّت سے تیری یاد ستا جاتی تھی
چاند جب کاسنی بادل سے ملا کرتا تھا

ثروت ظفر

گڑیا

امّی، میری پیاری امّی
مجھ کو پیار سے کہتی تھیں
کانچ کی گڑیا سے بھی نازک میری راج دلاری
ہے!
پیار سے چوم لیا کرتی تھیں
وہ میری پیشانی کو
کہتی تھیں، قسمت بھی تیری اتنی ہی اجیاری ہے
لیکن امّی، ہو نہ سکا وہ
جو تم مجھ سے کہتی تھیں
کیسے غزل میں انہیں بتاؤں
کانچ کی گڑیا ٹوٹ گئی ہے
اجیاری قسمت والی پہ رات بڑی اندھیاری
ہے!

غزالہ جلیل راؤ

درد کے پھول بھی کھلتے ہیں بکھر جاتے ہیں
زخم کیسے بھی ہوں، کچھ روز میں بھر جاتے ہیں

راستہ روکے کھڑی ہے یہی اُلجھن کب سے
کوئی پوچھے تو کہیں کیا کہ کدھر جاتے ہیں

چھت کی کڑیوں سے اُترتے ہیں مرے خواب مگر
میری دیواروں سے ٹکرا کے بکھر جاتے ہیں

نرم الفاظ، بھلی باتیں، مہذّب لہجے
پہلی بارش ہی میں یہ رنگ اُتر جاتے ہیں

اس دریچے میں بھی اب کوئی نہیں اور ہم بھی
سر جھکائے ہوئے چُپ چاپ گزر جاتے ہیں

جاوید اختر

صبا سحر

سرما کی مسکراہٹیں

مستقل مزاجی

ایک محفل میں ایک شخص کی ملاقات اپنی سابقہ بیوی سے ہوگئی۔ ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد اس نے تجویز پیش کی۔

''ہم دونوں کو دوبارہ شادی کرلینا چاہیے۔''

سابقہ بیوی یہ سنتے ہی بھڑک اٹھی۔ ''تم سے دوبارہ شادی کرے میری جوتی... میں پھر اس عذاب میں مبتلا ہونا نہیں چاہتی۔'' سابقہ بیوی کے تیور دیکھ کر وہ گھبرا گیا اور دھیمے لہجے میں بولا۔

''خدا کی قسم! تمہاری مستقل مزاجی قابل داد ہے۔ ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی۔''

کومل عدنان۔ ملیر

نایاب

ایک شخص نے دکاندار سے پوچھا۔ ''کیا آپ پرانی چیزیں خریدتے ہیں؟''

''جی ہاں! میرا یہی کاروبار ہے۔'' دکاندار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس نپولین کے زمانے کا ایک نایاب ٹائپ رائٹر ہے۔'' اس شخص نے بتایا۔

دکاندار نے حیرت سے کہا۔ ''لیکن نپولین کے زمانے میں تو ٹائپ رائٹر ایجاد ہی نہیں ہوا تھا۔''

''اس لیے تو نایاب ہے۔'' اس شخص نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

فریال صلاح الدین۔ میٹرو ول

تعاون

چندہ مانگنے والے افراد ایک کنجوس کے پاس پہنچے اور اس سے کہا۔ ''ہم گاؤں والوں کے لیے ایک تالاب بنانا چاہتے ہیں۔ اس لیے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔''

''ہاں... ہاں... تالاب کی واقعی بہت ضرورت ہے۔'' پھر کنجوس نے اپنے بیٹے کو آواز دے کر کہا۔ ''ان لوگوں کو تالاب کے لیے دو بالٹی پانی دے دو۔''

لبنیٰ اسلم۔ ہجرت کالونی

بد قسمتی

ایک صاحب نے اپنے دوست کو بتایا۔ ''بد قسمتی کبھی کبھی عجیب انداز میں انسان پر حملہ آور ہوتی ہے۔''

دوست نے تشویش سے پوچھا۔ ''کیوں... کیا کوئی حادثہ پیش آگیا؟''

''کل میں دس ہزار روپے کا ایک چیک کیش کرانے بینک گیا۔ بینک والوں نے کہا کہ میں اپنی شناخت کے لیے کسی سے گواہی دلواؤں کہ چیک پر جو نام لکھا ہے، وہ میرا ہی ہے۔ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو مجھے بینک میں اجمل صاحب نظر آئے، جو مجھے جانتے تھے۔'' ان صاحب نے بتایا۔

''مگر اس میں بد قسمتی کی کیا بات ہے؟'' دوست نے حیران ہو کر پوچھا۔

''میں اجمل صاحب کا دس ہزار روپے کا مقروض تھا اور گزشتہ ایک سال سے ان سے منہ چھپائے پھر رہا تھا۔'' ان صاحب نے بے بسی سے کہا۔

مدیحہ احمد۔ گلشن اقبال

بونس

ایک میڈیکل اسٹور والے نے پیک شدہ سینڈوچز بھی فروخت کے لیے کاؤنٹر پر رکھنا شروع کردیے تھے۔ ایک روز پڑوسی دکاندار نے پوچھا۔ ''سینڈوچز کی سیل کیسی جارہی ہے؟''

''ان کی وجہ سے میری ان ڈائریکٹ سیل بہت بڑھ گئی ہے۔'' میڈیکل اسٹور کے مالک نے بتایا۔

''ان ڈائریکٹ سیل... کیا مطلب؟'' پڑوسی دکاندار نے وضاحت چاہی۔

''جب سے میں نے سینڈوچز رکھنے شروع کیے ہیں ہاضمے کی گولیوں کی فروخت بہت بڑھ گئی ہے۔'' میڈیکل اسٹور والے نے بتایا۔

نمرہ رزاق۔ ڈیفنس

قابل دید

ایک دیہاتی کے پاس نئی فصل کے بعد کچھ زائد رقم آگئی تو اسے شہر جاکر ہوٹل میں ٹھہرنے کا شوق چرایا۔ شہر کے ایک ہوٹل میں پہنچ کر وہ لابی سے گزرتا ہوا استقبالیہ کاؤنٹر تک پہنچا تو قالین پر اس کے قدموں کے نشانات ثبت ہوتے چلے گئے۔ استقبالیہ کلرک ذرا بدمزا ہو کر بولا۔

''جناب! اگر آپ کے جوتوں کے نیچے اتنی مٹی لگی تھی تو اسے دروازے پر پڑی میٹ پر صاف کرلیتے۔''

''جوتے...؟'' دیہاتی نے حیرت سے اپنے پیروں کی طرف دیکھا۔ ''جوتے کس کمبخت نے پہنے ہوئے ہیں۔''

رخسار ظفر۔ لاہور

بچے ہمارے عہد کے...!

ایک پرائمری اسکول کے ٹیچر نے مناسب سمجھا کہ اپنے شاگردوں کو بجلی کے بارے میں بتانے کے لیے روزمرہ زندگی میں سے مثالیں دی جائیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک شاگرد کو کھڑا ہونے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''فرض کرو کہ میں پنکھے کا بٹن دباتا ہوں، لیکن پنکھا نہیں چلتا تو اس کا کیا مطلب ہے؟''

شاگرد نے جواب دیا۔ ''سر! یہی کہ آپ نے بجلی کا بل ادا نہیں کیا۔''

اقصیٰ شہباز۔ سلطان آباد

تلاش

زبیدہ نے اپنی سہیلی خالدہ سے کہا۔ ''تم اپنے آفس کے ساتھی خرم سے شادی کیوں نہیں کرلیتیں؟ اچھا لڑکا ہے اور تم سے شادی کرنے کا خواہش مند بھی ہے۔''

''میں کسی ایسے شخص سے شادی کروں گی جو زندگی کی اونچ نیچ سمجھتا ہو۔ جس میں دکھ درد برداشت کرنے کا حوصلہ ہو۔'' خالدہ نے اپنا نقطہ نظر پیش کیا۔

''اچھا... اچھا... میں سمجھ گئی۔'' زاہدہ نے تفہیمی انداز میں سرہلایا۔ ''تمہیں کسی رنڈوے کی تلاش ہے۔''

انیلا سرفراز۔ لاہور

شکایت

خاتون خانہ نے دودھ والے سے شکایت کی کہ وہ کافی دنوں سے بہت پتلا دودھ لا رہا ہے۔ باتونی اور چرب زبان دودھ والے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بے چاری بھینسوں کو کھانے کے لیے اچھی گھاس تو مل نہیں رہی۔ پھر وہ اچھا دودھ کیسے دے سکتی ہیں۔ وہ بے چاریاں تو اپنے دودھ کے معیار پر خود بہت شرمندہ ہیں لیکن وہ مجبور ہیں۔ آپ شاید یقین نہ کریں کہ وہ دودھ دیتے وقت آٹھ آٹھ آنسو روتی ہیں۔''

"اچھا... مگر تم اتنی کوشش ضرور کیا کرو کہ ان کے آنسو دودھ کی بالٹی میں نہ گریں۔" خاتون خانہ جل کر بولیں۔

فاطمہ احسن۔ ڈیفنس

جہاندیدہ

جیولری کی دکان میں ایک نوجوان نے ہیرے کی قیمتی انگوٹھی منتخب کی پھر جیولر سے فرمائش کی اس پر باریک الفاظ میں کندہ کردیں۔ "اختر کی طرف سے.... شبانہ کے لیے۔"

جیولر نے ادھر ادھر دیکھا پھر نیچی آواز میں ہمدردانہ لہجے میں بولا اگر برا نہ مانو تو ایک مشورہ دوں 'انگوٹھی پر تم صرف یہ الفاظ کندہ کروالو "اختر کی طرف سے...."

ارونا شیخ۔ کورنگی

فضول موضوع

دو لڑکیاں گپ شپ کے لیے ایک جگہ بیٹھیں تو تیسری لڑکی سمیرا کا ذکر آگیا۔ ایک لڑکی بولی "میرے خیال میں تو سمیرا بہت اچھی لڑکی ہے۔ کم از کم مجھے تو اس کے بارے میں کوئی بری بات معلوم نہیں۔"

دوسری لڑکی فوراً بولی "تو پھر کسی اور لڑکی کی بات کرتے ہیں۔"

فائزہ۔ لیبر اسکوائر

تصدیق

ارم نے اپنی دوست فرخندہ کو بتایا۔ "میرا منگیتر فاروق انتہائی بھلکڑ واقع ہوا ہے۔"

"واقعی... اس میں کوئی شک نہیں۔" فرخندہ نے تصدیق کی۔ "کل مہندی کی ایک تقریب میں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ مجھے اس کو بار بار یاد دلانا پڑا کہ اس کی منگنی مجھ سے نہیں، تم سے ہوئی ہے۔"

بے بی ماہم۔ اورنگی ٹاؤن

اچھی خبر

نیویارک میں رہنے والا ایک پاکستانی بہت خوش خوش اپنے فلیٹ میں داخل ہوا اور اپنی بیوی (جو کہ اس وقت کچن میں کھڑی برتن صاف کررہی تھی) سے کہا۔

"بیگم! آج سے ہمیں امریکی شہریت مل گئی ہے۔ آج سے ہم لوگ پاکستانی نہیں، بلکہ امریکی کہلائیں گے۔"

"کتنی خوشی کی بات ہے۔" بیگم برتن چھوڑ کر باورچی خانے سے باہر آئی اور بولی۔ "تم نے بڑی اچھی خبر سنائی۔ آج سے برتن دھونے اور کچن صاف کرنے کی ذمہ داری تمہاری ہیں میں ذرا سیر کرنے باہر جارہی ہوں۔"

کنول نوید۔ باغبان پورہ

بوجھ

لفٹ میں بہت سارے لوگ سوار ہوگئے تو لفٹ آپریٹر نے درخواست کی کہ ایک فرد لفٹ سے اتر جائے۔ ایک نہایت موٹی خاتون نے ایثار کا مظاہرہ کیا اور اتر گئیں۔ لفٹ آپریٹر نے بٹن دبایا اور لفٹ اوپر روانہ ہوگئی لفٹ کے واپس آنے کا انتظار کرنے والے لوگوں کی نظریں اپنے اوپر محسوس کرکے خاتون نے قدرے جھینپ کر کہا۔

"میرا وزن اتنا زیادہ نہیں کہ لفٹ میری وجہ سے رک گئی تھی.... دراصل آج میرے ذہن پر بہت بوجھ ہے۔"

فرحت شاکر۔ کورنگی

شگفتہ جاہ

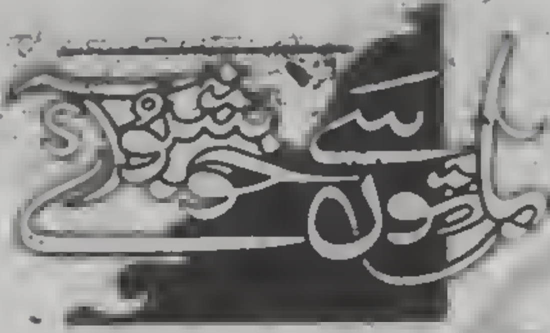

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت انس بن مالک رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"معراج کی رات میں نے جنت کے دروازے پر لکھا ہوا دیکھا۔ صدقے کا ثواب دس گنا ہے اور قرض کا اٹھارہ گنا۔ میں نے کہا "اے جبرئیل کیا وجہ ہے کہ قرض صدقے سے بھی زیادہ فضیلت کا حامل ہے؟"

انہوں نے کہا "اس لیے کہ سائل (بعض اوقات) سوال کرتا ہے حالانکہ اس کے پاس (اس کی ضرورت کا مال) موجود ہوتا ہے جبکہ قرض لینے والا ضرورت (اور مجبوری) کی حالت ہی میں قرض لیتا ہے (کیونکہ قرض کی واپسی تو ضروری ہے' اس لیے مجبوری کے وقت ہی لیا جاتا ہے)

قرض کی ادائیگی،

ایک بار سیدہ عالم حضرت فاطمۃ الزہرا رض کو بخار آگیا۔ وہ رات سیدہ رض نے سخت بے چینی میں کاٹی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی ان کے ساتھ جاگتے رہے۔ پچھلے پہر دونوں کی آنکھ لگ گئی۔

اذان کے وقت حضرت علی رض بیدار ہوئے تو دیکھا کہ حضرت فاطمہ رض وضو کررہی ہیں۔ وہ بھی نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد چلے گئے۔ مسجد سے تشریف لائے تو دیکھا کہ سیدہ فاطمہ رض حسب معمول چکی پیس رہی تھیں۔

انہوں نے کہا۔

"سیدہ آپ کو اپنے حال پر رحم نہیں آتا۔ رات بھر آپ کو بخار رہا۔ اب بھی آپ کا چہرہ تمتما رہا ہے۔ صبح اٹھ کر آپ نے ٹھنڈے پانی سے وضو کیا اور اب چکی پیسنے کی زحمت اٹھا رہی ہیں۔ اس سے مرض بڑھ جائے گا۔" سیدہ فاطمہ رض نے سر جھکا کر کہا۔

"اگر میں اپنے فرض کی ادائیگی میں مر بھی جاؤں تو میں انتہا سے زیادہ خوش ہوں گی۔ میں نے وضو کیا۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لیے، چکی پیسی آپ کی اطاعت اور بچوں کی پرورش کے لیے۔"

کوشش،

انسان موت سے بچنے کی کوشش کرتا ہے جہنم سے نہیں حالانکہ کوشش کرنے سے انسان جہنم سے بچ سکتا ہے لیکن موت سے نہیں۔

ثمرین اکرام۔ میرپور خاص

زندگی،

انسان کی زندگی کتاب کے تین صفحات کی طرح ہے۔ پہلا صفحہ "پیدائش" آخری صفحہ "موت" اور درمیانی صفحہ خالی ہے۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ اس درمیانی صفحے کو کیسے پر کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے؟

نمرہ۔ کراچی

وغیرہ... وغیرہ،

، مواقع نکل جاتے ہیں، مگر مواقع ختم نہیں ہوتے۔

، جڑیں سلامت ہوں تو ٹنڈ منڈ درختوں پر بھی موسم بدلتے ہی پھول آجاتے ہیں۔

، اپنے اندر روگ مت پالیے' اس دنیا میں آپ

ایک ہی تو ہیں۔
- نئی بنیادیں وہ لوگ بھر سکتے ہیں جو اس راز سے واقف ہوں کہ پرانی بنیادیں کیوں بیٹھ گئیں۔
- زخم لگتا ہے تو انسان تڑپ کر اللہ کی طرف مڑتا ہے یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب کسی کو خود آگہی ودیعت کی جاتی ہے۔
- خواب زندگی کی دلیل ہیں۔ انہیں کبھی ہارنے مت دینا۔

آمنہ اُجالا۔ ڈہرکی

اقوالِ حضرت علیؓ

- جب اللہ تعالیٰ خوشحالی عطا کرے تو اپنی آرزوؤں کو مت بڑھاؤ۔
- مجھے اس دُنیا سے کیا لینا جس کے حلال میں حساب ہے حرام میں عذاب ہے۔
- عالم جاہل کا حال جانتا ہے کیونکہ وہ جاہل رہ چکا ہوتا ہے لیکن جاہل عالم کا حال نہیں جانتا کیونکہ وہ عالم نہیں رہا ہوتا۔
- خوش اخلاق لوگوں سے خوش اخلاقی سے پیش آنا کمال نہیں بلکہ بداخلاق لوگوں سے خوش اخلاقی سے پیش آنا کمال ہے۔
- انسان دُکھ نہیں دیتے ان سے وابستہ امیدیں دُکھ دیتی ہیں۔
- اچھے لوگوں کی صحبت سے اچھائی حاصل ہوتی ہے جیسے ہوا خوشبو سے گزرتی ہے تو خوشبودار ہو جاتی ہے۔
- نادان دولت کے لیے دل کا چین لٹا دیتے ہیں اور دانش مند دل کے چین کی خاطر دولت لٹا دیتے ہیں۔
- عظیم ہیں وہ لوگ جو شہادت کا انتخاب کرتے ہیں لیکن ان سے بھی عظیم وہ ہیں جن کا انتخاب شہادت خود کرتی ہے۔
- انسان کا سب سے بڑا نقصان کسی کی نظر سے گر جانا ہے۔
- لمبی رات مومن کے لیے تحفہ ہے عبادت کا اور چھوٹا دن روزے کے لیے سازگار ہے۔
- استاد بادشاہ نہیں ہوتا مگر بادشاہ بنا دیتا ہے۔

نوال افضل گھمن۔ گجرات

کچھ پھول چُنے ہیں

- پیسہ کہتا ہے مجھے حاصل کرو اور باقی سب کو بھلا دو۔ وقت کہتا ہے میرے پیچھے بھاگو باقی سب چھوڑ دو۔ مستقبل کہتا ہے میرے لیے کوشش کرو باقی سب بھلا دو لیکن صرف میرا اللہ کہتا ہے کہ مجھے یاد کرو میں سب کچھ تمہارے قدموں میں ڈال دوں گا۔
- کوئی پیار کرنے والا اگر دُکھ دے اور آپ کی آنکھوں میں آنسو آجائیں تو اس یقین کے ساتھ اپنے آنسو صاف کر لینا کہ اس پل وہ تم سے کہیں زیادہ دُکھی ہو گا۔

حافظہ سمیرا۔ 157۔ این بی

حسنِ سلوک

ایک دفعہ بغداد کے خلیفہ معن نے کچھ لوگوں کو قید کیا۔ جب ان لوگوں کو جلاد کے سامنے لایا گیا تو وہ لوگ معن کی طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے۔

"اللہ تیرا بھلا کرے، تو بھوک اور پیاس کی حالت میں ہم کو قتل مت کر۔ اللہ کی قسم، اس قسم کا سلوک امیر المومنین کے شایانِ شان نہیں۔"

معن نے اسی وقت کھانا پانی لانے کا حکم دیا۔ وہ قیدی کھاتے رہے تھے اور معن انہیں دیکھ رہا تھا جب وہ کھانا کھا کر فارغ ہو گئے تو معن سے کہنے لگے۔

"اے امیر! اللہ آپ کی عمر دراز کرے۔ ہم اس وقت تک قیدی تھے لیکن اب مہمان ہو گئے۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ آپ مہمانوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔"

معن نے اسی وقت ان کو معاف کر دیا۔

گہرِ آبدار

- بعض اوقات سچ کا بیان بے ربط ہونے کی وجہ سے بے معنی ہو کر اپنا اصل مفہوم بھی کھو دیتا ہے۔
- کامیابی ایک خوبصورت تتلی ہے۔ جو اُڑتی ہے تو لوگ بچوں کی طرح اس کے پیچھے بھاگتے بھاگتے بہت دُور جا پہنچتے ہیں، انجام وہی کہ انسان اپنوں سے بچھڑ کر خود سے بھی بچھڑ جاتا ہے۔
- آنکھ دل کا دروازہ ہے۔
- اضطراب بے سبب نہیں ہوتا، بلکہ بھولا ہوا سبق، چھوڑی ہوئی منزل اور نظر انداز کیے ہوئے فرائض یاد دلاتا ہے۔
- انسان کی زندگی اُس شمع کی مانند ہے جو ہوا میں رکھی ہو۔
- حکمت ایک پھل ہے۔ جو کہ دل سے اُگتا ہے۔

حرا قریشی۔ ملتان

تحمل

مسلم بن زیادؒ ایک بار دعوت میں کافی دیر سے پہنچے تو میزبان نے کہا کہ کھانا ختم ہو چکا ہے اور اب کچھ باقی نہیں رہا ہے۔

مسلمؒ نے کہا۔ "دیگوں میں کچھ لگا ہو تو دے دو، وہی صاف کر لوں گا۔"

میزبان نے بتایا کہ دیگیں دھوئی جا چکی ہیں۔

آپ نے کہا۔ "دیکھو، شاید روٹی کا کوئی ٹکڑا بچا ہو۔"

میزبان نے پھر معذرت کی۔ "کچھ نہیں بچا۔"

حضرت مسلم بن زیادؒ واپس چلے آئے۔ کسی نے ان سے دریافت کیا۔

"آپ کو میزبان کے اس سلوک پر غصہ نہیں آیا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اس شخص نے نیک نیتی سے بلایا تھا، میں چلا گیا۔ اس نے نیک نیتی سے واپس کیا، میں لوٹ آیا۔ بھلا اس میں غصہ ہونے کی کیا بات ہے۔"

آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

صدقہ خیرات کی برکت

ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر جا رہے تھے۔ راستے میں ایک شخص نے درخواست کی۔

"اے نبی اللہ! مجھے اپنی پیدائش سے آج تک کبھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوا۔ آپ اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں کہ میرے مقدر کا تمام رزق ایک ساتھ ہی عطا کر دے تاکہ چند دن تو میں پیٹ بھر کر کھانا کھا سکوں۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دُعا فرمائی جو بارگاہِ الٰہی میں قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اس شخص کا کل رزق عطا کر دیا جائے گا اور وہ صرف پندرہ دن میں ختم ہو جائے گا۔"

ایک سال بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام ادھر سے گزرے تو اس شخص کو نہایت عیش و عشرت اور خوشحالی میں پایا۔ آپؑ کو بڑا تعجب ہوا۔ انہوں نے عرض کیا۔

"اے باری تعالیٰ! تیرا فرمانا تو یہ تھا کہ یہ شخص پندرہ یوم میں اپنی قسمت کا تمام رزق ختم کر لے گا لیکن سال گزرنے کے باوجود اس کا رزق بجائے ختم ہونے کے اور بڑھ رہا ہے۔"

غیب سے ندا آئی۔ "اے موسیٰ! بے شک تم نے درست کہا لیکن یہ شخص ہمارے دیے ہوئے اس رزق میں سے لوگوں کی مدد کرنے لگا۔ وہ غریبوں اور مسکینوں کو اللہ کی راہ میں دیتا ہے اور اللہ کے حکم کی پابندی کرتا ہے۔ اس نے صدقہ و خیرات کو شعار بنا لیا ہے اس کے رزق کے بدلے ہم اسے دس گنا زیادہ دیتے رہے اور اس کا رزق اس وقت تک بڑھتا رہے گا جب تک وہ اس عمل کا اعادہ کرتا رہے گا۔"

خالدہ جیلانی

کھلتا کسی کا کیوں میرے دل کا معاملہ

سفینہ ناز سہتو ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ملتان

آج آخری سطروں میں کہیں نام ہے اُس کا
احباب کی فہرست میں پہلا تھا جو ایک شخص

سونیا رہانی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ قاضیاں محلہ بالا

ہر سمت کو پھیلی ہے محبت کی زمیں
در پا میرے اظہار کا کس سمت کو جائے
ابر آر نئے سال کی دہلیز پر بیٹھے
تجھ کو ترے ماضی کا کوئی خواب سنائے

سورٹھ ساند ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ روحل والی گاؤں

جس کی عہدِ نا منصفی میں ظلم نے پایا عروج
اُس پر میرے ملک میں پھولوں کی بارش کی گئی

فارحہ اقبال ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کراچی

تمہیں یاد بھی نہ ہوگا، وہ جو کہہ کے دل لیا تھا
مرے بس میں کاش ہوتا جو سنا تھا بھول جاتا
نہیں تم سے کوئی شکوہ مگر ایک التجا ہے
جو بنا رہے ہو حالت، کبھی آ کے دیکھ لینا

نفیسہ نواز گیلانی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ منڈی بہاؤالدین

تنقید گلے شکووں کے پہرے میں کھڑا ہے
دل آج بھی چاہت کے کٹہرے میں کھڑا ہے
یہ گردشِ ایام تو اس پہ بھی ہے گزری
خود آج کسی دَور سنہرے میں کھڑا ہے

سمیرا نورین ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لاہور

جُدا کر کے اُسے خود سے میں گھر آ کر بہت رویا
جہاں جاتے تھے ہم دونوں وہاں جا کر بہت رویا
میں پہلے اُس کا رونا سوچ کر ہنستا رہا پہروں
میں پھر اُس کی ہنسی کو ذہن میں لا کر بہت رویا

ملائکہ کوثر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بسم اللہ پور

ماں تیرے بعد بتا، کون لبوں سے اپنے
وقتِ رخصت میرے ماتھے پہ دعا لکھے گا

کوثر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میاں چنوں

سردیوں کا موسم ہے برفیلی ہوائیں ہیں
سال نو آچکا ہے، جنوری کی شامیں ہیں
اُداسیوں میں لیے ہوئے ماہ و سال گزرتے ہیں
چلے آؤ کہ صدیوں سے ترستی ہوئی نگاہیں ہیں

شگفتہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ایبٹ آباد

رونے سے ملال گھٹ گیا ہے
بادل تھا برس کے چھٹ گیا ہے

نمرہ، اقراء ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کراچی

ہمیں خبر ہے کہ وہ آج رات روئے ہیں
کہ ان کے شہر سے جھونکے ہوا کے نم آئے

مہک علی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لاہور

بات کھلنے پر وہ لے بیٹھا پرانی رنجشیں
ایسا لگتا ہے کہ وہ مجھ سے خفا پہلے سے تھا

صومیہ نذیر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہری پور

تو ہے سورج تجھے معلوم کہاں رات کا دکھ
تو کسی روز میرے گھر میں اُتر شام کے بعد

ظل ہما ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ فیصل آباد

یہ چمن ویران ہے اب تک شگوفے کھل نہیں پائے
بڑی تاخیر کر دی ہے کسی نے مسکرانے میں

سائرہ مجید ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ فیصل آباد

کتابیں بھی بالکل میری طرح ہیں
الفاظ سے بھرپور مگر خاموش

نوال افضل گھمن ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ گجرات

روٹھا تو شہرِ خواب کو غارت بھی کر گیا
پھر مسکرا کر تازہ شرارت بھی کر گیا
دل کا نگر اُجاڑنے والا ہنر شناس
تعمیر حوصلوں کی عمارت بھی کر گیا

شعاع کے ساتھ

ادارہ

شاہ جہاں گل.... مرزا پور

1 ۔ شعاع سے وابستگی کو اتنا ہی عرصہ گزرا ہے۔ جتنا عرصہ میرے بچپن کو گزرا ہے۔ یہ ہماری امی کے جہیز کے سامان میں ایک خوب صورت بناوٹ کا چھوٹے سائز کا سوٹ کیس نما بکسا تھا۔ دل چاہتا تھا کسی طرح یہ مجھے مل جائے۔ کھلونے اور گڑیا رکھنے کے لیے خوب صورت بکسا تھا۔ ایک دن امی سے مانگ بھی لیا۔ امی نے جواباً" کہا۔

"میں اس میں خواتین‘ شعاع اور کرن لائی تھی۔"

یقیناً" اچھی اور قیمتی کتابیں ہوں گی جو اتنی سنبھال کر رکھی گئی تھیں۔ میں نے شمارے نکال کر پڑھنے شروع کیے۔ تب اقبال بانو‘ بشریٰ رحمان‘ لبنیٰ غزل‘ رضیہ بٹ‘ مہر تاباں‘ سیما مناف‘ بانو قدسیہ‘ غزالہ نگار اور کرنی کی تحریریں آتی تھیں۔ مگر اتنی تمیز نہیں تھی کہ کہانی پڑھ کر رائٹر کا نام یاد رکھیں۔ یا رائٹر کے نام کے ساتھ اس کی تحریر کا نام یاد رہ سکے۔ ان دنوں کی بہت سی تحریریں مجھے اب تک یاد ہیں جن میں ایک مکمل ناول تھا۔ رائٹر پتا نہیں کون تھیں۔ ناول کا نام البتہ۔ "عذاب‘ سراب‘ سحاب‘ گلاب" تھا۔ بہت ہی خوب صورت ناول تھا۔ دکھ سکھ کا ذائقہ لیے۔ جس کا اینڈ مجھے اسی خوب صورت تصور کے ساتھ یاد ہے جیسا میں نے ان دنوں پڑھ کر محسوس کیا تھا۔

(ڈیر نازیہ! وہ کتاب اور بکسا ماضی کی باتیں ہیں۔ سو پرانے ڈائجسٹوں کو مانگنے کے لیے اپنی ستر عدد خالا زاد بہنوں کو میری طرف روانہ مت کرنا پلیز۔)

ہمارے گاؤں میں دو خاندان شعاع‘ کرن اور خواتین کے قاری ہیں۔ ایک خاندان ہمارا جس میں مجھ سمیت چھ بہنیں‘ امی بھابھی شامل ہیں۔ دوسرا خاندان میری دوست فوزیہ‘ نازیہ اور اس کی ستر خالہ زاد بہنوں کا ہے۔ اکثر و بیشتر ایک دوسرے سے شمارے لیا کرتے ہیں اور اکثر اس معاملے پر تکرار بھی ہو جاتی ہے۔

"میرا فلاں شمارہ تمہاری طرف ہے۔ بھجوا رہی ہو یا سی آئی ڈی ٹیم کو زحمت دوں؟" ادھر سے ہماری دجیہہ فرماتی ہیں۔

"اور وہ جو تم نے فلاں مہینے والے شمارے کا ٹائٹل کسی بھینس کو کھلا دیا تھا۔ وہ...." ادھر سے مائرہ کا جوابی بارود پھینکا جاتا ہے۔

فوزیہ‘ نازیہ اور میں ان ستر چھوکریوں کی صلح کرواتے کرواتے نیم پاگل ہو گئی ہیں۔ پاگل پن کا ثبوت میں بھی اکثر دیے ہی جاتی ہوں۔ ایک بار میں نے فوزیہ سے دکھڑا رو دیا۔

"یہ صحیح نہیں ہے یار! تمہاری طرف سے جب بھی ڈائجسٹ واپس آتا ہے بغیر ٹائٹل کے ہوتا ہے۔"

"ہماری طرف طوفانی ہوائیں چلتی ہیں‘ اڑ جاتے ہیں‘ کیا کریں...." دوسری طرف سے شان بے نیازی سے جواب دیا گیا۔

"طوفانی ہوائیں تمہارا کچھ نہیں بگاڑتیں؟" میں بگڑ گئی۔

"ہم ستون کو پکڑ کے بیٹھے ہوتے ہیں۔"

فوزیہ کے جواب پر ہنسی آ ہی گئی۔

سامنے والی مائرہ کے پاس ہم سب سے پہلے شمارہ آجاتا ہے۔ اس لیے اترانے کے لیے وہ سب سے آگے ہوتی ہے۔ جب تک ہماری طرف ڈائجسٹ آئیں تب تک وہ اکثر شاموں کو اپنی چھت پر آکر قسط وار ناولوں کے اہم مقام‘ جملے ہمارے کانوں میں انڈیلتی رہتی ہے۔ کہانی کا سارا کریز اور چارم نکالنا کوئی مائرہ سے سیکھے۔

2 ۔ دن کا آغاز فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد ایک دوسرے کی طرف دیکھتے بھی نہیں۔ دوبارہ سے بستروں پر لمبے ہو جاتے ہیں۔ سو اماں تلاوت میں‘ امی تسبیح پڑھنے میں اور میں پاکستانی گیت غزلیں گنگناتی ناشتا بنانا شروع کر دیتی ہوں۔ باقی سب ایک گھنٹے کی نیند لینے کے بعد آدھی بند آدھی کھلی آنکھوں اور خاصے مشکل تاثرات کے ساتھ ناشتا کرنے کچن میں آتے ہیں۔

تھوڑی ہی دیر میں امی اور کنول ناشتا کر کے تیار ہونے کے بعد اسکول روانہ ہو جاتی ہیں۔ (پڑھانے) دجیہہ صفائی کا کام کرنے کے بعد سلائی سیکھنے۔ اماں دوسرے بیٹے کے گھر کا چکر لگانے نکل جاتی ہیں۔ باقی کا کام میں اور کرن مل کر نپٹاتے ہیں۔

بھابھی نے دوپہر کے کھانے کی تیاری کرنی ہوتی ہے۔ پر یہ بھی سچ ہے کہ زیادہ تر کام باقی بہنیں اور بھابھی ہی کرتی ہیں۔ میں کم ہی کرتی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ جب میرے افسانے کے بارے میں رائے دیتے کہا گیا تھا۔

"آپ نے کہانی پر توجہ نہیں دی۔" یہی جملہ دجیہہ نے فون پر آپا کو فارورڈ کیا تو انہوں نے بے ساختہ کہا تھا۔

"تم بولو نا کہ یہ گھر پر توجہ نہیں دیتی تو کہانی پر کیسے دے گی؟" (آپا بھی ناں)

جناب ایسی بھی بات نہیں۔ کام کرنا مجھے پسند ہے۔ بقول اماں کے جب تمہیں کام کرنے کا جن چڑھتا ہے تو تم باقی سب کو پیچھے چھوڑ دیتی ہو۔

میرے کام کرنے میں صفائی بھی بہت ہوتی ہے اور تیزی بھی۔ بس مستقل مزاجی نہیں ہوتی۔

ظہر کی نماز کے بعد ہم سب دوبارہ سے اکٹھا ہونا شروع ہوتے ہیں اور کھانا کھانے کے بعد کوئی پلنگ پر بستروں سے ٹیک لگائے۔ کوئی کچن میں رکھی چیئر پر بیٹھ کر‘ کوئی بھابھی کے کمرے میں بیڈ پر لیٹ کر... کوئی برآمدے میں رکھے چھوٹے سائز کے بیڈ پر بیٹھ کر شعاع کا مطالعہ کرتی ہیں۔ شام کی چائے کے بعد عصر کی نماز... اور گپ شپ کے بعد مغرب کی نماز کی تیاری... رات کا کھانا کنول کی ذمہ داری ہے۔ (ہم آزاد ملک کے حد سے زیادہ آزاد شہری ہیں۔)

عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد ہمیں فرصت ہی فرصت ہوتی ہے۔ صرف ہمیں کیونکہ دادی سو چکی ہوتی ہیں۔ امی درود و وظائف میں مصروف۔ بھابھی اپنے روم میں‘ بھائی لوگ باہر اور بابا اپنے کمرے میں ہوتے ہیں۔ گھر کی کوئی ایک جگہ ہوتی ہے جس میں ہم چار بہنیں ہوتی ہیں۔ ریڈیو پر مختلف ایف ایم چینلز... شعاع‘ چائے اور بے سری و بے تکی باتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔

"کچھ اس ادا سے آج وہ پہلو نشیں رہے۔"

عابدہ پروین کی غزل سننے میں گم ہونے ہی لگتی ہوں کہ اچانک کنول کا جملہ کانوں میں پڑتا ہے۔

"میں عابدہ پروین کے بچپن کی تصویر دیکھنا چاہتی ہوں۔" (لو... اور سنو۔)

دوسرے چینل پر کوئی گانا آرہا ہوتا ہے۔

"ہم آدھی رات کو اٹھ اٹھ کر تجھے یاد کرتے ہیں۔"

"آدھی نیند کرنے کے بعد یعنی فریش ہو کر پھر یاد کرنے لگتے ہیں۔" یہ کرن کا تبصرہ ہوتا ہے۔

کسی تیسرے چینل پر لائیو کالز کا پروگرام آرہا ہو تو پھر مل کر کالرز کے لہجوں اور آوازوں کی نقل اتارتے ہیں۔ بہت ہنستے ہیں۔ ساتھ ساتھ دجیہہ زونگ کے فری منٹس پر آپا‘ امی اور کزنز سے گپ لگاتی ہے۔ گھر کے اس حصے میں اک ہڑبونگ مچی ہوتی ہے۔ نہ تھمنے والا شور... بھابھی شامل ہو جائیں تو سونے پہ سہاگہ... وہ ہماری چچا زاد بھی ہیں‘ سو کوئی احتیاط کوئی جھجک بچ

میں نہیں رہتی۔
آوازوں اور شور کا یہ انداز ہوتا ہے کہ جیسے ابھی صبح طلوع ہوئی ہو۔ رات کچھ اور سرکتی ہے تو خاموشی ہونے لگتی ہے۔ ریڈیو آف..... فون بند..... باتیں ختم۔
پھر ہر کسی کے ہاتھ میں شعاع ہوتا ہے اور بہت بار پڑھے شماروں کو پڑھتے پڑھتے ایک کے بعد ایک سونے لگتی ہیں، وہ بھی جلد سونے پر بابا کی لمبی تقریر سننے کے بعد۔ صبح جلد اٹھنے والی تقریر..... جو اماں اور امی صبح اٹھاتے وقت کرتی ہیں۔

3۔ یوں تو شعاع کی بہت سی تحریریں ہیں۔ مگر پرانے ڈائجسٹ آپی کی طرف ہیں۔ سو مجھے بہت ساری تو نہیں، مگر کچھ یاد ہیں۔ ہر تحریر اپنی نوعیت کے حساب سے بہت پسند آئی۔ یہ بازی کس نے ہاری ہے۔ ضائمہ اکرم چوہدری، حصار محبت، فائزہ افتخار، بہت عرصہ بعد میں نے مزاحیہ تحریر پڑھی تھی۔ بہت انجوائے کیا تھا۔ "ملنے کی گھڑی جو ٹھہری ہے۔" سعدیہ عزیز آفریدی..... دکھ سکھ کی چاشنی اور کھٹاس لیے۔ دھنک رنگ موسم نگہت سیما، مغنی اور رما والی کہانی، توبہ شکن بانو قدسیہ کی گہرائی لیے تحریر اور آج کل جنت کے پتے کے علاوہ میں نے کوئی قسط وار ناول نہیں پڑھا۔ کیونکہ ناول مکمل ہو جائیں تو بھائی ہمیں کتابی صورت میں لا دیتے ہیں۔ بھئی بہت ساری کہانیاں، ناول، کیا لکھیں اور کیا چھوڑیں، بس اتنا کافی ہے۔
4 ۔ اپنی خامیاں اور خوبیاں جاننے کے لیے سب سے پہلے اپنی دوست عائشہ فیاض سے رابطہ کیا جو میری بچپن کی سنگی ساتھی سہیلی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ خوبی تم میں یہ ہے کہ جی جان سے بھروسے کے لائق ہو۔ اچھے دوست کھونا نہیں چاہتیں۔ خامی یہ ہے کہ حد سے زیادہ انا پرست ہو، خاصی بدمزاج اور بدتمیز بھی۔ انا پرستی، بدمزاجی اور بدتمیزی پر اب خاصا کنٹرول کر لیا ہے۔ مگر عائشہ کے سامنے ہرگز نہیں ہو پاتا۔ کیونکہ اس نے میرے ناز نخرے اور لاڈ ہمیشہ اٹھائے ہیں اور ایسا دوست ایک ہی ہوتا ہے زندگی میں۔ پر کبھی کبھی سنا بھی دیتی ہے۔
"اتنی کڑوی اور تیکھی ہو تم۔ میرے حوصلے کو داد دو، اب تک برداشت کرتی آ رہی ہوں۔"
ایک میری دوست صدف زاہد بھی ہے۔ میں اسے اتنی پیاری ہوں کہ میری ہزار خامیوں کو دیکھنے کے باوجود خامی والے خانے میں زیرو رکھے گی اور خوبیوں کے لیے..... میری نادیدہ خوبیاں بھی گنوائے گی..... ہاہاہا۔
کچھ دوستوں کا کہنا ہے تھوڑی ذہین، تھوڑی شرارتی ہو، گڈ گرل ہو۔ (پوری آنکھیں باہر ہیں عائشہ کی۔)
کچھ کا کہنا ہے۔ "تمہیں زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ باتیں بہت گہری کرتی ہو۔" نازیہ نے ایک تقریب میں کہا تھا۔
"یہ سچ ہے کہ جس تقریب میں تم نہیں آتیں، وہاں ہمیں مزا نہیں آتا۔"
بہنوں سے نہیں پوچھوں گی۔ پتا ہے کہ وہ بس اتنا ہی کہیں گی۔
"بہت بولتی ہو، بہت ہنستی ہو۔"
5 ۔ ساون کے حوالے سے بہت سی یادیں ہیں۔ چلیں ایک شیئر کر لیتی ہوں..... یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم کراچی میں تھے۔ صدف، عائشہ، میں اور وجیہہ.....

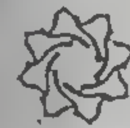

سرورق کی شخصیت	
ماڈل	ماریہ
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافر	موسیٰ رضا

دستک دستک دستک

شاہین رشید

سجل علی

"ہیلو سجل کیسی ہو؟"
"جی اللہ کا شکر ہے۔"
"کیا ہو رہا ہے آج کل۔"
"مت پوچھیں کیا ہو رہا ہے۔ پریشان ہوں۔"
"کیوں خیریت..... کام زیادہ ہے اس لیے۔"
"نہیں۔ آج کل دھمکی آمیز فون کالز بہت آ رہی ہیں۔"
"تمہیں..... خیریت کون ہے؟"
"یہی تو پتا نہیں۔ بس آپا! بہت پریشان ہوں۔ سوچ رہی ہوں دوبارہ لاہور شفٹ ہو جاؤں اور پھر اسی وقت آؤں جب کراچی میں کام ہو۔"
"مگر یہ کیسے ممکن ہے۔ تمہاری تو ڈھیر ساری بکنگ ہوتی ہیں۔ تم نے بتایا تھا۔"
"ہاں..... یہ تو ہے..... خیر چھوڑیں اللہ مالک ہے۔ آپ سنائیں آپ کا کام کیسا چل رہا ہے؟"
"اچھا..... تمہاری شکل ہماری پرانی اداکارہ "رانی" سے بہت ملتی ہے، کسی نے اس طرف توجہ دلائی؟"
"ہاں جی..... بہت لوگوں نے کہا ہے خاص طور پر میری آنکھوں کے بارے میں اور مجھے بھی کبھی کبھی ایسا لگتا ہے۔"
"ننھی میں تمہارا کام بہت خوبصورت تھا۔ تھوڑا بولڈ اور تھوڑا معصوم، کیسا لگا تھا تمہیں؟"
"جی بہت شکریہ۔ مجھے اس کا فیڈ بیک میری توقع سے بھی زیادہ اچھا ملا۔ بہت تعریف ہوتی ہے۔ سیروں خون بڑھ گیا ہے میرا۔"
"ماریں بہت پڑیں تھیں۔ سچ مچ پڑتی تھیں کیا؟"
"ہاں جی..... بہت ماریں پڑی ہیں اور کبھی سچ مچ اور کبھی جھوٹ موٹ۔ ویسے سچ مچ تو کافی پڑی ہیں۔ سین ہی ایسے ہوتے تھے کہ بناوٹ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔"
"اسما عباس بتا رہی تھی کہ تم انہیں ان کے نام سے پکارتی ہو۔"
قہقہہ "ہاں نا وہ میری دوست ہیں۔ بہت فرینڈلی ہیں ہم۔ بہت دوستی ہے میری ان کی۔ اس لیے میں اکثر انہیں ان کے نام سے ہی بلاتی ہوں۔"
"اور کہاں تک جانا ہے اس فیلڈ میں؟"
"بہت آگے۔ بہت خواب ہیں میرے۔ اگر کوئی

پورے ہونے دے تو۔ اگر اس طرح دھمکیاں ملتی رہیں تو بتائیے کہ مجھے کام کرنے میں کتنی دشواری ہو گی اور پھر گھر والے بھی کہاں اجازت دیں گے۔"

"ہوں۔ یہ تو ہے۔ اب تو تمہاری بہن "صبور علی" بھی تو اس فیلڈ میں دوبارہ آگئی ہے۔"

"ہاں جی "محمود آباد کی ملکائیں" کے بعد اس نے اس فیلڈ کو چھوڑ دیا تھا کیونکہ اسے زیادہ مزا نہیں آیا۔ مگر جب اچھی خاصی آفرز آنے لگیں تو سوچا کہ کچھ کر ہی لوں۔ تو اب ایک سیریل سائن کیا ہے صبور کام کرے گی مگر میرا خیال ہے کم کرے گی۔"

"مگر جب تمہاری جیسی شہرت ملے گی تو پھر ضرور کرے گی۔"

ہنستے ہوئے "جی شاید۔"

"چلو او کے پھر بات کریں گے۔"

✲ ✲ ✲

وہاج خان

"ہیلو کیسے ہیں وہاج صاحب! اور کہاں کہاں گھومتے رہتے ہیں۔ کبھی کراچی، کبھی لاہور، کبھی اسلام آباد؟"

"اللہ کا شکر ہے۔ بس جی کیا کریں۔ کام ہی کچھ ایسا ہے۔ اسلام آباد میں کام ختم ہوا تو لاہور چلا گیا۔ کراچی والے بلاتے ہیں تو کراچی چلا جاتا ہوں۔"

"کام زیادہ کہاں ہوتا ہے۔ کراچی، لاہور یا اسلام آباد میں؟"

"کام تو زیادہ کراچی میں ہی ہوتا ہے اور ہو رہا ہے تو کراچی زیادہ آنا جانا لگا رہتا ہے۔"

"ایک زمانہ تھا جب لاہور میں کام زیادہ ہوتا تھا اور آرٹسٹ لوگ لاہور شفٹ ہو رہے تھے اب کراچی میں ایسا ہو رہا ہے۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔۔۔ واقعی پہلے لاہور میں بہت کام ہوتا تھا مگر اب دوبارہ کام شروع ہوا ہے۔ جب سے اے اینڈ بی، سکس سگما اور سیونتھ اسکائی والوں نے لاہور میں پڑاؤ ڈالا ہے تو وہاں بھی کام اسٹارٹ ہو گیا ہے۔"

"ان پروڈکشن ہاؤسز کا کراچی سے لاہور آنا کام کی زیادتی ہے یا کراچی کے حالات ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ کراچی کے جو حالات ہیں اس کی وجہ سے اب کام کراچی سے لاہور یا اسلام آباد منتقل ہو گیا ہے۔"

"آپ کو کام کی سہولت کہاں ہوتی ہے۔ کیونکہ آپ کا گھر تو سرگودھا میں ہے۔"

"ظاہر ہے لاہور میں کیونکہ میرے گھر سے لاہور آنا جانا آسان ہے بہ نسبت کراچی کے اور لاہور میں کافی عرصہ گزارا تو لاہور اپنا اپنا سا لگتا ہے اور کراچی بھی اپنا ہی ہے۔ اور ویسے بھی ہمیں تو کام کرنا ہے جہاں بھی مل جائے۔ بس اللہ تعالیٰ کراچی کے حالات بہتر کرے۔"

"ڈر لگتا ہے کراچی آنے سے؟"

"نہیں نہیں۔ بڑا پیارا شہر ہے اور مجھے بہت پیار ہے کراچی سے۔ بس دہشت گردی اور موبائل چھیننے

کی وارداتیں۔۔۔ ان سے تو ہر کوئی ڈرتا ہے خواہ بلوچستان ہو یا کے پی کے ہو۔ پنجاب میں صورت حال کافی بہتر ہے، سکون ہے، اطمینان ہے۔"

"اور جناب انڈر پروڈکشن کتنے کام ہیں آپ کے؟"

"ماشاءاللہ کافی کام ہے اور آپ کو پتا ہے کہ میرا موڈ کچھ اس طرح کا ہے کہ میں کردار پر زیادہ زور دیتا ہوں، بہت ہی سلیکٹڈ کام کرتا ہوں۔ کراچی میں دو تین ڈرامے مکمل کروائے ہیں۔ کچھ کام لاہور اور اسلام آباد میں ہے۔ دو سیریلز پائپ لائن میں ہیں بلکہ فہیم برنی کا سیریل ہے اور مختار احمد کا سوپ ہے اور ان کی زیادہ تر ریکارڈنگ کراچی میں ہی ہو گی۔"

"اچھے ہیں رول آپ کے؟"

"بالکل جی۔ آپ کو پتا ہی ہے رول بھی اپنی پسند کے لیتا ہوں اور پیسے بھی اپنی پسند کے ہی لیتا ہوں۔ شروع شروع میں جب کریز ہوتا ہے کام کرنے کا اور آپ نے نام بنانا ہوتا ہے تو کم پیسے بھی منظور ہوتے ہیں اور کردار بھی ہر طرح کے قبول کرنے پڑتے ہیں لیکن پھر جب آپ کچھ بن جاتے ہیں۔ آپ کی ڈیمانڈ ہونے لگتی ہے اور کام بھی اپنی مرضی کا ہوتا ہے، دام بھی۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نے ہمیشہ اچھے رول کیے ہیں۔"

"جی اللہ کا بڑا شکر ہے کہ مجھے ہمیشہ ہی ویری ایشن والے رول ملے ہیں اور جتنی ورائٹی میرے کرداروں میں ہوتی ہے میرا نہیں خیال کہ میرے ہم عصروں نے اتنے ڈفرنٹ کردار کیے ہوں گے۔ کیونکہ یا تو کوئی مسلسل نیگیٹو رول کر رہا ہوتا ہے یا پھر پوزیٹو۔ جبکہ میں نے پوزیٹو رول بھی کیے ہیں اور نیگیٹو رول بھی کیے ہیں۔"

"پہلے جب لوگ اس فیلڈ میں آتے تھے تو چونکہ کام کم ہوتا تھا تو لوگ کہتے تھے کہ اچھا آپ اسٹار ہیں ویسے آپ کی جاب کیا ہے، کیا اب بھی ایسے سوال ہوتے ہیں؟"

"قہقہہ" "جی ابھی لوگ سوال کرتے ہیں کہ اس کے علاوہ آپ کیا کرتے ہیں؟ اس کی ایک وجہ ہے کہ ہمارے جتنے بھی سینئرز ہیں انہوں نے نام بھی بہت کمایا اور پیسہ بھی بہت کمایا مگر اپنے فیوچر کے بارے میں کچھ نہیں سوچا اور سب کچھ کھا پی کے ختم کر دیا اور پھر جب کام کم ہوا تو غربت نے ڈیرہ ڈال دیا۔ اب لگے ہیں کہ گورنمنٹ پیسہ دے دے۔ ہم تو عزت میں زندگی گزار رہے ہیں۔ تو یوں ان کا امپریشن لوگوں پہ بہت برا پڑتا ہے۔ میں نام نہیں لوں گا لیکن ہمارے سینئرز نے بہت پیسہ کمایا ہے تو بھئی جب اللہ آپ کو پیسہ دے رہا ہے تو عیاشیوں پر اتنا تو خرچ نہ کریں نا۔ اپنا گھر بنائیں کوئی کاروبار کریں۔ کیا کبھی آپ پر برا وقت نہیں آئے گا۔ اس لحاظ سے میں تو اس چیز کا بہت خیال رکھتا ہوں اور نہایت سوچ سمجھ کر خرچ کرتا ہوں۔ مجھے شو بازی کی عادت نہیں ہے۔ دکھاوے کے لیے میں مہنگے موبائل نہیں لیتا نہ ہی کچھ اور دکھاوا کرتا ہوں تو اللہ کا مجھ پر بڑا کرم رہتا ہے۔ کبھی کام کم بھی ہوتا ہے تو مجھے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑتا۔"

"مطلب یہ کہ یہ ابھی بھی ہوائی روزی ہے۔"

"ہوائی روزی کس کی نہیں ہوتی آپ بتائیں۔ ایک شخص اگر دو کروڑ کا بھی سامان ڈال کر دکان پر آکر بیٹھا ہے تو اس کی بھی ہوائی روزی ہے کہ کوئی گاہک آئے گا اس سے چیز خریدے گا تو اسے پیسے ملیں گے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ روزی کو لوگ ہوائی کیوں کہتے ہیں۔ رزق تو اللہ تعالیٰ نے دینا ہے اور وہ دیتا ہے کبھی کم کبھی زیادہ۔"

"جاب والے بہتر نہیں رہتے کیا؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ جاب والے بہت محدود زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ اب کسی کی تنخواہ تیس ہزار یا پچاس ہزار ہے تب بھی بے چارہ یہی سوچے گا کہ تنخواہ

آئے تو بجلی کا بل دوں، دودھ والے کا بل دوں، فلاں ضرورت پوری کروں۔ ہاں جن کی سیلری ایک لاکھ پلس ہوتی ہے وہ پھر کچھ بہتر زندگی گزار رہے ہوتے ہیں اور جاب کا کب بھروسا ہوتا ہے کہ باس کا موڈ ہوا اور کب وہ فارغ کردے۔"

"یہ تو ہے۔ چلیں جی ان شاء اللہ پھر بات کریں گے آپ سے۔ جب آپ کا کوئی نیا سیریل آئے گا۔"

"جی ضرور۔"

نیہا

"کیا حال ہیں۔ کیسی گزر رہی ہے۔"

"اللہ کا شکر ہے اور ماشاء اللہ بہت اچھی گزر رہی ہے۔"

"آپ کو سائرہ شبیر کہہ کر مخاطب کروں یا نیہا کہہ کے؟"

"سائرہ کہیں گی تو کوئی پہچانے گا بھی نہیں اور نیہا کہیں گی تو سب ہی پہچان لیں گے۔"

"سائرہ سے نیہا کیوں ہوئیں؟"

"بس مجھے نیہا اچھا لگتا ہے جبکہ میرے دوستوں اور رشتے داروں کو سائرہ اچھا لگتا ہے۔ سب کہتے ہیں کہ تمہیں اپنا نام نہیں بدلنا چاہیے تھا مگر اب تو کچھ نہیں ہوسکتا۔"

"آپ کو فون کرو تو "آیت الکرسی" سنائی دیتی ہے۔ کیا بہت مذہبی ہیں آپ؟"

"ہاں جی۔ میں کافی مذہبی ٹائپ کی لڑکی ہوں۔ نماز روزے کی پابند ہوں۔"

"پھر شوبز کیوں؟"

"بس کچھ لوگ کہتے ہیں کہ تم ٹھیک کررہی ہو۔ کچھ کہتے ہیں کہ غلط کررہی ہو، مگر میں خود اچھی ہوں تو مجھے فیلڈ کوئی نقصان نہیں پہنچا رہی اور ویسے بھی میں اپنے کام کو جاب کی طرح لیتی ہوں۔ اپنے کام سے کام رکھتی ہوں۔ جہاں کام ختم ہوا گھر کی لائف میں واپس آجاتی ہوں۔"

"سوشل لائف اچھی نہیں لگتی کیا؟"

"نہیں بالکل نہیں۔ کیونکہ میرا ایک بیٹا ہے۔ اگر سوشل ہو گئی تو پھر اس پر کون توجہ دے گا۔ ابھی تو سارا دن میری امی کے پاس ہوتا ہے۔ اسکول بھی جاتا ہے، میں بھی سارا دن کام پر ہوتی ہوں۔ رات کو اسے میری ضرورت ہوتی ہے تو میں کیوں ادھر ادھر جا کر اپنے بیٹے کو اگنور کروں۔ اب وہ ہی میرے لیے سب کچھ ہے اور اسی کے لیے میں اتنی محنت بھی کرتی ہوں۔"

"آپ کے زیادہ تر رول نیگیٹو ہوتے ہیں۔ جیسے ابھی حال ہی میں ختم ہونے والا سوپ "کاش میرا بھی گھر ہوتا" میں بھی آپ کا کردار نیگیٹو تھا۔"

"ایسا نہیں ہے کہ میں نے صرف نیگیٹو رول ہی کیے ہیں۔ کافی پوزیٹو بھی کیے ہیں مگر چونکہ نیگیٹو رول زیادہ مقبول ہوتے ہیں اس لیے لوگوں کو یاد رہ جاتے ہیں۔ اور آپ کو بھی اسی حوالے سے یاد رہ گئی۔"

"مجھے آپ کا "آذر کی آئے گی بارات" یاد ہے جس میں ایک سکھ کی بیوی کا رول کیا تھا آپ نے۔"

"ہاں اس رول نے مجھے بہت زیادہ شہرت دی تھی۔ ویسے وہ رول تھا بھی بہت مزے کا۔ مجھے خود بھی بہت مزا آیا تھا پرفارم کرکے۔ اس رول کے بعد تو میرے کام میں بھی اضافہ ہوا۔"

"بہت مذہبی ہیں۔ اللہ سے کوئی شکوہ؟"

"نہیں نہیں! کوئی شکوہ نہیں ہے۔ اس نے تو مجھے میری سوچ سے زیادہ نوازا ہوا ہے۔ شادی کی ناکامی کو میں اتنا بڑا ایشو نہیں سمجھتی۔ جو قسمت میں لکھا تھا وہ ہی ہوا۔ ہمارے اور آپ کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔"

"گویا قسمت پر یقین ہے۔"

"بالکل سو فیصد یقین ہے اور میرا یہ ایمان ہے کہ اللہ جو کچھ کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔"

☆

تبصیر نشاط

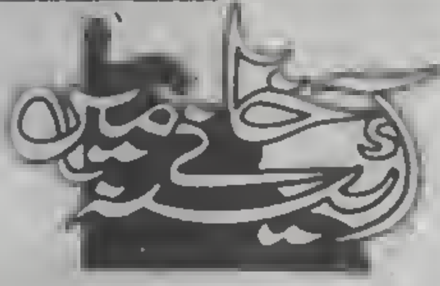

گلیمر

مشاعرے کی روایت بے حد قدیم ہے۔ خصوصاً پاک و ہند میں مشاعرے اپنے پورے تہذیبی رچاؤ کے ساتھ منعقد کیے جاتے ہیں اور باذوق لوگ ان میں نہایت ذوق و شوق سے شرکت بھی کرتے ہیں۔ ان مشاعروں کی اپنی روایات اور ایک خاص شکل ہے۔ مشاعرے کی نظامت کے فرائض انجام دینے والا سب سے پہلے اپنا کلام حاضرین کی نذر کرتا ہے۔ پھر دیگر شعراء کو اپنا اپنا کلام سنانے کے لیے باری باری مدعو کرتا جاتا ہے۔ برسوں سے یہ شکل قائم ہے۔ مگر جناب! کوئی بھی شکل ہو، کوئی بھی روایت ہو، اسے بنتے بگڑتے دیر کتنی لگتی ہے۔

اور اگر کوئی مشرقی روایت غلطی سے کہیں امریکا چلی جائے تو پھر تو اس کا اللہ ہی حافظ ہے۔ گزشتہ دنوں امریکا میں ایک مشاعرے کا انعقاد ہوا۔ اس میں شرکت کرنے والے شعراء ایسے تو نہیں تھے کہ ان کا نام سن کر مشاعرے میں کوئی بھی نہ آتا۔ مگر پھر بھی منتظمین مشاعرہ کو جانے کیا سوجھی کہ انہوں نے مشاعرے کی نظامت ریما سے کروائی۔ ارے! آپ بھول گئے، کون ریما۔۔۔ اپنی ریما کو امریکا گئے اتنا عرصہ بھی نہیں ہوا کہ آپ انہیں بھول ہی بیٹھیں۔ لیکن ریما کے مشاعرے کی نظامت کرنے سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ ریما جی خیر سے شاعرہ بھی ہوگئی ہیں۔ ابھی روایت ٹوٹنے کی بات ہوئی تھی نا! تو آپ اسے پرانی روایت کا ٹوٹنا یا ایک نئی روایت کا بننا ہی سمجھیے ۔۔۔ لیکن اس سب سے ہٹ کر اس اقدام کے پیچھے ایک خاص وجہ بھی ہے اور وہ ہے مشاعرے کے منتظم اعلا کا ریما کے شوہر ڈاکٹر طارق کا دوست ہونا۔ سو انہوں نے اس دوستی کا فائدہ اٹھایا اور ایک نئی روایت قائم کرنے کے ساتھ ساتھ مشاعرے میں گلیمر بھی ڈال دیا اور ریما کی شرکت سے مشاعرے کو وہ پبلسٹی بھی مل گئی، جو صرف شعراء کی شرکت سے شاید نہ ملتی۔

(اس روایت کے بعد کل کو شاید صدر مشاعرہ کی حیثیت سے کسی شاعر کی جگہ آپ کسی معروف اداکارہ کو براجمان دیکھیں اور وہ مشاعرے میں اپنی کہی نظم و

غزل کی جگہ اپنی مشہور فلموں اور ڈراموں کے مکالمے سنائیں۔ ویسے ریما کو مدعو کرتے وقت منتظمین نے شاید یہ سوچا ہو کہ میزبان مشاعرہ کے کلام سنانے کی روایت ہے تو ہو۔ مگر جو خود سراپا غزل ہو' اسے کوئی غزل سنانے کی بھلا کیا ضرورت...)

وکھری ٹائپ چوری

اکثر لوگ محض مال و دولت چرانے والے کو چور اور اس عمل کو چوری سمجھتے ہیں۔ مگر جناب! چوری کی بھی کئی اقسام ہوتی ہیں اور چور بھی بہت سے وکھری ٹائپ کے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً" شعراء اور عاشق حضرات کو محبوب سے پہلے دل چرانے اور پھر چین و سکون اور نیندیں چرا لینے کا شکوہ رہتا ہے۔ کوئی ٹیکس چوری کرتا ہے تو کوئی کسی کے کلام پر ہاتھ صاف کرتا ہے۔ قرض دار قرض خواہ سے نظریں چراتا ہے۔ مگر جناب! یہ سب چوریاں تو ہو گئیں پرانی... اب نیا دور ہے' انٹر نیٹ کا دور... تو چوریاں بھی کچھ وکھری ٹائپ کی ہی ہوتی ہیں۔

معروف اداکار ببرک شاہ چوری کی "تقریباً" ہر قسم سے مستفید ہو چکے۔ وینا ملک کے ہاتھوں پہلے دل اور پھر چین و سکون چوری کروایا۔ پھر وینا ملک نے ان سے نین بھی چرائے۔ ہو سکتا ہے' مال و دولت اور ٹیکس کی چوری سے بھی ببرک شاہ کا واسطہ پڑا ہو۔ چنانچہ "تقریباً" تمام اقسام کی چوریوں سے مستفید ہونے کے بعد اب ببرک شاہ کو جدید دور کی وکھری ٹائپ چوری کا سامنا ہے۔ یعنی سننے میں آیا ہے کہ ببرک شاہ کا ویب پیج اور آئی ڈی چوری ہوئی ہے۔ چونکہ اس چوری کو "ہیک کرنا" کہتے ہیں۔ لہٰذا یوں کہنا چاہیے کہ ببرک شاہ کا ویب پیج اور آئی ڈی ہیک ہو گئی ہے۔ سو ببرک شاہ نے اپنے مداحوں کو ہوشیار باش کیا ہے کہ خبردار! اب اس پیج پر ببرک شاہ سے متعلق کسی بھی بات پر جو یقین کیا تو... کیا خبر ان کا بدخواہ ہیکر اس پر کیا کچھ لکھ ڈالے۔

(ببرک جی! اس بدخواہ سے زیادہ بدخواہی تو آپ نے خود اپنے ساتھ کی ہے زندگی میں... کم از کم آپ کے ساتھ ہونے والی چوریوں کو دیکھ کر تو یہی اندازہ ہوتا ہے... اور ویسے بھی آپ نے اپنی زندگی میں کوئی ایسا راز چھوڑا بھی کب ہے کہ جس کے فاش ہو جانے کا آپ کو خدشہ ہو۔ وینا ملک کے بھارت میں "کارنامے" سرانجام دینے کے بعد بھی آپ نے مختلف ٹی وی چینلز پر جس فخر سے اب بھی ان کی واپسی کا انتظار کرنے کا اعلان کیا تھا... ہمارے خیال میں وہ فخریہ بیان کرنے والی بات نہیں' شرم کی بات تھی۔)

اڑان

ہمارے فنکاروں کی اکثریت پاکستان سے باہر کام کرنے کی خواہش مند ہے۔ اس کے لیے ان سب کا انتخاب صرف ایک ہی ملک ہے۔ یعنی بھارت... گویا ان کی نظروں کا ریڈار بھارتی حدود سے آگے کام کرنے

سے انکاری ہے۔ تاہم اپنی مدیحہ افتخار کی نظروں کی اڑان بالی ووڈ سے بھی پرے ہالی ووڈ پر جا ٹکی ہیں۔ مدیحہ افتخار کا کہنا ہے کہ انہیں پاکستان اور بھارت سے کئی فلموں کی آفر ہوئی ہیں۔ مگر انہوں نے یہ تمام آفرز ٹھکرا دیں۔ کیونکہ مدیحہ کے خیال میں پاکستان اور بھارت میں معیاری فلمیں بن ہی نہیں رہیں۔ مدیحہ کی خواہش ہے کہ وہ ہالی ووڈ کی فلموں میں کام کریں اور پھر آسکر ایوارڈ اپنے نام کرائیں۔ (اچھا تو صرف ہالی ووڈ پر ہی نہیں' بڑے رول پر بھی نظر ہے محترمہ کی۔)

مدیحہ کے مطابق پاکستانی اور بھارتی فلموں سے زیادہ معیاری کام تو وہ ٹی وی پر کر رہی ہیں۔

(اس بیان پر "تجھ پہ قربان" مدیحہ جی! تاہم یہ بیان دینے سے پہلے آپ نے تینوں ملکوں کی فلموں کا موازنہ صحیح طرح نہیں کیا شاید۔ ہالی ووڈ کی فلمیں محض معیار ہی میں نہیں' بلکہ لباس و ثقافت میں بھی خاصی مختلف ہیں اور پھر سنسر شپ... اس کے تو کیا ہی کہنے۔ اول بات تو وہاں سے آفر آنا ہی مشکل ہے... اور اگر جو آفر آ بھی گئی تو کیا آپ "وہ" کام کر سکیں گی' جو وہاں کی فلموں کا خاصہ ہے؟)

کچھ ادھر ادھر سے

شاہ محمود قریشی جب وزیر خارجہ تھے تو ان پر بھی الزام لگا تھا کہ انہوں نے اپنے ایک روم میٹ کو جو اسلام آباد میں عینکوں کا کاروبار کرتے تھے اور عینک والا جن کے نام سے مشہور تھے۔ گشتی سفیر لگوایا تھا۔ جنہوں نے دنیا بھر کے پچاس سے زائد ملکوں کا دورہ کیا اور دو کروڑ روپے کے قریب ڈیلی الاؤنس لیا۔ جو ان کی جیب میں گیا تھا۔ عینکیں بیچنے والے کا سفارت کاری سے کیا کام تو شاہ محمود قریشی کیا جواب دیں گے۔

(رؤف کلاسرا... راز و نیاز)

ملا عمر یا افغانستان کے طالبان نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ بلکہ وہ تو ہمارے وفا شعار دوست تھے۔ میں نے خود ملا عمر کی زبان سے یہ الفاظ سنے تھے کہ "پاکستان

کا احسان ہماری آنے والی نسلیں کبھی نہ بھولیں گی۔ آزمائش کی کسی گھڑی میں جہاں آپ کا پسینہ گرے گا۔ وہاں ہمارا خون گرے گا۔" پرویز مشرف نے اپنے اقتدار کے لیے پاکستان کو پرائی آگ میں جھونک دیا۔

(عرفان صدیقی... نقش خیال)

شیخ ایاز کہا کرتے تھے کہ کارکنان ان سوکھی ہوئی لکڑیوں کی طرح ہوتے ہیں۔ جنہیں جلا کر سیاست دان اپنی سردی اور اپنے ارد گرد کا اندھیرا دور کیا کرتے ہیں۔

(اعجاز منگی... آواز حق)

یہ شہر جو مسکرانے کے لیے قائم ہوا تھا۔ یہ شہر جو دل لگانے اور گھر بسانے کے لیے بنا تھا۔ یہ شہر جو کھل کر ہنسنے کے لیے وجود میں آیا تھا اور جو شہر آزادی کا منظر پیش کرنے کے لیے نمودار ہوا تھا۔ کراچی ایک قائد کا منتظر ہے۔ جس کی سربراہی میں اس شہر کے لوگ اپنے مقبوضہ شہر کو پھر سے آباد کریں گے۔ اس طرح جس طرح یہ شہر کبھی تھا۔

(ایاز منگی... آواز حق)

امت الصبور

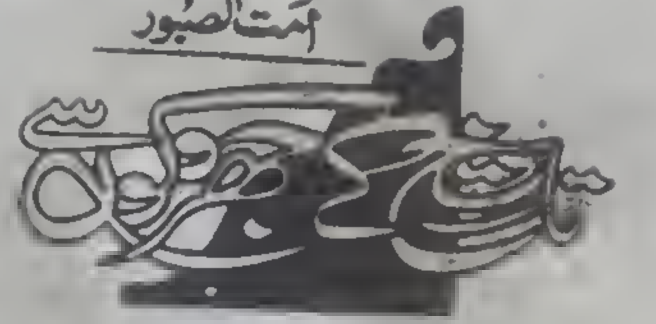

مصحف

نزول قرآن کے پورے تئیس سالہ عمل کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پاک ساتھ لکھواتے بھی رہے۔ جیساکہ قرآن مجید کی تاریخ کا ہر طالب علم بخوبی جانتا ہے۔ جوں ہی کوئی آیت نازل ہوتی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے فورا" کاتبان وحی کو بلا کر لکھوا دیتے۔ جو لکھا ہوتا۔ اسے وقتا فوقتا" سنتے بھی رہتے تھے اور صحابہ کرامؓ میں سے جو پورے قرآن کے حافظ تھے۔ ان سے پورا اور جن کو جتنا یاد ہوتا ان سے وہی حصہ وقتا" فوقتا" سنتے اور ان کو سناتے بھی رہتے تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن پاک کی تمام سورتوں اور آیات کو ایک کتاب کی شکل میں اس ترتیب سے یک جا نہیں کیا گیا تھا' جس ترتیب اور شکل میں آج وہ ہمارے پاس کتابی صورت میں موجود ہے۔ یعنی ترتیب تلاوت کے اعتبار سے قرآن پاک کے مکمل اور مرتب شدہ نسخے مصحف کی شکل میں تیار نہیں تھے۔ اس وقت کتابت قرآن کی شکل یہ تھی کہ کسی محفوظ جگہ پر مثلا" ایک صندوق میں قرآن مجید کے مختلف حصے (آیات اور سورتیں) مختلف اشیا پر یعنی تختیوں پر' اوراق پر' اونٹ کی ہڈیوں پر' کسی سلیٹ پر یا پتھر کی تختیوں پر لکھ کر محفوظ کر لیے جاتے تھے۔

جب ہم یہ کہتے یا روایات میں پڑھتے ہیں کہ فلاں صحابہؓ نے قرآن پاک کو جمع کیا تو اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ انہوں نے کتاب اللہ کی تمام آیات' سورتیں اور اس کے تمام حصے (مختلف اشیا پر لکھے ہوئے) سب کے سب ایک جگہ جمع کر کے محفوظ کر کے رکھ لیے تھے۔ لیکن ایک کتابی شکل میں جس طرح آج ہمارے پاس قرآن مجید موجود ہے' اس طرح اس وقت موجود نہیں تھا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا جب زمانہ آیا تو ایک مشہور جنگ' میں صحابہ کرامؓ کی بہت بڑی تعداد شہید ہو گئی۔ یہ جنگ جھوٹے مدعی نبوت مسلیمہ کذاب کے خلاف لڑی گئی تھی۔ اس جنگ میں مسلیمہ کذاب کو تو شکست ہو گئی' لیکن شہید ہونے والے بہت سے حفاظ صحابہ کرامؓ وہ تھے جنہوں نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کو سنا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا تھا۔ یہ ایک بڑا صدمہ تھا۔ جس سے صحابہ کرامؓ دوچار ہوئے۔

اس موقع پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بجاطور پر یہ خیال آیا کہ اگر اسی طرح بڑی تعداد میں صحابہ کرامؓ شہید ہوتے گئے تو ممکن ہے قرآن پاک کا کوئی حصہ اس طرح ضائع ہو جائے یا مٹ جائے۔ اس لیے فوری طور پر قرآن پاک کو کتابی شکل میں مرتب کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے تاکہ اس کی ترتیب میں فرق نہ آنے پائے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ بعد میں آنے والوں میں سے کسی سے ترتیب آیات و سورتوں کے بارے میں کوئی بھول چوک ہو جائے اور اس کے نتیجے میں کتاب اللہ کے مختلف حصوں کی ترتیب کے بارے میں کوئی اختلاف پیدا ہو جائے۔ لہٰذا ایسے کسی بھی ممکنہ اختلاف سے بچنے کے لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خیال تھا کہ قرآن پاک کو ایک کتابی شکل میں محفوظ کرنا چاہیے۔

یہ مشورہ لے کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ مزاج تھا کہ جو کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے وہ میں اسی طرح کروں گا اور جو کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا' وہ میں ہرگز نہیں کروں گا۔ اس مزاج کے عین مطابق انہوں نے کہا کہ "جو کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا' وہ میں کیوں کروں؟"

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کو سمجھاتے رہے۔ بہت دیر تک گفتگو ہوئی اور کافی دیر کی گفتگو کے بعد بالآخر ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اطمینان ہو گیا کہ یہ کام کرنا چاہیے۔

اب ان دونوں بزرگوں نے حضرت زید بن ثابتؓ کو بلایا جو کاتبان وحی میں نمایاں مقام رکھتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سیکریٹری بھی رہ چکے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر قوموں کے ساتھ تمام خط و کتابت بھی وہی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تبلیغی خطوط لکھے تھے۔ وہ بھی سارے کے سارے حضرت زید بن ثابتؓ ہی کے لکھے ہوئے تھے۔ ان کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بلایا اور تفصیل سے ان کو بتایا کہ یہ کام ہم کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے بھی وہی جواب دیا جو ابتدا میں خود ابوبکر صدیقؓ نے دیا تھا۔ یعنی جو کام خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ آپ وہ کام کیوں کرتے ہیں؟ اب یہ دونوں مل کر ان کو سمجھاتے رہے۔

حضرت زید بن ثابتؓ اس وقت تقریبا" بیس بائیس سال کی عمر کے ہوں گے۔

بہرحال ان دونوں بڑے معمر بزرگوں کے سمجھانے سے بالآخر حضرت زیدؓ مان گئے۔ لیکن جب انہوں نے حضرت زیدؓ سے یہ کہا

"کہ اس کام کو تم کرو گے اور تمہیں یہ کام کرنا ہے۔"

تو حضرت زیدؓ بہت پریشان ہوئے۔ حضرت زیدؓ کہتے ہیں کہ "مجھے ایسا لگا کہ گویا انہوں نے احد پہاڑ اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کی ذمہ داری میرے سر پر رکھ دی' یعنی اتنی بڑی ذمہ داری مجھ پر ڈال دی گئی۔ اگر اس کے بجائے یہ حضرات مجھے کہتے کہ احد پہاڑ کو کھود کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دو تو میں تنہا اس کام کو کرنے کے لیے تیار ہو جاتا اور یہ کام میرے لیے نسبتا" آسان ہوتا۔"

بہرحال حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اصرار پر حضرت زیدؓ اس عظیم الشان اور تاریخ ساز کام کے لیے آمادہ ہو گئے۔ خلیفہ اول نے ان کی معاونت کے لیے چند ارکان پر مشتمل ایک کمیشن بھی بنا دیا' جو ان صحابہ کرامؓ پر مشتمل تھا' جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک میں کتابت وحی کی خدمت سرانجام دیا کرتے تھے۔ وہ تمام حضرات جن کو یہ ذمہ داری سپرد کی گئی وہ سب کے سب قرآن مجید کے حافظ اور صف اول کے علما میں سے تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے خود براہ راست حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن پاک پڑھنا سیکھا۔ خود خلیفہ رسول قرآن کے حافظ اور عالم تھے۔ ان کے قریب ترین مشیر اور رفیق سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی بہت بڑے عالم قرآن تھے۔ ان کے پاس بھی سارا قرآن پاک لکھا ہوا موجود تھا۔ خود اس کمیشن کے ارکان حافظ قرآن بھی تھے۔ ان حالات میں یہ بہت آسان بات تھی کہ یہ حضرات اپنی یادداشت سے قرآن مجید کا ایک نسخہ تیار کر دیں۔ ان کے پاس عرضہ میں پیش کیے ہوئے اجزائے قرآن موجود تھے۔ لیکن اس کے باوجود خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مفصل ہدایات دیں۔ کہ سب افراد جس قرأت پر متفق ہوں اور وہ قرات خلیفہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حفظ کے مطابق ہو۔ پھر سب حضرات کی تحریریں ان کی یادداشتوں کی تائید کریں۔

اس کے علاوہ ہر آیت کی تائید صحابہؓ کے حلفیہ بیانات سے بھی ہو جو یہ حلفیہ بیان دیں کہ یہ آیت ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنائی تھی اور اسی طرح سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور فرمائی تھی۔ پھر ہر ہر آیت کی تائید اور ثبوت میں دو' دو تحریریں پیش کی جائیں جن کے بارے میں یہ گواہی دی جائے کہ یہ تحریر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھ کر سنائی گئی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اسی طرح منظور فرمایا تھا۔ ایسی ہر تحریر کے دو چشم دید گواہ ہوں اور جو یہ حلفیہ بیان دیں کہ یہ تحریر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنائی گئی تھی اور ہم وہاں موجود تھے۔ آپ صلی اللہ

علیہ وسلم نے اس کی تصحیح فرمائی اور ہم اس کے گواہ ہیں۔ یہ سب بیانات اور شہادتیں مکمل ہوجائیں، تب اس کو لکھا جائے۔

اس حتی الامکان احتیاطی طریقہ کار کے مطابق انہوں نے قرآن پاک کو لکھنا شروع کردیا اور ترتیب کے ساتھ چند ماہ میں پورے قرآن کی تدوین مکمل ہوگئی۔

اس پورے عمل میں ایک لفظ اور ایک حرف کا بھی کہیں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ البتہ دو آیتیں قرآن پاک کی ایسی رہ گئیں جن کے بارے میں ایک مشکل سوال پیدا ہوگیا۔

قرآن پاک کی وہ دو آیتیں سورہ توبہ کی آخری دو آیات تھیں۔

کمیشن کے ارکان نے کہا کہ ہم سب کو یاد ہے کہ یہ سورہ توبہ کی آخری دو آیات تھیں۔ ہمارے پاس جو ذاتی تحریری ذخیرہ ہے۔ اس میں بھی موجود ہیں۔ اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یاد ہیں اور ان کی تحریروں میں بھی موجود ہیں۔ دو گواہ بھی آگئے۔ انہوں نے حلفیہ بیان بھی دے دیا کہ ہم نے یہ دونوں آیات اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنائی تھیں۔

ان دونوں گواہان کی زبانی گواہی کے علاوہ دو تحریری یادداشت کے حق میں صرف ایک گواہی دستیاب ہوسکی۔

کسی نے کہا کہ "یہ کوئی ایسی اہم بات نہیں۔ کوئی حرج نہیں، اگر دوسری دستاویز کے دو گواہ نہیں ہیں۔ لیکن کمیشن نے یہی طے کیا کہ جب ایک اصولی طریقہ کار طے ہوچکا ہے تو اس کو نہیں توڑنا چاہیے۔ چنانچہ اعلان کرایا گیا کہ یہ آیت جس جس نے بھی عرضہ میں پیش کی تھی، وہ آکر کمیشن کے سامنے گواہی دے۔

پورے مدینہ میں اعلان کرادیا گیا، لیکن کوئی نہیں آیا۔ پھر ایک کارندہ مقرر کیا گیا۔ اس نے گھر گھر جاکر ایک ایک صحابی سے پوچھا کہ "جب یہ عرضہ ہو رہا تھا اور یہ دو آیتیں پیش ہوئی تھیں تو کیا تمہارے پاس اس وقت کا کوئی گواہ موجود ہے؟" اس پر بھی کوئی گواہ نہیں ملا۔

ممکن ہے کہ کچھ لوگ سفر پر گئے ہوں۔ ممکن ہے بعض گواہان کا انتقال ہوگیا ہو، ممکن ہے ایسے بعض صحابہ جو وہاں موجود ہوں، حج پر گئے ہوئے ہوں۔ غرض بہت سے امکانات ہوسکتے ہیں، کئی باتیں ہوسکتی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ کوئی آدمی نہیں ملا۔

اس پر کچھ لوگوں نے کہا کہ شہر اور قرب و جوار کی بستیوں میں عام منادی کرائی جائے۔ وہ بھی کرادی گئی۔ دوسرا گواہ تب بھی نہ ملا۔ اس پر خلیفہ وقت کے حکم سے جمعہ کی نماز میں بڑے اجتماع میں یہ مسئلہ لوگوں کے سامنے رکھا گیا۔ وہاں کسی نے پوچھا۔ "وہ ایک گواہ جو دستیاب ہے وہ کون ہے؟"

اس پر ایک صحابہ نے بتایا۔ "وہ ایک گواہ حضرت خزیمہ بن ثابت انصاریؓ ہیں۔"

یہ نام سننا تھا کہ بہت سے حضرات کھڑے ہوگئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد نقل کیا، جس سے فوراً" مسئلہ حل ہوگیا۔

مسئلہ کیسے حل ہوگیا؟ اس کے لیے ایک واقعہ بیان کرنا ضروری ہے۔ جب یہ بات ہو رہی تھی تو وہ زمانہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے آٹھ، دس ماہ بعد کا تھا۔ آپ اس زمانے سے ذرا تین، چار سال پہلے جائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ابھی حیات تھے۔

مدینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ کبھی کبھی شہر سے باہر ٹہلنے یا حالات کا جائزہ لینے کے لیے تشریف لے جاتے تھے۔ کبھی تو صبح کی نماز کے بعد تشریف لے جایا کرتے تھے اور کبھی عصر کی نماز کے بعد۔ ایسے ہی کسی موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم شہر سے باہر تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ ایک قبیلہ پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ وہاں خیمے لگے ہوئے تھے اور ایک بدو ایک گھوڑا یا اونٹ لیے کھڑا تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔ "یہ جانور بیچتے ہو؟"

اس نے کہا۔ "جی ہاں، بیچتا ہوں۔"

قیمت پوچھی، اس نے قیمت بتادی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "چلو، میرے ساتھ چلو، میں تمہیں قیمت ادا کردیتا ہوں۔"

چنانچہ دونوں مدینہ منورہ کی سمت چل پڑے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آگے آگے چل رہے تھے اور بدو اونٹ یا گھوڑا لیے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ جب شہر میں داخل ہوئے تو لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ یہ جانور فروخت ہوچکا ہے۔

ایک صاحب نے بدو سے پوچھا۔ "جانور بیچتے ہو؟"

اس نے کہا "ہاں بیچتا ہوں! کتنی قیمت دوگے؟"

ان صاحب نے کچھ زیادہ پیسے لگادیے۔

اس پر بدو بولا۔ "ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔"

اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مڑے اور فرمایا کہ "یہ جانور تو تم نے مجھے بیچ نہیں دیا تھا؟"

اس نے کہا۔ "میں نے تو نہیں بیچا۔"

اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تم سے قیمت کی ادائی کی بات نہیں ہوئی تھی؟"

اس نے کہا۔ "نہیں۔" وہ صاف مکر گیا۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ اپنی بات دہرائی تو اس نے کہا۔

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی گواہ ہو تو لائیے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم تنہا ہی تھے۔ وہاں اتفاق سے حضرت خزیمہ بن ثابتؓ کھڑے تھے۔ انہوں نے کہا۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جانور اس شخص سے اتنی قیمت میں خریدا ہے۔"

اس پر وہ بدو خاموش ہوگیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قیمت ادا کردی، بلکہ کچھ زیادہ بھی دے دیے اور جانور لے کر آگئے۔ اس کام سے فارغ ہوکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خزیمہؓ سے پوچھا۔ "میں نے تو تمہیں وہاں نہیں دیکھا! تم کہاں کھڑے تھے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "میں تو وہاں نہیں تھا۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔ "تم نے پھر گواہی کیسے دے دی؟"

حضرت خزیمہؓ نے جواب میں عرض کیا۔ "میں روز گواہی دیتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جبریل امین آئے اور وحی لے کر آئے اور یہ کہ جنت، دوزخ موجود ہیں۔ جب میں یہ سب ان دیکھی باتیں سچ مان رہا ہوں تو یہ معمولی سی بات کیسے نہ مان لوں؟"

اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بڑے خوش ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"آج سے خزیمہؓ کی گواہی دو آدمیوں کے برابر مانی جائے گی۔"

یہ واقعہ کئی صحابہ کرامؓ نے دیکھا اور سنا ہوا تھا۔ انہوں نے اس کی تصدیق کی۔

اب لوگوں کو احساس ہوا کہ حضرت خزیمہؓ کی گواہی کو جو دو آدمیوں کے برابر قرار دیا گیا تھا۔ یہ کیوں قرار دیا گیا تھا۔ شاید اسی موقع کے لیے ایسا کیا گیا ہو۔ چنانچہ اس ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیاد پر ان دو آیتوں کے بارے میں حضرت خزیمہؓ کی گواہی کو دو کے برابر تسلیم کرلیا گیا اور یہ دونوں آیتیں سورہ توبہ کے آخر میں لکھ دی گئیں۔

اس طرح قرآن کا پہلا مکمل اور کتابی شکل میں مرتب شدہ نسخہ تیار ہوگیا۔ یہ نسخہ جس کو مشورے سے مصحف کے نام سے یاد کیا گیا، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے قبضے میں رہا۔

ان کے انتقال کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس رہا اور ان کے انتقال کے بعد ان کی صاحبزادی ام المومنین حضرت حفصہؓ کی تحویل میں رہا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے تک یہ روایت چلی آرہی تھی کہ عرب کے مختلف قبائل کو اجازت تھی کہ قرآن مجید اپنے اپنے لہجے میں پڑھ لیا

کریں۔ ہر زبان میں مختلف قبیلوں اور علاقوں کے لہجے مختلف ہوتے ہیں۔ زبان تو ایک ہی ہوتی ہے۔ لکھی بھی ایک ہی طرح جاتی ہے' لیکن لوگ مختلف انداز میں پڑھتے اور بولتے ہیں۔ چونکہ عرب قبائل مختلف علاقوں میں آباد تھے اور مختلف لہجے ان کے ہاں رائج تھے۔ اس لیے آغاز میں ہر قبیلہ اپنے اپنے لہجے میں قرآن پاک پڑھا کرتا تھا۔ قبائلی عصبیت بڑی شدید ہوتی ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آغاز میں نئے اسلام قبول کرنے والوں کو قریش کے لہجے کا پابند نہیں کیا' جو عربی زبان کا ٹیکسالی لہجہ سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ جو جس لہجے میں پڑھتا تھا' اس کو اسی لہجے میں پڑھنے کی اجازت دے دی۔ البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقتاً "فوقتاً" توجہ دلاتے رہے کہ قرآن جس لہجے میں اتارا گیا ہے وہ قریش کا لہجہ ہے اور یہ کہ قریش کا لہجہ ہی معیاری ہے۔

حجاز کے باہر کے صحابہ کرامؓ میں جو حضرات تعلیم حاصل کرتے جاتے تھے' وہ قریش کا معیاری اور ٹیکسالی لہجہ اختیار کرتے جاتے تھے لیکن عام لوگ اور بدو پس منظر کے حامل حضرات اپنے مخصوص قبائلی یا علاقائی لہجے میں ہی پڑھتے رہے۔

جب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ آیا تو یہ وہ دور تھا کہ نئی نئی نسلیں اور نئی نئی قومیں اسلام میں داخل ہو رہی تھیں۔ ایرانی' ترکی' رومی' حبشی وغیرہ جو عربی نہیں جانتے تھے۔ وہ روزانہ ہزاروں کی تعداد میں اسلام قبول کر رہے تھے۔ ان نئے مسلمانوں نے جوش و خروش سے عربی زبان سیکھنی شروع کردی۔ مثلاً" کسی یمنی نے اپنے نو مسلم دوستوں اور شاگردوں کو اپنے لہجے میں قرآن سکھایا تو کسی کوفہ والے نے اپنے لہجے میں سکھا دیا۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب خلیفہ تھے' اس وقت مسلمانوں کی فوجیں دنیا کے مختلف حصوں میں مصروف جہاد تھیں۔ آذربائیجان کے علاقے میں بھی' آرمینیا کے علاقے میں بھی۔ مشہور صحابی حضرت حذیفہؓ بھی آرمینیا کے مجاہدین میں شامل تھے۔ آپ ایک انتہائی محترم اور معزز صحابی تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص رازدان سمجھے جاتے تھے۔ آپ بھی وہاں جہاد میں شریک تھے۔

ایک دن انہوں نے دیکھا کہ امام نے نماز پڑھائی اور ایک خاص لہجے میں تلاوت کی۔ نماز کے بعد کئی لوگوں نے امام صاحب کے لہجے پر اعتراض کیا اور کہا کہ آپ نے غلط پڑھا۔ امام صاحب نے جواب میں کہا کہ میں نے تو فلاں صحابی سے قرآن سیکھا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت حذیفہؓ نے اپنے امیر سے کہا۔

"مجھے جہاد سے چھ ماہ کی چھٹی دے دیں' مجھے ضروری کام ہے۔"

وہ فوراً" مدینہ منورہ روانہ ہوگئے۔ کئی ماہ کے سفر کے بعد وہ مدینہ طیبہ پہنچے۔

کہتے ہیں وہ دوپہر کا وقت تھا اور گرمی کا زمانہ تھا۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ ذرا آرام کر کے پھر امیر المومنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملاقات کے لیے جائیں۔ لیکن حضرت حذیفہؓ نہ مانے۔ سیدھے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر پہنچے۔ وہ پریشان ہو کر نکلے کہ حضرت حذیفہؓ اچانک کیسے اور کیوں آئے ہیں۔ پوچھا۔

"آپ تو جہاد پر گئے ہوئے تھے۔ پھر اچانک کیا بات ہوئی؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "امیر المومنین! مسلمانوں کی خبر لیں۔ قبل اس کے کہ کتاب اللہ میں اختلاف پیدا ہو۔"

اور ان کو اختلاف قرأت کا واقعہ سنایا اور کہا کہ "یہ انتہائی غلط بات ہے۔ قرآن کے بارے میں اس طرح کے اختلاف کی اب اجازت نہیں دی جاسکتی۔ آج لہجے کا اختلاف ہے۔ کل ممکن ہے کوئی اور اختلاف پیدا ہو جائے۔ اس لیے آج ہی اس کا کچھ حل تلاش کریں۔"

دونوں حضرات نے بیٹھ کر طے کیا کہ حضرت حفصہؓ کے پاس جو قرآن کا نسخہ ہے' اس کو منگوا کر اس کی کاپیاں تیار کروائی جائیں اور تمام دنیائے اسلام کے

شہروں میں بھیج دی جائیں۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حکم سے گیارہ نسخے (اور بعض روایات میں آتا ہے کہ سات نسخے) تیار کیے گئے۔

دوبارہ حضرت زید بن ثابتؓ ہی کو یہ ذمہ داری سونپی گئی۔ چنانچہ ان گیارہ یا سات نسخوں کو تمام بڑے بڑے شہروں میں بھجوا دیا گیا اور یہ اعلان کردیا گیا کہ جتنے انفرادی نسخے اب تک لوگوں کے پاس موجود ہیں' وہ سب سرکار کے حوالے کردیے جائیں۔ وہ سب انفرادی نسخے ضبط کرنے کے بعد میں تلف کردیے گئے۔

فیصلہ یہ ہوا کہ آئندہ جس کو قرآن کا نسخہ تیار کرنا ہو' وہ ان نسخوں سے تیار کرے اور نسخہ قریش کے لہجے میں قریش کے رسم الخط کے مطابق ہی تیار کیا جائے۔

چنانچہ آئندہ قرآن پاک کے تمام نسخے سو فیصد اسی لہجے اور ہجے کے مطابق لکھے گئے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا لہجہ تھا۔ اس سے قبل سب لوگ اپنے اپنے ہجے کے مطابق لکھا کرتے تھے۔ لہجے کے اختلاف سے ہجے کا اختلاف ہو سکتا ہے۔ ان حالات میں اس کا امکان تھا کہ ایک ہی لفظ کے ہجے مختلف انداز سے رواج پا جائیں۔

یہ امکان اس لیے بھی تھا کہ اس وقت تک عرب میں لکھنے لکھانے کا زیادہ رواج نہیں تھا۔ عرب میں بہت تھوڑے لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

بلاذری کی روایت کو درست مانا جائے تو مکہ میں صرف سترہ آدمی لکھنے پڑھنے سے واقف تھے۔ ایسی صورت میں ہجے اور طرز تحریر کو باقاعدہ معیار کے مطابق نہیں بنایا جاسکتا تھا۔ اور اس بات کا امکان خاصا تھا کہ ایک ہی لفظ کو مختلف لوگ مختلف انداز سے لکھنا شروع کردیں۔

اس امکان اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے دیگر ممکنہ خدشات سے بچنے کے لیے قریش کے ہجے میں قرآن پاک کے یہ سات یا گیارہ نسخے تیار کرائے گئے۔ باقی سب نسخے ضبط کر کے ضائع کردیے گئے اور اعلان کیا گیا کہ آئندہ سب لوگ ان ہی مستند نسخوں کے مطابق نقلیں تیار کرلیں۔ چنانچہ اس کے بعد سے تمام نئے نسخے ان اصل نسخوں کے مطابق تیار ہوئے اور وہ گیارہ نسخے تمام دنیائے اسلام میں تقسیم کردیے گئے۔

(ان نسخوں میں سے تین نسخے اس وقت بھی دنیا میں موجود ہیں جو اپنی اصل شکل میں محفوظ ہیں۔ اتفاق سے راقم الحروف کو ان تینوں نسخوں کی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔)

ایک لندن کے مشہور برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ دوسرا استنبول (ترکی) میں ہے اور تیسرا تاشقند میں ہے' ازبکستان کے دارالحکومت میں۔ یہ وہ نسخہ ہے جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں تیار ہوا تھا اور خلیفہ کے پاس رہتا تھا اور یہی وہ نسخہ ہے جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ذاتی مطالعہ میں بھی رہتا تھا۔ جب وہ شہید ہوئے تو وہ اسی نسخے کی تلاوت فرما رہے تھے۔ مشہور ہے کہ ان کا خون بھی قرآن کے صفحات پر گرا تھا اور اس کی نشانی بھی ان صفحات پر موجود ہے۔ تاشقند والا نسخہ حمزہ اسٹریٹ میں کلاں مسجد کی ایک لائبریری میں رکھا ہوا ہے۔)

یوں حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ نسخے تیار کروادیے اور یہ سارے نسخے حضرت زید بن ثابتؓ ہی کے لکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے جو رسم الخط اختیار کیا تھا آج تک اسی رسم الخط کی پیروی کی جاتی ہے۔

الغرض جس انداز میں حضرت زید بن ثابتؓ نے قرآن مجید لکھا تھا اسی انداز میں آج کے زمانے تک لکھا جا رہا ہے۔ اس خط کو رسم عثمانی کہتے ہیں اور آج تک اس کی پیروی ضروری قرار دی جاتی ہے۔ دنیا میں قرآن مجید کے جتنے بھی نسخے ہیں وہ ان ہی گیارہ نسخوں کی نقل ہیں' جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تیار کروائے تھے۔

(ڈاکٹر محمود احمد غازی کا مضمون بہ شکریہ ماہنامہ پکار)

☼

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

سبزیوں کا پلاؤ

اجزا:

ابلے چاول	چار کپ
مٹر	ڈیڑھ کپ
پھول گوبھی	ایک کپ
شملہ مرچ	ڈیڑھ کپ
پیاز	دو عدد
لہسن ادرک	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
پسی سیاہ مرچ	ایک چائے کا چمچہ
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

گرم تیل میں زیرہ اور چوپ کی ہوئی پیاز سنہری کر کے چوپ کیے ہوئے لہسن ادرک کالی مرچ اور نمک ڈال دیں پھر مٹر اور گوبھی کے گلنے کے بعد شملہ مرچ ڈال کر بھونیں۔ ابلے ہوئے چاول ڈال کر ہلکے ہاتھ سے مکس کریں اور دس منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔

بیسنی قورمہ

اجزا:

بیسن	آدھا کلو
پیاز	پانچ عدد
ہری مرچ	پانچ عدد
لہسن ادرک پیسٹ	دو چائے کے چمچے
دہی	آدھا کپ
پسی سرخ مرچ	دو چائے کے چمچے
پسا دھنیا	آدھا چائے کا چمچہ
ہلدی	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

بیسن میں زیرہ، ہری مرچ اور ہرا دھنیا، دو چوپ کی ہوئی پیاز اور نمک ملا کر پیسٹ بنالیں۔ فرائنگ پان میں تیل گرم کرکے بیسن کا آمیزہ پھیلا کر ڈال دیں۔ تھوڑا ایک جائے تو پلٹ دیں اور سنہری ہونے پر اتار لیں اور حسب پسند شیپ میں ٹکڑے کاٹ لیں۔ الگ پتیلی میں تیل گرم کرکے دہی کے علاوہ تمام اجزا ڈال دیں۔ باقی پیاز پیس کر شامل کریں اور بھونیں۔ پانی خشک ہونے لگے تو دہی ڈال دیں اور مسالا یکجان ہوجانے تک بھونیں، پھر شوربے کے لیے حسب مرضی پانی ڈالیں۔ ساتھ ہی بیسنی ٹکڑے ڈال کر تیز آنچ پر پکائیں، پھر گرم مسالا چھڑک کر دم پر رکھ دیں۔

فش کٹاکٹ

اجزا:

مچھلی	آدھا کلو
دہی	آدھا کپ
پیاز	دو عدد
لہسن ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
ٹماٹر	دو عدد
ہرا دھنیا، ہری مرچ	حسب پسند
کٹی سرخ مرچ	ایک چائے کا چمچہ
کٹا ہوا زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
کٹا ہوا دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

مچھلی دھو کر کانٹے الگ کرلیں اور چھوٹے چھوٹے کیوبز میں کاٹ لیں۔ توے پر تیل گرم کرکے باریک چوپ کیے ہوئے ٹماٹر اور پیاز ڈال کر نرم کریں، پھر کٹاکٹ کرتے رہیں۔ لہسن ادرک پیسٹ، نمک، زیرہ، دھنیا، سرخ مرچ اور ہری مرچیں، دہی اور مچھلی کے کیوبز ڈال کر کٹاکٹ کریں۔ یکجان ہوجائے تو ہرا دھنیا، پودینہ اور گرم مسالا ڈال کر اس وقت تک کٹاکٹ کریں جب تک تیل الگ ہوجائے پھر چپاتی یا نان کے ساتھ پیش کریں۔

لکھنوی کریلے

اجزا:

کریلے	آدھا کلو
پیاز	آدھا کلو
دہی	ایک کلو
لہسن ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
ہلدی	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
سرخ مرچ	ایک چائے کا چمچہ
میتھی دانہ	آدھا چائے کا چمچہ
رائی	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

کریلے چھیل کر درمیان سے کٹ لگائیں۔ بیج نکال دیں اور نمک لگا کر دھوپ میں رکھ دیں۔ ایک دو گھنٹے بعد اچھی طرح دھو کر خشک کرلیں۔ دہی میں تمام اجزا اور سلائس میں کٹی پیاز ڈال کر آمیزہ بنائیں اور کریلوں میں بھر دیں۔ تیل گرم کرکے رائی اور میتھی دانہ کڑکڑائیں، پھر کریلے اور دہی، پیاز کا بچا ہوا آمیزہ ڈال دیں۔ ہلکی آنچ پر کریلے گل جانے تک پکائیں۔ وقفے وقفے سے پتیلی پکڑ کر کریلوں کو الٹ پلٹ کرتے رہیں۔ (کریلوں میں زیادہ چمچہ چلانے سے گریز کرنا چاہیے) ہرا دھنیا چھڑک کر گرم گرم چپاتیوں کے ساتھ پیش کریں۔

ادارہ

خوبصورت سنہرے

بالوں کا رنگنا اب فیشن بنتا جارہا ہے۔ اب بال محض سفید بال چھپانے کے لیے ہی نہیں رنگے جاتے۔ بلکہ اب یہ فیشن کا لازمی حصہ ہیں۔ رنگے ہوئے بال شخصیت کی دلکشی میں اضافہ کرتے ہیں۔ تاہم یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے، جب آپ بال رنگتے وقت اپنی شخصیت، اپنی جلد، آنکھوں اور بالوں کی رنگت اور ساخت کو مدنظر رکھیں۔ اگر آپ کا رنگ گورا ہے تو آپ پر بالوں کا ہر رنگ سجے گا۔ قدرے صاف رنگت پر براؤن رنگ کے بال اچھے لگتے ہیں۔ گندمی یا زیتونی رنگ کی حامل خواتین اپنے بالوں کا رنگ سیاہ رکھیں تو ان کی شخصیت زیادہ پرکشش لگتی ہے۔ اگر آپ کے بالوں کی رنگت قدرتی طور پر گہری سیاہ ہے تو آپ بالوں پر سرخ، کاپر اور لائٹ براؤن رنگ کریں۔ اگر آپ کے بال زیادہ سفید ہیں اور آپ دیسی طریقوں سے بال رنگ رہی ہیں تو آپ کو دوسری مرتبہ بال رنگنے پر بہتر نتائج ملیں گے۔ ذیل میں ہم بال رنگنے کے چند طریقے بتارہے ہیں۔ جن کی مدد سے آپ اپنے بال گھر میں بہ آسانی رنگ سکتی ہیں۔

☆ اگر آپ اپنے بالوں کو سیاہ رنگ دینا چاہتی ہیں تو ایک پیالی تازہ آملہ لے کر انہیں پیس لیں۔ یہ پیسٹ بالوں پر اچھی طرح لگالیں۔ دو گھنٹے بعد سر دھولیں۔ تازہ آملہ نہ ہو تو آملہ پاؤڈر بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ آج کل بازار میں باآسانی دستیاب ہے۔ آملہ پاؤڈر کو پانی کی مناسب مقدار میں ملا کر گاڑھا پیسٹ تیار کرلیں۔ یہ پیسٹ بالوں پر لگالیں۔ تین گھنٹے بعد سر دھولیں۔

☆ اگر آپ اپنے بال براؤن رنگ کے کرنا چاہتی ہیں تو ایک پیالی مہندی لے کر پانی میں گھول لیں۔ اسے ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پھر برش کی مدد سے بالوں پر اچھی طرح لگالیں۔ جب مہندی خشک ہوجائے تو سر دھولیں۔

☆ اگر آپ اپنے بالوں کو گولڈن براؤن رنگ دینا چاہتی ہیں تو پیاز کے زیادہ چھلکے لے کر ایک یا ڈیڑھ گلاس پانی میں ابال لیں۔ جب چھلکوں کا عرق اچھی طرح پانی میں شامل ہوجائے تو اسی پانی میں ایک پیالی مہندی گھول لیں۔ ایک چمچہ شہد شامل کرکے اچھی طرح پھینٹیں۔ ایک گھنٹے کے لیے مہندی رکھ دیں۔ پھر بالوں پر لگالیں۔ جب مہندی خشک ہوجائے تو سر دھولیں۔

☆ بال ہلکے براؤن کرنے کے لیے اخروٹ کے درخت کی چھال (دنداسہ) لے کر پانی میں ابال لیں۔ بال شیمپو سے دھونے کے بعد آخر میں اس پانی سے سر دھوئیں۔ اخروٹ کی چھال کو مہندی میں ملا کر بھی بالوں میں لگایا جاسکتا ہے۔

☆ بال سیاہ کرنے کے لیے چائے کی پتی زیادہ مقدار میں لیں اور اس سے سادہ قہوہ بنالیں۔ دو چمچے کافی بھی شامل کرلیں۔ شیمپو سے سر دھونے کے بعد اسی قہوے سے سر دھوئیں۔ بہتر نتائج کے لیے اس قہوے میں تھوڑی سی مہندی بھی شامل کی جاسکتی ہے۔ مہندی شامل کرنے کی صورت میں آپ اسے بالوں پر دو گھنٹے کے لیے لگائیں اور پھر سادہ پانی سے سر دھولیں۔